TIGHT BINDING BOOK

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222766

UNIVERSAL
LIBRARY

ادع الی سبیل ربك بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی احسن

الاحیاء

کا

پہلا وعظ مسمّٰی بہ

السّوق لاھل الشّوق

منجملہ ارشادات جامع شریعت وطریقت حضرت مولانا

شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی دام فیضہ

(عبدالواسع جعفری کے اہتمام سے)

مطبع انوار احمدی واقع الہ آباد سے شایع ہوا

قیمت سالانہ ۸ مہر قیمت وعظ ہذا ۱۰ار معہ محصول ہے

قواعد وضوابط رسالہ الاحیاء

۱۔ اس رسالہ میں صرف مواعظ حسنہ حضرت حکیم الامت دام فیضہٗ کے شائع ہوں گے۔

۲۔ اس رسالہ کا مقصود مسلمانوں کی دینی اصلاح ہے۔ اور رسالگیں طریقت کے اوہام و شکوک دفعیہ ہے۔ اور مسلمانوں کی دینی معلومات کی ترقی ہے۔

۳۔ اس رسالہ کے ہر مہینہ میں ۴۸ صفحے شائع ہوں گے۔ سال بھر میں ۵۷۶ صفحے ہو جائیں گے قیمت سالانہ نفع عام کے خیال سے صرف ۲ روپہ محصول ڈاک رکھی جاتی ہے۔ ویلوپی ایبل یعنی قیمت طلب پیکٹ کے لئے ۲ روپے صرف ہوں گے۔

۴۔ چونکہ ہر وعظ ۴۸ صفحے پر ختم نہیں ہو سکتا اس لئے ہر مہینہ میں پورا وعظ ارسال نہ ہوگا بلکہ ہر مہینہ کسی وعظ کے آخر کے صفحات کسی کے شروع کے شامل کر کے ۴۸ صفحے پورے کئے جائیں گے۔ اس۔ خریداروں کو اطلاع دی جاتی ہے کہ ہر رسالہ کو بحفاظت رکھیں۔ تاکہ جس وعظ کے شروع کے صفحات کسی مہینہ میں بھیجے جائیں۔ دوسرے مہینہ میں جب آخر کے صفحات پہنچیں تو دونوں کو ملا کر وعظ پورا کر لیا جائے۔ رسالہ کا نمبر اور مہینہ کا نام ہر صفحہ کے نیچے لکھا ہوگا۔ اس سے سال بھر کے ۱۲ پرچے دیکھ لئے جائیں کہ پورے وصول ہوئے کہ نہیں۔ اور وعظ کا نام ہر صفحہ کے اوپر لکھا ہوگا۔ اس سے ہر وعظ کے اوراق ملا کر وعظ پورا کر لیا جا سکتا ہے۔

۵۔ اگر کسی مہینہ کا رسالہ نہ پہنچے تو دوسرے ماہ تک انتظار کر کے اطلاع دینا چاہئے کہ فلاں مہینہ کا پرچہ نہیں پہنچا اطلاع ملنے پر فوراً روانہ کر دیا جائیگا۔ اگر دوسرے رسالہ کے پہنچنے پر اطلاع نہ دی گئی تو رسالہ قیمت دیا جائیگا

۶۔ رسالہ کی قیمت ہندوستان کے لئے ۲ روپیہ ویلوپی ایبل ہے اور ممالک غیر کے لئے ۴ شلنگ ۸ پنس مقرر ہے ایک پرچہ کی قیمت ہندوستان کے لئے ۵ پ ممالک غیر کے لئے ۱۰ پنس ہے قیمت ہر صورت میں پیشگی لیجاتی ہے

۷۔ ہر خریدار کو شروع سال سے خریدار ہونا ضروری ہے۔ جو صاحب درمیان سال میں خریدار ہوں ان کو شروع سال سے سب پرچے بھیجکر شروع سال سے خریدار سمجھا جائیگا

۸۔ رسالہ کا سال ماہ رمضان المبارک سے شروع ہوگا۔

۹۔ یہ رسالہ کسی صاحب کے پاس بلا طلب یا تحریک روانہ نہیں کیا جائیگا۔

۱۰۔ اس رسالہ کے بابت تمام خط و کتابت اس پتہ سے کرنی چاہئے۔

عبدالواسع جعفری منیجر مطبع انوار احمدی۔ الہ آباد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تمہید وعظ السّوق لاہل الشّوق

بعد حمد وصلوٰۃ عرض کرتا ہے کاتب وعظ احقر محمد مصطفےٰ بجنوری مقیم میرٹھ محلہ کرم علی کہ آج ایک دنیا کو معلوم ہے کہ حضرت والا کا وعظ منجملہ عجائبات کے ہے اُس کے جس پہلو پر نظر ڈالئے بیساختہ یہی کہنا پڑتا ہے ؎

بہارِ عالمِ حُسنش دل وجاں تازہ میدارد　　برنگ ارباب صورت را بہوارباب معنی را

یہ حضرت ہی کے وعظ کی خصوصیات میں سے ہے کہ ہر مذاق کا آدمی علیٰ قدر مراتب اُس سے محظوظ ہوتا ہے۔ اہل زبان بندش الفاظ سے لطف اُٹھاتے ہیں اور اہل علم تحقیقات علمیہ سے مسرور ہوتے ہیں۔ اہل ظاہر کلام کی تہذیب سے محو ہو جاتے ہیں اور اہلِ باطن اندرونی امراض کے چٹکلے سن سن کر پھڑکے اُٹھتے ہیں بقول ایک محقق کے کہ حضرت کا وعظ کیا ہوتا ہے کہ حلقۂ شیخ ہوتا ہے جس میں ہر شخص کا کچھ نہ کچھ حصّہ موجود ہے درحقیقت حضرت کا وعظ از قبیل فصل خطاب ہے جس سے دودھ کا دودھ پانی کا پانی الگ الگ ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہر دل میں سرایت کئے بغیر نہیں رہتا کیونکہ حق بات کی خاصیّت یہی ہے کہ دل کے اندر ہی جگہ لیتی ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

از نصیحتہائے ناصح رنجش و آزردگی　　قلب اہل معصیّت را گرچہ طبعی اقتضا

لیک حسن موعظت ہا کیں دواءِ تلخ را　　در قلوبِ سامعینِ وعظ او چوں قند ہا

احقر کو اس جگہ وعظ کی ثنا وصفت کرنا مقصود نہیں ہے کیونکہ نہ یہ اسکا موقعہ ہے اور نہ یہ چند سطریں اس کے لئے کافی ہی ہو سکتی ہیں۔ احقر نے اس کے متعلق کچھ بطور مشتے نمونہ از خروارے اپنے ایک رسالہ مسمیٰ "معمولات اشرفی" میں لکھا ہے یہاں اس بحث کو بس اس پر ختم کیا جاتا ہے کہ حضرت کے وعظ کی خوبیاں کالشمس فی نصف النہار آشکارا ہو چکی ہیں بہت کم کان ایسے ہوں گے جو اُن سے آشنا نہ ہوں اصل وعظ تو چیزے دیگر ہے قلمبند شدہ وعظوں کو دیکھکر ہی اہل فہم پھڑک اُٹھتے ہیں حالانکہ معلوم ہے کہ وہ روایت بالمعنی ہے اور اگرچہ ضبط کرنے والوں نے جان توڑ کر کوششیں کیں لیکن ؎

گر مصور صورتِ آں دلستاں خواہد کشید لیک حیرانم کہ نازش را چساں خواہد کشید

قلم زبان کا ساتھ کہاں تک دے سکتا ہے اور لب ولہجہ کا عکس قلم میں کیسے آسکتا ہے غرض وعظ کی ثنا وصفت کو عیاں راچہ بیاں پر محمول کر کے چھوڑا جاتا ہے اور یہاں ایک خاص تغیر کو بیان کیا جاتا ہے جو اس وعظ سے تعلق رکھتا ہے جاننا چاہئے کہ چونکہ حضرت والا سے حق تعالیٰ کو ارشاد وہدایت کا کام لینا تھا اسواسطے وعظ سے دلچسپی اور تناسب تامہ ابتدائے عمر سے عطا فرمائی تھی جسوقت میں سن شریف بہت کم تھا اور حضرت کانپور میں قیام فرماتھے بڑے بڑے مجمعوں میں بیان ہوتا تھا اور پُرانے پُرانے سن رسیدہ اور مشہور اور متبحر علما وعظ سنکر حیران رہجاتے تھے (احقر نے کچھ واقعات معمولات اشرفی میں درج کئے ہیں وہ قابل ملاحظہ ہیں) جوں جوں سن شریف بڑھتا گیا تبحر علمی بھی بڑھتا گیا اور اس کمال میں آناً فاناً ایک خاص نشو ونما ہوا بالخصوص اُس وقت سے جب کہ حضرت والا کو قطب عالم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے بارگاہ سے خلافت عطا ہوئی کہ اُسوقت سے جملہ حالات کمالات خصوصاً وعظ میں وہ تغیرات ہوئے کہ بالکل اسکا مصداق ہے۔ کزرع اخرج شطأہٗ فازرہ فاستغلظ فاستوے علی سوقہ یعجب الزراع پہلا تغیر تو یہ ہوا کہ وعظ کہنا بالکل بند ہو گیا حتے کہ اُس سال مدرسہ کے جلسہ دستار بندی میں حضرت سے وعظ کے لئے کہا گیا تو عذر کیا اور فرمایا کہ میری زبان پر الفاظ ہی نہیں آتے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا بیان کروں۔ بہت اصرار سے اتنا کیا کہ ایک صفحہ کاغذ پر بہت تھوڑا مضمون فضیلت علم

میں لکھکر پڑھ دیا بعد چندے وعظ پھر شروع ہوا لیکن جس کسی نے دونوں وقت کے وعظ سُنے ہیں وہ بخوبی اندازہ کرسکتا ہے کہ دونوں میں زمین آسمان کا بل تھا دونوں میں الفاظ اور معانی یا صورت اور روح کی نسبت تھی اور دمبدم تفاوت ہوتا گیا حتی کہ اس وقت میں جو حالت وعظ کی ہے وہ ایک دنیا پر ظاہر ہے آج وہ بلا شک وشبہ جوامع الکلم کی قبیل سے ہے کوئی لفظی یا معنوی خوبی ایسی نہیں جو اُس میں موجود نہ ہو اب وہ حالت ہے کہ حضرت کے تقریر میں کہیں ایک لفظ کی بھی تبدیلی بلکہ تقدیم و تاخیر کی بھی گنجائش نہیں۔ ہر ہر جملہ بلکہ ہر ہر لفظ علم و حکمت کا عطر اور لب لباب اور جوہر ہوتا ہے۔ احقر کو دونوں حالتوں کا فرق مختصر الفاظ میں بیان کرکے وہ خاص تغیر دکھلاتا ہے جو اس وعظ السوق میں پیدا ہوا ہے ابتداء میں عادت شریف بطور استمرار یہ تھی کہ اوّل آیت کا ربط ماقبل سے بیان فرماتے پھر فوائد قیود کے پیرایہ میں تمام آیت کا مضمون بیان فرماتے اور درمیان میں نکات و لطائف وغیرہ سب کچھ ہوتے زمانہ فترت وعظ کے بعد ربط کے بیان کرنے کا التزام کم کردیا اور نفس آیت کے مضمون کا بیان فرماتے پھر اسمیں یہاں تک وسعت ہوئی کہ ایک ایک جملہ کا بیان پانچ پانچ چھ چھ سات سات گھنٹہ تک ہوا کیا اور کوئی مضمون از قبیل حشو و زوائد نہ آتا پھر ایک خوبی کا اور اضافہ ہوا وہ یہ کہ اول ایک تمہید ہوتی پھر مقاصد کا بیان ہوتا اور تمام وعظ میں ایک موضوع خاص پر بحث ہوتی اور کل مالہ وما علیہ کا بیان ہوتا اور اس موضوع ہی کے مناسبت سے نام رکھا جاتا مثلاً وعظ الخشوع میں خشوع ہی کی بحث ہے اور اُسکی ضرورت اور طرق تحصیل اور موانع تحصیل کے علاج سب سے تعرض کیا گیا ہے گویا ایک مستقل کتاب ہے جسمیں مقدمہ اور ابواب اور خاتمہ سب کچھ ہے پھر بعد چندے ایک اور خوبی کا اضافہ ہوا کہ شروع ہی میں تمام وعظ کا خلاصہ بیان فرما دیتے کہ آج اس موضوع پر بحث ہوگی اور یہ مضامین بیان ہوں گے اور اخیر میں خلاصہ مختصر الفاظ میں بیان فرما دیتے تاکہ طالبین کو معالجۂ امراض میں سہولت ہو ناظرین اندازہ کرسکتے ہیں کہ اس حالت میں وعظ کس درجہ کمال پر پہونچا ہوا ہے احقر اسکو بلا خوف تردید خرق عادت اور کرامت کہتا ہے اسی سال میں یعنی ۱۳۳۶ھ میں بعض ناہنجاروں اور

بے ادب لوگوں نے حضرت کے بعض مضامین اور معالجات پر حرف گیری کی جو اسقدر بیجا تھی کہ بعض آریوں نے دیکھکر کہا کہ یہ بالکل زبردستی ہے اور متکلم کے کسی لفظ سے یہ معنی نہیں پیدا ہوتے جو اُس کے سر لگائے جاتے ہیں اس کا ایسا شور مچایا کہ حضرت والا کو بھی گونہ تکدر ہوا اور افسوس کے لہجہ میں یہ شعر پڑھا ؎

گفت اے موسیٰ دہانم دوختی وز پشیمانی تو جانم سوختی

اور فرمایا میرا کیا حرج ہے اب میں مضامین عالیہ بیان کرنا بالکل چھوڑ دونگا بس سیدھا سیدھا بیان کرونگا۔ جن لوگوں نے وہ وعظ سنے ہیں اُن کو جس قدر قلق ہوسکتا ہے ظاہر ہے ؎

از خدا خواہیم توفیق ادب بے ادب محروم ماند از فضل رب

بے ادب خود را نہ تنہا داشت بلکہ آتش در ہمہ آفاق زد

بہرحال وعظ "السوق" سب سے پہلا وعظ ہے جسمیں طرز بدلا گیا خود حضرت نے ایک مرتبہ فرمایا کہ میں سے پہلے میں ہر قسم کے مفید مضامین آیت کے تحت میں ذرا سی مناسبت سے بیان کر دیتا تھا اور اب صرف ترجمہ کیا کروں گا۔ اور وہی مضامین بیان کرونگا جو کسی سے منقول ہوں تاکہ اگر کوئی اشکال کرے تو صرف میرے ذمہ تصحیح نقل ہو اور بس اور فرمایا کہ اب طرز یہ ہوگا کہ آیتیں زیادہ پڑھی جاویں اور مطالب مختصر بیان کئے جاویں جیسا کہ پہلے اس کا عکس تھا کہ آیت مختصر ہوتی تھی اور مطالب طول طویل اس کو سُنکر جملہ خدام کو از حد قلق تھا مگر وعظ السوق کو سُنکر چند اشخاص بیساختہ بول اُٹھے کہ حضرت کتنا ہی قصداً بگاڑیں، مگر جس چیز کو خدا بناوے وہ کیسے بگڑ سکتی ہے اور خواجہ عزیز الحسن صاحب اور ایک شخص اور ہمزبان ہوکر کہہ اُٹھے ؎

چلی شوخی نہ کچھ بادِ صبا کی بگڑنے میں بھی زلف اسکی بنا کی

اور ایک شخص نے کہا یہ وعظ کے لئے غایت کمال کا مرتبہ ہے بقولیکہ ما النہایۃ العود الی البدایۃ غرض وعظ السوق میں پہلا طرز پھر اختیار کیا گیا ہے اور مضامین وہی بیان کئے گئے ہیں۔ جو آیت اور ترجمہ سے بلا واسطہ تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن اس پر بھی اس قدر دلچسپ اور ہر دل پسند ہوا کہ جن لوگوں نے ابتدا کے وعظ حضرت والا کے سنے ہیں وہ کہتے ہیں کہ باوجود اتحاد

طرز کی زمین آسمان کا بل ہے اس کی خوبی کچھ سننے ہی سے تعلق رکھتی تھی افسوس ہے کہ قلم زبان کا ساتھ نہیں دے سکتا تاہم جو کچھ بُرا بھلا محفوظ ہو سکا ہدیۂ ناظرین ہے۔ کاتب لکھتا ہے کہ خدا کا شکر ہے کہ یہ تغیرِ طریقۂ بیان صرف ایک اسی وعظ تک محدود رہا آئندہ مواعظ پھر اُسی طریق پر ہونے لگے جس میں صرف ترجمہ اور توضیح بقدر ضرورت پر اکتفا نہیں بلکہ کل مالہ وما علیہ سے بحث کی جاتی ہے اور استنباطات اور علوم غیر منقولہ بھی شامل ہیں

احقر محمد مصطفےٰ کاتب وعظ ہذا

السوق لاہل الشوق

این	متیٰ	کم	کیف	ماذا	من ضبط	المستعون	الاشتات
مدرسہ قاسم العلوم محبوب شاہی بازار چوک مراد آباد	۲۲ شعبان ۱۳۳۲ھ ہجری یوم الاحد بجون ۱۹۱۴ء	از ۸ بجے تا ۱۲ بجے صبح تا ۱ بجے ۵۵ منٹ کل وقت ۴ گھنٹے ۵۵ منٹ	کرسی پر لب بند بیٹھکر	ترغیب علم و اجلال و فرح و جزت	احقر محمد مصطفےٰ کنبوری مقیم میرٹھ محلہ کوٹلی	۱۵۰۰ تا ۲۰۰۰	

وعا خطبہ۔ اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم وما قدروا اللہ حق قدرہ والارض جمیعا قبضتہ یوم القیٰمۃ والسمٰوات مطویات بیمینہ سبحانہ وتعالیٰ عما یشرکون ونفخ فی الصور فصعق من فی السمٰوات ومن فی الارض الا من شاء اللہ ثم نفخ فیہ اخریٰ فاذا ھم قیام ینظرون واشرقت الارض بنور ربھا ووضع الکتاب وجیٔ بالنبیین والشھداء وقضی بینھم بالحق وھم لا یظلمون۔ ووفیت کل نفس ما عملت وھو اعلم بما یفعلون۔ وسیق الذین کفروا الیٰ جھنم زمرا حتیٰ اذا جاؤھا فتحت ابوابھا وقال لھم خزنتھا الم یاتکم رسل منکم یتلون علیکم اٰیات ربکم وینذرونکم لقاء یومکم ھذا قالوا بلیٰ ولکن حقت کلمۃ العذاب علی الکفرین قیل ادخلوا ابواب جھنم خلدین فیھا فبئس مثویٰ المتکبرین وسیق الذین اتقوا ربھم الی الجنۃ زمرا حتیٰ اذا جاؤھا وفتحت ابوابھا وقال لھم خزنتھا سلام علیکم طبتم فادخلوھا خلدین وقالوا الحمد للہ الذی صدقنا وعدہ واورثنا

الارض نتبوأ من الجنة حيث نشاء فنعم اجر العاملين وترى الملئكة حافين من حول العرش يسبحون بحمد ربهم وقضى بينهم بالحق وقيل الحمد لله رب العلمين ط یہ چند آیتیں ہیں جن میں حق جل شانہ وعم نوالہ نے اکثر حصہ میں معاد کا ایک مضمون بیان فرمایا ہے۔ اور اس سے مقصود اس مقام پر توحید کی ترغیب اور تاکید ہے اور ترک توحید پر ترہیب ہے تو یہ دو مضمون ہیں اور ان دونوں میں سے بھی زیادہ مقصود اثبات توحید ہے گو عبارت میں معاد کے بیان کو زیادہ طول ہے اور اس میرے دعوے پر کہ مقصود اثبات توحید ہے آیت میں صریح قرینہ وما قدروا اللہ حق قدرہ ہے جسکا میں ترجمہ کرونگا تو بہت وضاحت کیساتھ یہ بات سمجھ میں آجاوے گی غرض اس آیت میں کھلے کھلے الفاظ ایسے موجود ہیں جن سے میرا مدعا ثابت ہوتا ہے ترجمہ کے عنوان میں غور کرنے سے معلوم ہوجاویگا کہ مقصود زیادہ تر اثبات توحید ہے اور اس مضمون کی تاکید کے لئے معاد کا بیان کیا گیا ہے اور اس آیت سے اوپر تو بہت ہی صریح الفاظ اس مضمون کے موجود ہیں دیکھئے فرماتے ہیں قل افغير الله تامرونی اعبد ایہا الجاہلون یعنی اے جاہلو کیا تم مجھے خدا تعالی کے سوا کسی اور کی عبادت کے لئے کہتے ہو۔ اس میں غیر اللہ کی عبادت پر انکار کیا گیا یعنی شرک کی نفی کی گئی اور یہ عین اثبات توحید ہے اور اس سے بھی صریح عنوان اس کے آگے یہ موجود ہے ولقد اوحی الیک والی الذین من قبلک لئن اشرکت لیحبطن عملک ولتکونن من الخاسرین اس میں لفظ لئن اشرکت موجود ہے نفی شرک کے لئے اس سے زیادہ کونسا لفظ صریح ہوسکتا ہے اور ہر چند کہ لئن اشرکت واحد حاضر کا صیغہ ہے جسمیں بظاہر خطاب صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے مگر مقصود یہ نہیں ہے کہ یہ حکم یعنی شرک کی ممانعت اور توحید کی تاکید صرف حضور کی ذات مبارک کے ساتھ خاص ہے کیونکہ اسپر سیکڑوں نصوص اور دلائل موجود ہیں کہ توحید کا قائل ہونا ہر شخص کے لئے ضروری ہے اور شرک سب کے لئے ممنوع ہے بلکہ اس آیت میں اصل مقصود ملازمت ثابت کرنا ہے درمیان شرک اور حبط عمل کے یعنی جہاں شرک کا وجود ہوگا اس کے ساتھ حبط عمل بھی ضرور ہوگا اور حضور کو اسکا مخاطب اس لئے کیا گیا کہ وحی کے مخاطب اول حضور ہی ہیں غرض خطاب خاص کے صورت میں ایک

نفی الشرک واثبات التوحید میں خطاب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کیوں ہے

قاعدہ کلیہ بیان کیا گیا ہے وہ یہ کہ شرک کو حبط عمل لازم ہے یہ تو مشہور جواب ہے اس بات کا کہ اس موقعہ پر یا اسی جیسے دوسرے موقعوں پر قرآن میں حضور کو مخاطب کیوں بنایا گیا ہے اور اس کا ایک نہایت لطیف جواب اور ہے وہ یہ کہ لئن اشرکت میں خطاب حضور کو ہے ہی نہیں کیونکہ حضور کی شان غایت نزاہت رکھتی ہے شرکت جیسی گندی چیز کا وہاں کیا ذکر اور کیا احتمال شرک تو وہ اکبر الکبائر اور اقبح القبائح ہے جس کو کسی صاحب عقل نے بھی جائز نہیں رکھا شان نبوت تو بہت اعلیٰ ارفع ہے بلکہ اس کا خطاب دوسرے مخاطبین کو ہے اور اس پر کوئی لفظ اوحی الیک سے اشکال نکرے جو اسی جملہ میں موجود ہے کہ اوحی الیک میں تو یقیناً حضور کو خطاب ہے اس کا مخاطب تو ہر شخص نہیں ہو سکتا جب ایک جملہ میں آپ کو خطاب ہے تو جملہ ثانیہ لئن اشرکت الخ کے مخاطب بھی آپ ہی ہوں گے کیونکہ یہ کوئی ضروری بات نہیں کہ آیت میں کئی مضمون ہوں تو سب کے مخاطب حضور ہی ہوں بلکہ ہو سکتا ہے کہ ایک کے مخاطب حضور ہوں اور باقی مضامین تبلیغ کے لئے ہوں اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ کی طرف اور تمام انبیا کی طرف وحی بھیجی گئی ہے اس مضمون کی کہ لئن اشرکت ایہا المخاطب لیحبطن عملک تاکہ یہ حکم خدا کے بندوں کو پہنچا دو کہ جو کوئی شرک کرے گا اس کے اعمال حبط ہو جائیں گے تو لئن اشرکت میں تو خطاب افراد امت کو ہوا اور لقد اوحی الیک الخ میں حضور کو اور دیگر انبیاء علیہم السلام کو خطاب ہوا بہر حال خطاب خواہ عام ہو یا خاص احاد امت کو ہو مقصود آیت میں نفی اور ابطال شرک ہے اور پوری آیت سیاق و سباق میں نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شرک کو باطل کرنا اور توحید کو ثابت کرنا منظور ہے چنانچہ فرماتے ہیں ما قدروا اللہ حق قدرہ یعنی ان لوگوں نے خدا کی اتنی عظمت نہیں جانی جتنی کہ واقع میں ہے اسمیں شکایت ہے شرک کی کیونکہ شرک کے معنی یہی ہیں کہ خدا میں کسی بات کی کمی ہے اسواسطے دوسرے کو ماننے کی ضرورت ہے۔ کوئی دوسرے کو کسی کام میں جب ہی شریک کرتا ہے کہ وہ کام خود اس سے پورا نہ ہو سکے مثلاً تجارت میں کوئی دوسرے کو اسی وجہ سے شریک کرتا ہے کہ اس کے پاس روپیہ کم ہے یا یہ اسمیں کما حقہ محنت نہیں کر سکتا غرض اس میں مالی

فائدہ: شرکت کے خطاب حضور علیہ السلام کو نہیں ہوتا۔

فائدہ: شرکت کی وجہ سے عمل حبط ہوتا ہے۔

یا جانی کمی ہے اُس کے پورا کرنے کے لئے دوسرے کو شریک کرتا ہے تو خدا کے ساتھ جب کسی کو شریک کیا جاوے گا تو اس کے معنی یہی ہوں گے کہ نعوذ باللہ خدا میں کسی بات کی کمی ہے اس کے پورا کرنے کے لئے دوسرے کی ضرورت ہے اس صورت میں خدا تعالیٰ کو کمال و آثار کمال میں تفرد نہ ہوگا تو مشرک نے خدا کو کامل نہیں مانا بلکہ ناقص مانا تو اس نے خدا کی پوری تعظیم نہیں کی کیونکہ پوری تعظیم بدون اس کے نہیں ہوسکتی کہ کمال یا اُس کے آثار میں کمی نہ مانی جاوے میں نے یہ دو لفظ یعنی کمال و آثار کمال اسواسطے کہے کہ بعض دفعہ اعتقاد وجہ کمال میں تو شرک نہیں ہوتا مثلاً خالقیت وغیرہ میں خدائے تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ مانا جاوے مگر آثار میں شریک مانا جاوے جیسے مشرکین عرب کرتے تھے کہ مقصودیت و خالقیت میں کسی کو حق تعالیٰ کی برابر نہیں مانتے تھے ہاں اُس کے آثار میں غلطی کرتے تھے اس کی شہادت قرآن میں موجود ہے حق تعالیٰ نے اُن کا قول نقل فرمایا ہے ما نعبدہم الا لیقربونا الی اللہ زلفیٰ۔ یعنی مشرکین کہتے تھے کہ ہم ان بتوں کی پرستش صرف اس واسطے کرتے ہیں کہ یہ ہم کو خدا کے یہاں پہنچا دیں اور مقرب بنا دیں اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ خدا کے برابر تو کسی کو نہیں جانتے تھے ہاں خدا کے تصرفات میں بعضوں کو دخیل مانتے تھے بلفظ دیگر یہ کہ کمال میں تو شریک نہیں کرتے تھے لیکن آثار کمال میں شریک کرتے تھے اور حدیث میں روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مشرک سے پوچھا تیرے کتنے معبود ہیں کہا سات ہیں اُن میں سے سب سے بڑا تو آسمان میں ہے بڑے بڑے کاموں کے لئے اُس کو پکارا جاتا ہے اور معمولی کاموں کے لئے دوسرے معبود ہیں دیکھئے یہ لوگ کمال مطلق تو حق تعالیٰ ہی کے لئے ثابت کرتے تھے کیونکہ اس سے بڑا کسی کو نہیں جانتے تھے ہاں کمال کے آثار میں دوسروں کو بھی شریک کرتے تھے وہ یہ کہ خدائے تعالیٰ کے یہاں پہنچانے اور قریب کرنے کے لئے اُن کو معبود مانتے تھے مگر اس پر بھی حق تعالیٰ نے انکار فرمایا چنانچہ آیت مذکورہ میں انکا وہی قول نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ والذین اتخذوا من دونہ اولیاء ما نعبدہم الا لیقربونا الی اللہ زلفیٰ ان اللہ یحکم بینہم یوم القیمۃ فیما ہم فیہ یختلفون ان اللہ لا یہدی من ہو کاذب کفار ایسے لوگوں کو کفار فرمایا۔ غرض یہ دونوں مشرک ہیں اسی واسطے میں نے دو لفظ عطف کے ساتھ کہے کہ کمال

مشرکین عرب حق تعالیٰ کی برابر کسی کو نہیں سمجھتے تھے مگر آثار کمال میں غلطی کرتے تھے۔

میں اور اس کے آثار و مقتضیات میں جبتک کمی کی بالکلیہ نفی نہ کی جاوے اسوقت تک پوری تعظیم نہیں ہوسکتی اگر ایک میں بھی کمی مانی جاوے گی تو پوری تعظیم نہ ہوگی خواہ کمال میں کمی ہو یا اس کے آثار و مقتضیات میں یہ دونوں منافی ہیں حق تعالیٰ کی عظمت کے اور ان میں سے کسی ایک کا بھی قائل ہونا شرک ہے پوری بڑائی بھی ہے کہ نہ کمال میں کسی کو شریک مانا جاوے اور نہ مقتضیات کمال میں غرض شکایت کرتے ہیں کہ ماقدروا اللہ حق قدرہ ان لوگوں نے خدائے تعالیٰ کی پوری عظمت نہیں کی حالانکہ پوری پوری عظمت کرنی چاہئے کیونکہ خدائے تعالیٰ کی ایسی شان ہے کہ زمین اس کی ایک مٹھی ہے اور آسمان ایک ہاتھ میں لپیٹ لئے جاویں گے اور صور پھونکا جاوے گا اور قیامت قائم ہوگی اور کفار جہنم میں جاویں گے اور مومنین کو جنت ملے گی غرض حق و باطل پر اس اہتمام کے ساتھ جزا و سزا ہونے والی ہے پھر یہ لوگ کس خیال میں ہیں اور کیوں خدائے تعالیٰ کی عظمت کما حقہ نہیں کرتے اور شرک کئے جاتے ہیں اول تو کمال ذاتی ہی مقتضی ہے توحید کے ماننے کا خواہ جزا و سزا نہ بھی ہو کیونکہ جب اسکو خدا کہا تو اس کے ناقص ہونے کے کیا معنی لامحالہ اس کو کامل ماننا چاہئے اور جب وہ واقع میں خدا ہے تو اس کا ماننا ایک سچی بات کا ماننا ہے اور سچی بات مانی ہی جاتی ہے خواہ اس کے ماننے پر کوئی ثمرہ مترتب ہو یا نہ ہو مثلاً یہ مسجد اینٹ کی بنی ہوئی ہے جس کو ہم نے آنکھ سے دیکھ لیا ہے کہ اینٹ کی ہے تو کیا اب یہ کہنے کی گنجائش ہے کہ ہم تو اس کو اینٹ کی بنی ہوئی جب کہیں گے کہ ہم کو پچاس روپیہ دئے جاویں۔ نہیں اصل یہی ہے کہ سچی بات ماننا پڑتی ہے خواہ اس پر کوئی نتیجہ ہمارے موافق مترتب ہو یا نہ ہو بلکہ سچی بات پر اگر نتیجہ ہمارے خلاف ہی مترتب ہو تب بھی اسکا انکار نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک شخص ایک دیوار کے نیچے کھڑا ہے اور کوئی شخص خبر دے کہ دیوار گرائی جارہی ہے اور وہ اس بات کو ثابت بھی کردے مثلاً اس کو دکھلادے کہ یہ مزدور اوپر چڑھے ہوئے اسکو گرا رہے ہیں۔ تو یہ بہانہ اس کی تکذیب کے لئے کافی نہ ہوگا کہ اول تو ہمکو پچاس روپیہ دلواو تب ہم مانیں گے اور اگر روپیہ بھی نہ ملیں تب بھی اس کے ماننے میں لازم آتا ہے کہ ہم اپنے لئے اس دیوار میں دب جانا تسلیم کرلیں جو کہ ایک بڑی مضرت ہے لہٰذا ہم ایسے نقصان کی بات کو نہیں مانتے صاحب چاہے تم دبو یا مرو یا کچھ بھی ہو چونکہ وہ سچی بات ہے

اس کو تو ماننا ہی پڑیگا۔ اسی طرح حق تعالیٰ کا تفرد فی الکمال اور اسکا منزہ عن الشریک ہونا دلیل سے ثابت ہے اور واقعی بات ہے تو اُس کو ماننا پڑے گا خواہ جزا و سزا کچھ بھی نہ ہو تو اصل مقتضا تو کمال ذاتی یعنی حق تعالیٰ کے فی الواقع متفرد ہونے کا یہی ہے کہ بلا خوف جزا و سزا کے بھی اُس کو مانا جاوے کیونکہ سچی بات ہے اور اگر کوئی سچی بات ہونے کے سبب نہ مانے تو جزا و سزا کے خوف سے تو ماننا چاہئے اس کی مثال یہ ہے کہ علم فی نفسہ اچھی چیز ہے اُس کو حاصل کرنا چاہئے اول تو شوق سے حاصل کرنا چاہئے اور اگر شوق سے نہ ہو تو خوف سے سہی اسی واسطے بچہ کو مارتے پیٹتے اور ڈراتے ہیں تاکہ وہ خوف ہی سے علم حاصل کرے اسی واسطے قرآن شریف میں اس عنوان کو اختیار کیا گیا کہ توحید کے بیان کے ساتھ معاد کا بیان کیا گیا کہ اب ایسا ہونے والا ہے یوم الفصل آنے والا ہے اور وہاں یہ یہ ہوگا باوجود اس کے تعجب ہے کہ مشرکین پوری تعظیم نہیں کرتے اور شرک سے باز نہیں آتے جیسے بچہ سے کہیں کہ کل کو امتحان ہونیوالا ہے اور ایسی ایسی قچیاں منگائی گئی ہیں اور ایسے ایسے جلاد بلائے گئے ہیں جو بالکل بے رحم ہیں اگر اس پر بھی وہ یاد نہ کرے تو تعجب کیا جاویگا کہ کس قدر دلیر اور بدطینت ہے کہ علم اول تو ویسے ہی قدر کی چیز ہے بے علم آدمی جانوروں سے بھی بدتر ہے قطع نظر اس سے اس بے حیا کو ایسی مار کا بھی خوف نہ ہوا ظاہر ہے کہ بچہ کے سامنے یہ ہولناک چیزیں سنانے سے غرض اُس کو علم سکھانا ہے اسی طرح آیت میں مقصود توحید کا اثبات اور شرک کی نفی کرنا ہے اسی کے لئے معاد کا ذکر فرمایا ہے۔ امام رازی فرماتے ہیں۔ متن قرآن یعنی اُس کے اصول مسائل تین چیز ہیں توحید اور رسالت اور معاد یہ تینوں اصول اور متن ہیں باقی سب ان کی شرح ہیں ان میں سے دو مسئلے اس آیت میں مذکور ہیں یعنی توحید اور معاد۔ اور غور کیا جاوے تو تیسرا مسئلہ یعنی مسئلہ رسالت بھی اس آیت میں مذکور ہے کیونکہ ان ہی آیات میں صاف موجود ہے۔ اَلَمْ یَاْتِکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یعنی فرشتے کفار سے بطور سرزنش کہیں گے کہ کیا تمہارے پاس پیغمبر نہیں آئے تھے اور وہ حسرت سے جواب دیں گے کہ بَلٰی وَلٰکِنْ حَقَّتْ کَلِمَۃُ الْعَذَابِ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ یعنی پیغمبر آئے تو بیشک تھے مگر قسمت ہماری کہ یہ عذاب چکھنا تھا انکی بات کو نہ مانا معلوم ہوا کہ مسئلہ رسالت بھی ضروری اور ماننے کی چیز ہے تو تینوں اصول دین اس آیت میں مذکور ہیں

متن قرآن توحید و رسالت و معاد ہے۔

اور مسئلہ رسالت کے ضروری ہونے کا راز یہ ہے کہ مسئلہ توحید موقوف ہے رسالت پر اور مسئلہ توحید ضروری ہی ہے تو مسئلہ رسالت بھی ضروری ہوا اور مسئلہ توحید کے مسئلہ رسالت پر موقوف ہونے کا بیان یہ ہے کہ توحید خدائے تعالےٰ کی معرفت پر موقوف ہے اور معرفت ایک تعلق ہوتا ہے درمیان دو شخصوں کے اور تعلق کے لئے مناسبت شرط ہے اور بندوں میں اور خدا میں کچھ مناسبت نہیں اسواسطے ضرورت ہوئی واسطہ کی اس واسطہ ہی کو رسول کہتے ہیں خدائے تعالیٰ کی شان یہ ہے انت کما اثنیت علی نفسک یہ سید العارفین جناب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقولہ ہے فرماتے ہیں کہ اے اللہ آپ خود ہی اپنی ذات وصفات کو خوب جانتے ہیں ہم نہیں جان سکتے اور یہ بطور مبالغہ نہیں ہے بالکل سچی اور واقعی بات ہے ذات وصفات واجب تعالیٰ کا علم ممکن کو ہو ہی نہیں سکتا۔ اپنا علم انھیں کو ہے اگر کوئی عقل سے کچھ دریافت کرنا چاہیگا تو قیاس الغائب علی الشاہد ہوگا کیونکہ اُن کی کوئی نظیر نہیں تو بہت سے بہت یہ ہوگا کہ شاہان دنیا پر قیاس کرینگے کہ اُن کی بھی قدرت اور علم اور دیگر صفات ایسی ہی ہوں گی اور یہ بات کہ اُن کی قدرت عام اور علم محیط سب کوئی چیز خارج نہیں یہ بلا وحی کے ثابت نہیں ہوسکتی تو خدا کی معرفت عقل سے جو کچھ ہوتی بھی وہ بالکل ناقص ہوتی چنانچہ جن لوگوں نے وحی سے استفادہ نہیں کیا اور اپنی عقل کے زعم میں رہے انھوں نے الٰہیات میں ایسی غلطیاں کی ہیں جن پر آج اہل حق کے بچے بھی ہنستے ہیں جب تک وحی نہیں تھی وہ لوگ بڑے عقلمند اور حکیم مانے جاتے تھے لیکن وحی کے آنے پر اُن کی قلعی کھل گئی کہ کیسی فاش غلطیوں میں مبتلا تھے غرض خدائے تعالیٰ کی معرفت بلا اُسی طرف کی خبر کے اور بلا توسط واسطہ کے جسکو رسول کہتے ہیں نہیں ہوسکتی اگرچہ خبر کے بعد بھی کہ اُس کی مُدرک نہیں مگر خبر سے اتنا تو ہوا کہ وجہ تو اس کی مدرک ہوئی (یعنی علم بالوجہ تو ہوگیا) اجمالا اتنا تو معلوم ہوگیا کہ خدائے تعالےٰ وہ ہے جسکی قدرت اور علم سے کوئی چیز خارج نہیں بلا وحی اور بلا رسول کے اتنا بھی معلوم نہیں ہوسکتا یہ راز ہے مسئلہ رسالت کی ضرورت کا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مسئلہ توحید بلا مسئلہ رسالت کے پورا نہیں ہوسکتا۔ غرض تینوں اصول مسائل اس آیت میں مذکور ہیں توحید بھی اور رسالت بھی اور معاد بھی ہاں بیان مبسوط معاد کا ہے گو مقصود توحید ہے اور اس سے تعجب نہ کیا جاوے اور یہ شبہہ نہ کیا جاوے کہ اگر مقصود مسئلہ توحید ہوتا تو اسکے

بیان میں بسط ہوتا نہ کہ اُس مسئلہ کے بیان میں جو مقصود نہیں اور تبعًا اور ضرورتًا لایا گیا ہے گویا طریق کو مقصود سے بڑھا دیا گیا صاحو کبھی تو طیبہ و تمہید میں زیادہ کام ہوتا ہے بہ نسبت اصل مقصود کے جیسے کھانا ایک مقصود ہے کہ یہ ذرا دیر کا کام ہے مگر اس کے تمہید اور مقدمات کو دیکھئے کہ اللہ تو پہ کس قدر طول طویل اور دشوار ہیں اس کا شروع مثلاً کھیتی سے ہوتا ہے اس کے لئے برسات کے موسم کا انتظار کرنا پڑتا ہے بہت انتظار کے بعد موسم آیا تو بیلوں کی ضرورت ہے اور آدمیوں کی ضرورت ہے سب طکر کام کرتے ہیں حتی کہ مالک کو بھی اُن کے ساتھ لگنا پڑتا ہے برسات کی دھوپ ہے اور سر سے پیر تک پسینہ بہہ رہا ہے ہزار کوششوں اور دردسریوں کے بعد کھیت پیدا ہوا اور عرصہ تک نگاہداشت اور غور و پرداخت کے بعد اُس میں دانہ پیدا ہوا پھر وہ کاٹا گیا اور پیروں میں لاکر گاہا گیا دانہ الگ کیا گیا اور بھوسہ الگ پھر اُس دانہ کو پیسا گیا پھر پکایا گیا اور پکانے کے لئے ماما کی تلاش کرنی پڑی غرض ہزار وقت یہ نوبت آئی کہ کھانا تیار ہوا پس میں کتنا عرصہ لگا اور کتنے بکھیڑے ہوئے کہ خدا کی پناہ اور یہ سب ذریعہ اور تمہید کا مرتبہ تھا اور جو اصل مقصود ہے یعنی کھانا وہ پانچ منٹ میں ختم دیکھئے اس مثال میں مقصود سے ذریعہ اور تمہید کو اتنا طول ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ بہ نسبت مقصود کے ذریعہ میں طول ہے بلکہ طریق کا بہ نسبت مقصود کے طویل ہونا تو موافق عادت کے ہے اور امر اکثری ہے دیکھئے آپ کہیں سیر کرنے یا اور کسی کام کے لئے جاتے ہیں تو اصل مقصود طول عرض میں کتنا ہوتا ہے اور اسکا طریق کتنا ہوتا ہے مثلاً کلکتہ سیر کے لئے گئے تو سیرگاہ یعنی شہر کلکتہ تو دو چار میل ہی کا طول عرض رکھتا ہے مگر طریق اس کا ایک ہزار میل کا ہے تو یہ کچھ تعجب کی بات نہیں کہ طریق مقصود سے بڑا ہے بلکہ امر معتاد یہی ہے کہ طریق مقصود سے طول ہو ہاں جلالت قدر میں مقصود کا ذریعہ سے بڑا ہونا ضروری ہے اگر اسکا خیال نہ رکھا جاوے تو غلطی ہوگی مثلاً کلکتہ جانا سیر کے لئے اور عجائبات دیکھنے کے لئے تو مضائقہ نہیں کیونکہ یہ چیزیں کسی درجہ میں مہتم بالشان ہیں اور اگر مثلاً کوئی اسواسطے جاوے کہ ایک مٹھی گھاس کی ضرورت ہے اور اُس کے لئے اتنا سفر کرے تو ہر شخص بیوقوف بتلاویگا کہ اتنی ذراسی بات کے واسطے اتنا بڑا راستہ کیوں طے کیا اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ مقصود جلالت قدر میں طریق کی برابر نہیں آیت میں مقصود مسئلہ توحید ہے اور یہ جسقدر جلیل القدر مسئلہ ہے

ذریعہ کا مقصود سے طول ہونا تعجب کی بات نہیں کیونکہ اکثر اوقات ذریعہ کا طول مقصود سے بڑا ہوتا ہے۔

سب جانتے ہیں اس کے لیے طریق کو جتنا بھی طول ہو تعجب کی بات نہیں بلکہ عین عادت اور عقل کے موافق ہے غرض اتنی تقریر سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی کہ آیت میں بالقصد مسئلہ توحید کا اثبات اور شرک کی نفی کرنا ہے اور اس کی تاکید کے لئے مسئلہ معاد نہایت شد و مد کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور مسئلہ رسالت بھی آیت میں مذکور ہے غرض تینوں اصول دین آیت میں مذکور ہیں لیکن مجھ کو اس وقت صرف مسئلہ معاد کو بیان کرنا مقصود ہے اور نتیجہ یہ نکالونگا کہ جب معاد میں ایسے واقعات ہونے والے ہیں تو ظاہر ہے کہ اس کی درستی کی بہت ضرورت ہوئی تو اسکا جاننا بھی سخت ضروری ٹھہرا کہ معاد کی درستی کیسے ہوتی ہے اور چونکہ یہ اعتمال تھا کہ پھر یاد رہے نہ رہے اس لئے اسکو میں ذرا تفصیل کے ساتھ یہیں بتائے دیتا ہوں کہ معاد کی درستی کے طریقے میں اخیر میں کہا بتاؤنگا سو اس طریق کا حاصل وہ یہ ہے کہ عقائد و اعمال کی اصلاح کیجاوے اور یہ موقوف ہے علم پر تو علم کی ضرورت ثابت ہوجاوے گی اور یہ مضمون اس علمی جلسہ کے مناسب ہوجاوے گا صاحبو یوں تو حضور کے ارشاد ہی سے ضرورت علم کی معلوم ہے بہت سی حدیثیں علم کی فضیلت اور اس کے طلب وجوب کے متعلق موجود ہیں۔ جب حضور کا حکم ہم کو ملگیا تو ضرورت معلوم ہوگئی کہ اس کام کو کرنا چاہئے اب اور کسی ضرورت کے تلاش کی حاجت نہیں رہی لیکن اگر عقل سے بھی ثابت ہوجاوے اس طرح سے کہ تحریر عن المضرت اور جلب منفعت ضروری چیز ہے اور منجملہ مضرتوں کے مضار آخرت بھی ہیں بلکہ مضرت کے افراد میں اکمل وہی ہیں تو آخرت کے مضار سے بچنا بھی ضروری ہوا اور وہ موقوف ہے مضار آخرت کے علم پر جسکا ذریعہ محض علم دین ہے تو اس سے یہ مضمون اور زیادہ اقرب الی الفہم اور موجب طمانیت قلب ہوگا اسواسطے میں بیان معاد کے بعد اصلاح عقائد و اعمال کی ضرورت بیان کروں گا اس کے لئے علم کی ضرورت ثابت کرونگا تاکہ اچھی طرح ذہن نشین ہوجاوے اسوقت اس اصلاح مذکور کے طریق کے متعلق کچھ عرض کرتا ہوں آج کل اسکو سب مانتے ہیں کہ مسلمانوں کو اپنے تمام حالات میں اصلاح کی حاجت ہے اور اس کے لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ سب مسلمان ملکر کوشش کریں یہ کام ایک دو افراد کا نہیں ہے اور اصلاح کے لئے علم کی ضرورت ہے تو اس بات کی ضرورت ہوئی کہ علم کے لئے سب مسلمان مل کر کوشش کریں گھر گھر علم کا چرچا ہو جگہ جگہ سے اہل علم کے موجود ہوں چنانچہ بحمداللہ بہ نسبت پہلے زمانہ کے

اس میں ترقی بھی ہے۔ ہر جگہ مدرسہ موجود ہے کچھ نہ کچھ مجمع اہل علم کا موجود رہتا ہے اور مدرسہ جگہ جگہ ہونے سے بہت فائدہ پہنچا ہے کیونکہ جب علم کی مسلمانوں کو ضرورت ہے اور علم کی ترقی علمی مجالس سے ہوتی ہے تو علمی مجالس جس قدر زیادہ ہوں اسی قدر علم کو ترقی ہونے کی اور اسی قدر مسلمانوں کو نفع پہونچنے اور قوت علمی بڑھنے کی امید ہوگی علم کی مثال ریل کے انجن کی سی ہے کہ اُسی کی طاقت سے ریل چلتی ہے انجن جتنا زوردار ہو اتنی ہی رفتار ریل کی زیادہ ہوتی ہے اور اگر ایک انجن کی جگہ دو انجن جوڑ دئے جاویں تو ظاہر ہے کہ قوت اور بڑھ جاوے گی بنابرین جتنی مجالس علمی یعنی مدارس تعداد میں زیادہ ہوں گے علمی قوت بڑھے گی اور مسلمانوں کو نفع ہی پہونچیگا یہاں سے اُن لوگوں کی غلطی ظاہر ہوتی ہے جو کہا کرتے ہیں کہ مدرسہ کھولنے کی کیا ضرورت ہے شہر میں ایک ہی مدرسہ کافی ہے۔ بازار میں اگر دس دکانوں کی جگہ گیارہ ہوجاویں تو اُس کو بازار کی ترقی کہا جاتا ہے اور جتنی بڑھتی جاویں اُس کو اچھی نظر سے دیکھا جاتا ہے پھر نہ معلوم مدرسوں کی تعداد بڑھنے پر اعتراض کیوں کیا جاتا ہے غور سے دیکھئے تو اسپر اعتراض کا منشاء صرف یہ ہے کہ دین کی کچھ وقعت اُن کے ذہن میں نہیں ہے اس واسطے اُسکے ذرائع کی بھی حاجت نہیں سمجھتے دراصل ایک مدرسہ بھی اُن کے دل میں کھٹکتا ہے مگر چونکہ نام اسلامی مدرسہ کا لگا ہوا ہے اس واسطے اُس سے کچھ تعرض نہیں کرسکتے کیونکہ لوگ مطعون کریں گے پس یہ خوف اُن کو اُس مدرسہ کی مخالفت سے روکے ہوئے ہے ورنہ ان کے دل کی پوچھو تو اُس ایک مدرسہ کو بھی نہ رہنے دیتے تعدد تو کہاں گوارا ہوسکتا ہے یہی وجہ ہے کہ اگر ذرا سی کوتاہی مدرسہ میں ہوجاتی ہے تو یہ لوگ مخالفوں کی طرح طعن کرنے کو کھڑے ہوجاتے ہیں کیونکہ خاموشی کی جو اصل وجہ تھی یعنی اعتراض کرنے سے لوگوں کا مطعون کرنا وہ اب نہیں رہی کیونکہ اُس کوتاہی کی وجہ سے سب لوگ مدرسہ کے موافق نہیں رہے کچھ ان کے بھی ہمخیال پیدا ہوگئے ہیں اب ان کا اصلی خیال ظاہر ہونے کا موقعہ ملا چنانچہ وہ ظاہر ہوتا ہے اور مدرسہ والوں کے گلے پر چھری پھیرنے کو تیار ہوتے ہیں اور اگر مدرسہ بیخ و بُنیاد سے بھی جاتا رہے تو اُن کے کان پر جوں نہ رینگے اگر یہ صرف تعدد کے مخالف ہوتے تو اُس ایک مدرسہ سے تو ہمدردی رکھتے اور ایسے وقت میں اُس کی اصلاح کی

یہ غلطی ہے کہ شہر میں ایک ہی مدرسہ کافی ہے دراصل دکانوں کی وقعت زیادہ ہونے میں نہیں ہے۔

ذرا سی کوتاہی سے مدرسہ پر طعن۔

کوشش کرتے ہیں کہ اس کے بھی اٹھا دینے کی غرض تعدد کی مخالفت جس طرح آجکل ہو رہی ہے وہ تو بیجا ہے اور اس کا منشا دین سے لاپروائی ہے جو مسلمان کیلئے کسی طرح زیبا نہیں حیرت کی بات ہے کہ ہر مذہب والے کو یہ خیال ہے کہ مذہبی ترقی ہو اور اس کے ذرائع سوچتے ہیں اور اس کو منجملہ ضروریات کے سمجھتے ہیں لیکن مسلمانوں کا خیال یہ ہوتا جاتا ہے کہ مذہب کی کوئی ضرورت نہیں اور اسی وجہ سے اس کے ذرائع کو بیکار سمجھتے ہیں اور وہ ذرائع جتنے زیادہ ہوں انکے طبیعت کے زیادہ خلاف ہوتے ہیں یہ تو غلطی ہے اور اس بنا پر تعدد مدارس کی مخالفت درحقیقت دین کی مخالفت ہے لیکن اس تعدد مدارس کے متعلق ایک شکایت واقعی بھی ہے وہ یہ ہے کہ تکثیر مدارس فی نفسہ تو واقعی مفید اور باعث ترقی دین ہے لیکن آجکل یہ تکثیر ظاہراً تو تکثیر ہے اور درحقیقت تکثیر بالثنا بمعنی تعدد نہیں بلکہ تکسیر بالسین بمعنی شکستن ہے ایک کی جگہ دو مدرسہ اسواسطے نہیں ہوتے کہ مسلمانوں کی علمی قوت دوچند ہو جاوے اُس مدرسہ کو اس سے قوت پہنچے اور اس کو اُس سے بلکہ اس واسطے ہوتے ہیں کہ ایک قوت دو جگہ بٹ جاوے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسکو قوت رہتی ہے نہ اُس کو اس کی مثال یہ ہوئی کہ ایک روٹی ایک آدمی کے پاس ہے بجائے اس کے کہ وہ اُس کو اکیلا کھاوے دوسرا اور شریک ہو گیا تو ظاہر ہے کہ نہ اسکا پیٹ بھریگا نہ اُس کا تو یہ تعدد اشخاص روٹی کے لئے تکسیر ہوئی یعنی دو حصے کر دینا تکثیر بمعنی تکثیر کردن جب ہوتی کہ وہ دوسرا آدمی اس روٹی میں حصہ دار نہ بنتا بلکہ اور روٹی لاکر شامل کرتا تو ایک سے دو زیادہ روٹیاں ہو جاتیں یہی حالت آج کل کے تعدد مدارس کی ہے کہ اس واسطے تعدد نہیں ہوتا کہ دوسرے کو علمی اور دینی قوت پہنچاویں بلکہ اسواسطے ہوتا ہے کہ اُسکی علمی اور دینی قوت آدھی بانٹ لیں بلکہ یہ بھی نہیں ہر ایک کی یہ نیت ہوتی ہے کہ اس کی سب قوت چھین لے تو اب مثال یہ ہوئی کہ ایک روٹی والے کے پاس دوسرا آدمی آیا اور اُسکا ارادہ یہ ہے کہ وہ کل روٹی اُس سے چھین لے اور خود کھالے اور اس کو نہ دے بلکہ اس سے بھی ترقی کر کے کہا جاتا ہے کہ یہ مثال بھی صحیح نہیں ٹھیک مثال یہ ہے کہ وہ دوسرا صرف یہ چاہتا ہے کہ اس سے وہ روٹی چھن جاوے چاہے اسکو بھی نہ ملے جسکو حسد کہتے ہیں اسی طرح ہر مدرسہ والا یہ چاہتا ہے کہ دوسرا مدرسہ نہ رہے چاہے

تعدد مدارس کی مخالفت کی وجہ

یہ مدرسہ بھی رہے یا نہ رہے اور افسوس اس میں کون مبتلا ہیں وہ لوگ جو مقتدا اور علما کہلاتے ہیں اور جن کو لوگ دین کا حامل سمجھتے ہیں اور ان کے وجود سے دین کا وجود سمجھا جاتا ہے جبہ قبہ سے تو ان کو جیسا چاہے سمجھ لیجئے ورنہ درحقیقت ان کی حالت دنیا داروں سے بھی بدتر ہے اور یہ ان لوگوں سے بھی زیادہ خطرناک امراض میں مبتلا ہیں جنکا ذکر اوپر آیا ہے کہ وہ ظاہراً صرف تعدد مدارس کے خلاف ہیں اور درحقیقت ایک مدرسہ کی بھی اُن کے نزدیک ضرورت نہیں کیونکہ اُن کے نزدیک دین ہی کی ضرورت نہیں ان علماء کی حالت اُن سے بدتر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں اس بات میں تو برابر ہیں کہ نہ وہ مدرسہ کے وجود کو ضروری سمجھتے ہیں نہ تعدد کو (اور اس کی وجہ سوائے قلت مبالات بالدین کے کچھ نہیں) گو دونوں زبان سے مدرسہ کی حمایت ہی کا دم بھرتے ہیں لیکن حقیقت وہی ہے جو میں نے عرض کی ایک فریق لوگوں کے مطعون کرنے سے ڈر رہا ہے اسواسطے حمایت کا دم بھرتا ہے اور ایک اپنے پیٹ کی وجہ سے کہ مدرسہ نہ رہے گا تو ہمارا گزارہ کیسے ہوگا غرض اس میں تو دونوں برابر ہیں کہ ضرورت مدرسہ کی جس حیثیت سے ہونی چاہئے ایک ذہن میں بھی نہیں اور ان علما صاحبان میں اتنی بات زیادہ ہے کہ قلت مبالات بالدین کے ساتھ یہاں حسد بھی شریک ہے جو بدترین امراض ہے اور اس میں ایک شدت اور یہ بڑھ گئی کہ اہل دنیا کا تو جو فعل بھی ہوتا ہے دنیا کے رنگ میں ہوتا ہے اُس سے کوئی دھوکا نہیں کھاتا اور ان حضرات کا ہر فعل دین کے رنگ میں ہوتا ہے گویا معصیت طاعت کی شکل میں ہوتی ہے اس سے بہت دھوکا ہوتا ہے اب سمجھ میں آگیا ہوگا کہ یہ مقتدا صاحبان اہل دنیا سے بھی خراب حالت میں ہیں اور ان کی کوشش تعدد مدارس کے لئے علم کو بڑھانے اور قوت پہونچانے کے لئے نہیں ہے بلکہ اُس موجودہ قوت کو مٹانے کے لئے ہے تو یہ مدارس کی تکثیر بالفناء نہ ہوئی بلکہ تکسیر بالسین ہوئی اور اُن پر جو تعدد کی مثال یہ دیگئی تھی کہ ریل میں دو انجن لگا دئے گئے تو قوت اور رفتار بڑھ جاوے گی یہاں یہ مثال جب صحیح ہوتی جبکہ دونوں میں تزاحم نہ ہوتا اور جب تزاحم ہو تو مثال یہ ہوگی کہ انجن جوڑے گئے لیکن رفتار دونوں کی ایک طرف کو نہیں رکھی گئی ایک کو مغرب کی طرف چلایا گیا اور ایک کو مشرق کی طرف تو ظاہر ہے کہ ریل کو اُس سے کوئی فائدہ بھی نہ پہنچیگا کیونکہ اُن دونوں انجنوں میں سے ایک بھی نہ چل سکیگا جب تک ایک کو

حسد میں علما اور مقتدا مبتلا ہیں

حاسد علما عوام سے بھی بدتر ہیں

علما کی حیثیت طاعت کی شکل میں ہوتی ہے

آج کل کے تعدد مدارس کی بلیغ مثال

اس میں سے الگ نہ کر لیا جاوے ورنہ یا تو ٹرین ایک ہی جگہ کھڑی رہے گی یا دونوں کے زور سے بیچ سے ٹوٹ جاوے گی کچھ اس کے ساتھ ہو جاوے گی اور کچھ اُس کے ساتھ یہی حالت مدرسوں کے اس تعدد کے وقت ہوتی ہے کہ دونوں میں تزاحم ہوتا ہے جس دین کی قوت کے لئے مدارس کی ضرورت تھی اس کے دو ٹکڑے ہو جاتے ہیں بلکہ ان کا تزاحم ایسا ہوتا ہے جیسے دو انجنوں کا آمنے سامنے سے مقابلہ ہو۔ جس کو ریل پڑنا لکھتے ہیں جسکے تصور سے بھی وحشت ہوتی ہے خدا نہ دکھاوے وہی حالت ان حضرات کے تزاحم سے دین کی ہو رہی ہے کہ اس کے واسطے یہی کہنا پڑتا ہے کہ خدا نہ دکھاوے مگر افسوس ہر جگہ یہ تزاحم واقع ہو رہا ہے اور دیکھتے دیکھتے عادت ہو گئی اس واسطے اُس سے کچھ زیادہ انقباض بھی نہیں ہوتا غرض آجکل تعدد مدارس کی حقیقت اور اسکا کچا چٹھا یہ ہے تو یہ بات موجب نسکایت ہے یا نہیں اور اس حالت میں تو تعدد مدارس سے جو طبیعتوں کو انقباض ہوتا ہے وہ مطلقاً بے اصل نہیں ہے بلکہ اُس کے لئے کچھ واقعیت ضرور ہے گو نئے تعلیم یافتوں کو جو انقباض ہوتا ہے وہ تو بے اصل ہی ہے کیونکہ اُس کا منشاء دین سے علیحدگی ہے اور کاش تزاحم کے وقت دونوں میں سے ایک فریق تواضع اختیار کر لیتا اور کہتا کہ لے بھائی تو مجھے ہی پیچھے ہٹا لے اور ہم ہی دب گئے تو بات ختم ہو جاتی اور تزاحم جاتا رہتا دب جانے پر ایک حکایت یاد آئی ایک شیخ صاحب ڈاڑھی چڑھاتے ہوئے چلے جا رہے تھے راستہ میں ایک خانصاحب ملے اُن کو شیخ صاحب کا ڈاڑھی چڑھانا سخت ناگوار ہوا اور کہا کیوں بے تو ہماری برابری کرنے لگا شیخ جی بڑے چالاک تھے کہا برابری کیوں نہ کریں ہم تجھ سے کس بات میں کم ہیں خاں صاحب کو اور غصہ آگیا اور کہا اچھا آ لڑ لے شیخ جی نے کہا یوں نہیں لڑنے لڑائی لڑنی ہے تو اچھی طرح لڑیں گے پھر اپنے پیچھے جورو بچوں کو بیوہ اور یتیم چھوڑ گئے تو کس کام کی بات ہوگی لڑنا ہے تو پہلے اپنے اپنے کنبہ کو ختم کر لو پھر دل کھول کر لڑو خانصاحب کو غصہ بیحد چڑھا ہوا تھا زور میں آکر اس کے لئے بھی تیار ہو گئے اور گھر جا کر تمام کنبہ کو صاف کر دیا اور لوٹ کر آئے کہ آ اب لڑے شیخ جی نے کیا کیا کہ اپنی ڈاڑھی اُتار لی اور کہا کہ لو بھائی تم ہی جیتے میں ہارا میں تمہاری برابری نہیں کرتا تم بڑے اور میں چھوٹا تواضع ایسی چیز ہے جس کی بدولت شیخ جی اور شیخ جی کا کنبہ صحیح و سالم رہا اور تکبر ایسی چیز ہے جسکی

بدولت خاں صاحب کا سارا کنبہ غارت ہوگیا۔ اور اگر شیخ جی بھی اکڑتے ہی جاتے اسکا مصداق ہوتا۔

وگرازہر دو جانب جاہلانند اگر زنجیر باشد بگسلانند

اور نتیجہ وہی ہوتا کہ شیخ جی کا سارا کنبہ بھی صاف ہوجاتا بلکہ شیخ جی بھی نہ رہتے اور خانصاحب بھی نہ رہتے اگر مرتے بھی نہیں تو زخمی تو ہو ہی جاتے ایک تواضع نے ایک کا کنبہ بچایا اور دونوں کی جان بچائی دو رسیاں جب لڑتی ہیں تو اسکی وجہ بھی یہی ہوتی ہے کہ دونوں انجنوں میں سے کوئی پیچھے ہٹنا نہیں چاہتا اگر ایک انجن خود یا بواسطہ ڈرپور کے یہ کہتا کہ میں مزاحمت نہیں کرتا اور آگے کو نہیں چلتا بلکہ واپس ہوتا ہوں میری چال پیچھے ہی کو سہی تو وہ تمام آفتیں نہ آتیں جو تزاحم سے آتی ہیں اور مالی اور جانی نقصان سب سے حفاظت رہتی ہاں ایک بات یہ ہوتی کہ ذرا دیر کو ہیٹی ہوتی اور تابعیت کا اطلاق آتا سو یہ کوئی بات نہیں تابعیت تو کوئی عیب نہیں کیونکہ متبوعیت کو کوئی کہاں تک نباہیگا کسی نہ کسی بات میں تو ہر شخص کو کسی نہ کسی کا تابع بننا ہی پڑتا ہے پھر اس موقعہ پر بھی تابعیت اختیار کرلی جاوے تو کیا عیب لگ جاویگا تابعیت اور چھوٹا پن تو بڑی اچھی چیز ہے اس سے اپنا بوجھ ہلکا ہوجاتا ہے کم متبوع بنکر بھی دیکھو اور تابع بنکر بھی دیکھو اندازہ ہوجاویگا کہ کس میں راحت ہے دیکھو ایک عالم سے کوئی مسئلہ پوچھا جاوے اور وہ اس میں غور و خوض کرے مگر اطمینان نہ ہو تو اگر وہ یہ کہدے کہ مجھے شرح صدر نہیں ہوا دوسرے سے پوچھ لو تو کتنا بوجھ ہلکا ہوجاویگا مگر آج کل اس کو کسر شان سمجھا جاتا ہے اور علم کی شان یہی سمجھی جاتی ہے کہ مسئلہ کا جواب ضرور دیا جاوے خواہ وہ غلط ہی ہو بس اس شان نے تباہ کیا اسی سے علما میں اتفاق نہیں ہوتا کوئی عالم دوسرے کا تابع بننا نہیں چاہتا حالانکہ اتفاق اور تابعیت سے مؤنت کم ہوجاتی اور بوجھ بٹ جاتا ہے مگر ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ بے علمی کا اقرار کرنے سے کرکری ہوگی اور اس کو گوارا نہیں کرتا مگر اس سے کرکری میں پڑ جاتے ہیں بعض دفعہ تو وہ کرکری یہیں دنیا ہی میں ظاہر ہوجاتی ہے مثلاً دوسرے سے رائے نہ لینے کی وجہ سے جواب میں غلطی رہ گئی اور وہ غلطی پکڑ لی گئی بعض دفعہ وہ غلطی ایسی فاش ہوتی ہے کہ آدمی کو بہت خفیف ہونا پڑتا ہے اور اگر یہاں ظاہر نہ بھی ہوئی تو ایک وقت وہ آنے والا ہے جس میں وہ بہت رنگ لاوے گی وہ وقت آنکھ بند ہونے کے بعد کا ہے وہ کرکری ایسی

تابعیت بھی ہے متبوعیت سے

شان نے تباہ کیا

سخت ہوگی کہ اسکا کچھ علاج نہ ہوسکیگا مگر ہلوگ ایسے بے حس ہوگئے ہیں کہ کرکری سے بھاگتے ہیں اور کرکری میں مزا آتا ہے اور بیدھڑک مسئلہ کا جواب دیدیتے ہیں اور اس سے جو کسی قدر شان بڑھتی ہے اُس میں لطف آتا ہے یہ ایسا ہے جیسے تمباکو کھانے والے کہتے ہیں کہ تمباکو میں مزا آتا ہے ذرا اُن سے پوچھو تو کہ سرا تمباکو بھی کوئی مزے کی چیز ہے مگر چونکہ تم عادی ہوگئے ہو اس واسطے حس خراب ہوگیا ہے ذرا ایک نئے آدمی کو کھلا کر دیکھو کیسا چکر آتا اور کیسی ہچکیاں آنے لگتی ہیں۔ ہلکے سے ہلکا تمباکو بھی کھلادو تو وہ برداشت نہیں کرسکتا اور کھانے والوں کی یہ حالت ہے کہ جتنا کڑوا اور تیز ہو اُتنا ہی اُن کو مزہ آتا ہے اور اُس کو اچھا سمجھتے ہیں اسپر ایک قصہ یاد آیا کہ ایک شخص نے دوکان سے تمباکو خریدا اور اُس کو پیا تو ہلکا ثابت ہوا پھر آیا کہ اس سے کڑوا دو دوکاندار نے اور تیز قسم کا تمباکو دیدیا مگر خریدار کو وہ بھی ہلکا معلوم ہوا۔ کہا اس سے بھی کڑوا دو تو دوکاندار کہتا ہے بس اس سے کڑوا اللہ کا نام۔ لفظ تو بیہودہ ہے مگر معنی صحیح ہیں وہ یہ کہ کڑوا ہونا تمباکو کے لیے کمال سمجھا جاتا ہے تو اس لفظ کے معنی یہ ہوئے کہ تمباکو کو تو اتنا ہی کمال حاصل ہے اس سے زیادہ کمال اللہ کے نام کو ہے اس معنی کے اعتبار سے یہ شخص کافر نہیں ہوا کبھی فتوے لگا دیا جاوے یہ ایسا تلخ ہوا جیسے عارف شیرازی کہتے ہیں ؎

آن تلخ وش کہ صوفی ام الخبائثش خواند اشہی لنا واحلی من قبلۃ العذارے

غرض اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ کا نام کڑوا ہے بلکہ یہ مطلب ہے کہ اس سے زیادہ لذیذ اللہ کا نام ہے اور کڑوے سے اسواسطے تعبیر کیا کہ تمباکو میں کڑوا ہونا ہی لذت ہے یہ سیدھی سی توجیہ ہے آدمی کو چاہئے کہ حقیقت پر نظر کرے نہ کہ عنوان وصورت پر اس مثال سے غرض یہ ہے کہ عادت ہوجانے سے حس ایسا بدل جاتا ہے کہ کڑوا پن بھی کمال سمجھا جاتا ہے حالانکہ کڑوا ہونا بھی کوئی کمال ہے بس عادت نے حس میں ایسی تبدیلی کردی ہے کہ کڑوے ہی میں لذت آتی ہے جیسے ہماری طرف ایک شخص مقدمہ باز تھے وہ مقدمہ بازی کے اس قدر عادی ہوگئے تھے کہ بلا کچہری جائے اُن کو چین ہی نہ آتا تھا اور گھر کی روٹی اچھی نہیں معلوم ہوتی تھی خواہ مخواہ سرائے میں جاکر پڑتے اور اُن کی

حکایت اس کڑوا اللہ کا نام ہے

ایک مقدمہ باز کی حکایت

روکھی پھیکی روٹی کھاتے اور اسمیں خوش رہتے گھر پر گھی دودھ سے بھی منہ سیدھا ہوتا تو اُن کو اگر مقدمہ بازی میں لطف آتا تھا تو کیا اس سے کوئی عقلمند یہ ثابت کر سکتا ہے کہ مقدمہ بازی لذت اور مزے کی چیز ہے؟ نہیں بلکہ یہی کہا جاویگا کہ ان کا حس خراب ہو گیا ہے اور عادت نے حقیقت پر پردہ ڈال دیا ہے جیسے تمباکو حقیقت میں تکلیف کی چیز تھی مگر عادت سے اُس میں مزہ آنے لگا اسی عادت سے مقدمہ بازی جیسی بُری چیز میں لطف آنے لگا حالانکہ کس قدر بکھیڑے کی چیز ہے توڑ پھوڑ پاڑ ٹیاں بنانا جھوٹے گواہ بہم پہونچانا وکلاء کی خوشامد کرنا اوروں میں مارے مارے پھرنا ایک مجمع کو جمع کرنا اور اُن کو ساتھ لئے پھرنا عملہ والوں کو رشوتیں دینا اور ہاتھ جوڑنا افسوس تو یہ لوگوں کا اس سے جی نہیں گھبراتا مگر کیا کیجئے عادت سے حقیقت پر پردہ پڑ گیا ہے اور ایسی بدمزہ چیز لذیذ بن گئی ہے ان بکھیڑوں کے تو تصور سے بھی وحشت ہوتی ہے بس اس کے سوا اور کیا کہا جائے کہ عادت سے سہار ہو گئی ہے سمجھ میں آگیا ہوگا کہ بعض تکلیف کی چیزیں بھی عادت ہو جانے سے لذیذ معلوم ہونے لگتی ہیں

مدارس کے تزاحم کے بد نتائج

اسی قبیل سے وہ تکلیفیں بھی ہیں جو مدارس کے تزاحم سے پیش آتی ہیں بعض دفعہ اس کی نوبت کہاں تک پہونچتی ہے کہ دونوں مدرسوں کے مہتمموں کے خاندانوں میں عداوت ہو جاتی ہے اور اس پر بھی بس نہیں ہوتا کیونکہ مدرسہ دینی کام ہے اس سے تمام مسلمانوں کو تعلق ہوتا ہے اس لئے ان کے تزاحم کا اثر صرف دو خاندانوں تک محدود نہیں رہتا بلکہ عام مسلمانوں پر پڑتا ہے اور مدرسوں کے تزاحم کے وقت عام مسلمانوں میں فرقہ بندی ہو جاتی ہے اور بہت سے فریق بنجاتے ہیں جن میں عداوتیں پیدا ہو جاتی ہیں پھر یہ عداوتیں بچے دیتی ہیں اور جس بات پر ان کی بنا ہوئی تھی اس پر بھی محدود نہیں رہتیں بلکہ ذاتی عداوتیں طرح طرح کی پیدا ہو جاتی ہیں آپ جانتے ہیں کہ عداوت اتفاق کی ضد ہے اور سب جانتے ہیں کہ اتفاق تمام راحتوں کی جڑ ہے تو اس کی ضد تمام تکالیف کی جڑ ہوگی تو یہ تزاحم ایسی بُری چیز ہوئی کہ تمام تکالیف کی جڑ ہے مگر آجکل ایسی بے حسی چھائی ہوئی ہے کہ ہر جگہ مدارس میں یہ تزاحم موجود ہے اور لوگوں کو اس سے ذرا بھی گرانی نہیں ہوتی یہ بے حسی داخل عادت ہو گئی ہے گویا مدرسہ کے لئے یہ بات مان لی گئی کہ تزاحم بھی

لازمی چیز ہے جب مدرسہ کا کام شروع کیا تو اس کو بھی شروع کر دیا اور سمجھتے ہیں کہ جہاں مدرسہ کے اور کاموں میں محنت و مشقت ہے اسی جنس سے یہ بھی ہے اور نیز یہ بھی سمجھتے ہیں کہ جیسے مدرسہ کے اور کاموں میں اجر ہے ایسے ہی اس توڑ پھوڑ میں بھی اجر ہے بلکہ اور کاموں سے زیادہ اجر ہے کیونکہ اس میں مجاہدہ زیادہ ہے اس غلطی میں اچھے اچھے پڑھے لکھے مبتلا ہیں۔ اور مقدمہ بازیوں اور پالیسیوں کو مدرسہ کا کام سمجھتے ہیں حالانکہ یہ سب بناء فاسد علی الفاسد ہے یہ مستحسن جب ہوتا جب شریعت نے اُس کا حکم کیا ہوتا یا شریعت کے کسی حکم پر اس کی بناء ہوتی اس کی بناء تو بہت گندی اور شریعت کے خلاف امر پر ہے وہ امر وہی ہے جسکو میں نے اوپر عرض کیا کہ تعدد مدارس دوسرے مدرسہ کو توڑنے اور دین کی موجودہ قوت مٹانے کے لئے ہوتا ہے خلاصہ یہ کہ اس کی بناء اکثر حسد پر ہوتی ہے پھر جس چیز کی بناء حسد پر ہو اس سے شریعت کو کیا واسطہ شریعت میں تو حسد منجملہ بدترین اعمال کے ہے تو جس کام کی بناء اسپر ہو اُسپر اجر کی توقع رکھنا نہ معلوم کہاں تک صحیح ہے تعدد فی نفسہ تو بُرا نہ تھا کیونکہ مدرسہ دار العلم ہے اور دین کے لئے علم کی ضرورت ہے تو جتنے دار العلم زیادہ ہونگے اُتنے ہی دین کو قوت ہوگی اور اس کی نظیر بھی موجود ہے دیکھئے ایک شہر میں بلکہ ایک قصبہ میں مسجدیں متعدد ہوتی ہیں اور اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتا بلکہ کسی کا دل نہیں کھٹکتا پھر مدارس نے کیا قصور کیا ہے مسجد دار العمل ہے اور مدارس دار العلم تو جیسے دار العمل کا تعدد دین کے لئے مضر نہیں بلکہ مسلمانوں کے لئے آرام دہ ہے اور ترقی دین کی علامت ہے ایسے ہی دار العلم کا تعدد بھی دین کے لئے مفید اور علامت ترقی ہونا چاہئے لیکن عجیب بات ہے کہ مساجد کے تعدد سے کوئی نہیں کھٹکتا اور مدارس کے تعدد سے کھٹکتے ہیں۔ یہ بات در اصل بے بنیاد بھی نہیں ہے اس میں ایک راز ہے وہ یہ کہ عادۃً تعدد مساجد کی بنا ان باتوں پر نہیں ہوتی جنپر تعدد مدارس کی بنا ہوتی ہے یعنی باہمی مخالفت اور جاہ اور بڑائی اس واسطے مساجد سے کوئی نہیں کھٹکتا اور مدارس سے کھٹکتے ہیں اور جہاں کہیں مساجد میں بھی یہ خرافات شامل ہو جاتی ہیں اور تعدد کی بنا جاہ اور بڑائی پر ہو جاتی ہے وہاں مساجد کی بھی یہی گت ہو جاتی ہے کہ ہر شخص ان کو بُری نظر سے

فائدہ: مدرسہ کے لئے نذر کی ہوئی زمین کا حکم

فائدہ: مساجد کے تعدد پر اعتراض نہ ہونے اور مدارس کے تعدد پر ہونے کا سبب

قصہ دو مسجد کان پور

دیکھنے لگتا ہے چنانچہ کان پور میں دو مسجدیں برابر ایسی ہی موجود ہیں پہلے ایک مسجد تھی پھر ایک شخص نے صرف اپنے بڑائی دکھانے کے لئے دوسری بنائی اب دونوں میں مخالفت کی یہ نوبت ہے کہ ہر ایک میں کوشش کی جاتی ہے کہ یہاں نمازی زیادہ ہوں اس کے لئے تعارف سے بھی کام لیا جاتا ہے اور اپنے جان پہچان لوگوں کو ہر مسجد والا اپنی مسجد میں کھینچکر لیجاتا ہے جب اس سے بھی کام نہیں چلتا تو مٹھائی بانٹی جاتی ہے اور عمدہ عمدہ مٹھائیاں بنوائی جاتی ہیں یہ مسجد کو احکام میں مسجد ہو مگر باعتبار ثواب کے مسجد نہیں ہے کیونکہ ثواب مسجد خدا کے لئے بنانے سے ہوتا ہے اور جب اُسمیں دوسری حیثیت لگ گئی وہ یہ کہ خدا کے حکم کے خلاف بنائی گئی ثواب کیا دیکھو مسجد ضرار کی نسبت قرآن شریف میں موجود ہے کہ وہ مسجد مع اہل مسجد کے دوزخ میں گرے گی دیکھئے جہاں نقد کی بنا فاسد ہو وہاں مسجد جیسی متبرک چیز میں سے بھی برکت جاتی رہتی ہے اور اُسکا نقد بھی بُرا ہو جاتا ہے وہ بناء فاسد کیا ہے مسجد ضرار میں تو کفر کی تائید اور اسلام کا اضرار تھا اور یہ بناء خبیثہ تھی اس لئے وہ احکام میں بھی مسجد نہیں ہوئی اور یہاں یہ تو نہیں بلکہ اس سے ہلکی چیز ہے یعنی اپنا نام مقصود ہونا اِسکا منشا حب جاہ اور کبر ہے اس لئے وہ احکام میں مسجد ضرار نہیں ہے لیکن ثواب نہ ہونے میں اسی کے مشابہ ہے لیکن چونکہ عام طور سے مساجد میں یہ بناء نہیں ہوتی اس لئے اس سے کوئی نہیں کھٹکتا اور نقد مدارس کی بناء اسپر ہوتی ہے اس وجہ سے اس سے سب کھٹکتے ہیں پس راز اسکا یہ ہوا کہ کہیں نقد سے مقصود ثواب ہوتا ہے تو وہاں تزاحم نہیں ہوتا اور نتیجہ اُسکا اچھا نکلتا ہے اور کہیں مقصود ثواب نہیں ہوتا بلکہ سباب ہوتا ہے پھر وہاں ثواب کہاں سباب کے معنی گالیاں بکنا ہے گالیاں بکنے میں ثواب کا کیا کام اس صورت میں نتیجہ کبھی اچھا نکل نہیں سکتا اور تزاحم ضرور ہوتا ہے اور یہ اثر ہر جگہ لازم ہے خواہ دار العمل یعنی مسجد میں ہو تو اور دار العلم یعنی مدرسہ میں ہو تو جہاں نقد ہو مسجد کا ہو یا مدرسہ کا اگر ثواب کے لئے ہو یعنی اسمیں خلوص ہو اور محض دین مقصود ہو تو وہاں تزاحم نہ ہوگا اور وہی نقد مسجد کا ہو یا مدرسہ کا اگر ثواب کے لئے نہیں ہے یعنی اُسمیں

خلوص نہیں ہے تو تزاحم ضرور ہوگا اس وقت تعدد سے زیادہ تر مقصود بجائے ثواب اور دین کی تائید کے اپنا بڑا بننا ہوتا ہے اسی کی شکایت ہے کہ تعدد مدارس فی نفسہ تو بُرا نہ تھا مگر آجکل اکثر جگہ اُس کی بناء حب مال یا جاہ پر ہوتی ہے اس واسطے قابل اعتراض ہے دیکھ لیجئے اس سے بہت کم مدرسہ خالی ہوں گے جہاں دو مدرسہ ہوئے بس وہاں ثواب اور خلوص سے تو بحث نہیں رہتی بس یہ نیت ہوتی ہے کہ کام کی نسبت ہماری طرف ہو کیوں صاحب اگر دین مقصود ہے تو اس خصوصیت کو کیا دخل ہے یہ تو کھلا ہوا حب جاہ ہے کیونکہ دین مقصود ہوتا تو نظر اس پر رہتی کہ دین کا کام ہو جاوے خواہ ہمارے ہاتھ سے ہو یا دوسرے کے ہاتھ سے اور جب اپنی خصوصیت مدنظر ہوئی تو مقصود یہ ہوا کہ ہمارا نام ہو اسی کا نام حب جاہ ہے کانپور کا قصہ ہے کہ ایک طالب علم ایک مدرسہ میں پڑھتا تھا جب وہ قریب فراغ پہنچا تو دوسرے مدرسہ میں جا نام لکھایا دستار بندی کا جلسہ ہونیوالا تھا اب صبح کو جلسہ ہے شام کو پہلے مدرسہ والوں نے اسکو بلایا اور کہا محنت تو کی ہم نے اس کے کیا معنی کہ دستار بندی دوسرے مدرسہ میں ہو لہذا تم یہیں آجاؤ اسپر ایک قصہ اور یاد آیا دو بھائی تھے اُن کے یہاں کچھ مہمان آئے تو ایک بھائی بولا کہ آج دوپہر کی دعوت میرے یہاں ہے اور دوسرے سے کہا شام کی دعوت تم کر دینا چنانچہ اس پر طرفین کی تراضی ہوگئی جسکے یہاں صبح کی دعوت تھی اس نے کیا کیا کہ اُن سے کہا کہ چلو جنگل ہوا دیں ذرا ہوا خوری اور تفریح ہوگی جنگل میں ایک گولر کے درخت کے نیچے جا کھڑا کیا اور کہا گولر خوب پک رہے ہیں دل چاہتا ہے کہ گولر کھاویں چنانچہ کسی کو درخت پر چڑھا کر خوب گولر جھڑوائے اور خود بھی کھائے اونکو بھی کھلائے مقصود اُن کو ہی کھلانا تھا تاکہ روٹی کم کھاویں جب دوسرے بھائی کو خبر ہوئی تو اُس نے کہا اسوقت کی دعوت تو میرے یہاں ہے تو شام کو کھلا دینا اُس نے کہا واہ یہ خوب رہی گولر ایا تو ہمنے اور کھانا تو کھلائیگا ایسا نہیں ہو سکتا سو حضرت یہی قصہ یہاں ہوا کہ ایک مدرسہ والوں نے اُس طالب علم سے کہا کہ تجھے گولر ایا تو ہمنے یعنی محنت کی اور تیار کیا اور وقت پر دوسرے آکو دے اُس مدرسہ والوں نے اُس طالب علم کو کچھ روپئے دینے بھی کہے اور اُس پر پکا کر لیا

کانپور کا قصہ کہ ایک طالب علم کی دستار بندی کی

دعوت کا ایک قصہ کہ دو بھائیوں نے کیا

کہ دستار بندی دوسرے مدرسہ میں نہ ہو بلکہ یہیں ہو اسکی خبر دوسرے مدرسہ والوں کو بھی لگ گئی انھوں نے کمیٹی کی کہ کیا کرنا چاہئے بعض چالاکوں نے ایک ترکیب نکالی اور اس طالب علم کو کسی حیلہ سے بلاکر ایک کوٹھری میں بند کر دیا نہ کہنا نہ سننا کسی کو کانوں کان خبر نہیں بس کوٹھری میں بند کرتالا ڈالدیا اس سے مقصود اُن کو دق کرنا نہیں تھا بلکہ صرف محبوس کر لینا اور اپنے قبضہ میں رکھنا منظور تھا اسی واسطے کوٹھری میں اُسکے کھانے پینے وغیرہ کا کل سامان فراغت کے ساتھ جمع کر دیا چند قسم کے پھل رکھدئے پانی پینے کے لئے گھڑا لوٹا گلاس سب کچھ سامان کر دیا معلوم نہیں نماز کیسے پڑھی ہوگی اور پیخانہ کیسے پھرا ہوگا اسی طرح اُن کو قید رکھا پہلے مدرسہ والے اُن کو تلاش کر کے مایوس ہو کر بیٹھ رہے یہ سمجھے ہوں گے کہ طالب علم لاابالی ہوتے ہی ہیں کہیں کو چلدئے ہونگے جب عین جلسہ کا وقت ہوا تو دوسرے مدرسہ والوں نے اون کو کوٹھری میں سے نکالکر بہت حفاظت کے ساتھ جلسہ میں پہنچایا اور دستار بندی کر دی جب کام نکل گیا تو چھوڑ دیا کہ اب جہاں چاہے تشریف لیجائے وہاں تو روپئے بھی ملتے تھے یہاں کچھ بھی نہ ملا مفت ہی میں کام نکالا یہ نوبت ہے تزاحم کی کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اسکی بنا ثواب پر ہے اس کی بنا صرف جاہ پر ہے کہ یوں نام ہوگا کہ ہمارے مدرسہ میں اتنے طلبہ کی دستار بندی ہوئی اگر دین کی ترقی منظور ہوتی تو اس بکھیڑے کی کیا ضرورت تھی بس ایک عالم تیار ہوا تھا جس سے دین کی امداد ہونے کی توقع ہے اس مدرسہ سے ہوا تو کیا اور اس مدرسہ سے ہوا تو کیا مگر یہ تو منظور ہی نہیں منظور تو یہ ہے کہ ہمارا نام ہو اور اس کی وجہ وہی بڑائی ہے جسکو جاہ کہتے ہیں کہ یہ کہا جاوے کہ ہمارے مدرسہ سے اتنے آدمی پڑھکر نکلے جسطرح ہو تعداد بڑھائی جاوے اس موقع پر مولانا محمد یعقوب صاحب کی ایک بات یاد آئی وہ فرمایا کرتے تھے (یہ حضرات مخلص تھے اور ہم مفلس ہیں یعنی خلوص سے خالی ہاتھ ہیں مفلس کے لفظ پر ایک لطیفہ یاد آیا ایک شخص سے میں نے کہا آپ بڑے مخلص ہیں انھوں نے شاید کبھی مخلص کا لفظ سنا نہ تھا وہ مفلس سمجھے تو کہنے لگے جی اللہ کا فضل ہے کھانے کو سب کچھ ہے) مولانا فرمایا کرتے تھے کہ جو کوئی راہ نجات

بھی پڑھاتا ہے وہ بھی ہمارا معین ہے ہمارا کام بٹاتا ہے ہم کو بھی اُس کی اعانت کرنی چاہئے اور ملا جلا رہنا چاہئے یہ ہے خلوص اور یہ ہے ثواب کے واسطے دین کی تعلیم دینا یہ انبیاء علیہم السلام کا سا باہمی علاقہ ہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں انبیاء سب بھائی بھائی ہیں یہ ہے طریقہ سنت اور طریقۂ حق اور یہی مشائخ اور علماء اور فقرا کو چاہئے کہ باہم ایسا علاقہ رکھیں مگر آجکل اگر کسی دوسرے کو بھائی کہتے بھی ہیں تو اُس کے معنی وہ ہوتے ہیں جو ہندو بھائی اور عیسائی بھائی کے معنی ہیں کہا جاتا ہے ہمارے ہندو بھائی یوں کہتے ہیں اور عیسائی بھائی یوں کہتے ہیں یہ لفظ تہذیب کا ہے ورنہ مراد دشمن ہے تو مشائخ یا علماء اگر کسی اپنے ہمعصر کی نسبت بھائی یا برادر کا لفظ بولتے ہیں تو برادران وطن مراد ہوتے ہیں جسکا اطلاق ہندوؤں پر آتا ہے نہ برادران طریق علما کو بھی چاہئے کہ اتحاد سے رہیں اور دین کا کام دین کی طرح کریں نہ آجکل کے مدرسوں کی طرح کہ دوسرے مدرسہ میں چاہے کیسی ہی اچھی تعلیم ہوتی ہو اور کیسے ہی قابل لوگ وہاں موجود ہوں مگر جب اُسے یاد کرینگے تو برائی ہی سے یاد کریں گے کیا اس حالت پر کوئی کہہ سکتا ہے کہ خلوص سے کام کیا جاتا ہے خلوص تو کوسوں دور ہے بس مقصود دوسرا ہی ہے کہیں مقصود جاہ ہے یعنی انتساب کہ ہم اتنا کام کرتے ہیں اور کہیں مال یعنی چندہ رسی کی ضرورت سے مجمع بڑھایا جاتا ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ طالب علم زیادہ ہوں کیونکہ جب طالب علم زیادہ ہوں گے تو لوگ سمجھیں گے کہ کام خوب ہو رہا ہے لہذا چندہ بھی زیادہ دیں گے یہ چندہ ایسا مطمح نظر ہوا ہے کہ اس پر بھی نظر نہیں رہی کہ چندہ مقصود بالذات ہے یا کسی چیز کا ذریعہ ہے اور اس کی وہ حالت ہو گئی ہے جیسے بعض لوگ کھانے کے حریص ہوتے ہیں اور کھائے چلے جاتے ہیں خواہ اس پر وہ غرض جس کے لئے کھانا موضوع ہے مرتب نہ بھی ہو یعنی تغذیۂ بدن ہو یا نہو چاہے دست ہی آتے رہیں مگر کھائے ضرور جاتے ہیں اور جب کوئی ٹوکے تو کہتے ہیں سب کام تو قوت پر موقوف ہیں اور قوت موقوف ہے کھانے پر تو سب کام موقوف ہیں کھانے پر تو کھانا ایسی ضروری چیز ہے اور تم اُس سے منع کرتے ہو اُس بیوقوف نے یہ نہیں سمجھا کہ

اس دلیل میں ایک مقدمہ میں تفصیل کی کسر ہے وہ یہ کہ یہ تو صحیح ہے کہ سب کام موقوف ہیں قوت پر اور یہ بھی صحیح ہے کہ قوت موقوف ہے کھانے پر مگر یہ کہ کونسا کھانا مورث قوت ہے اسمیں کلام ہے اگر یہ کہا جاوے کہ مطلق کھانا مورث قوت ہے تو اسپر ہم لانسلم کہیں گے کیونکہ کھانا وہ مورث قوت ہوتا ہے جو ہضم ہو اور ہضم جبھی ہوگا جب پیٹ کے موافق کھایا جاوے اور جب پیٹ سے زیادہ کھایا جاویگا تو وہ ہضم نہیں ہوسکتا اور جب ہضم نہ ہوگا تو اُس سے طبیعت غذا نہیں حاصل کرسکتی بلکہ مجبور ہوگی اُس کی دفع پر اور اسمیں کوئی فعل نہ کرے گی بجز اسکے کہ دستوں کے راہ نکالدے تو اس کھانے کا نتیجہ تو محض یہ ہوا کہ ایک راہ سے پیٹ میں داخل کیا گیا اور دوسرے راہ سے نکالدیا گیا تو اس دلیل میں غلطی یہ تھی کہ ایک مقدمہ کا خیال نہیں رہا جسپر نتیجہ کی صحت موقوف تھی خلاصہ غلطی کا یہ ہوا کہ ذریعہ کو اختیار کیا گیا مگر نہ بحیثیت مقصود ہونے کے بلکہ ذریعہ کو مقصود بنالیا گیا یہی حالت آج کل کے چندہ کی ہے کہ لوگ ایسے اس کے پیچھے پڑے ہیں کہ فنافی الچندہ ہوگئے نہ جائز کو دیکھتے ہیں نہ ناجائز کو پس چندہ ہونا چاہئے اور جب کوئی اُنسے کہے کہ چندہ میں یہ خرابیاں ہیں تو وہی جواب یہاں بھی ملتا ہے جو اُس کھانے والے نے دیا تھا کہ سارے کام تو آجکل مالی قوت پر موقوف ہیں اور مالی قوت کا مدار چندہ پر ہے تو سارے کام موقوف ہوئے چندہ پر اور تم اس سے منع کرتے ہو صاحبو یہ دونوں مقدمے ٹھیک ہیں مگر ایک مقدمہ یہاں بھی قابل تفصیل ہے کہ یہ چندہ جسمیں حدود کا خیال نہ رکھا جاوے یہ بھی مفضی الی القوت ہے یا نہیں سو دعوے کیا جاتا ہے کہ ہرگز نہیں ہے کیونکہ قوت سے مراد دینی قوت ہے (اسکو خوب ذہن نشین کرلیجئے) اور جب چندہ اس طریق سے لیا گیا جو شرعاً ممنوع ہے تو دین تو پہلے ہی غارت ہوگیا پھر اُس سے دینی قوت کی توقع رکھنا کیا معنی یہ تو ایسا ہوا جیسے کھانے کے شوق میں آکر ڈھیلے و پتھر کھالئے اور خوش ہیں کہ اس سے قوت آوے گی بلکہ ڈھیلے پتھر بھی نہیں سنکھیا کھالیا اور دل خوش کرلیا کہ اس سے قوت آوے گی اس سے جیسی قوت آوے گی ابھی ذرا دیر میں معلوم ہوجائے گی۔ غلطی یہ ہی ہے کہ چندہ کو مقصود بالذات سمجھا ذریعہ نہیں

چندہ کو مقصود بالذات سمجھنا

سمجھا اگر ذریعہ سمجھتے تو ظاہر ہے کہ چندہ ذریعہ کا ہے دین کا تو دین اُس کے واسطے
غارت نہ کرتے اور دین کو غارت کرکے چندہ لیا تو یہ تو ایسا ہوا جیسے چھت کی مرمت
کے لئے سیڑھی کی ضرورت تھی اور کوئی یوں کرے کہ چھت ہی میں سے دو کڑیاں نکالکر
ان کی سیڑھی بنالے تو کیا آپ اسکو عقلمند کہیں گے ہرگز نہیں اسمیں بھی تو غلطی یہ ہے
کہ اس نے مقصود اور ذریعہ میں فرق نہیں کیا اور ذریعہ کے لئے یعنی سیڑھی کے لئے
مقصود کو یعنی چھت ہی کو بگاڑ ڈالا اسی طرح یہ چندہ والے کرتے ہیں کہ چندہ جو کہ ذریعہ ہے
دین کی درستی کا اس کے لئے دین ہی کو خراب کرلیتے ہیں اور سنئے آپ کو معلوم ہوگا کہ اصلاح
ذات البین اور اتفاق بھی ایک فرد ہے دین کا اور اسکا مقابل تخریب دین ہے تو چندہ
اگر موجب ہوا فساد اور نفاق اور عداوت کا تو وہ قوت دین کا ذریعہ کہاں بنا بلکہ تخریب
دین کا ذریعہ بن گیا بس اسوقت تو یہی کہا جاویگا کہ مقصود سے کچھ غرض نہیں ذریعہ ہی
کو مقصود بنا لیا ہے جہاں دو مدرسے ہوجاتے ہیں وہاں کیا کیا بُرے اور شرمناک واقعات
ہوتے ہیں اور اُن سب کی اصل نکالیجاوے گی تو وہی چندہ اصل نکلیگی کہ ہر مدرسہ الا اسکی
کمی سے ڈر رہا ہے اسواسطے دوسرے مدرسہ کی مخالفت کرتا ہے اور دونوں آپس میں
لڑتے ہیں حتی کہ ہاتھا پائی اور فوجداری کی نوبت آجاتی ہے پھر کیسا فضیحت ہونا پڑتا ہے
عدالت تک نوبت آتی ہے اور موافق اور مخالف سب کے سامنے ہنسائی ہوتی ہے حالانکہ
دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اگر دو مدرسے ہوگئے تو حرج کیا ہوگیا کام ہلکا ہوگیا پہلے سب کام
ایک کو کرنا پڑتا تھا اب دو ہوگئے تو کام بٹ گیا۔ اس کو تو غنیمت سمجھنا چاہئے ہمارے یہاں
تھانہ بھون میں مدرسہ ہے جس کو لوگ جانتے ہیں ایک دفعہ ایک نیا مدرسہ ہونے کو تھا
میں نے کہلا بھیجا کہ چشم ما روشن دل ماشاد اچھا ہے ہمارا کام آپ اپنے سر لیلیں اگر آپ
مدرسہ کرتے ہیں تو ہم مخالفت نہیں کرینگے جس سے آپ کے چندہ میں کچھ کمی ہو بلکہ ہم اپنا
مدرسہ اُٹھا دیں گے یہ چندہ بھی جو کچھ ہو آپ ہی لے لیجئے اسکا اثر یہ ہوا کہ وہ نیا مدرسہ
موقوف رہا اگر دوسرے مدرسہ کو روکنا بھی ہو تو یہ ترکیب ہے نہ یہ کہ اُس سے لڑا جاوے
اور فوجداری کی جاوے میں نے دراصل یہ ترکیب نہیں چلی تھی اور صرف کہلا بھیجا تھا بلکہ

چندہ مدرسہ کا ذریعہ ہے دین کا

اتفاق بھی ایک فرد ہے دین کا

تھانہ بھون میں ایک دینی مدرسہ کھلا

دل سے یہی ارادہ تھا حتی کہ یہ کیا کہ اپنے یہاں کے مدرسین کو تین چار مہینہ کی تنخواہیں پیشگی دیکر میں باہر چلا گیا اور ان سے کہہ گیا کہ اگر وہ مدرسہ واقعی شروع ہو جاوے تو مراجعت نہ کرنا بلکہ اسمیں چلے جانا اور تنخواہیں اس واسطے دیدیں کہ شاید اس میں بالفعل چندہ کی کمی ہو اور اس لئے وہاں مدرسین کو تنخواہیں نہ مل سکیں اور وہ اس وجہ سے وہاں جانے سے نہ رک جاویں اور باہر اس وجہ سے چلا گیا کہ شاید میری موجودگی میں نئے مدرسہ والوں کو کچھ رکاوٹ ہو۔ میں تو اس کے لئے بالکل تیار تھا مگر اثر یہ ہوا کہ وہ مدرسہ شروع ہی ہو کر رہگیا ایک فریق نرم ہو جاوے تو اسکا دوسرے پر بھی اثر ہوتا ہے اور وہ بھی نرم ہو جاتا ہے اسکا مطلب یہ نہ سمجھئے کہ اس ترکیب سے اس غرض کے لئے کام لینا چاہئے دوسرے پر یہ اثر ہو کہ وہ نرم پڑ جاوے اور اس سے دب جاوے اور دوسرا مدرسہ جاتا رہے یہ تو خود مطلبی اور دھوکا دینا ہے اور اسکو پالیسی کہتے ہیں۔ اور اس سے اثر بھی نہیں ہوتا بلکہ جب یہ بات کھل جاتی ہے کہ اسمیں پالیسی تھی تو اثر برعکس ہوتا ہے اور ہر شخص پہلے مدرسہ والوں کا مخالف بنجاتا ہے اور لوگ کہنے لگتے ہیں کہ مولویوں کو بھی مکاری آتی ہے بلکہ نرم برتاؤ فی نفسہ مامور بہ اور محمود ہے اور دونوں اسکے مخاطب ہیں یہ سمجھکر دونوں کو چاہئے کہ نرمی کا برتاؤ کریں اور خلوص سے کام کریں جس سے بھی جو کام دین کا ہو جاوے اسکو غنیمت سمجھے تزاحم کیوں کیا جاتا ہے یہ صورت ہے اتفاق کی حضرت حاجی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ لوگ اتفاق اتفاق پکارتے پھرتے ہیں مگر جو اصل ہے اتفاق کی اس سے بہت دور ہیں تو اتفاق کی اصل تواضع ہے جن دو شخصوں میں تواضع ہو گی انمیں نااتفاقی نہیں ہو سکتی اور تواضع کی ضد تکبر ہے جہاں تکبر ہو گا وہاں اتفاق نہیں ہو سکتا اب لوگ ہر بات میں تکبر کو اختیار کرتے ہیں اور زبان سے اتفاق اتفاق پکارتے ہیں تو اس سے کیا ہوتا ہے اگر دونوں تواضع سے کام لیں تو اتفاق قائم رہے اور تواضع جب ہوتی ہے جبکہ جب مال و جاہ نہ ہو اور جہاں مال رجاہ کا دخل ہو گا وہاں تزاحم ضرور ہو گا یہ جب مال و جاہ فساد کی جڑ ہیں اگر یہ نہ ہوں تو خدا کی قسم ہے کہ تزاحم کبھی نہ ہو جیسے اسی کی ایک نظیر موجود ہے کہ مساجد میں تزاحم نہیں ہوتا کیونکہ عادۃً اکثر مساجد کے بنانے میں مال و جاہ

پالیسی کی خرابی

اتفاق کی بنا تواضع ہے

مقصود نہیں ہوتا اور جہاں مساجد میں بھی یہ بلا شامل ہے وہاں تزاحم بھی موجود ہے مساجد کو بھی چھوڑئیے۔ مدرسوں ہی میں جہاں یہ بلا نہیں ہے وہاں تزاحم بھی نہیں دیکھ لیجئے گورنمنٹ کے ہزاروں مدرسے ہیں اور آپس میں تزاحم نہیں کیونکہ اُن میں مال وجاہ کی غرض شامل نہیں کیونکہ ہر شخص کو اپنی تنخواہ سے مطلب ہے یہ خیال کسی کو نہیں کہ ایک مدرسہ میں طالب علم زیادہ ہوں گے تو دوسرے سے بڑھ جاویگا اور چندہ زیادہ آویگا اور نام ہوگا کہ فلانے کا مدرسہ خوب چلتا ہے وہ مدرسے تو سب ایک ہی کے ہیں چندہ کا وہاں کام نہیں اور طالب علم زیادہ ہونے سے کسی ایک شخص کا نام نہیں ہوتا۔ غرض مال وجاہ کی شرکت نہیں اسواسطے تزاحم بھی نہیں اگر ہمارے مدرسوں میں بھی یہ بلا نہ رہے تو تزاحم نہ رہے اور اس کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ دونوں میں سے ایک ماتحت بنجاوے دوسرے کا تو حقیقت میں دونوں ایک ہوں گے ایک اصل اور ایک فرع تو تزاحم نہ ہوگا کیونکہ ایک کی ترقی دوسرے کی ترقی کو مانع نہ سمجھی جاوے گی بلکہ ہر ایک کی ترقی دوسرے کی بھی ترقی سمجھی جاوے گی اور دوسری صورت یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے تابع نہ سہی مگر آپس میں محبت رکھیں اور غور کرنے سے یہ صورت ثانی زیادہ مشکل معلوم ہوتی ہے کیونکہ ہم لوگ ایسے فاسد المذاق ہوگئے ہیں کہ بلا حکومت اور دباؤ کے ملکر کوئی کام نہیں کر سکتے بہرحال جتنی کوشش ہو سکے اچھا ہے آپس میں میل اور اتحاد پیدا ہونے کی کچھ تدبیریں ہیں مثلاً ایک یہ کہ علماء ایک دوسرے سے ملتے رہیں۔ دوسرے یہ کہ دوسرے مدرسہ کے طالب علم کو اپنے مدرسہ میں داخل نہ کریں تاوقتیکہ وہاں کی اجازت نہ ہو اور مہتمم کے دستخط نہ لے آویں ایک طرف سے یہ ہو اور دوسری طرف سے یہ ہو کہ اس طالب علم کو اس مدرسہ میں داخل ہونے سے منع نہ کریں اور دستخط اور اجازت دیدیا کریں کیونکہ مقصود تعلیم دین ہے ممکن ہے کہ ایک کتاب ایک مدرسہ میں ہوتی ہو جس میں شرکت کی طالب علم کو ضرورت ہے اور دوسرے مدرسہ میں وہ نہیں ہوتی تو اس صورت میں اس طالب علم کو ایک مدرسہ کا مقید کرنا اس کا وقت ضائع کرنا ہے اور مقید کرنے کی کوئی وجہ بھی تو ہو۔ غرض آپس میں اتحاد رکھنا ہو تو اسکی یہ تدابیر ہیں

مدرسوں میں اتحاد کی تدبیر

ان تدابیر کو اگر بتکلف بھی اختیار کیا جاوے تو اثر ہوتا ہے قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اخلاق باطنی کو دخل ہے ظاہری برتاؤ میں کہ جیسے اخلاق ہوتے ہیں ویسا ہی برتاؤ اس سے ظاہر ہوتا ہے ایسے ہی اسکا عکس بھی ہے کہ ظاہری برتاؤ کو بھی دخل ہے باطنی اخلاق کے پیدا ہو جانے میں کہ جیسا برتاؤ بتکلف اختیار کیا جاوے ویسے ہی اخلاق پیدا ہو جاتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے ادفع بالتی ہی احسن فاذالذی بینک وبینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم (یعنی اگر کسی سے تکلیف پہونچے تو اُس کی مکافات اچھے برتاؤ کے ساتھ کیجئے اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ جس کو آپ سے عداوت تھی وہ پکا دوست بنجاویگا صدیق صداقت سے ہے جسکے معنی ہیں محبت اور خلت یعنی وہ دوستی جو قلب میں گھس گئی ہو معلوم ہوا کہ نیک برتاؤ کا گو وہ بتکلف ہی سے ہو یہ اثر ہے کہ دوسرے شخص کے قلب میں سچی اور واقعی محبت پیدا ہو جاتی ہے آیت سے یہ مسئلہ بدلالۃ النص ثابت ہو گیا کہ اگر یہ تدابیر اتحاد دل سے بھی نہیں اختیار کر سکتے تو بتکلف ہی اختیار کر لیں غرض اتحاد اچھی چیز ہے اس کے حاصل کرنے کی تدابیر کرنی چاہئیں پھر اتحاد کی صورت میں تعدد مدارس بھی کچھ بُرا نہیں مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مقصود علم دین کی خدمت ہو نہ کہ جاہ اور مال اگر مقصود تعدد سے علم دین کی خدمت ہو تو جتنا تعدد ہوگا علم دین کی خدمت زیادہ ہوگی یہ ایسا ہوگا جیسے ایک آدمی کے ساتھ دس آدمی ہو جاویں تو دس گنا کام ہوگا اور اسکو ہر شخص چاہتا ہے کہ علم دین کی جس قدر زیادہ خدمت ہو سکے ضروری ہے خصوصاً اس زمانہ میں کہ ضلالت سے نجات بلا اُس کے ناممکن ہے یعنی خصوصاً اسواسطے کہا کہ پہلے زمانہ میں تو اہل تزاحم کم تھے اس لئے تھوڑی جماعت کی دین سے واقفیت کافی تھی اور ناواقفوں کے لئے صرف اتنا کافی تھا کہ جو ضرورت پیش آئے اُسکا حکم کسی سے پوچھ لیا اب اہل باطل کی مزاحمت بھی موجود ہے زمانہ آزادی اور خودرائی کا ہے ہر شخص جدا جدا اسلام پر حملہ کرنے کو تیار ہے غیر اسلام والے بھی اسلام پر حملہ کرتے ہیں اور خود اہل اسلام میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو اسلام پر حملہ کرتے ہیں اور یہ حملہ زیادہ مضر ہے کیونکہ غیر اہل اسلام تو مخالف ہیں صورۃً وحقیقۃً دونوں طرح ان کو دشمن سمجھا جاتا ہے اور دشمن کی بات کا

بتکلف اخلاق سے بھی اثر ہوتا ہے

نجات بلا علم دین ممکن نہیں

زیادہ اثر نہیں ہوتا اور یہ لوگ دشمن بصورتِ دوست ہیں ان کے جال سے بچنا مشکل ہے
اب تو دین کی حفاظت کی اس کے سوا کوئی صورت ہی نہیں کہ علم کافی والوں کی بہت
بڑی جماعت ہو اور اتنا بڑا مجمع اہل علم کا بلا کافی قوت اور کوشش کے نہیں ہو سکتا
اس واسطے ضرورت ہے کہ سب مسلمان متفق ہو کر کوشش کریں اب وقت اختلاف کا
نہیں رہا اس تقریر سے علم اور کافی علم کی ضرورت ثابت ہو گئی اور یہی علم ذریعہ ہے دین
کی حفاظت کا اسی سے عقائد درست ہو سکتے ہیں اور اسی سے اعمال درست ہو سکتے ہیں
اور اس مجموعۂ اصلاح کا خلاصہ درستی معاد ہے تو حاصل یہ ہوا کہ درستی معاد ہوتی ہے علم سے
اس واسطے علم کی سخت ضرورت ہے اور اس وقت جو آیت تلاوت کی گئی اس کے
ضمن میں مسئلہ معاد ہی کا بیان مجھے مقصود ہے اب میں آیت کا ترجمہ ہی کئے دیتا ہوں
متعلقات کو طول نہیں دونگا ابتک میرا یہ طریقہ تھا کہ ایک آیت پڑھی اور اس کے متعلق
تمام مالہ وما علیہ سے بحث کی اور اس ضمن میں اصل مضمون کے متعلقات اور متعلقات کے
متعلقات اور اُن کے متعلقات سب ہی آجاتے تھے اور بات کہیں سے کہیں پہونچ جاتی
تھی گو اس سلسلہ کے بڑھ جانے سے بھی کلام میں تشتت نہ ہوتا تھا اور اصل مضمون
محفوظ رہتا تھا کیونکہ نظر اصل مضمون ہی کی طرف رہتی تھی تاہم اصل مضامین کے ساتھ
متعلقات بہت زیادہ ہوتے تھے جسکا خلاصہ یہ ہے کہ آیت تھوڑی ہوتی تھی اور بیان
زیادہ ہوتا تھا۔ اور آج اُس طرز کو چھوڑ کر دوسرے طرز سے بیان کرونگا وہ یہ ہے کہ
متعلقات کو طول نہیں دونگا صرف آیتوں کا ترجمہ کرونگا اور مختصر طور پر توضیح مطلب کرونگا
اس طرز کا نتیجہ یہ ہے کہ آیتیں زیادہ ہوں گی اور متعلقات کا بیان کم ہوگا اور میرا قدیم
طریقہ یہی تھا گو اس دوسرے طریقہ کی ایک مدت سے عادت ہو جانے کے سبب
یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ قدیم طریقہ تھا اور آج جدید طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ لیکن
واقعی بات یہ ہے کہ قدیم طریقہ عرصہ سے بدلا ہوا تھا اور بجائے اُسکے دوسرا طریقہ
اختیار کیا ہوا تھا آج پھر اُسی قدیم طریقہ کا اعادہ کیا جاتا ہے اور بات بھی یہی ہے
کہ بیان ذریعہ ہے اور اصل مقصود مضمون آیت ہے تو نظر مقصود پر رہنی چاہئے۔

ذریعہ وہی اختیار کرنا چاہیے جو موصل الی المقصود ہو اور بس اگر ایک کام کے چند ذرائع ہوں تو ظاہر ہے کہ جو ذریعہ احقر ہو یعنی چھوٹے سے چھوٹا ہو اُسی کو اختیار کرنا چاہیئے قدیم طریقہ مختصر اور بہت سہل تھا اسواسطے اس کو درمیانی طریقہ پر ترجیح ہو سکتی ہے جیسا کہ ظاہر ہے کہ ترجمہ اور مضامین اصلیہ کے بیان کرنے میں کچھ بھی دقت نہیں اور اس دوسرے طریقہ میں چند چیزوں کی ضرورت ہے (جیسا کہ آگے معلوم ہوگا) تو چند چیزوں کے جمع کرنے میں اتنی سہولت نہیں ہو سکتی جتنی ایک چیز میں ہوگی یہاں میں پھر وہ بات یاد دلاتا ہوں کہ طریق مقصود نہیں بلکہ مقصود ہی مقصود ہے مقصود کیا ہے وہ یہ ہے جسکا بیان خود قرآن میں موجود ہے وذکر فان الذکریٰ تنفع المومنین جس کا خلاصہ نصیحت ہے مسلمانوں کو جب مقصود نصیحت ہے اور بیان اُسکا ذریعہ اور طریق ہوا تو کیا ضرور ہے کہ ایک ہی طریقہ کا التزام کر لیا جاوے بلکہ جب کوئی دوسرا طریقہ انفع معلوم ہو تو چاہیئے کہ پہلے کو بدل دیا جاوے اور یہ مؤید بالسنت بھی ہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں ہے ما خیر بین امرین الا اختار ایسرہما یعنی حضور کو جب کسی دو بات میں اختیار دیا جاتا تو اُن میں سے اسی کو اختیار فرماتے تھے جو آسان ہو۔ یہ ایسا ہے جیسے حج کو جانے کے دو رستے ہوں ایک قریب اور ایک بعید تو عقل کی بات یہی ہے کہ قریب کا راستہ اختیار کیا جاوے اسمیں بعض لوگ غلطی کرتے ہیں اور طریق طویل کے اختیار کرنے کو باعث ازدیاد ثواب اور مجاہدہ سمجھتے ہیں وطن میں ایک صاحب سے میری گفتگو ہوئی وہ اسی خیال کے تھے اور کہتے تھے کہ دین میں سہولت پسندی اچھی نہیں کیونکہ جتنی مشقت زیادہ ہوگی اُتنا ہی ثواب زیادہ ہوگا حدیث موجود ہے اجرک علی قدر نصبک یعنی اجر بمقدار محنت کے ہے اور میں کہتا تھا کہ اس حدیث سے طریق طویل کو اختیار کرنے کی فضیلت بتلانا مقصود نہیں ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ بڑے مقصود کو حاصل کرو اور اُسکی تحصیل میں جو مشقتیں پیش آئیں اُن کی وجہ سے ہمت نہ ہارو کیونکہ اجرک علی قدر نصبک اُن مشقتوں پر اجر بھی زیادہ ملیگا یہ مقصود نہیں کہ مقصود کے دو طریقوں میں سے اعسر اور اطول کو اختیار کرو اس امید پر کہ اس سے

طویل طریق کو اختیار کرنا غلطی ہے حضرت والا اس کے متعلق ایک لطیفہ بھی سناتے تھے

اجرک علی قدر نصبک کے معنی

ثواب بڑھ جاویگا یہ تو درحقیقت مقصود سے محرومی ہے اور ذریعہ کو مقصود بنانا ہے وہ کسی طرح مانتے نہ تھے میں نے کہا اچھا اگر یہی بات ہے کہ جتنا ذریعہ کو طول دیا جاوے اتنا ہی باعث فضیلت ہے تو آپ یوں کیا کریں کہ اگرچہ پانی تھانہ بھون میں بھی موجود ہے مگر فضیلت بڑھانے کے لئے وضو کے واسطے پانی جلال آباد سے لایا کیجئے اور اس سے وضو کرکے نماز پڑھا کیجئے اس طرح ہر نماز کا ثواب بہت بڑھ جاویگا کیا آپ کے دل کو یہ بات لگتی ہے تب اُن کی سمجھ میں آیا تو اصل بات یہی ہے کہ ذریعہ اور طریق کو طول دینا کچھ فضیلت کی بات نہیں ہاں اگر مقصود کے لئے کوئی طریق ہی نہ ہو سوائے طریق طویل کے تو ہمت نہ ہارے غرض وعظ ایک طریق ہے جس سے مقصود مسلمانوں کا نفع ہے تو جس طریق میں بلا مشقت و مضرت ہو وہی طریق اچھا ہوگا اور جو طرز آج اختیار کیا گیا ہے اس کی بھی شان ہے اس دوسری طریق میں ایک مضرت یہ ثابت ہوئی کہ بعض سامعین کو غلط فہمی ہوتی تھی کیونکہ بعض مضامین نئے ہوتے تھے جو کتابوں میں نظر سے نہیں گذرتے اکثر طبائع نئی بات سے چونکتی ہیں۔ اسواسطے لوگ اُن سے متوحش ہوتے تھے اور غور کرنے کا مادہ طبیعتوں میں رہا ہی نہیں ہے بس نئی بات سنکر خواہ مخواہ اعتراض کر دیتے تھے اور نئے مضامین ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اس طریق میں صرف منقولات پر اکتفا نہ ہوتا تھا کہ فلاں کتاب میں یوں لکھا ہے اور فلاں کتاب میں یوں لکھا ہے بلکہ معقولات بھی شامل ہوتے تھے یعنی سیاق و سباق اور قواعد سے استنباط کرکے ایسے مضامین بھی بیان ہوتے تھے جو کسی نے نہیں لکھے۔ کیونکہ ہر مضمون کا کتاب میں لکھا ہوا ہونا ضروری نہیں اور کتابوں میں قواعد کے درج کرنے کا یہی تو حاصل ہے کہ جزئیات کے لکھنے کی ضرورت نہ رہے پس چند اصول کلی لکھدئے ہیں جن سے سیکڑوں جزئیات نکالے جا سکتے ہیں تو وعظ کے وقت اُن جزئیات کو مستنبط کرکے بیان کر دینے میں کیا حرج ہے اول تو ہمیں اسکی لیاقت کہاں اور قواعد ہم کو ایسے مستحضر کہاں ہیں جتنے ہم زیادہ استنباط کر سکیں مگر خیر ہم بہت تواضع بھی کیوں کریں آخر کچھ تو علم خدائے تعالیٰ نے دیا ہی ہے کہیں کہیں استنباط سے بھی کام لیا

جاتا تھا اور کچھ نہ کچھ ایسے مضامین بھی جو کسی سے بالتصریح منقول نہ ہوں بیان میں آجاتے تھے اُن سے بعض لوگ چونکتے تھے اور خواہ مخواہ اعتراض کرتے تھے یا بعض مضامین ایسے ہوتے تھے کہ اُن کے سمجھنے کی لیاقت سامعین میں نہیں ہوتی تھی نہ اُس کے سمجھنے کی کوشش کرتے تھے بس جو مدلول سرسری طور پر اپنی سمجھ میں آگیا اسی کو واقعی مطلب سمجھکر اعتراض کر دیتے تھے ان مضرتوں کو دیکھ کر خیال ہوا کہ اس بکھیڑے کو کیوں مول لیا۔ اس طریقہ کو چھوڑ ہی کیوں نہ دیا جاوے جس سے یہ سب خرابیاں پیدا ہوئیں گو اُس سے یہ فائدہ بھی ہوتا تھا کہ وہ نئے مضامین اگر کسی کو پسند آگئے تو وہ بہت محظوظ ہوتے تھے لیکن پھر یہ مفسدہ ہوتا تھا کہ کبھی مضامین منقولہ و غیر منقولہ میں تعارض کے توہم سے فرقہ بندی شروع ہوگئی اور ایک اس کے طرفدار ہو گئے اور ایک اُس کے گو اس فرقہ بندی سے بیان کنندہ کا کوئی نقصان نہیں کیونکہ اُسنے کوئی غلطی نہیں کی ایسی فرقہ بندی سلف کے وقت میں بھی ہوئی ہے مگر مجھے اس سے بھی غیرت آتی ہے کوئی قاسمی بنے اور کوئی رشیدی کوئی اشرفی اور کوئی روپیہ صاحبو انسان بنیے اشرفی روپیہ بننے سے کیا فائدہ پھر غور سے سمجھ میں آیا کہ یہ ساری خرابی استنباط کی ہے نہ یہ ہو نہ اختلافات ہوں جب نقل محض ہوگی اور صرف ترجمہ ہوگا تو بات بڑھے ہی گی نہیں پھر استنباط کی نوبت ہی نہیں آوے گی تو اس طریق میں خطرہ نہیں جب کوئی اشکال کرے کہدیا دیکھ لو یہ ترجمہ اور یہ مضمون فلاں صاحب نے لکھا ہے اپنے اوپر کچھ بھی بار نہ رہا اُس طریق میں دماغ پر بھی تعب بہت ہوتا تھا کیونکہ آیت میں سے ایک مضمون نکالا اور اس مضمون میں سے اور مضمون نکالا اور اُس میں سے اور نکالا ان سب کا سلسلہ یاد رکھنا اور ہر مضمون کے لئے اصل کو تلاش کرنا اور ہر پہلو پر نظر رکھنا ظاہر ہے کہ کس قدر دماغ کا کام ہے اور اس صورت میں آیت کے الفاظ کا اتباع ہے جو مضامین سیدھے سیدھے اُن الفاظ سے سمجھ میں آویں بیان کر دے تو بہت سا کام کم ہوگیا غرض اُس طریق میں بہت بکھیڑے تھے نیز ضرر بھی دیکھا تو اس سنت پر عمل کرنے کو جی چاہا ماخیر بین امرین الا اختارا ہونہما اور اس بات کی ضرورت محسوس

ہوئی کہ وہ طریقہ بدل دیا جاوے اسواسطے اب میں صرف سیدھے سیدھے ترجمہ پر
اکتفا کرونگا بعضوں کا خیال یہ ہے کہ اس طریق کے بیان میں مزا نہیں ہے اس کا
جواب یہ ہے کہ مزا مقصود نہیں شفا مقصود ہے دیکھئے حکیم محمود خاں مریض کے لئے
نسخہ لکھتے تھے۔ اُس میں مزا کہاں ہوتا تھا بلکہ بعضے نسخے تو نہایت بدمزہ ہوتے ہونگے
پھر یہ تھوڑا ہی ممکن تھا کہ کوئی بدمزہ ہونے کی وجہ سے اس نسخہ کو چھوڑ کر مومن خاں
کے مزہ دار شعر پڑھ لیا کرے مزہ شعر میں ہے مگر شفا نسخہ میں ہے حتی کہ بمقتضائے انا
عند ظن عبدی بی بعض دفعہ صرف کاغذ گھولکر پلا دینے سے شفا ہوگئی اور مومن خان
اور ذوق اور شوق کے تمام دیوان بھی پی جاوے تو شفا نہیں ہوسکتی تو مقصود نفع ہے
نہ مزہ جسکی نظر مقصود پر ہے اُس کے نزدیک دونوں طریقے یکساں ہیں اصلاح کے مضامین
اسمیں بھی ہوں گے کیونکہ نرا ترجمہ سہی مگر ہے تو ترجمہ اُسی کلام کا جسمیں سرتا پا
اصلاح بھری ہوئی ہے رنگینی نہ سہی اور اس بے مزہ طریق کو اختیار کرنے میں یہ
بھی ایک نفع ہے کہ لوگ مجھے وعظ کے لئے کم بلاویں گے اور گرمی میں دق نکریں گے
مجھے آرام ملیگا نیز بلانے والوں کی محبت بھی معلوم ہوجاوے گی کہ صرف اپنے کام
کے لئے بلاتے ہیں یا محبت ہی اسکی محرک ہوئی ہے چنانچہ یہاں کے بلانے والوں
سے مینے صاف کہدیا تھا کہ اگر وعظ مقصود ہے تو میں وعظ تو اب پھیکا اور بے مزہ
کہونگا اگر اسپر بھی آپ حضرات راضی ہوں تو میں حاضر ہوں چنانچہ اس وعدہ کا
اسوقت ایفا کرونگا حضرات داعین کی محبت ہے کہ انھوں نے اسکو منظور کیا گو اصل
محبت تو یہی ہے کہ روٹیاں کھلاویں اور بوٹیاں نہ نوچیں اور کام لے کر اور پوری
محنت کراکے روٹی دی تو کیا احسان کیا یہ تو مزدوری ہے۔ خیر یہ تو لطیفہ تھا اصل وجہ
اس تبدیل طریقہ کی محض مضرات ہیں جنکا اب احساس ہوا بیاں تو کیا جاتا ہے
نفع کے لئے اور پیدا ہوا نقصان تو کیوں ایسا طریقہ اختیار کیا جاوے میں نے
اترے پترے سب کھول دئے مجھے بناوٹ پسند نہیں جو بات صاف ہے وہ
کہدی اب جسکا جی چاہے وعظ سنے اور جسکا جی چاہے نہ سنے اب میں ترجمہ کرتا ہوں

فرماتے ہیں وما قدروا اللہ لوگوں نے حق تعالیٰ کی ایسی عظمت نہ کی جیسا عظمت کرنا چاہئے تھا حالانکہ اُن کی عظمت وہ ہے کہ والارض جمیعًا قبضتہ یوم القیمۃ۔ تمام زمین اُسکی ایک مٹھی میں ہوگی قیامت میں۔ والسمٰوات مطویات بیمینہ اور کل آسمان اُسکے داہنے ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہوں گے یمین کا لفظ اور ایسی ہی قبضہ کا لفظ متشابہات میں سے ہے جنکا بیان کوئی کر نہیں سکتا صرف اتنا معلوم ہے کہ ان الفاظ کے معنی متعارف مراد نہیں حدیث میں ہے فرماتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کلتا یدیہ یمین یعنی خدائے تعالیٰ کے دونوں ہاتھ یمین ہیں مراد یہ ہے کہ قوت میں یمین ہی کی طرح ہیں۔ یعنی وہاں فرق نہیں ہے کہ ایک ہاتھ قوی اور ایک ضعیف ہو جیسے مخلوقات میں متعارف ہے کہ داہنا ہاتھ قوی اور بایاں ضعیف ہوتا ہے متشابہات کے متعلق تحقیق یہی ہے کہ ان میں گفتگو نہ کرے اور ان پر ایمان رکھے مثلاً خدائے تعالیٰ کے لئے شریعت میں ید کا اطلاق آیا ہے لہذا اسکا تو قائل ہو کہ ید ثابت ہے مگر اسکی کیفیت وغیرہ سے بحث نہ کرے بس سیدھی بات ہے جیسا اللہ ویسا ہی اُسکا ید ہم کو اللہ کی حقیقت کہاں معلوم ہے اور اُسکا علم بالکنہ کہاں حاصل ہے بس ایسے ہی اُس کے ید کا بھی علم نہیں ہے یہ تو قبضہ اور یمینہ کی بحث ہوئی اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ زمین پر قدرت بیان کرنے کے لئے تو قبضہ فرمایا اور آسمانوں کے لئے مطویات بیمینہ فرمایا۔ دونوں کے واسطے عنوانوں میں فرق کیوں کیا کہ زمین کی بابت تو فرمایا کہ مٹھی میں ہوگی اور آسمانوں کی نسبت فرمایا کہ لپٹے ہوئے ہاتھ میں ہوں گے گویا ہتھیلی پر رکھے ہیں سیدھی بات یہ تھی کہ یوں فرمادیتے والارض والسمٰوات جمیعًا قبضتہ یعنی زمین و آسمان سب اس کی مٹھی میں ہوں گے اسکا نکتہ ایک ان پڑھ آدمی کی سمجھ میں آیا بلکہ آدمی کے نہیں آدمن کے سمجھ میں آیا جو مجھ سے ترجمہ پڑھا کرتی تھی اور مجھے وہ نکتہ بہت پسند آیا حتی کہ میں نے اسکو اپنے کتاب میں مدرج بھی کر دیا میں نے اس سے پوچھا کہ یہ فرق عنوانوں میں کیوں کیا گیا ہے کہا زمین بہ نسبت آسمان کے چھوٹی ہے اور چھوٹی چیز کے لئے

یہی عادت ہے کہ مٹھی میں بند کی جاتی ہے اور بڑی چیز کے لئے عادت یہ ہے کہ لپیٹ کر کھلے ہاتھ پر رکھ لی جاتی ہے مٹھی کو بند نہیں کیا جاتا اسواسطے زمین کے لئے وہ عنوان اختیار کیا گیا اور آسمان کے لئے یہ دیکھئے یہ علوم قرینہ ہیں ان میں خصوصیت پڑھے لکھوں اور علما و فضلا کی نہیں ہے جس کو حق تعالیٰ چاہیں القاء کردیں خدا کی دین ہے جسکو چاہے دیدیں بعض وقت ایک عامی آدمی کی سمجھ میں وہ بات آجاتی ہے جو ایک بڑے عالم کی سمجھ میں نہیں آتی اور ایسا بہت ہوتا ہے کہ عامی آدمیوں کی سمجھ میں دین کی بات آجاتی ہے وجہ اسکی یہ ہے کہ دین فطرت کے بہت قریب ہے جسکی فطرت میں سلامت ہو اسکا ذہن اُس تک پہونچ جاتا ہے گو عامی آدمی اس مضمون کو اصطلاحی الفاظ میں ادا نہ کرسکے مگر اعتبار تو معانی کا ہے الفاظ کو تو ادا ہوں تو کیا حرج ہے یہ نور ایمان کی برکت ہے اور نور ایمان کم و بیش ہر مسلمان کو حاصل ہے۔ خواص کی کچھ خصوصیت نہیں مگر اسکو سن کر ان پڑھ لوگ فخر نہ کرنے لگیں کہ ہم بھی نکات جانتے ہیں کیونکہ ان کے نکات کے صحیح و غلط ہونے کا معیار یہی ہے کہ اہل علم ان کے جس نکتہ کو صحیح کہیں وہ صحیح ہے ورنہ غلط ہے ان کے واردات اہل علم کی رجسٹری کے محتاج ہیں علم اور بے علمی برابر نہیں ہے بلکہ عوام تو کیا غیر متبحرین کی واردات بھی جبھی معتبر ہیں جبکہ متبحرین کے نزدیک صحیح ہوں اصل میں تو اُن کے صحیح ہونے کا معیار یہ ہے کہ شریعت کے موافق ہوں اور شریعت کے موافق ہونے کو پہچاننا یہ متبحرین کا کام ہے اس واسطے یہ کہدیا گیا کہ وہ متبحرین کے نزدیک صحیح ہوں آج اس غلطی میں اچھے اچھے پڑھے لکھے مبتلا ہیں ذرا سی کسی کو کوئی کیفیت حاصل ہوئی یا کوئی وارد قلب پر آیا اور اُس کو وحی سمجھنے لگے اور کہتے ہیں ہمکو یہ القاء ہوا ہے گویا یہ مقدمہ انکے نزدیک مسلم ہے کہ القاء شدہ بات کبھی غلط نہیں ہوتی صاحبو یہ بڑی غلطی ہے القاء کا من جانب اللہ ہونا ضروری نہیں القاء من جانب شیطان بھی ہوتا ہے اور بہت ہوتا ہے خود نفس موجود ہے وان الشیاطین لیوحون الی اولیاءہم یعنی شیاطین اپنے ہم جنسوں پر القاء کرتے ہیں آجکل اس غلطی میں بڑے بڑے لوگ مبتلا ہیں اسی غلطی میں پڑکر کوئی مدعی

ولایت ہنگیا اور کوئی مدعی نبوت صاحبو جب نص موجود ہے کہ القاء شیطانی بھی ہوتا ہے
تو پھر ہر القاء کو صحیح اور قطعی سمجھ لینا کیسے ٹھیک ہے اس کے لئے ایک یہی معیار ہے
کہ اگر وہ شریعت کے موافق ہے تو صحیح ہے ورنہ غلط ہے اسمیں بڑی احتیاط کی ضرورت
ہے کبھی اپنے حالات اور واردات پر اعتماد نہیں کرنا چاہئے تاوقتیکہ کوئی متبحر اور تجربہ کار
اس کو شریعت کے موافق نہ کہے اہل فن نے بالتصریح لکھدیا ہے کہ کل حقیقۃ رد تا
الشریعۃ بھی زندیقۃ ہمارے حضرت حاجی صاحب کو اس بارہ میں اس قدر احتیاط تھی
کہ علما کے سامنے کوئی نکتہ بیان فرماتے تو یہ بھی فرما دیتے کہ بھائی میرے نکات اور
اقوال میں تم غور کر لینا اگر کچھ غلطی ہو تو بتلا دینا اور اس بارہ میں ادب سے کام نہ لینا
میں کہہ چکا اب تم ذمہ دار ہو جب ایسے کاملین اور عارفین کو اسقدر احتیاط تھی تو بما
وشما چہ رسد۔ اس باب میں ہرگز جرأت نہیں کرنا چاہئے کسی حال اور کسی وارد کو صحیح
مت سمجھو جبتک کہ وہ شریعت کے موافق نہ ہو اور شریعت کے موافق ہونے کے
لئے بھی اپنی تحقیق پر بس نہ کرو بلکہ اس کو اُس وقت تک شریعت کی موافق نہ سمجھو
جبتک کوئی متبحر عالم اسکو شریعت کے موافق نہ کہدے غرض عام لوگ اپنی یہ ایک تعریف
سنکر کہ عوام کی سمجھ میں یہی بعض نکات صحیح طور پر آجاتے ہیں کیونکہ دین فطرت کے
بہت قریب ہے اور ان لوگوں کی فطرت میں تصنع وغیرہ نہ ہونے کی وجہ سے بہت سلامتی
ہوتی ہے شریعت میں نکات نکالنے کی جرأت نہ کریں ورنہ وہ قصہ ہوگا کہ ایک ہمارے ابتدائی
کتابوں کے استاد تھے اُن کے پاس ایک درزی بیٹھا تھا اُس نے آمنت باللہ پڑھی اور
والبعث بعد الموت پر ایک آہ کی اور کہا کہ بادل کی بھی موت ہے ع بعد کا ظاہر نہ ہوا تھا
الف پڑھا تھا اس لئے یہ نکتہ مستنبط کیا یا کسی نے من ذالذی یشفع کا ترجمہ کیا تھا
من ذل جو شخص ذلیل کرے ذی یعنی نفس کو (شاید ذی کو جی پڑھا یا اسم اشارہ
سمجھا) یشفع شفا پاویگا۔ ع یاد رکھ ایسے ہی ایک صاحب تھے کہ وہ بی بی کو تو خوب
کھلاتے پلاتے تھے اور اُن کی ماں بھی موجود تھی اُس کی خبر گیری نہ کرتے تھے اُنسے
ایک مولوی صاحب نے کہا کہ تو ماں کو کچھ کھانے کو کیوں نہیں دیتا کہا کہ ان میں تو

حضرت حاجی صاحب کی احتیاط واردات کے بارہ میں

قصہ بادل کی بھی موت ہے

ایک جاہل کا نکتہ

ایک صاحب کا ترجمہ من ذالذی یشفع

کھلانے کا حکم بی بی ہی کے لئے آیا ہے واطعموہم من جوع یعنی جوے کو کھانا دو (جوے بمعنی زوجہ) مولوی صاحب بھی بڑے حاضر جواب تھے کہا بھلے مانس بی بی کے لئے تو کھانا ہی دینے کا حکم آیا ہے اور ماں کے لئے تو یہ حکم ہے کہ مالہ و ماکسب یعنی ماں کا سب مال ہے جو کچھ تیرے پاس ہے سب ماں کا ہے اس حکم کے رو سے تو جوے کا کھانا تو الگ رہا تو بھی اپنے مال میں سے بلا اجازت ماں کے کچھ نہیں کھا سکتا اب وہ لاجواب ہوئے یہاں طالبعلمانہ ذرا سا اشکال ہے اسکو اور اس کے حل کو بھی سن لیجئے وہ یہ کہ اُس شخص نے جو استدلال قرآن شریف سے کیا یعنی اطعموہم من جوع کے معنے یہ لئے کہ بی بی کو کھانا دے اُس کو تو غلط کہا گیا اور جاہلانہ نکات میں شامل کیا گیا لیکن اُس کے جواب میں مولوی صاحب نے بھی ایسی گنوار و بات کہی کہ وہ بھی بجنسہ ویسی ہی ہے کیونکہ ماکسب کے معنی عربی زبان میں یہ کہاں ہیں کہ بیٹے کا مال سب ماں ہی کی ملک ہے پھر ایک گنوار ہی پر کیا الزام ہے معلوم ہوا کہ علماء بھی ایسے نکتے نکالتے ہیں اسکا جواب یہ ہے کہ اول تو ہم یہ نہیں کہتے کہ مولوی صاحب نے ٹھیک جواب دیا اور قرآن کا یہی مدلول ہے اور نہ ہم یہ کہتے ہیں کہ مولوی صاحب کا یہ نکتہ مقبول ہے اور اس گنوار کا وہ نکتہ مقبول نہیں بلکہ ہم دونوں کو یہی کہتے ہیں کہ یہ جاہلانہ نکات ہیں دونوں یکساں ہیں اور اس قسم کے نکات قرآن میں نکالنا درست نہیں یہ مولوی صاحب والا نکتہ بھی غلط ہے اور بجنسہ ویسا ہی ہے جیسا وہ گنوار والا نکتہ ہے لیکن چونکہ یہ واقعہ ایک بڑے عالم کا ہے اسواسطے یہ نہیں کہا جاتا کہ قراں میں تحریف کی گئی یا وہ ماکسب کے معنی یہی سمجھتے تھے بلکہ اسمیں تاویل کی جائیگی کہ مولوی صاحب نے جواب الزامی دیا ہے۔ جسکا حاصل یہ ہے کہ اگر ایسے نکات سے حکم ثابت ہو سکتا ہے جیسا اُس نے لایلاف سے جوے کا حق ثابت کیا تو تبت سے ماں کا سب حق ثابت ہو جاویگا یہ جواب اس کے ساتھ استدلال کے رد کرنے کے لئے بہت کافی ہے یہ تقریر ہے اس طالبعلمانہ شبہ کی اور اُس کے جواب کی غرض یہ ہے کہ عوام کے نکات اکثر ایسے لغو ہوتے ہیں جیسے مثالوں میں بیان ہوئے لہذا

عوام کو قران میں نکات نکالنے کی اجازت نہیں اور اس سے عوام خوش نہ ہوں کہ ایک شخص کے ایک نکتہ کی میں نے تعریف کردی آیت والارض جمیعًا قبضتہ اور السموات مطویات بیمینہ کے متعلق اُسکی سمجھ میں آگیا تھا اور میں نے تعریف میں یہ لفظ کہدیا کہ عوام کا مذاق چونکہ فطرت کے بہت قریب ہوتا ہے اور دین بھی فطرت کے موافق ہے اس واسطے دین کی بات ان کی سمجھ میں آجاتی ہے مطلب یہ ہے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عوام کے ذہن میں کوئی صحیح نکتہ آجاتا ہے اور علما کو بھی یہ نہ چاہئے کہ ہر بات کو صرف یہ دیکھکر کہ عوام کے مُنھ سے نکلی ہوئی ہے غلط سمجھنے لگیں بلکہ اُس بات میں غور کریں اور دیکھیں کہ قواعد شرعی کے مخالف ہے یا نہیں اگر مخالف نہ ہو تو اسکو مان لیں اور اس کو اپنے لئے کسر شان نہ سمجھیں دین کچھ ان ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے دین تو سب کی مشترک جائداد ہے تو ایمان سب میں موجود ہے اُسکی برکت سے اگر کسی وقت ایک عامی آدمی کے سمجھ میں ایسی بات آجاوے جو کسی عالم کی سمجھ میں نہ آئی ہو تو کیا استحباب ہے خدا کی دین ہے جسکو چاہیں دیدیں اسی قبیل سے یہ نکتہ ہے جو والارض جمیعًا قبضتہ یوم القیمۃ والسموات مطویات بیمینہ میں ایک عامی آدمی کے منہ سے نکلا مجھے یہ پسند ہوا لہذا میں نے اسکو اپنی کتاب تفسیر بیان القرآن میں بھی درج کردیا ہے آگے فرماتے ہیں سبحنہ وتعالیٰ عمایشرکون ترجمہ یہ ہے کہ پاک ہے حق تعالیٰ اور برتر ہے اس سے جو شرک کرتے ہیں دیکھئے جملہ سابقہ پر اس جملہ کو مترتب کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس تمام آیت سے مقصود نفی شرک ہے جسکا میں نے شروع ہی میں دعوے کیا تھا کہ گو بظاہر یہاں معاد کا بیان ہے مگر مقصود اُس سے توحید الٰہی کا اثبات ہے جسکو شکایت کے عنوان میں اس طرح ارشاد فرمایا گیا کہ لوگوں نے خدائے تعالےٰ کی عظمت نہیں پہچانی اور اب اُسکی شرح کی ہے کہ سبحنہ وتعالیٰ عمایشرکون اس میں تصریحًا شرک سے تنزیہ ہے غرض آیت کے الفاظ سے بہت وضوح کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں مضمونوں میں سے یعنی توحید اور معاد میں سے گو مضمون معاد کو طول کے ساتھ بیان کیا گیا ہے مگر مقصود اثبات توحید ہے آگے فرماتے ہیں ونفخ فی الصور فصعق

من في السموات ومن في الارض الا من شاء اللہ معنی یہ ہیں کہ نفخ صور سے گر پڑیں گے تمام وہ لوگ جو آسمانوں اور زمین میں ہیں صعق کے معنی بیہوشی ہو کر گر پڑنا ہیں تو یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ مر جاوینگے کیونکہ مرنے میں بیہوشی اور گر پڑنا ہوتا ہی ہے اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ غشی طاری ہو جاوے گی کیونکہ صور کی آواز ایسی ہولناک ہو گی کہ سب کے حواس جاتے رہیں گے الا من شاء اللہ من في السموات والارض میں سے مستثنی کیا من شاء اللہ کو معنی یہ ہوئے کہ تمام آسمان اور زمین کے لوگ بیہوش ہو جاویں گے سوائے اُس کے جسکا بیہوش ہونا حق تعالیٰ کو منظور نہ ہو اس سے بظاہر معلوم ہوا کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو بیہوش نہ ہوں گے باقی یہ اللہ کو معلوم ہے کہ وہ کون کون ہیں اور ایک توجیہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ الا من شاء اللہ گو بظاہر استثنا ہے مگر بمعنی شرط کے ہے جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ کسی کا بیہوش نہ ہونا مشیت ایزدی پر ہے اگر چاہیں تو کسی کو صعق کے حکم کلی سے مستثنی بھی کر سکتے ہیں تو اس کا تحقق جب بھی صحیح ہے کہ کسی کو بھی صعق سے نہ بچایا جائے کیونکہ ماحصل اس کا یہ ہوا کہ مستثنے کرنا مشیت پر موقوف ہے مشیت اس کے وقوع کے متعلق ہوئی تو وقوع ہوگا اور عدم وقوع کے متعلق ہوئی تو عدم وقوع ہوگا تو یہ مضمون ہر حال میں صادق رہا کہ بعض افراد بشرط مشیت مستثنے ہو سکتے ہیں اس کے لئے استثنا کا وقوع ضروری نہیں۔ ثم نفخ فیہ اخری فاذا ہم قیام ینظرون۔ ترجمہ پھر نفخ صور دوبارہ ہوگا تو ایک دم سب کھڑے ہو جاویں گے اور محشر کا تماشہ پیش نظر ہوگا اگر صعق کے معنی مر جانے کے ہیں تو یہ معنی ہوئے کہ مردے زندہ ہو جاویں گے اور اگر صعق کے معنی بیہوش ہو جانے کے ہوں تو یہ معنی ہوئے کہ بیہوشی سے ہوش میں آجاویں گے اس میں اختلاف ہے کہ نفخ صور کتنے دفعہ ہوگا اس آیت سے بتفسیر مشہور اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ایک نفخہ سے تمام عالم مر جاویگا مگر میں نے کہا تھا کہ صعق کے معنی بیہوش ہو جانے کے بھی ہیں اس لحاظ سے اس کے معنی یہ بیان کئے ہیں کہ جو لوگ اُسوقت زندہ ہوں گے وہ مر جاویں گے اور جو لوگ اس سے پہلے مر چکے ہیں اُن کی روحیں بے ہوش ہو جاویں گی اور نفخہ ثانیہ سے مردے زندہ ہو جاویں گے اور بیہوش روحیں ہوش میں

آجاویں گی اسی کا نام حشر ہے سب اگلے پچھلے مردے انسان اور حیوان اور حشرات ایک ایک زندہ ہو جاویں گے یہاں یہ اشکال ہو سکتا ہے کہ زمین ان سب کے لئے کافی کیسے ہوگی کیونکہ اگر مردم شماری سے دیکھا جاوے تو اولین و آخرین تمام انسانوں ہی کی تعداد اس قدر ہو سکتی ہے کہ زمین اُن کے جمع ہونے کے لئے کافی نہ ہو چہ جائے کہ تمام وحوش و طیور وغیرہ سب کے سب جمع ہوں جواب یہ ہے کہ واقعی زمین موجودہ حالت میں تو اس کے لئے کافی نہیں ہو سکتی لیکن اُس وقت زمین کو وسعت دیدی جاوے گی جیسے ربڑ کو چھلا دیں تو وہ بڑھ جاتا ہے کہ ربڑ پہلے چھوٹا ہوتا ہے مگر کھینچنے سے بڑھ جاتا ہے یہی خاصیت زمین میں ہے کہ اس وقت چھوٹی ہے اور اُس وقت اُس کو کھینچ کر بڑھا دیا جاویگا اور یہ بات عام طبائع میں بھی محال نہیں بلکہ ممکن ہے چنانچہ محاورات میں بولتے ہیں کہ زمین کی طنابیں کھینچ گئیں معلوم ہوا کہ عوام بھی زمین کو بڑھنے اور کھینچنے کے قابل سمجھتے ہیں بلفظ دیگر یوں کہئے کہ زمین میں تخلخل ہو جاوے گا تخلخل کو حکماء نے بھی ممکن مانا ہے تخلخل کے لفظ سے یہ مضمون سہولت سے ذہن نشین ہو جاتا ہے اور استبعاد رفع ہو جاتا ہے کیونکہ تخلخل کا امکان ذہنوں میں موجود ہے یہاں سے ایک بات طالب علموں کے کام کی بھی نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ حدیث میں ایک قصہ آتا ہے کہ ایک شخص نے ننانوے قتل کئے تھے اس کے بعد اس کو کچھ تنبہ ہوا اور خیال ہوا کہ میری مغفرت کیسے ہوگی اس کے دریافت کرنے کے لئے ایک عالم کے پاس پہونچے اور سب واقعہ بیان کیا کہ میں نے ننانوے قتل کئے ہیں میری مغفرت کی بھی کوئی صورت ہے وہ خفا ہوے اور کہا کہ ایک ہی قتل دوزخ میں جانے کے لئے کافی ہے چہ جائے کہ ننانوے قتل جاؤ اب کوئی صورت بخشش کی نہیں ہو سکتی اُسے بہت رنج ہوا اور غصہ بھی آیا اور کہا جب یہی بات ہے کہ دوزخ میں جانا ضرور ہے تو آپ کو بھی کیوں چھوڑوں جس نے میرے دل پر نشتر لگایا ہے جہاں ننانوے قتل ہوئے ہیں ایک اور بھی سہی پورے سو بھی کیوں نہ ہو جائیں چنانچہ اُن کو بھی قتل کر دیا مگر پھر دل نے نہ مانا اور دوسرے عالم کے پاس پہونچا اور سارا واقعہ بیان کیا کہ ننانوے قتل کئے تھے اور ایک قتل ابھی کر کے آیا ہوں میری مغفرت

حشر کے لئے زمین کے کافی ہونے کی بحث

قصہ ایک شخص کا جس نے ننانوے قتل کئے

کی بھی کوئی صورت ہے میں توبہ کرلوں تو میری بخشش ہوسکتی ہے یا نہیں وہ حکیم بھی تھے اور شاید کچھ اس شخص سے خوف بھی ہوا ہو اس لئے خیال ہوا کہ اس وقت ترہیب کا موقعہ نہیں ہے ترغیب کی ضرورت ہے ترغیب ہی سے اثر ہوگا کہا توبہ سب کی قبول ہے سنو قتل کیا اگر ہزار بھی کئے ہوں تب بھی توبہ قبول ہوسکتی ہے تم توبہ کرو مگر تکمیل توبہ کی شرط یہ ہے کہ اس سرزمین سے چلے جاؤ اور کسی نیک بستی میں جاکر رہو اس نے ایسا ہی کیا ان کے ہاتھ پر توبہ کی اور ایک دوسرے بستی کو چلا راستہ میں موت کا وقت آگیا اور ملک الموت علیہ السلام نے اس کی جان قبض کرلی اس وقت اس کو نہایت یاس ہوئی اور کچھ تو نہ ہوسکا اتنا کیا کہ اپنا سینہ اس بستی کیطرف بڑھا دیا جہاں جانا تھا اب اسکے پاس ملائکہ دونوں قسم کے آئے عذاب کے بھی اور رحمت کے بھی وہ کہتے تھے اس کی روح کو ہم لے جائیں گے اور وہ کہتے تھے ہم لے جائیں گے آخر اس جھگڑے کے فیصلہ کے لئے حق تعالیٰ نے ایک فرشتہ بھیجا اور اُس نے کہا اس راستہ کی پیائش کرو جس بستی کے یہ شخص قریب ہو اسی کا حکم ہوگا واقع میں وہ شخص اپنی بستی کے قریب تھا تو فیصلہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ عذاب ہی کے فرشتے غالب آتے مگر حق تعالیٰ نے خود ہی یہ فیصلہ کیا اور خود ہی اس کی تکمیل بھی فرمادی یہ اُس کی نیت کی برکت تھی کہ اُس سے جو کچھ ہوسکتا تھا کرچکا اور وہ ارادہ ہے یہ اُس کے اختیار سے باہر تھا کہ دوسری بستی میں پہونچ جاوے آدمی کا اختیاری فعل نیت کرنا ہے اور بقدر وسعت کوشش کرتا رہے اس کی تکمیل اور نتیجہ کا متفرع ہوجانا یہ حق تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے چنانچہ یہاں وہ شخص نیت کرچکا اور جہاں تک اس کے امکان میں تھا چل چکا حق تعالےٰ نے اس پر نتیجہ اپنی رحمت سے متفرع فرمایا اس طرح باوجودیکہ وہ اپنی بستی سے قریب تھا لیکن زمین کے اس حصے کو حکم دیا کہ دور ہوجا اور دوسرے حصّہ کو حکم دیا کہ قریب ہوجا بس فرشتوں نے پیائش کی تو وہ اُس دوسری بستی سے قریب ثابت ہوا جہاں کو جارہا تھا اور قریب بھی صرف اس قدر کہ اس کا سینہ اُس طرف بڑھا ہوا تھا لہٰذا رحمت کے فرشتے غالب آئے اس قصے میں بیان کرنا اس بات کا مقصود ہے کہ کوئی طالب علم پوچھ سکتا ہے کہ وہ دونوں

بستیاں کس طرح قریب اور بعید ہوگئیں جواب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی قدرت سے کچھ بعید نہیں اور اس میں اشکال کرنے کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ جس بات کے استحالہ پر کوئی دلیل عقلی قائم نہیں ہے وہ ممکن ہے پھر ممکن کے وقوع میں کیا استبعاد ہے مگر طبیعت چاہتی ہے کہ اس قریب اور بعید ہونے کی کوئی صورت بھی بیان کی جائے جس سے قریب الی الفہم ہو جاوے اور استبعاد بالکل باقی نہ رہے وہ یہ ہے کہ اس وقت تخلخل اور تکاثف کا حکم ہوا ایک حصے میں تخلخل ہوا اور اس کی مسافت بڑھ گئی اور دوسرے حصے میں تکاثف ہوا اس کے اجزا سمٹ گئے اور مسافت گھٹ گئی پھر بعد میں خواہ ہر حصہ اپنی حالت سابقہ پر لوٹ آیا ہو یا اسی حالت میں رہ گیا ہو اس تقریر سے واقعہ قریب الی الفہم ہو جاتا ہے اور استبعاد رفع ہو جاتا ہے مگر دعویٰ نہیں کیا جاتا کہ یہی صورت ہوئی تھی صرف احتمال کے طور پر کہا جاتا ہے کہ اس قرب اور بعد کے ہونے کی یہ بھی صورت ممکن ہے سو دفع اشکال کے واسطے یہ احتمال بھی کافی ہے اب سمجھ میں آگیا ہوگا کہ حدیث میں جو آیا ہے کہ قیامت میں تمام عالم کے حشر کے لئے زمین کافی ہوگی اس کی توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس زمین کے اجزاء میں تخلخل ہو جائیگا جس سے اتنی وسعت ہو جائیگی کہ حشر کے لئے کافی ہو اب آگے محشر کے واقعات گنوائے ہیں ایک واقعہ یہ ہے واشرقت الارض بنور ربہا۔ یعنی زمین چمک اٹھے گی خدائے تعالیٰ کے نور سے محمود آیت میں ہے کہ یہ نور حق تعالیٰ کی تجلی کا ہوگا دوسری آیت میں حق تعالیٰ کی آمد صاف الفاظ میں ہے۔ وجاء ربک والملک صفاً صفا یہ آیتیں متشابہات میں سے ہیں ان کی حقیقت سے کاوش کرنا ٹھیک نہیں پس سیدھے سیدھے یہ معنی کہے جاویں کہ حق تعالیٰ زمین کی طرف متوجہ ہوں گے اور تشریف لاویں گے یہ تو ترجمہ ہو گیا آیت کا باقی اس کے حقیقی معنی کی نسبت یہی کہیں گے کہ اللہ اعلم بمرادہ بذالک حق تعالےٰ کا ہی کلام ہے اور انھیں کو اس کے معنی خوب معلوم ہیں یہ آیت ایسی ہے جیسے آیت الرحمٰن علی العرش استوی ہے کہ اس کے معنی میں بھی یہی کہا جاتا ہے کہ استواء یلیق بہ اس وقت استواء عرش پر ہے اور اس وقت یعنی قیامت میں زمین کی طرف تجلی ہو یہ معنی ہیں جاء ربک کے اور اگر تجلی سے کیف سمجھ میں نہ آوے تو تقریب

الی الفہم کے لئے یوں سمجھ لیجئے کہ جب بادشاہ کے خدم وحشم آتے ہیں تو کہتے ہیں بادشاہ آرہا ہے حالانکہ ابھی بادشاہ نہیں آیا تو ایسی ہی جاء ربک سے معنی مجازی مراد لے لیجئے کہ حق تعالیٰ کے خدم وحشم آویں گے یعنی فرشتے اور جنت اور نار وغیرہ آئیں گے اور عدالت قائم ہوگی اور حساب وکتاب ہوگا مگر اس سے جزماً یہ نہ سمجھا جاوے کہ یہی معنی مراد ہیں کیونکہ متشابہات کے بارہ میں سلف کا مسلک یہی ہے کہ کچھ معنی نہ بیان کئے جاویں اور اُن کے علم کو حق تعالیٰ کی سپرد کیا جاوے نہ حقیقی معنوں سے بحث کیجاوے نہ مجازی سے بس یہ کہکر چھوڑ دیا جاوے کہ اللہ اعلم بمرادہ بذالک مگر متاخرین نے عوام کی وحشت رفع کرنے کے لئے معنی مجازی بیان کرنے کی اجازت دی ہے مگر اُن کا مطلب یہ نہیں کہ جو معنی مجازی بیان کئے جائیں اُن پر یقین کر لیا جاوے کہ یہی معنی مراد ہیں اور یہ بھی سمجھ لیجئے کہ جو واقعات محشر کی آیت میں مذکور ہیں وہ فرضی نہیں ہیں بلکہ واقعی ہیں آجکل اس مذاق کے لوگ بھی بہت ہیں جن کو ان واقعات سے اس قدر استعجاب ہوتا ہے کہ ان کو ناممکن کہدیا ہے اور آیات اور نصوص میں یہ تاویل کرتے ہیں کہ ترغیب وترہیب کے لئے یہ فرضی باتیں فرمادی ہیں تاکہ جنت کے شوق میں اعمال صالحہ کریں اور دوزخ سے ڈر کر معاصی سے باز رہیں اور جو واقعہ قیامت کا بیان کیا جاتا ہے اس کی نظیر مانگتے ہیں۔ صاحبو! بہت سے واقعات وہاں کے ایسے ہیں جن کی نظیر یہاں موجود نہیں ہے کیونکہ دنیا عالم طبائع ہے اور وہاں طبائع کو دخل نہ ہوگا لیکن چونکہ اُن کے استحالہ پر کوئی دلیل عقلی نہیں ہے اسواسطے ان کو ممکن کہا جاویگا اور ممکن کے وقوع کا اگر صحیح دلیل سے دعوٰی کیا جاوے تو کسی کو اُس کی تکذیب کا یا اس میں کوئی اشکال نکالنے کا حق نہیں ہوسکتا لہذا اُن لوگوں کا خیال بالکل غلط ہے بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ حق تعالیٰ محض ترغیب وترہیب کے لئے فرضی واقعات بیان فرمائیں جب کلام میں فرضیت پر کوئی لفظ دال نہیں تو اُن کو فرضی مثال لکھنے کے لئے کوئی دلیل ہونی چاہئے اور اگر بلا دلیل کسی بات کو فرضی کہا جاسکتا ہو تو اس طرح تو اوامر و نواہی اور احکام سے بھی اطمینان اُٹھ جائیگا کیونکہ ممکن ہے کہ یہ بھی سب فرضی باتیں

فی قضایا ہذا سے متعلق تحقیق

بعض لوگ واقعات محشر کو تمثیل پر محمول کرتے ہیں

ہوں حالانکہ کوئی مسلمان اسکا قائل نہیں ہوسکتا و وضع الکتاب۔ ترجمہ اور نامہ اعمال لائے جاویں گے یعنی سب کے ہاتھوں میں دئے جاویں گے کیفیت اُن کے دئے جانے کی دوسری آیتوں میں مذکور ہے وہ یہ ہے کہ نیکوں کے نامۂ اعمال داہنے ہاتھ میں دئے جاویں گے اور بدوں کے بائیں ہاتھ میں یہ نامۂ اعمال کا لایا جانا ایسا ہے جیسے عدالت میں مسل پیش کی جاتی ہے کہ اب اس کے موافق مقدمہ ہوگا اور جرح قدح ہوگی وجئ بالنبیین ترجمہ انبیا علیہم السلام کو بھی بلایا جاوے گا یہ ایسا ہے جیسے عدالت میں گواہ بلائے جاتے ہیں۔ وقضی بینہم بالحق وہم لایظلمون ط ترجمہ اور تمام فیصلے ٹھیک ٹھیک کئے جاویں گے اور کسی کا حق نہیں مارا جاویگا یعنی یہ نہیں ہوگا کہ کسی نے کوئی نیکی ذرا سی بھی کی ہو اور وہ نامہ اعمال میں نہ ہو یا کوئی بُرائی کسی نے نہ کی ہو اور وہ نامہ اعمال میں درج کر دی گئی ہو بلکہ بمقتضائے سبقت رحمتی علی غضبی ایسا ہوگا کہ ایک نیکی انسان نے نہ کی ہو اور نامہ اعمال میں درج ہو وہاں داد و دہش اور انعامات بہت ہوں گے بات بات پر رحمت ہوگی بعضوں کی بخشش صرف اتنی ہی بات پر ہو جاوے گی کہ راستہ سے انھوں نے ایک کانٹا ہٹا دیا تھا ایک عورت کی بخشش اس بات پر ہو جاوے گی کہ اُس نے ایک کتے کو دیکھا کہ کنوے کے کنارہ پر پیاس کے مارے گیلی مٹی چاٹ رہا ہے اُس کو رحم آیا اور اپنے چرمی موزہ کو اس نے اپنی اوڑھنی میں باندھ کر کنوے میں لٹکا کر پانی نکالا اور اس کو پلایا وہ عورت بدکار تھی لیکن حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اس نے ہماری مخلوق پر رحم کیا ہے لہذا ہم اس پر رحم کرتے ہیں یہ دونوں قصے حدیث میں آئے ہیں اور بکشوفات ایسے بہت ہیں مثلاً ایک شخص کا قصہ ہے کہ وہ نیکوکار اور پرہیزگار تھا اُس کا انتقال ہوگیا کسی نے خواب میں اُس کو دیکھا پوچھا کہئے کیا معاملہ ہوا کہا یہاں مجاہدے اور ریاضتیں تو کچھ کام نہیں آئیں (مطلب یہ ہے کہ ان میں کسر تھی اور وہ اس قابل نہ تھے کہ اُن پر بخشش کا استحقاق سمجھا جاوے یہ اس واسطے کہا گیا کہ کوئی یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ مجاہدہ وریاضت اور اعمال بیکار چیز ہیں ہرگز نہیں یہ ضرور کام کی چیزیں ہیں مگر ایسے اعمال کر کون سکتا ہے۔ جو دربار خداوندی میں پیش کئے جاسکیں اسواسطے کہا ہے ۵

مستحق رحمت

مستحق رحمت ہونے کا ایک عجیب واقعہ

بندہ ہماں بہ کہ ز تقصیر خویش عذر بدرگاہ خدا آورد
ورنہ سزاوار خداوندیش کس نتواند کہ بجا آورد

غرض اُس نے کہا کہ مجاہدے ریاضت تو کچھ کام نہیں آئے مگر حکم ہوا کہ جاؤ تم نے ایک دن ایک بلّی کے بچّہ پر رحم کیا تھا کہ وہ سردی سے کانپ رہا تھا تم نے اسکو لحاف میں لے لیا جاؤ تم کو ہم نے اس کی عوض میں بخشا آدمی کبھی کسی ادنی سے عمل کو بھی حقیر نہ سمجھے کیا خبر کس عمل کو حق تعالیٰ قبول فرمالیں اور بخشدیں حدیث میں ہے یا عائشۃ لا تستحقری طاعۃ ونحوہ یعنی اے عائشہؓ کسی نیک عمل کو حقیر نہ سمجھو الحاصل وہاں بات بات رحمت کا بہانہ ہوگی ہاں یہ نہ ہوگا کہ بلا کچھ کئے کسی کو پکڑ لیا جاوے یہ معنی ہیں۔ وہم لایظلمون کے یعنی کسی کا حق مارا نہیں جاوے گا۔ یہاں ایک طالب علمانہ شبہہ ہوسکتا ہے وہ یہ کہ حبط اعمال بالکفر ثابت ہے جا بجا نصوص میں وارد ہے اولئک حبطت اعمالہم وفی النار ہم خالدون ۵ ان ہولاءِ مُتَبَّرٌ مَّا ہم فیہ وباطل ما کانوا یعملون ۵ وقدمنا الیٰ ما عملوا من عمل فجعلناہ ہباءً منثوراً ۵ وغیرہا من الآیات۔ تو یہ کہاں صادق ہوا کہ کسی کی نیکی غارت نہ کی جاویگی میں کہتا ہوں کہ اس نے دنیا ہی میں خود اپنی نیکی کو غارت کردیا تھا قیامت کے دن اسکی نیکی غارت نہیں کی گئی اُس نے خود دنیا میں اپنے اختیار سے وہ فعل کیا ہے جسکی خاصیت سے دوسرے اعمال غارت ہوجاتے ہیں تو قیامت کے دن وہ خود ہی اپنے اعمال کو غارت کرکے لایا ہے نہ یہ کہ یہاں تو اُسکا عمل درست تھا اور وہاں پہونچکر غارت کیا گیا اسکی مثال ایسی ہے کہ ایک کمہار نے برتن بنائے مگر بناتا گیا اور توڑتا گیا اور فرض کیجئے کہ اُسکے واسطے ایک وقت مقرر تھا کہ اس وقت اُس کا کام ختم کردیا جاوے گا تو اس صورت میں جس وقت اُس کا کام ختم کیا جاوے گا ظاہر ہے کہ ایک برتن بھی اُس کے پاس نہ ہوگا گو اُس نے برتن بنائے ضرور ہیں تو اس حالت میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ کسی نے برتن اسکے توڑ ڈالے یا چھین لئے اس واسطے یہ خالی ہاتھ ہے بلکہ یہ کہا جائیگا کہ اس نے خود ہی کوئی برتن باقی نہیں رکھا یہی حالت کافر کی ہے کہ قیامت میں وہ اسواسطے خالی ہاتھ نہ ہوگا کہ کسی نے اس کی نیکیاں چھین لیں بلکہ وہ دنیا میں اُن کو خود ہی تباہ کرکے آیا ہے تو

حبط اعمال بوجہ کفر ثابت ہے

لایظلمون بالکل صادق ہے ایک شبہ تو یہ رفع ہوا ایک شبہ اور ہے وہ یہ کہ حدیث میں آیا ہے من سن سنۃ حسنۃ فلہ اجرہا واجر من عمل بہا ومن سن سنۃ سیئۃ فعلیہ وزرہا ووزر من عمل بہا او کما قال۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض گناہ انسان پر بلا کئے ہوئے بھی رکھے جائینگے مثلاً قابیل نے ہابیل کو مار ڈالا تھا تو حدیث میں آیا ہے کہ قیامت تک جو قتل بھی دنیا میں ہوتا ہے اس کا کچھ حصہ گناہ کا قابیل کو بھی پہونچتا ہے اسی طرح ہر اس گناہ کا حال ہے جس کی اقتداء دوسروں نے کی ہو تو سوال یہ ہے کہ اس نے کیا کیا تھا دوسروں کے عمل اس پر کیوں ڈالے جاتے ہیں یہ تو وہم لایظلمون کے خلاف معلوم ہوتا ہے جواب یہ ہے کہ اس نے کما کیا کیوں نہیں اس کی اقتداء سے جو گناہ بھی ہوتا ہے اس کا سلسلہ اس تک برابر ملا ہوا ہے اور اس کو ضرور اس گناہ میں دخل ہے اس کی مثال یہ ہے جیسے بچے اینٹوں کی ریل بنایا کرتے ہیں کہ پاس پاس دور تک اینٹیں کھڑی کرتے چلے جاتے ہیں پھر ایک کو گراتے ہیں اس سے دوسری اینٹ گرتی ہے اور دوسری سے تیسری اور تیسری سے چوتھی اسی طرح جہاں تک اینٹوں کا سلسلہ ہوتا ہے گرتی چلی جاتی ہیں اب فرض کر لیجئے کہ اخیر اینٹ کے سامنے ایک شیشی رکھی ہوئی ہے وہ اس اخیر اینٹ کے گرنے سے ٹوٹ گئی تو آپ کیا کہیں گے کیا اس کا جرم اس شخص پر جس نے پہلی اینٹ گرائی ہے عائد کریں گے یا نہیں ظاہر ہے کہ ضرور عائد کریں گے حالانکہ وہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے تو وہ اینٹ نہیں گرائی جس سے شیشی ٹوٹی ہے میں نے تو ایک وہ اینٹ گرائی تھی جو شیشی سے بہت دور تھی اس لئے شیشی توڑنے کا الزام میرے اوپر لگانا بلا وجہ ہے اور ظلم ہے کیونکہ جو کام میں نے نہیں کیا وہ میرے ذمہ لگایا جاتا ہے اس کا جواب آپ بھی دیں گے کہ جب تجھے معلوم تھا کہ یہ اینٹیں اس طرح کھڑی ہیں کہ ایک کے گرانے سے یکے بعد دیگرے سب گر جائینگی حتی کہ آخر اینٹ شیشی پر گرے گی پھر جب تو نے ایک اینٹ کو گرایا تو ضرور تو نے ہی شیشی کو قصداً توڑا اسی طرح جب ایک شخص نے گناہ کیا اور وہ جانتا تھا کہ یہ فعل مضر ہے اور دوسرے اس کی اقتداء کریں گے تو وہ قصداً اور اختیاراً ہر اُس گناہ کا جو اُس کی اقتداء سے ہوگا سبب بنا تو اب اگر اس کے

من سن سنۃ سیئۃ پر شبہ کرنا وہ گناہ کیوں کر لاد دیا جاتا ہے۔

نامۂ اعمال میں دوسرے اقتداء کرنے والوں کی وجہ سے بھی گناہ لکھا گیا تو بے کئے نہیں لکھا گیا بلکہ اس کا کیا ہوا گناہ لکھا گیا اس سے دوسرا شبہہ بھی رفع ہو گیا یہ درمیان میں دو شبہوں کا ازالہ ہو گیا اصل بیان یہ تھا کہ قیامت کے دن یہ تو ہو گا کہ بعض نیکی بدون کئے ہوئے نامہ اعمال میں لکھی ہوئی ملیں گی اور یہ نہ ہو گا کہ کوئی نیکی کی ہو اور وہ نامۂ اعمال میں لکھی ہوئی نہ ملے یہ شان رحمت ہے کہ عدل کا معاملہ نہیں فرمایا بلکہ فضل کا معاملہ کیا جائیگا ورنہ یہ ہوتا کہ جیسے کی ہوئی نیکی نامۂ اعمال میں درج ہونے سے نہ رہتی ایسے ہی کوئی نیکی بلا کئے ہوئے درج بھی نہ کی جاتی جس سے نہ نیکی بڑھتی نہ گھٹتی اور آیت اس معاملہ رحمت کی نفی نہیں کرتی اسی طرح نیکی کے مضاعف ہونے کی بھی نفی نہیں کرتی کیونکہ آیت میں لایظلمون کا لفظ ہے اس سے یہ مدلول ہے کہ کسی کی حق تلفی نہیں کی جائیگی اور اس سے یہ نہیں لازم آتا کہ حسنات میں کچھ اضافہ بھی نہیں کیا جائیگا کیونکہ دلائل سے ثابت ہے کہ قیامت میں حسنات میں اضافہ ہو گا بیان اس کا یہ ہے کہ معاملات جزائیں قسم کے ہو سکتے ہیں ظلم اور عدل اور رحمت ظلم یہ ہے کہ کسی کا حق مار لیا جائے اور اس کی کی ہوئی نیکیوں کا اجر نہ دیا جائے اور عدل یہ ہے کہ گناہوں کی سزا دی جائے اور نیکیوں کا اجر برابر سرابر دیا جائے اور رحمت یہ ہے کہ گناہوں کو نظر انداز کیا جائے اور نیکیوں کا اجر بڑھا دیا جائے حق تعالیٰ بندوں پر ظلم تو کیا کرتے عدل کا برتاؤ بھی نہیں کریں گے بلکہ بہت سے گناہوں کو عفو فرما دیں گے اور نیکیوں کا ثواب قانون سے بہت زیادہ دینگے کہ ایک نیکی دس نیکی کی برابر تو ضرور ہی ہو گی بلکہ حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن مومنین کے ساتھ یہ برتاؤ ہو گا کہ ان کو بعض وہ نیکیاں نامہ اعمال میں لکھی ہوئی ملیں گی۔ جو انھوں نے کی بھی نہیں تھیں اور گناہوں کی بعض کے ساتھ یہ حالت ہو گی کہ اول بندہ کے سامنے چھوٹے گناہ پیش کئے جائیں گے اور بڑے پیش بھی نہیں کئے جائیں گے پھر اُن چھوٹوں کی نسبت بھی یہ حکم ہو گا کہ ان کو معاف کر دو اور ان کو نیکی سے بدل دو اب کیا ہے اس وقت یہ حالت ہو گی کیا تو ڈر رہا تھا کہ کہیں بڑے گناہ پیش نہ ہوں اور یا جب گناہوں کی عوض نیکیاں ملتی دیکھی تو خود کہے گا کہ میں نے

تو اور بھی بڑے بڑے گناہ کئے تھے وہ کہاں ہیں ان کو مجھے کیوں نہیں ظاہر کیا گیا اور اس سے غرض یہ ہوگی کہ جب چھوٹے چھوٹے گناہوں کی جگہ یہ نیکیاں ملی ہیں تو بڑے گناہوں پر ان سے بڑی نیکیاں ملیں گی اس امید میں بے ساختہ کہنے لگے گا کہ میرے بڑے گناہ کہاں گئے سبحان اللہ کچھ حد ہے رحمت کی اور یہ بھی ہوگا کہ بعضے گناہ وہ ہونگے جو بندہ نے کئے تھے لیکن وہ نامہ اعمال میں لکھے ہوئے نہ ہوں گے پہلی قسم تو وہ تھی کہ گناہ نامہ اعمال میں لکھے ہوئے تھے مگر پیش نہیں کئے گئے اور یہ قسم وہ ہے کہ گناہ نامۂ اعمال میں لکھے ہوئے ہی نہیں ہیں یہ وہ گناہ ہیں جن سے توبہ کر لی گئی ہے اور اہل سنت کی تحقیق تو یہ ہے کہ بلا توبہ بھی عفو ہو سکتا ہے کہ ممکن ہے کہ کسی گناہ سے توبہ بھی نہ کی ہو اور حق تعالیٰ نے محض اپنی طرف سے اسکو معاف کر دیا ہو غرض کس قدر رحمت ہے کہ بہت سے گناہ جو کئے گئے تھے وہ نامہ اعمال میں نہ ہوں گے اور بہت سی نیکیاں جن کو بندہ نے کیا بھی نہیں وہ نامہ اعمال میں موجود ہوں گی یہ شان رحمت ہے جو عدل سے بالاتر ہے اور ظلم کا تو ذکر ہی کیا آگے فرماتے ہیں۔ ووفیت کل نفس ما عملت وہو اعلم بما یفعلون۔ قران کا کیا نظم ونسق ہے کہ ایک ہی آیت میں ترغیب بھی ہے اور ترہیب بھی ہے اس جملہ کا ترجمہ یہ ہے کہ ہر شخص کو اُس کے اعمال کی جزا پوری پوری دیجائیگی اور حق تعالیٰ کو ہر ہر فعل کا علم ہے اس میں ذرا ڈرا بھی دیا کہ گو ہم یہ تاؤ بھی کرینگے کہ کسی کی حق تلفی نہیں کرینگے اور پورا پورا اجر دیں گے لیکن ہم کو علم سب اچھے بُرے اعمال کا ہے حاکم کا یہ کہنا کہ جو کچھ تم کر رہے ہو ہم جانتے ہیں اس میں یہ اثر ہے کہ سننے والے اس سے کانپ اُٹھتے ہیں اوپر چونکہ ترغیب انتہاء درجہ کی تھی اسواسطے ذرا سی ترہیب بھی شامل کر دی تاکہ تعدیل ہو جائے اب سمجھئے کہ یہاں تک جزاؤ سزا کا بیان اجمالی تھا اب اس تمام قصے کا نتیجہ بطور تفصیل بیان فرماتے ہیں۔ وسیق الذین کفروا الی جہنم زمراً۔ اسکا ترجمہ یہ ہے کہ ہنکائے جائیں گے کفار جہنم کی طرف جماعتیں جماعتیں سوق کے معنی ہیں زبردستی چلانا اس سے یہ معنی ادا ہوتے ہیں کہ کفار اپنے قصد و اختیار سے جہنم میں نہیں جائیں گے بلکہ جبراً ڈھکیل کے لیجائے جائیں گے جیسے جانوروں کو

بلا توبہ بھی عفو ہو سکتا ہے۔

مار مار کے لے چلتے ہیں اسیطرح فرشتے ان کے پیچھے ہونگے اور دھکیل دھکیل کے لیجاتے ہونگے کہ چلو چلو یہ معنی مفسرین نے لکھے ہیں زمرا کے معنی ہیں جماعت جماعت یعنی کفار کی جماعتیں ہونگی بڑے کفار آگے ہوں گے اور اُن سے چھوٹے اُن کے پیچھے اور اُن سے چھوٹے اُن کے پیچھے دیکھئے شان عدل دوزخ میں بھی ظاہر ہوگی کہ کفار میں بھی بقدر مراتب کفر فرق رکھا جائیگا اس کا بیان دوسرے آیت میں اس طرح ہے۔ ثم لننزعن من کل شیعۃ ایہم اشد علی الرحمٰن عتیا فرماتے ہیں کفار کی ہر جماعت سے بھی ہم اُن کو الگ چھانٹ لیں گے جو کفر میں اشد تھے اس سے بھی معلوم ہوا کہ کفار کی جماعتیں ہوں گی اور یہ تفصیل بھی معلوم ہوئی کہ بڑے بڑے کفار الگ ہوں گے اور چھوٹے الگ یہی حاصل ہے زمرا کا اور کفار کی سزائیں بھی جو دوزخ کے اندر ہوں گی علی قدر مراتب متفاوت ہوں گی گو خلود سب کو ہوگا کیا شان ہے کہ کفر پر بھی سزا دیتے ہیں تو عدل سے دیتے ہیں۔ حتیٰ اذا جاؤہا فتحت ابوابہا۔ ترجمہ۔ یہاں تک کہ کفار جب دوزخ کے پاس پہونچ جاویں گے تو دوزخ کے دروازے کھولے جاویں گے لوگوں نے اس سے استنباط کرکے لکھا ہے کہ دوزخ کے دروازے بند رہتے ہیں اور اس وقت کھولے جائیں گے جب کفار اس کے پاس پہونچ جائیں گے اس میں نکتہ یہ لکھا ہے کہ اس کی گرمی قوی رہے تنور اگر ڈھک دیا جائے تو اس کی گرمی زیادہ ہوجاتی ہے بہ نسبت اس کے کہ کھلا رہے دوزخ مدتوں سے بند ہوگا تاکہ اس وقت دروازے کھلنے سے ایک دم بھپکا نکلکر جُھلس دے ایک گرمی آگ کی اور ایک حبس کی اور دونوں سے سزا مقصود ہے حق تعالیٰ کے یہاں کی چیز بڑی ہے عذاب بھی ہے تو ایسا ہے کہ اسمیں کوئی کسر تعذیب میں نہیں رہیگی یہ نکتہ تو لوگوں نے بیان کیا ہے اور دوزخ کے دروازے بند ہونے میں ایک نکتہ اور بھی ہوسکتا ہے اور جس سے اسکے متغائر معنی پیدا ہوتے ہیں کیونکہ نکتۂ اولیٰ کا حاصل یہ ہے کہ یہ بیان ہے شان تعذیب کا اور اس نکتہ ثانیہ کا حاصل یہ ہے کہ یہ بیان ہے شان رحمت کا وہ نکتہ ہے کہ دوزخ کے دروازے اسواسطے بند ہوں گے کہ یہ دکھلا دیا جاویگا کہ دیکھو ہماری طرف سے اتنی گنجائش دی جاتی ہے کہ پاس پہونچنے تک بھی شاید کسی کو کوئی ٹوٹا پھوٹا ذریعہ نجات کا ملجاوے ذرہ برابر ایمان بھی نکل آوے تو وہ

نج جاوے اور جب دروازہ تک پہونچنے پر بھی کوئی ذریعہ نجات کا بہم نہ پہونچا تو اب مجبوری ہے اتمام حجت ہو چکا اور کہا جا سکتا ہے کہ ہم نے تو دوزخ سے دور رکھا جہاں تک ہو سکتا تھا بچایا اور پھاٹک بند رکھا مگر کوئی ذریعہ رحمت کا ان کے پاس تھا ہی نہیں اب پھاٹک کھولا جاتا ہے اور ان کو داخل کر دیا جاتا ہے۔ وقال لہم خزنتہا الم یاتکم رسل منکم یتلون علیکم آیات ربکم وینذرونکم لقاء یومکم ہذا۔ ترجمہ۔ اور دوزخ میں جانے والوں سے خزنۂ جہنم کہیں گے کیا تمہارے پاس تمہارے ہی جنس کے رسول نہیں آئے تھے جو تمہارے سامنے حق تعالیٰ کی آیتیں پڑھتے تھے (یعنی احکام الٰہی سناتے تھے) اور اس دن کے دیکھنے سے ڈراتے تھے یہ بھی اتمام حجت ہے کہ ان سے اقرار بھی لیلیا جاوے تاکہ وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ ہم پر ظلم ہوا اور اس میں اول یا دولایا پیغمبروں کے آنے کو جسکا حاصل یہ ہوا کہ اسباب ہدایت مہیا تھے مگر افسوس ہے کہ تم نے ان اسباب سے کام نہیں لیا پھر کہتے ہیں منکم یعنی وہ رسول کوئی غیر نہیں تھے تمہارے ہی بھائی بند تھے یعنی فرشتے یا جن نہیں تھے بلکہ از جنس انسان تھے جن سے بوجہ مجانست کے بہت نفع کی امید تھی یہ بھی حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو ہم ہی میں سے بھیجا کیونکہ مناسبت ہوتی ہے مجانست سے اور نفع موقوف ہے مناسبت پر تو اگر انبیا علیہم السلام ہمارے مجانس نہ ہوتے تو اُن سے اتنا نفع نہ ہوتا یہ عین رحمت ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو ہمارا ہم جنس پیدا کیا یہی وجہ ہے کہ اُن کو ہمپر غایت درجہ کی شفقت ہوتی ہے اگرچہ اتمام حجت کے لئے یہ بھی کافی تھا کہ دنیا میں ایک فرشتے کو بھیج دیتے کہ وہ احکام الٰہی سنا دیتا بلکہ اتنا بھی کافی تھا کہ کتاب لکھی ہوئی اُتار دیتے کہ لوگ اُس میں احکام الٰہی دیکھ لیتے بس تبلیغ ہو جاتی اور اس پر دار و گیر ہو سکتی مگر ایسا نہیں کیا یہ کس قدر رحمت ہے اس کی مثال یہ ہے کہ ایک طبیب تو مریض کو ضابطہ کی حد میں کیف ما تفق دوا بتا دیتا ہے اس کا لحاظ نہیں کرتا کہ کڑوی ہے یا میٹھی اور ایک طبیب ایسا شفیق ہے کہ دواؤں میں سے بھی وہ دوا بتاتا ہے جو بدمزہ نہ ہو بلکہ شربت بنا کر پلاتا ہے تو حق تعالیٰ نے اپنے احکام اس طرح بھیجے ہیں گویا ہم کو شربت بنا کر پلایا ہے چنانچہ انبیاء علیہم السلام کو جنس انسان ہی سے پیدا کیا جس کا اثر

انبیاء علیہم السلام کے از جنس انسان ہونے کی وجہ

یہ ہے کہ انھوں نے صرف ضابطہ کی تبلیغ نہیں کی تبلیغ بھی کی اور ہدایت کے لئے دعا بھی کی اور دل وجان سے توجہ بھی کی انبیا علیہم السلام محض منادی نہیں تھے بلکہ تربیت کنندہ اور اتالیق بھی تھے۔ کہ احکام الٰہی کو پہونچایا اور اُنپر خود عمل کرکے دکھایا اور نمونہ قائم کیا اور بات بات پر نگرانی کرکے درست کر دیا بلکہ اتالیق بھی نہیں یوں کہنا چاہئے کہ امت کے باپ تھے کہ ہر وقت اُن کو اُمت کی اصلاح ہی کی فکر رہتی تھی جیسے باپ اولاد کے پیچھے کھپ جاتا ہے اور یہی چاہتا ہے کہ ان میں کوئی کسر نہ رہے انبیاء علیہم السلام نے تبلیغ بھی کی اصلاح کی تدبیریں بھی کیں اور دعائیں بھی کیں یہ بات اُس صورت میں ہرگز نہ پیدا ہوتی کہ انبیا علیہم السلام غیر جنس ہوتے غرض منکم کا لفظ اسپر دلالت کرتا ہے کہ ایسے پیغمبر آئے تھے جو تمھارے اوپر نہایت شفیق تھے اور انھوں نے کوئی دقیقہ تمھارے خیر خواہی میں اُٹھا نہیں رکھا اب تمھارے پاس کیا عذر ہے اور یتلون مضارع کا صیغہ لایا گیا ماضی کا صیغہ نہیں لایا گیا کیونکہ مضارع کا صیغہ تکرار پر دلالت کرتا ہے کیا معنی کہ اُنھوں نے صرف ایک دفعہ تبلیغ کرکے نہیں چھوڑ دیا بلکہ بار بار قبل تبلیغ کی ینذرونکم یعنی اس دن کی پیشی سے تم کو ڈراتے تھے کہ خدائے احکم الحاکمین کے سامنے جوابدہی کرنا ہوگی اور اُس وقت کوئی عذر وحیلہ نہ ہوگا اور الم یاتکم بعینہٖ استفہام لایا گیا بجائے اتاکم کے کیونکہ اتاکم میں صرف اخبار ہوتا جو مقتضی جواب کو نہیں ہوتا اور استفہام مقتضی جواب کو ہوتا ہے ظاہر ہے کہ ایک تو یوں کہا جاوے کہ تمھارے پاس ہمارا پروانہ پہونچا تھا اور تم نے اُس کی تعمیل نہیں کی اور ایک یوں کہا جاوے کہ کیا تمھارے پاس پروانہ نہیں پہونچا تھا اسکا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اول اسکا جواب دو جب وہ جواب دے گا کہ حضور پہونچا تھا اُس کے بعد اُس پر یہ الزام متوجہ ہوگا کہ باوجود پروانہ پہنچنے کے تم نے تعمیل حکم کیوں نہیں کی غرض استفہام مقتضی جواب کو ہوتا ہے اس کا فائدہ یہ ہے کہ وہ اعتراف کرلیں اور اقراری مجرم ہوجاویں اور یہ کہنے کی گنجائش نہ رہے کہ ہم کو صرف شہادت سے سزا دی گئی چنانچہ اس استفہام کے جواب میں وہ اقرار کرینگے قالوا بلیٰ کہیں گے ہاں پیغمبر بیشک آئے تھے ولکن حقت کلمت العذاب علی الکفرین مگر ہمارے قسمت ہی میں عذاب لکھا تھا اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسئلہ جبر سے

تمسک کریں گے اور اس طرح اپنی برأت کریں گے کہ ہمارا قصور نہیں کیونکہ ہماری قسمت میں ازل سے یہی لکھا گیا تھا جس کے آگے ہم مجبور محض تھے کیونکہ مسئلہ جبر جو خلاف واقعہ ہے اور وہ اس لفظ کو قیامت میں کہیں گے جہاں انکشاف حقائق ہو چکا ہوگا اصل یہ ہے کہ یہ کلمہ حسرت کا ہے گو عنوان جبر کا ہے اس کی مثال ہمارے محاورہ میں یہ ہے کہ کسی سے کوئی فاش غلطی ہو جاوے اور اُس کی وجہ سے نقصان عظیم اُٹھاوے تو وہ اس غلطی سے پچھتاتا ہے اور جب لوگ اُس سے کہتے ہیں کہ تجھے کیا سوجھا تھا جو ایسا کام کر بیٹھا تو وہ نہایت درجہ ندامت اور حسرت سے کہتا ہے ارے میاں قسمت ہی پھوٹ گئی یہاں بھی ظاہر میں اُس کے وقوع کو قسمت کی طرف منسوب کیا گیا ہے مگر مطلب یہ نہیں ہے کہ مسئلہ جبر سے تمسک کرتے ہیں ورنہ یوں کہتے ارے میاں مجھ سے کیا قصور ہوا قسمت میں یہی تھا میں کیا کرتا ان الفاظ کی بندش اور لہجہ بتاتا ہے کہ حسرت کا کلمہ ہے اسی طرح ولکن حقت کلمۃ العذاب علی الکفرین ہے کہ اُس سے مقصود اپنے فعل کو تقدیر پر حوالہ کرنا نہیں ہے بلکہ صرف اظہار حسرت ہے قیل ادخلوا ابواب جہنم خالدین فیہا کہا جائیگا یعنی فرشتے کہیں گے اچھا دوزخ میں چلو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ادخلوا صیغۂ امر ہے جو چاہتا ہے استقبال کو جس کے معنی یہ ہوئے کہ اس جواب کے بعد دخول ہوگا اور یہ حکم اُس گفتگو کے بعد ہوگا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکالمہ اہل دوزخ اور فرشتوں میں جہنم کے دروازہ سے باہر ہوگا گو آیت میں کوئی لفظ قطعی الدلالت ایسا نہیں ہے جس سے کہا جاوے کہ یقیناً اور قطعاً یہ مکالمہ خارج جہنم ہی ہوگا لیکن الفاظ اور ترتیب سے صراحتہً یہی معلوم ہوتا ہے اور کوئی قرینہ اسکے خلاف پر موجود نہیں لہذا یہی کہا جاویگا کہ یہ مکالمہ خارج جہنم ہی ہوگا تو کیا عدل ہے کہ سزا سے پہلے مجرم سے اقرار لیلیا اور کوئی حجت اُس کی باقی نہیں رکھی ابواب جہنم کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل جہنم کا دخول جہنم میں دروازوں سے ہوگا یہاں حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے استدلال کیا ہے اور یہ مضمون اسی آیت کے تحت میں لکھا ہے یا سورۃ حدید میں لکھا ہے کہ پل صراط پر کفار سے عبور نہیں کرایا جاویگا بلکہ پل صراط پر صرف مومنین اور منافقین اُتارے جاویں گے کیوں کہ پل صراط کے بارہ میں وارد ہے کہ وہ ایک پل ہے جو جہنم کے اوپر بچھایا جاوے گا اور

تنبیہ عبدالقادر کا قول کہ کفار پل صراط پر نہ اتارے جاویں گے

اُس پر چلنے والے بعضے پار اوتر جاویں گے (وہ مومنین ہوں گے) اور بعضے پار نہ اُتر سکینگے بلکہ کٹ کر دوزخ کے اندر گر پڑیں گے پس اگر کہا جاوے کہ وہ کٹ کر گرنے والے عام کفار ہوں گے تو اُن کے متعلق یہ مضمون کہاں صادق ہوگا ادخلوا ابواب جہنم کیونکہ اوپر سے گرنے والے کو داخل من الوسط کہا جا سکتا ہے داخل من الابواب نہیں کہا جا سکتا ہاں ایک گروہ کفار کا بھی ایسا ہوگا جو صراط پر اُتارا جاویگا اور وہ منافقین کا گروہ ہے اور نکتہ اسمیں یہ ہے کہ صراط جنت کی سڑک ہے کہ اُس سے عبور کر کے جنت میں جا سکیں گے تو اس پر چلنے کے مستحق وہی ہو سکتے ہیں جو جنت میں جانیکا ارادہ رکھیں اور وہ مؤمنین ہیں یا وہ جن میں شبہہ ہے مومنین کا یعنی مشابہت ہے مؤمنین کے ساتھ اور وہ منافقین ہیں جو زبان سے مدعی ہیں مؤمن ہونے کے مومنین تو حقیقۃً جنّت کے مستحق ہیں اور منافقین صرف ظاہراً و ادعاً چنانچہ اس کا اثر یہ ہوگا کہ مومنین عبور کر جاویں گے اور منافقین کٹ کر جہنم میں گر جاویں گے یہ خلاصہ ہے شاہ صاحب کے تحقیق کا کہ کافر محض جس نے زبان سے بھی ایمان ظاہر نہیں کیا پل صراط پر نہیں چلایا جائیگا بلکہ یہ لوگ ابواب جہنم سے داخل کئے جائیں گے پل صراط پر صرف مومنین چلائے جائیں گے خواہ وہ حقیقی مومن ہوں یا ادعائی خالدین فیہا حال مقدرہ ہے ادخلوا کی ضمیر اُنتم سے مطلب یہ ہوا کہ جہنم میں جاؤ اس حال میں کہ خلود تمھارے واسطے تجویز شدہ ہے۔ فبئس مثوی المتکبرین۔ ترجمہ پس وہ بُری ہے جگہہ متکبرین کی۔ یہاں یہ بات قابل غور کرنے کے ہے کہ متکبرین سے مراد کون لوگ ہیں ظاہر ہے کہ وہی کفار مراد ہیں جن کو دروازۂ جہنم سے داخل کیا جائیگا کیونکہ اُن ہی سے خطاب ہو رہا ہے نیز سب جانتے ہیں کہ دوزخ کفار ہی کی مستقل جگہہ ہے گنہگار مسلمانوں کے لئے جہنم مثوی نہیں ہے عارضی جیلخانہ ہے تو ان ہی کو اوپر کفار کہا گیا ہے وسیق الذین کفروا میں اور ان ہی کو یہاں متکبرین کہا گیا اور ظاہر ہے کہ اگر چور کو سزا دیجائے اور یوں کہا جائے کہ چور کی یہ سزا ہے تو علت سزا کی چوری ہی ہوگی اسی طرح جب کہا گیا وسیق الذی کفروا الی جہنم زمرا۔ یعنی کفار جہنم کی طرف ہنکائے جاویں گے تو جہنم میں جانے کی علت کفر ہی کو کہا جاوے گا اور جب کہا گیا فبئس مثوی المتکبرین

تو اس بڑے ٹھکانے پانے کی علت تکبر ہی کو کہا جاویگا اور دونوں جگہ مجرم ایک ہی گروہ ہے تو حاصل یہ نکلا کہ اُس گروہ کی اس سزا کی یعنی دخول جہنم کی علتیں دو بیان ہوئیں کفر اور تکبر اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ دونوں ایک جز ہیں یعنی ایک مفہوم کے دو نام ہیں جیسے اسد بھی شیر کو کہتے ہیں اور لیث بھی اُسی کو کہتے ہیں یا دونوں الگ الگ چیزیں ہیں اور ان میں سے ہر ایک علت ہے دخول جہنم کی غرض ان دونوں میں کیا علاقہ ہے تو سمجھ لیجئے کہ دونوں مفہوم کے لحاظ سے تو ایک نہیں ہیں کیونکہ کفر اور تکبر کو کسی نے مرادف نہیں کہا باعتبار مفہوم لغوی کے دونوں علٰحدہ چیزیں ہیں تو اب یہ کہا جاویگا کہ دونوں علٰحدہ علٰحدہ علتیں ہیں دخول جہنم کی لیکن ان دونوں میں ہر ایک مستقل علت نہیں ہے بلکہ ایک علت ہے اور ایک علت العلت بیان اس کا یہ ہے کہ علت جس سے مراد سبب ہے دو قسم پر ہے ایک سبب اور ایک سبب السبب جیسے امتلاء عروق بھی سبب ہے حمیٰ کا اور عفونت اختلاط بھی سبب ہے حمیٰ کا لیکن عفونت سبب ہے اور امتلا سبب السبب ہے امتلاء سے عفونت پیدا ہوتی ہے اور عفونت سے حمیٰ پیدا ہوتا ہے پس امتلاء اور عفونت دونوں کو سبب حمیٰ کہہ سکتے ہیں لیکن واقع میں سبب عفونت ہے اور امتلا سبب السبب ہے اسیطرح کفر اور تکبر دونوں کو سبب کہہ سکتے ہیں۔ دخول جہنم کا لیکن درحقیقت دخول جہنم کا سبب قریب کفر ہے اور تکبر سبب السبب ہے یعنی تکبر سبب ہے کفر کا جو سبب ہے دخول جہنم کا اسوجہ سے قرآن میں کہیں تکبر کو علت قرار دیا ہے دخول جہنم کے لئے اور کہیں کفر کو اور غور سے دیکھا جاوے تو یہ بالکل واقعی بات ہے کہ کفر اور تکبر میں اصل تکبر ہی ہے اور کفر تکبر کا نتیجہ اور فرع ہے اور کفار کو جہنم میں جو لیجاوے گا تو تکبر ہی لیجاویگا اس لحاظ سے دخول جہنم کے محل میں بئس مثویٰ المتکبرین کہنا بالکل برمحل ہے جو لوگ کفر میں مبتلا ہیں وہ اس وجہ سے مبتلاء کفر نہیں ہیں کہ حق بات اُن کو معلوم نہیں ہوتی اور غلطی سے اس بلا میں پڑ جاتے ہیں بلکہ وجہ یہ ہوتی ہے کہ اُن کو حق بات کے قبول کرنے میں کسی سے جھوٹا بننا پڑتا ہے اس واسطے باوجود حق کو جاننے کے اُس کو قبول نہیں کرتے حق بات اول تو عقل ہی سے معلوم ہو جاتی ہے لیکن اس کو اگر کافی نہ کہا جاوے تو حق تعالےٰ

کفر سبب ہے دخول جہنم کا اور تکبر سبب السبب ہے۔

کی یہ بھی رحمت ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو بھیجکر اُس کو اچھی طرح سمجھا دیا ہے، ایسا کہ اس میں کوئی خفا باقی نہیں رہا اور انبیاء علیہم السلام کے بعد علما کے ذریعہ سے اُس کو بالکل آشکارا کر دیا ہے موٹی بات ہے کہ حجت میں کوئی فریق اہل حق سے کبھی نہیں جیت سکا جب اہل حق ہمیشہ غالب رہتے ہیں تو اُس کو قبول نہ کرنے کی کونسی وجہ اور اُسکے مقابل باطل کو قبول کرنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے بجز تکبر کے کچھ بھی وجہ نہیں کیونکہ اوپر کی تقریر سے جب صاف ظاہر ہو گیا کہ کفار کا باطل کو اختیار کرنا اس وجہ سے نہیں کہ حق بات میں کچھ خفا ہے تو معلوم ہوا کہ باوجود وضوح کے قبول حق سے کوئی اور ہی مانع ہے وہ مانع سوائے عار کے کچھ نہیں ہے کسی کو اس سے عار ہوئی کہ آبا اجداد کے خلاف کیسے نیا دین قبول کریں کسی کو اس سے عار ہوئی کہ ایک معمولی اپنے ہی ہمجنس آدمی کے کہنے سے نئی بات کیسے مان لیں چنانچہ قرآن میں بعض کا قول نقل فرمایا گیا ہے ولئن اطعتم بشرا مثلکم انکم اذا لخاسرون اور بعض کو اس سے عار ہوئی کہ ہم معمولی لوگوں کی برابر کیسے بنیں چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کا قول حق تعالیٰ نے نقل کیا ہے قالوا انؤمن لک واتبعک الارذلون۔ یعنی ہم تمہارا کہنا کیسے مان لیں حالانکہ تمہارے متبعین تو معمولی لوگ ہیں۔ کوئی بڑے مالدار اور رؤسا تمہارے پیرو نہیں یہ حماقت دیکھئے کہ قبول اور ریاست کو اتباع حق کا مدار قرار دیا حالانکہ غور کر کے دیکھئے تو جتنے شرور ہیں وہ ان ہی لوگوں سے شروع ہوتے ہیں جو مالدار ہیں اور امور خیر میں ہمیشہ غربا ہی سبقت کرتے ہیں اس قوم کو قبول حق سے یہ عار مانع ہوا کہ ہم معمولی لوگوں کی برابر کیوں بنیں اور اگر کوئی دلیل اُن کے پاس ہوتی تو حضرت نوح علیہ السلام کے مقابلے میں اُسکو ضرور پیش کرتے معلوم ہوا کہ دلیل تو کچھ نہ تھی حق واضح ہو چکا تھا لیکن یہ ہی عار مانع تھی اور کہاں تک حق واضح نہ ہوتا حضرت نوح علیہ السلام تقریباً ایک ہزار برس اپنی قوم میں رہے اس طویل مدت میں اُنھوں نے کونسا دقیقہ اظہار حق میں چھوڑ دیا ہوگا غرض وہ چیز ہے جو کبھی چھپتا ہی نہیں مینے ایک مکتوب حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کا دیکھا ہے جو بیاور ضلع اجمیر کسی کو لکھا تھا اُس مکتوب

قبول حق سے مانع صرف عار ہے

مولانا محمد یعقوب صاحب کا مکتوب

میں یہ الفاظ تھے کہ حق وہ ہے جو مدلول ہو نص کا بلا کلفت مطلب یہ ہے کہ جو لوگ آپس میں کسی بات میں جھگڑتے ہیں ایک فریق کہتا ہے کہ قرآن سے یہ ثابت ہے اور دوسرا فریق کہتا ہے کہ یہ ثابت ہے تو اس میں قول فیصل یہ ہے کہ اپنے اغراض اور خیالات کو الگ کرکے اور ان سے بالکل قطع نظر کرکے دیکھو کہ نص قرانی کا مدلول بلا کلفت کیا ہے جسمیں ایچ پیچ اور تکلف اور تاویل کی بالکل ضرورت نہ ہو بس وہی حق ہے وہ اپنے خیال کے موافق ہو یا مخالف مطلب یہ ہے کہ حق تو چھپتا ہی نہیں اُس کو قصداً اغراض اور تاویلوں سے چھپایا جاتا ہے خلاصہ یہ ہے کہ جو کوئی بھی کفر اختیار کرتا ہے اُسکی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ حق اُس سے پوشیدہ رہا حق تو پوشیدہ رہنے کی چیز ہی نہیں حق ضرور واضح ہو جاتا ہے لیکن عار سبب ہوتی ہے کفر کا اور عار کی حقیقت تکبر ہے تو تکبر سبب ہوا کفر کا اب تکبر اور کفر دونوں میں علاقہ معلوم ہو گیا وہ یہ کہ تکبر سبب ہے کفر کا اور کفر سبب ہے دخول جہنم کا تو تکبر بھی سبب ہوا دخول جہنم کا لیکن بواسطہ یعنی سبب السبب ہوا اور بنا بر تقریر مذکور متکبرین کے لفظ میں اشارہ ہے تمام عقائد اور اخلاق کی اصلاح کی ضرورت کی طرف کیونکہ استقراء سے تمام خرابی عقائد کی و اخلاق کی تکبر ہی سے پیدا ہوتی ہے اور یہی تکبر اصل ہے ہر ذمیمہ کی اور تکبر کا نتیجہ بیان کیا گیا دخول جہنم تو اس میں ہر بُرے عقیدہ اور ہر ذمیمہ کی بُرائی آگئی اس کی مثال یہ ہے کہ کہا جاوے کہ میٹھا کھانے سے خون میں گرمی پیدا ہوتی ہے تو اسمیں گڑ بھی آگیا جو جڑ ہے مٹھائیوں کی اور جلیبی بھی آگئی اور قلاقند بھی چنانچہ سب جانتے ہیں کہ تکبر ہی سبب ہوا ہے ابلیس کے کفر کا اور اس کے ملعون ہونے کا تو خیال کرنے کی بات ہے کہ لوگ کفر سے تو بچتے ہیں اور اُس کے نام سے بھی ڈرتے ہیں جو ایک شاخ ہے کبر کی اور کبر سے نہیں بچتے اور اس سے نہیں ڈرتے حالانکہ وہ اصل ہے کفر کی حیرت ہے کہ شاخ سے تو ڈرا جائے اور جڑ سے نہ ڈرا جائے یہ ایسا ہوا جیسے کوئی جلیبی اور قلاقند سے تو بچے لیکن گڑ خوب کھاوے۔ کبر دلوں کے اندر ایک چنگاری ہے جو راکھ سے دبی ہوئی رکھی ہے اسکا انتظار نہ کیجئے کہ جب وہ ظاہر ہو گی اور آگ بھڑک اُٹھے گی اُس وقت بجھالیں گے کیونکہ جس وقت آگ بھڑک اُٹھتی ہے پھر کسی کے بس میں نہیں آتی

تکبر کے اندر اشارہ ہے ہر قسم کی اصلاح کی طرف

کبر دلوں کے اندر ایک چنگاری ہے

مال اور اسباب کو تو جلاتی ہی ہے بجھانے والے کو بھی لپیٹ لیتی ہے۔ آگ سے زیادہ چنگاری سے حفاظت کیجئے کیونکہ آگ کی طرف تو التفات ہوتا بھی ہے اور آدمی اُس سے ہوشیار ہو ہی جاتا ہے مگر چنگاری کی طرف التفات کم ہوتا ہے اور وہ دبے ہی دبے اپنا کام کر جاتی ہے تو اس کا انتظار کیوں کیا جائے کہ جب کفر تک نوبت آئے کی اُس وقت تکبر کا علاج کرلیں گے پہلے ہی سے اس کی تدبیر کیوں نہ کی جائے تاکہ کفر تک نوبت ہی نہ آئے مولانا کہتے ہیں ؎

علت ابلیس انا خیر منہ بد است ایں مرض در نفس ہر مخلوق ہست

اس سے مراد ابلیس کا وہ لفظ ہے جو اُس نے اُس وقت کہا تھا جب اسکو سجدہ کا حکم ہوا انا خیر منہ یعنی میں آدم سے بہتر ہوں تو اُس کو کیوں سجدہ کروں دیکھئے اُس کے دل میں ہمیشہ سے کبر تھا کہ اپنے آپ کو بڑا سمجھتا تھا جس سے آخرکار نوبت کفر تک آ ہی گئی چنانچہ خدا تعالیٰ کے حکم کے سامنے انکار سے پیش آیا اور ہمیشہ کے لئے ملعون اور جہنمی ہو گیا مولانا اس واقعہ کو بیان کرکے ہم کو ہوشیار کرتے ہیں ایں مرض در نفس ہر مخلوق ہست مطلب یہ ہے کہ ابلیس کا واقعہ سنکر ہنسو مت اپنی خبر لو کیونکہ وہ مسالہ تمہارے اندر بھی موجود ہے اتنا فرق ہے کہ وہاں اُس مسالہ میں رگڑ بھی لگ گئی تھی اور یہاں ابھی تک رگڑ نہیں لگی ہے دیا سلائی تیار موجود ہے رگڑ لگنے کی دیر ہے اور ایک مٹی کے تیل کا پیپہ بھی موجود ہے پھر جہاں دیا سلائی ہو وہاں تو ہر وقت ہی خطرہ ہے کہ خدا جانے کس وقت مسالہ میں رگڑ لگ جائے اور تیل میں آگ لگ کر بھڑک جائے اور سب گھر بار پھونک ڈالے مولانا آگاہ کرتے ہیں کہ تم کو کسی وقت بے فکر نہ ہونا چاہئے کیونکہ تمہارے یہاں بھی ایک پیپہ مٹی کے تیل کا موجود ہے وہ کیا ہے نفس جسمیں ہر وقت استعداد ہے شر کی بس چنگاری پڑنے کی دیر ہے (تم ہو تو مٹی کے مگر تیل کے ساتھ ہو کہ آگ لگی بھڑکی) جب تک تکبر اندر موجود ہے ہرگز کوئی شخص مامون نہیں ہو سکتا مگر عجیب بات ہے کہ یہی سب سے خطرناک چیز ہے اور اسی کا علاج نہیں کیا جاتا اچھے اچھے نمازی اور پرہیزگار ہیں جن کے لوگ معتقد ہیں مگر ان کے اندر یہ بلا بھری ہوئی ہے اس کو کچھ گناہ اور عیب ہی

نہیں سمجھا جاتا معمولی گناہوں سے بچتے ہیں اور کبر جیسے گناہ کی کچھ پرواہ نہیں وجہ یہ ہے کہ دین نام رکھا گیا ہے صرف اعمال ظاہری کا اور اعمال باطنی کو دین کے اندر داخل ہی نہیں سمجھا جاتا بس نیچا کرتا پہن لیا اور پانچوں وقت کی نماز پڑھ لی اور پاجامہ شرعی پہن لیا اور اپنے آپ کو شبلی وقت سمجھنے لگے خواہ باطنی معاصی میں سر سے پیر تک آلودہ ہوں اور یہ حالت ہو جو ایک بزرگ کہتے ہیں ؎

دین نام رکھا گیا ہے صرف اعمال ظاہری کا

از بروں چوں گور کافر پر خلل — واندروں قہر خدائے عزوجل

از بروں طعنہ زنی بر بایزید — وز درونت ننگ میدارد یزید

یہ مرض ایسا عام ہوا ہے کہ کوئی بھی اس سے خالی نہیں الا ماشاء اللہ خصوصاً اہل علم کسی نے سچ کہا ہے آفۃ العلم الخیلاء یعنی علم کی آفت تکبر ہے اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ وہ آفت جو علم سے پیدا ہوتی ہے اور ایک یہ کہ وہ آفت جو مانع ہے حصول علم سے کوئی معنی بھی لئے جاویں یہ بات ہر صورت میں صادق ہے کہ تکبر مضر علم ہے چنانچہ جس کے قلب میں تکبر ہے اُس کے قلب میں نور علم نہیں ہو سکتا غرض کبر بدترین امراض ہے اور یہ علما کے حصہ میں آیا ہے۔ جاہل بیچاروں میں ایسا بڑا مرض پیدا ہی نہیں ہوتا اہل علم کا جیسا مرتبہ بڑا ہے ایسے ہی ان کا مرض بھی سب سے بڑا ہے اس لئے ایسے علما سے جو اس آفت میں مبتلا ہوں جھلا ہی اچھے کیونکہ ان میں اتنا بڑا مرض تو نہیں ہے اور ایسے علم سے جس کے ساتھ تکبر بھی ہو وہ جہل اچھا جس کے ساتھ تکبر نہ ہو اس کو سُنکر لوگ کہیں گے کہ علم کی مذمت کر دی حالانکہ علم تو ہر حال میں اچھی ہی چیز ہے علم ہی ایک روشنی ہے جس سے بھلے بُرے میں امتیاز کیا جا سکتا ہے میں کہتا ہوں کہ عینک اس غرض سے لگائی جاتی ہے کہ آنکھ کی روشنی بڑھے مگر اس سے یہ فائدہ جب ہی تو نکلے گا کہ طریقہ کے موافق استعمال کی جائے ورنہ اگر عینک کو کان پر رکھ لیا جاوے تو کیا فائدہ یا اس کے شیشہ پر چونہ لپیٹ دیا جائے یا کالک لگا دی جائے تو کیا کام دے سکتی ہے ایسی عینک کے ہونے سے تو نہ ہونا اچھا کیونکہ وہ تو رہی سہی بصارت کو بھی کھوتی ہے اور خواہ مخواہ کا بوجھ بھی بندھتا ہے یہ ہی حالت علم کی ہے کہ اگر اس کو طریقہ سے استعمال کیا جائے یعنی اس سے اپنے نفس کی اصلاح کا

آفۃ العلم الخیلاء

علم کی مثال عینک سے

علم سے کام لینے کا طریقہ

کام لیا جائے تو بہت کام کی چیز ہے اور سرتاپا نور ہی نور ہے۔ اور اگر اس سے یہ کام نہ لیا جائے بلکہ دوسروں سے لڑنے جھگڑنے بڑا بننے کے لئے استعمال کیا جائے تو بیکار بلکہ مضر ہے تو یہ کہنا کچھ بیجا نہ ہوا کہ علم ہر حالت میں اچھی چیز نہیں بلکہ بعض حالتوں میں قابل مذمت بھی ہے میں سچ کہتا ہوں کہ بعض ان پڑھ لوگ پڑھے ہوؤں سے اچھے ہیں ان پڑھ لوگوں کے ذہن میں کبھی یہ وسوسہ بھی نہیں آتا کہ ہم دوسروں سے اچھے ہیں اور تعلیم یافتہ لوگوں کے ذہن میں ہر وقت یہی بات بھری رہتی ہے کہ ہم دوسروں سے اچھے ہیں اَن پڑھ لوگ اتنی بصیرت تو رکھتے ہیں کہ اپنے عیبوں کو جانتے ہیں گو اجمال ہی کے مرتبہ میں سہی چنانچہ وہ یہ جانتے ہیں کہ ہم جاہل ہیں اور یہ حضرات اتنی بصیرت بھی نہیں رکھتے کہ اپنے عیب کو دیکھ سکیں کہ ہم میں تکبر ہے حسد ہے عُجب ہے وغیرہ وغیرہ پس وہ اگر چُندھے ہیں تو یہ اندھے ہیں ہم دوسروں کو کیا کہیں خود اپنے ہی آپ کو کہتے ہیں کہ یہ مرض ہم میں موجود ہے مرض کا وجود علامات سے پہچانا جاتا ہے ہم جب کسی سے ملتے ہیں تو ابتدا بالسلام کیوں نہیں کرتے طبیعت اس سے کیوں رُکتی ہے کیا یہ اس کی علامت نہیں ہے کہ ہم کو دل میں اپنے بڑے ہونے کا خیال ہے اگر اپنے آپ کو بڑا نہ سمجھتے تو ابتدا بالسلام سے عار کیوں آتی پھر جب علامت سے ثابت ہو گیا کہ مرض موجود ہے اور مرض بھی کونسا بدترین امراض تو پھر ہم کس بات پر بھولے بیٹھے ہیں اور وہ کونسی خوبی ہے جس کی بنا پر دوسرے سے اپنے آپ کو اچھا سمجھتے ہیں کیا یہ بات قابل اصلاح نہیں ہے ضرور ہے اور اصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ یوں سوچنا چاہئے کہ تم اگر اس دوسرے شخص سے بڑھے ہوئے ہو جس کو سلام کرنے سے عار آتی ہے تو کس بات میں بڑھے ہوئے ہو بڑھنے اور گھٹنے کا معیار بھی ہے اگر معیار علم ہے اور وہ تم میں موجود ہے اور اُس میں نہیں ہے تو خیال کرو کہ علم فی نفسہ مقصود چیز نہیں بلکہ علم صرف اس وجہ سے مقصود ہے کہ وہ عمل کا ذریعہ ہے تو جب تم دوسرے سے ملے تو اُس وقت کا عمل سلام کرنا ہے اور وہ تم نے کیا نہیں تو تمہارا علم بیکار رہا کیونکہ موصل الی المقصود نہ ہوا جب بیکار ہوا تو باعث فضیلت بھی نہ ہوا تو تم اُس سے بڑھے ہوئے نہ ہوئے بلکہ گھٹے

بعض جاہل پڑھے لکھوں سے اچھے ہیں

ابتدا بالسلام سے عار کیوں آتی ہے

ابتدا بالسلام کی عادت ڈالنے کی تدبیر

ہوئے ہوئے اور اگر معیار فضیلت مال ہے تو اگر اُس کے پاس مال تم سے کم ہے اور تمہارے پاس مال اُس سے زیادہ ہے تب بھی تعلقات قائم رکھنے کی ضرورت ہے کیونکہ مال کی ترقی یا بقا تجارت سے ہوتی ہے اور تجارت گو روپیہ سے ہوسکتی ہے مگر اُس کے لئے تعلقات بڑھانے کی ضرورت ہے اور سلام ایک عمدہ ذریعہ ہے تعلق بڑھانے کا بس یہ بھی اسی بات کا مقتضی ہے کہ تم ہی اس کو سلام کرو غرض آدمی کو اگر اپنی اصلاح کا خیال ہو تو ہر حال میں کوئی نہ کوئی وجہ اور صورت نفس سے تکبر چھوڑانے کی نکال سکتا ہے یہ سب باتیں سمجھدار آدمی کے لئے ہیں اور عمل کرنے والے کے لئے ورنہ مناقشہ اور جھگڑا کرنے کو تو بڑی گنجائش ہے ایک طالب علم کا قصہ ہے کہ راستہ میں ان کی ایک جاہل آدمی سے ملاقات ہوئی انھوں نے اُسے سلام نہیں کیا یہ مرض اہل علم میں ہوتا ہی ہے اس وقت اسی کا بیان ہو رہا ہے اس جاہل نے انکا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کیا آپ نے کتاب میں ابتدا بالسلام کرنے کی فضیلت نہیں پڑھی انھوں نے جواب دیا کہ ہاں پڑھی ہے مگر قاعدہ یہ ہے کہ چھوٹا آدمی بڑے کو سلام کرے تم جاہل ہو اور ہم عالم ہیں لہذا تم چھوٹے اور ہم بڑے تمکو چاہئے تھا کہ ہمیں سلام کرتے ان دونوں میں گفتگو بہت بڑھ گئی حتی کہ وہ شخص ان کو پکڑ کر انکے استاد کے پاس لے گیا اور سارا قصہ سُنایا اُستاد نے طالب علم صاحب سے کہا کہ بھائی یہ قضیہ مسلم سہی کہ چھوٹا آدمی بڑے کو سلام کرے مگر تم کو یہ سوچنا چاہئے تھا کہ بڑا اور چھوٹا ہونا اپنے خیال کا معتبر نہیں ممکن ہے حق تعالیٰ کے نزدیک وہ بڑا ہو استاد نے یہ سچی بات کہی اور صحیح تعلیم دی مگر طالب علموں کی ذہانت دیکھئے آپ فرماتے ہیں کہ یہی بات تو اس جاہل کو بھی سمجھنا چاہئے تھی کہ ممکن ہے عند اللہ میں بڑا ہوں لہذا اسکو ابتدا بالسلام کرنا چاہئے تھی دیکھئے کیا جواب دیا ہے کہ جاہل تو جاہل استاد کو بھی بند کر دیا حاصل یہ کہ قیل و قال اور بحث مباحثہ کو تو بہت گنجائش ہے اور کوئی بات ایسی نہیں جسکا جواب نہو سکے مگر اس سے کام نہیں چلتا اور یہ طریقہ کچھ مفید نہیں یہ طریقہ دُنیا کے تو کسی کام میں اختیار کر کے دیکھئے معلوم ہو جائیگا کہ اس سے کیسا کام چلتا ہے مثلاً کھانا پکانا سیکھنا ہو اور کسی کو اس کام کے لئے استاد بنایا وہ کہتا ہے کہ شوربے میں اتنا مسالہ اور اتنا نمک اور اتنا پانی

ایک طالب علم کا عجیب مناظرہ سلام کے متعلق

ڈالو آپ بجائے اُس کی اطاعت کرنے کے قیل وقال شروع کردیں اور ذہانت سے کام لینے لگیں کہ اسکی کیا دلیل ہے۔ کہ اتنا پانی اتنا ہی مسالہ اتنا ہی نمک چاہیئے ہم یوں کیوں نکریں کہ جتنا پانی بتایا ہے اتنا ہی نمک ڈال دیں تو اس قیل وقال سے جیسا کھانا پکے گا معلوم ہے گو استاد آپ کی ذہانت کے سامنے لاجواب ہو جائے لیکن ہے یہی بات کہ یہ طریقہ مفید اور موصل الی المطلوب نہ ہوگا اس قیل وقال سے کچھ کام نہیں چل سکتا مفید طریقہ یہی ہے کہ استاد کے بتانے کو بے چون وچرا تسلیم کرلو اور ذہانت کو چھوڑ دو پھر دیکھو کہ کھانا پکانا کیسے جلدی آتا ہے اور کھانا کیسا مزیدار پکتا ہے۔ جو آدمی کام کرنے والا ہوتا ہے وہ قیل وقال میں کبھی نہیں پڑا کرتا اُس کی نظر کام پر ہوا کرتی ہے اسی طرح تہذیب نفس میں مشغول ہونے والے کو دوسرے کو الزام نہیں دینا چاہیئے کیونکہ یہ طریقہ مفید نہیں اگر دوسرے کو الزام دے بھی دیا تو اسکا کام کیا ہوا یعنی اسکو تہذیب نفس کیا حاصل ہوئی یہ تو ایسی بات ہوئی جیسے ایک شخص بتلائے کہ تمہارے مُنہ پر کالک لگ گئی ہے اور یہ سننے والا بجائے اپنی کالک چھوڑانے کے اُس کو الزام دینے لگے کہ تیری بھی تو ناک ٹیڑھی ہے یہ بات اگرچہ واقع میں سچی بھی ہو اور الزام بیجا نہ ہو تب بھی یہ دیکھو کہ تم کو اس الزام سے کیا نفع ہوا جو شخص نفس کی تربیت کرنا چاہتا ہے اُسے دوسرے کو الزام دینے کی طرف متوجہ نہونا چاہیئے اگر دوسرا کسی بات میں گھٹا ہوا بھی ہے تب بھی اس کو اس کے مقابلہ میں اپنے نفس کو بڑھانے سے کیا فائدہ اس صورت میں اس نے نفس کی تربیت نہیں کی بلکہ ایک بُرائی زیادہ کرلی اور حاصل یہ ہوا کہ پہلے تو شاید اس دوسرے شخص سے کسی بات میں بڑھا ہوا بھی ہو لیکن اب یعنی جبکہ اپنے نفس کو اس سے بڑا سمجھا یقیناً اس سے گھٹ گیا دوسرے کو الزام دینے کا یہ نتیجہ ہوا اب بتلایئے یہ طریقہ مذکورہ صحیح ثابت ہوا یا یہ طریقہ آئندہ کہ ہر شخص ہر بات کو تحقیق کی نظر سے دیکھے اور دوسرے کو الزام دینے سے قطع نظر کرلے اگر کسی بات میں دوسرے کو گھٹا ہوا دیکھا ہے تو اس وقت یہ سوچے کہ ہم بھی کسی بات میں اس سے گھٹے ہوئے ہیں یا نہیں کیونکہ ہر شخص میں کچھ خوبیاں بھی ہوتی ہیں اور کچھ بُرائیاں بھی اگر اس شخص میں ایک بُرائی ہے تو ممکن ہے کہ ہم میں بہت سی بُرائیاں ہوں یا ایک ہی بُرائی ہو

لیکن اس کی بُرائی سے بدتر ہو پھر کس طرح اسکو ہم گھٹیا ہوا سمجھتے ہیں اور کیوں دوسرے کو اپنے آپ سے کم درجہ سمجھ کر سلام میں ابتداء کرنے سے عار آتی ہے میں نے تدبیر بتادی اس رذیلہ کے ہٹانے کی لیکن یہی مقدمات ہیں جن سے آدمی یہ مفید کام بھی لے سکتا ہے اور اچھا اور کار آمد نتیجہ نکال سکتا ہے اور یہی مفید مقدمات ہیں کہ اگر ان کو اس طالب علم کی طرح الٹی ترتیب دے دی جائے تو نتیجہ غیر مفید اور بُرا نکل سکتا ہے جیسا اس طالب علم نے کہا تھا کہ جیسا مجھے کہا جاتا ہے کہ یوں سمجھو کہ ممکن ہے واقع میں وہ جاہل اچھا ہو ایسے ہی اس جاہل سے بھی تو کہنا چاہئے کہ یوں سمجھ کہ ممکن ہے واقع میں ہر طرح تجھ سے میں بڑھا ہوا ہوں لہذا وہ مجھے سلام کرے دیکھئے یہ وہی مقدمات ہیں جنکا حاصل یہ تھا کہ ہر شخص میں خوبیاں بھی ہیں اور بُرائیاں بھی ان سے ایک طرح تو مفید اور نہایت کار آمد نتیجہ نکلا تھا اور انہی سے اُسی ترتیب کے ساتھ ایسا بُرا اور مضر نتیجہ نکلا اسکی وجہ یہ ہے کہ اس طالب علم نے وہ طریقہ اختیار کیا ہے جو غلط ہے غرض ہم لوگ دوسرے کو اپنے سے کم ثابت کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی بُرائی اس کی تلاش کر لیتے ہیں اور اُس میں جو بھلائی ہوتی ہے اُس پر نظر نہیں کرتے بجائے اس کے صحیح طریقہ یہ ہے کہ اپنے عیبوں پر نظر ڈالو اور دوسرے کے ہنروں پر اپنے اندر ہزار ہنر ہوں تو ان کو مت دیکھو اور ایک بھی عیب ہو تو اس کو دیکھو اور دوسرے میں ہزار عیب بھی ہوں تو ان کو مت دیکھو اور ایک بھی ہنر ہو تو اس کو دیکھو نتیجہ یہ ہوگا کہ اپنے آپ کو اُس سے ہر حال میں کم سمجھو گے اور اس کو خود سلام کرو گے تو کبر تمہارے پاس بھی نہیں آئے گا اور نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر تم میں ہزار ہنر ہیں اور ایک عیب ہے تو اس طریقہ سے اس ایک عیب سے بھی نظر نہ چوکے گی اور کبھی نہ کبھی وہ عیب بھی تم میں سے نکل جائیگا اور تم سراپا ہنر ہو جاؤ گے یہ طریقہ اچھا ہے یا وہ طریقہ اچھا ہے کہ دوسروں ہی کے عیبوں کو دیکھتے رہو اور اس میں پڑ کر اپنے عیب سے غافل رہو تاکہ دوسرے اور عیب بھی تم میں پیدا ہوتے جائیں اور رفتہ رفتہ سراپا عیب بن جاؤ سمجھدار اور عمل کرنے والے کے لئے ان ہی مقدمات میں سیدھا راستہ کھلا ہوا ہے اور قیل وقال کرنے والے اور حجتیں چھانٹنے والے کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا کیونکہ یہی مقدمات وہ بھی

اپنے عیبوں پر نظر رکھئے اور دوسروں کے ہنروں پر

پیش کرتا ہے بات یہ ہے کہ جسکو خود اصلاح منظور نہ ہو اس کو کیونکر سمجھایا جائے غرض
یہ آفت اور کج روی سب میں ہے اہل علم بھی اس سے خالی نہیں بلکہ ان میں یہ مرض
عوام سے زیادہ ہے ہم خود اپنے آپ ہی کو کہتے ہیں کہ ہم ابتدا بالسلام نہیں کرتے
اس کا منشا وہی اپنے آپ کو بڑا سمجھنا ہے یا راستے میں علو چاہتے ہیں ادھر کو نکلیں
نظریں ہم پر اٹھ جائیں یہ سب بڑا بننا اور کبر ہی ہے اور بعض وقت راستے میں اس
طرح دبے ہوئے اور جھکے ہوئے چلتے ہیں جس سے معلوم ہو کہ بڑے متواضع ہیں
حالانکہ دل میں یہ ہوتا ہے کہ اسی متواضعانہ ہیئت کو دیکھ کر لوگوں کی نظریں
ہماری طرف اٹھیں یہ ایک کبر دقیق ہے اسکا پتہ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ
علیہ کے ایک مقولے سے چلا فرمایا تھا کہ بعض کبر بصورت تواضع ہوتا ہے جیسا کہ
بعض مصنفین میں دیکھا جاتا ہے کہ جب کسی جمع میں پہونچے تو صف نعال میں بیٹھ گئے
اس کے سوا کوئی جگہ ہی اختیار نہیں کرتے لوگ جانتے ہیں کہ یہ فلاں شخص ہیں با وضع
قطع اور صورت و شکل سے بھی سفید پوش اور شریف اور پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہیں
پڑھے لکھے کی صورت چھپتی نہیں ہے اب لوگ اصرار کرتے ہیں کہ حضرت یہاں تشریف
لائیے صدر مقام پر بیٹھئے آپ کہاں بیٹھ گئے ہم سب کو شرمندہ کر دیا یہ جگہ آپ کے بیٹھنے
کی نہیں ہے آپ کو خدا تعالیٰ نے بڑا رتبہ دیا ہے مگر یہ ہیں کہ جوں جوں اصرار ہوتا جاتا
ہے اور اسی جگہ پر جمتے جاتے ہیں اور نہایت عاجزی سے کہتے ہیں کہ بھائی میں تو اس
جگہ کے بھی قابل نہیں من آنم کہ من دانم سفید کپڑوں کو یا ظاہری تقدس کو مت دیکھو
اندر تو میرے سارے عیب ہی بھرے ہوئے ہیں (سچ کہتا ہے واقعی سارے عیب
ہی بھرے ہوئے ہیں کیونکہ ام العیوب یعنی کبر موجود ہے) کتنا ہی کہئے مگر وہ اپنی جگہ
سے نہیں ہٹتے بلکہ اور نیچے کو کھسکتے جاتے ہیں یہ وہی کبر ہے جسکو مولانا نے فرمایا کہ
بعض کبر بصورت تواضع ہوتا ہے صورت تو ایسی کہ بالکل سراپا تواضع معلوم ہوتے
ہیں لیکن حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ لوگ ہم کو متواضع سمجھیں اور اس طرح انکے
دلوں میں ہماری وقعت اور بڑائی آجائے تو بڑائی مقصود ہوئی نہ تواضع یہ کبر بڑا

خطرناک ہے یہ اُس کبر سے اشد ہے۔ جو بعض دنیا داروں میں ہوتا ہے کہ کھٹ پٹ کرتے ہوئے آئے اور سب سے اونچی جگہ بیٹھ گئے۔ یہ بھی کبر ہے مگر دونوں میں فرق ہے اس سے نیچے بیٹھنے والے کا کبر اشد ہے کیونکہ وہ چھپا ہے اور یہ ظاہر ہے اور تپ دق اور پرکے بخار سے زیادہ خطرناک ہے دوسرے اس لئے اشد ہے کہ یہ فعل یعنی صف نعال میں بیٹھ جانا اور تواضع کی صورت اختیار کرنا محمود عندالناس ہے، اس سے زیادہ رفعت حاصل ہونے کی امید ہے اور اسی واسطے اسکو اختیار کیا جاتا ہے اور اس شخص کی وضع جو کہ خود آگے اونچی جگہ پر بیٹھ گیا ہے لوگوں کے نزدیک بھی محمود نہیں اس سے اتنی رفعت حاصل ہونے کی امید نہیں جتنی اُس میں تھی تو وہ کبر بڑا ہوا اس کبر سے اور ایک وجہ یہ ہے کہ اس نے اپنی وضع قائم رکھنے کے لئے اپنے بھائی کا کہنا نہ مانا یہ صف نعال میں دوسروں کی دل شکنی کرکے اس لئے بیٹھتا ہے کہ اپنی وضع میں فرق نہ آجائے اور کوئی یوں نہ کہے کہ یہ تو فرش پر بیٹھنے والے تھے کرسی پر کیوں بیٹھ گئے یہ شخص آن پرست ہے بعض لوگوں کو وضع داری میں اس قدر غلو ہوتا ہے کہ اسکے لئے رقمیں خرچ کرتے اور دقتیں اُٹھاتے ہیں مگر اپنی وضع میں فرق نہیں آنے دیتے حقیقت اس کی محض کبر ہے کہ ہم اتنے بڑے ہیں کہ کوئی ہم سے ہماری وضع نہیں چھوڑا سکتا یہ سب شیطانی دھندے ہیں وضع کیا چیز ہے اور قطع کیا چیز ہے اور آن کیا چیز ہے آپنے آپ کو اتنا بڑا ہی کیوں سمجھے کہ اس کے لئے کوئی خاص وضع مقرر ہو بندہ کا حق تو یہ ہے کہ جس وردی اور جس وضع میں سرکار رکھیں اوسی میں رہے اپنی رائے اور ارادہ کو بالکل فنا کردے۔ ادنےٰ حالت میں رکھیں تو ادنےٰ حالت میں رہیں اور اعلےٰ حالت میں رکھیں تو اعلیٰ حالت میں رہے نہ اعلیٰ کو خود اختیار کرے نہ ادنیٰ کو یہ ہے تواضع حقیقی ورنہ بچہ یوں کہنا چاہئے کہ بنی اسرائیل بڑے متواضع تھے کہ انھوں نے ایک اعلیٰ درجہ کے کھانے کو چھوڑ کر ادنیٰ درجہ کے کھانوں کو اختیار کیا تھا ان پر حق تعالےٰ نے اپنے فضل سے من وسلویٰ اُتارا تھا اور یہ وہ اعلیٰ درجہ کی غذا ہے کہ بڑے بڑے آدمیوں کو بھی نصیب نہیں ہوتی اُن کو شیرینی ترنجبین کی ملتی تھی اور نمکین غذاؤں کا

وضع داری میں غلو کبر ہے

بندہ کی کیا وضع

بنی اسرائیل کو من وسلویٰ کو چھوڑ کر ادنیٰ کھانے اختیار کرنا تواضع نہ تھا

گوشت ملتا تھا اور لطف یہ کہ یہ چیزیں خود بخود اُن کے پاس آجاتی تھیں اُن کو کچھ خرچ کرنے اور محنت مشقت کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی ظاہر ہے کہ یہ کیسی اعلیٰ درجہ کی نعمت ہے چنانچہ حق تعالیٰ نے بطور امتنان کے متعدد جگہ فرمایا ہے وانزلنا علیکم المن والسلوٰی مگر انھوں نے اس حالت کو پسند نہیں کیا اور یہ کہا لن نصبر علی طعام واحد فادع لنا ربک یخرج لنا مما تنبت الارض من بقلہا وقثائہا وفومہا وعدسہا وبصلہا یعنی ہم ایک کھانے پر صبر نہیں کرسکتے خدا تعالیٰ سے کہئے کہ ہمارے واسطے کچھ سبزیں زمین سے پیدا کرے جیسے ترکاریاں اور کھیرے اور گیہوں اور مسور اور پیاز تو ان کے اس فعل کو بھی تواضع کہنا چاہئے کیونکہ اُنھوں نے اعلیٰ چیز کو چھوڑ کر ادنیٰ کو اختیار کیا جیسے وہ صف نعال میں بیٹھنے والا باوجود لوگوں کے اصرار کے ادنیٰ جگہ کو اختیار کرتا ہے مگر دیکھئے اس کی نسبت اُن کے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کیا فرماتے ہیں قال استبدلون الذی ہو ادنیٰ بالذی ہو خیر یعنی فرمایا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کیا بدلتے ہو تم ایک اعلیٰ درجہ کی چیز کو ادنیٰ درجہ کی چیز سے یہ بطور انکار کے فرمایا معلوم ہوا کہ اُن کا یہ فعل پسند نہیں ہوا حالانکہ سب جانتے ہیں کہ تواضع یا زہد صفت محمود ہے مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام اس پر انکار فرما رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ انکا یہ فعل تواضع اور زہد میں داخل نہ تھا ورنہ آپ اسپر انکار کیوں کرتے پیغمبر سے زیادہ تو کوئی صاحب بصیرت نہیں ہوسکتا اس سے صاف معلوم ہوا کہ بعض وہ فعل بھی جو صورتاً تواضع ہوتے ہیں حقیقۃً نہیں ہوتے اس سے مولانا کے اس مقولہ کا ثبوت واضح ہوگیا کہ کبھی کبر بصورت تواضع بھی ہوتا ہے بنی اسرائیل کے اس سوال کے الفاظ ہی بتلا رہے ہیں کہ یہ زہد اور تواضع نہ تھا بلکہ ایک شرارت اور حق تعالیٰ کی نعمت سے اعراض تھا دیکھئے پیغمبر کے سامنے کہتے ہیں لن نصبر علی طعام واحد یعنی ہم سے یہ ہرگز نہ ہوگا کہ ایک ہی کھانے پر بس کریں اگر یہ تواضعاً کہا جاتا تو اس کے لئے ایسے الفاظ ہوتے کہ حضرت ہم اس قیمتی اور اعلیٰ غذا کے قابل نہیں ہیں ہمارے نفس اس سے پھول جائیں گے اس لئے خدا تعالیٰ سے دعا فرما دیجئے کہ ہمیں کوئی اور چیز دیں جو ہماری

حیثیت کے لائق ہو لیکن نہیں انھوں نے بجائے عاجزی کے کلمات کے ایک نہایت سخت لفظ کہا جس میں تمرد پایا جاتا ہے کہ ہم ہرگز ایسا نہیں کریں گے کہ ایک ہی کھانا کھاتے رہیں تواضع تو عبودیت کا شعبہ ہے جس کو عجز و نیاز لازم ہے عاجزانہ الفاظ ایسے نہیں ہوتے غرض یہ فعل تواضع نہ تھا اسی واسطے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس فعل پر انکار کیا اور آگے دیکھئے حق تعالیٰ کی طرف سے اس پر کیا انعام ملا فرماتے ہیں وضربت علیہم الذلۃ والمسکنۃ وباؤا بغضب من اللہ یعنی ان کے لئے مقرر کردی گئی خواری اور محتاجی اور انھوں نے خدا تعالیٰ کا غضب اپنے اوپر لیا یہ اس تواضع کا انعام ملا حالانکہ تواضع تو بڑی چیز ہے جسکا صلہ یہ ہے من تواضع للہ رفعہ اللہ یعنی جو کوئی تواضع اختیار کرتا ہے اس کو حق تعالیٰ رفعت اور بلندی دیتے ہیں اور یہاں حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ انکو ذلت اور پستی دی گئی معلوم ہوا کہ یہ فعل انکا تواضع تھا ہی نہیں لیجئے خود حق تعالیٰ کے قول سے اس مقولہ کی تصدیق ہو گئی کہ بعض تواضع حقیقت میں تکبر ہوتا ہے تکبر اور عبودیت دو متضاد چیزیں ہیں اگر عبد بننا ہے تو اپنی رائے کو چھوڑ دینا چاہیئے یہ بھی اپنی رائے ہے کہ ایک وضع اختیار کر لی ہے جسکو کوئی چھوڑا ہی نہیں سکتا یہ تواضع نہیں ہے علیٰ ہذا بعضوں نے زہد کو اپنی وضع بنایا ہے کہ کھانے کی کوئی چیز چھوڑ دی ہے مثلاً اناج نہیں کھاتے یہ بھی صورتاً زہد ہے اور حقیقت میں وہی تکبر ہے جس سے صرف یہ مقصود ہے کہ شہرت ہو کہ شاہ صاحب ایسے کامل ہیں کہ دنیا سے کچھ تعلق ہی نہیں رکھتے حتی کہ اناج نہیں کھاتے ایسی ضروری اور محبوب چیز کو خدا تعالیٰ کے لئے چھوڑ دیا ہے صاحبو غور سے دیکھئے تو شاہ صاحب نے اناج کو خدا تعالیٰ کے لئے نہیں چھوڑا بلکہ نفس کے لئے چھوڑا ہے تاکہ یوں کہا جائے کہ شاہ صاحب بڑے کامل زاہد ہیں یہ حب جاہ ہے جو امراض میں سے ہے یہ زہد نہیں ہے جو عملاً کمالات میں سے ہے زہد کے معنی یہ نہیں ہیں کہ خدا النعمت دے اور اس کو استعمال نہ کرے دیکھئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں خلق لکم ما فی الارض جمیعاً یعنی خدا تعالیٰ نے تمہارے واسطے وہ سب چیزیں پیدا کیں جو زمین میں ہیں یہ کیسی عبودیت ہے کہ خدا تعالیٰ تو

(اناج چھوڑ دینا کوئی زہد نہیں ہے)

فرماویں کہ یہ چیزیں تمہارے واسطے ہیں اور تم اُن سے مُنہ پھیر لو ایسے شخص کو جو اناج نہیں کھاتا یہ چاہیئے کہ اس آیت کی تفسیر میں ایک استثنا بڑھا دے الا اناج کہ اور سب چیزیں تو پیدا کی ہیں ہمارے واسطے مگر اناج یہ اچھی عبودیت ہے کہ خدا تعالیٰ کے کلام میں بھی اصلاح کی نوبت آگئی حضرت عبودیت کا خلاصہ اپنی رائے کو فنا کر دینا ہے اور اپنی رائے کو کچھ سمجھنا یہ عبودیت کی ضد اور تکبر ہے بس بندہ کی شان تو یہ ہے کہ کسی بات میں بڑا بنے ہی نہیں جس چیز میں ذرا سا بھی تکبر پائے اُس سے دور بھاگے اگر ململ پہننے سے تکبر ہوتا ہے تو وہ نہ پہنے اور گاڑھا پہننے سے تکبر ہوتا ہو تو وہ نہ پہنے کبھی گاڑھا پہننے سے بھی تکبر ہوتا ہے اور وہ تکبر اُس تکبر سے گاڑھا ہوتا ہے جو ململ سے ہوتا ہے جیسا ململ پتلا ہے ایسا ہی اس کا تکبر بھی پتلا ہوتا ہے جہاں گاڑھا پہننے سے مقصود یہ ہو کہ لوگ یوں کہیں کہ شاہ صاحب بڑے متواضع ہیں بڑے زاہد ہیں اور اس سے شاہ صاحب کا نفس پھولنے لگے میں سچ کہتا ہوں کہ اس وقت گاڑھے سے وہ ململ ہی اچھا ہے اس وقت یہ گاڑھا حق تعالیٰ کو پسند نہیں ململ پسند ہے خلاصہ یہ کہ ایک کبر بشکل کبر ہوتا ہے اور ایک کبر بشکل تواضع ہوتا ہے اور یہ اہل علم میں زیادہ ہوتا ہے اور یہ ایسا خفی کبر ہے کہ اسکا پتہ دوسروں کو تو کیا صاحب مرض کو بھی نہیں چلتا عوام تو علما کے ساتھ ایسا عقیدہ رکھتے ہیں کہ علم کا نام آتے ہی اُن کی ہر بات کو اچھا سمجھنے لگتے ہیں اور یہ عالم صاحب حقیقت سے ناآشنا اپنے افعال کی صورت اچھی پاکر مطمئن ہیں کہ ہم عالم باعمل ہیں تواضع ہم میں موجود ہے زہد ہم میں موجود ہے حالانکہ تواضع ہے نہ زہد صرف تکبر ہی تکبر ہے اگر کسی حقیقت شناس کے پاس بیٹھتے تو ان کو معلوم ہوتا کہ کیا ہے کچھ تو یہ خود اس غلطی میں مبتلا ہیں اور کچھ لوگوں کے منہ سے تعریف سن سن کر انکا دماغ خراب ہو گیا ہے اور سمجھتے ہیں کہ کوئی بات تو ہے جو ہماری تعریف کی جاتی ہے غرض سرتاپا مریض ہو گئے اور مرض کے ساتھ خدر یعنی سُن کا مرض بھی ہو گیا کہ مرض کا حس باقی نہیں رہا بلکہ حس الٹا ہو گیا کہ مرض کو صحت سمجھنے لگے یہی وجہ ہے کہ آج کل اس بات کو علما کے کمالات میں سمجھا جاتا ہے اگر کوئی غلطی ہو جاوے تو اُس سے علی الاعلان رجوع

نہ کیا جاوے اس کی ہمت نہیں ہوتی بلکہ ایک تاویل سے اخفاء کی ضرورت ذہن میں آتی ہے وہ یہ کہ اگر علی الاعلان رجوع کیا جاویگا تو عوام کے ذہن سے ہماری وقعت اُٹھ جائے گی اور اُن کے ذہن میں یہ بات آجائے گی کہ ان کو کچھ علم نہیں ہے اور آئندہ کے لئے ہمارے فتوئ کا اعتبار نہ کریں گے پھر شریعت کا حکم اُن کو کیسے معلوم ہوگا اور ہدایت کیسے ہوسکیگی گویا مسلمانوں کے بڑے خیر خواہ ہیں کہ ان کو علم سے محروم رکھنا نہیں چاہتے میں اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ یہ مسلمانوں کی خیر خواہی نہیں ہے بلکہ اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ اپنے نفس کی خیر خواہی ہے فقط یہ منظور ہے کہ ہماری وقعت اور جاہ میں فرق نہ آوے اور ہم بڑے بنے رہیں اور اسمیں یہ بات بھی داخل ہے کہ اپنے ایک بزرگ سے غلطی ہوگئی ہو اور ان کو واضح بھی ہوگیا ہو کہ یہ غلطی ہوئی ہے لیکن معتقدین اس کو غلطی نہیں کہتے بلکہ کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح اس کا صواب ہونا ثابت کردیں اور بات بنے یا نہ بنے مگر اس کی پرورش کئے جاویں گے اور اس غلطی کی پرورش کو بزرگوں کی نصرت سمجھتے ہیں حالانکہ یہ نصرت جائز نہیں کیونکہ نصرت حق کی چاہئے نہ کہ باطل کی یاد رکھو کہ ایک غلطی تو وہ ہوئی ہو ان بزرگ سے ہوئی تھی اور دوسری غلطی یہ ہے کہ آپ اسکو بنا رہے ہیں اور یہ آپ کی غلطی اشد ہے پہلے غلطی سے کیونکہ وہ تو نادانستگی سے ہوئی اور یہ دیدہ و دانستہ ہے یا یہ کہو کہ وہ خطا ہے اور یہ عمد اور غور کیا جاوے تو درحقیقت یہ ان بزرگ کی نصرت ہے ہی نہیں بلکہ ان پر کبر کی حمایت ہے حقیقت اسکی یہ ہے کہ نفس رائے دیتا ہے کہ اگر اپنے بزرگ کی غلطی تسلیم کروگے تو اس سے اپنی حماقت ظاہر ہوگی کیونکہ سننے والے کہیں گے کہ یہ بھی اچھے شخص کے معتقد ہیں جس سے ایسی ایسی غلطیاں ہوتی ہیں بس یہ حقیقت ہے اس نصرت کی کہ نفس نسبت الی الحماقت سے بچنا چاہتا ہے مگر اس کے واسطے یہ مقدمات سوجھاتا ہے کہ وہ بزرگ ہیں اُنکی نصرت خدام کے ذمہ ہے ایک ادنیٰ مسلمان کی نصرت بھی مسلمان کے ذمہ حق ہے چہ جائیکہ ایک بڑے بزرگ کی یہ دھوکہ ہے نفس کا کہ ایک بُری بات کو ایسی اچھی صورت پہنادی ہے مگر حقیقت اس کی وہی ہے کہ نفس نسبت الی الحماقت سے بچنا چاہتا ہے اور ان کو دھوکہ

اپنے بزرگ کی غلطی کا تاویل کرنا۔

میں ڈال رکھا ہے اس واسطے یہ اُلٹی سیدھی ہانکے جاتے ہیں کیا ٹھکانا ہے اس دھوکہ کا بڑا گہرا دھوکہ ہے اور بہت سی تہوں میں لپٹا ہوا کبر ہے اسی واسطے کسی جاننے والے نے کہا ہے کہ سب سے بڑا مولوی نفس ہے کہ کیسی کیسی دور کی سوچتا ہے اور کتنی دور سے پکڑتا ہے یہ وہ واقعے میں نے بطور مثال کے بیان کئے ہیں ورنہ سیکڑوں امور میں یہی بات ہے کہ ظاہر میں صورت اچھی ہے کہیں تواضع ہے کہیں زہد ہے کہیں نصرت ہے کہیں ایثار ہے کہیں نصیحت اور ہدایت ہے لیکن حقیقت اُن کی کچھ بھی نہیں ہے سوائے کبر کے مگر افسوس کہ لوگوں میں حتی کہ علما میں بھی حس نہیں رہا کیونکہ سر سے پیر تک اسی میں مبتلا ہیں اور کبر طبیعت ثانیہ بنگیا ہے جب اس کا حس ہی نہیں رہا تو علاج کی طرف توجہ کیسے ہو مگر میں پھر بھی بتائے دیتا ہوں کہ اس کا علاج کچھ نہیں ہے سوائے ایک بات کے اور وہ بات یہ ہے ؎

نفس نتواں گشت الا ظل پیر ۔۔۔ دامنِ آں نفس کش را سخت گیر

مگر یہ بھی یاد رکھئے کہ سایہ میں آنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ دھوپ میں سے ہٹ کر اُس کے سایہ میں کھڑے ہو جاؤ بلکہ اس کے معنی ہیں اس سے تعلق پیدا کرنا اور اس کا اتباع کرنا تاکہ اس کے اخلاق کا اثر تم پر پڑے صاحبو صحبت اور تعلق کا اثر ضرور ہوتا ہے سائنس سے بھی یہ بات ثابت ہے کہ نفس میں مسارقت کا مادہ ہے یعنی دوسرے سے اثر لینے کا (مسارقت سرقہ سے مشتق ہے سرقہ کے معنی ہیں چوری، چوری کے نام سے نہ چونکئے گا چوری دو طرح کی ہوتی ہے جائز اور ناجائز جائز چوری میں کچھ حرج نہیں) غرض نفس چوری کرتا ہے یعنی جس سے اس کو تعلق و ارتباط اور محبت ہو وہ دیدہ و نادیدہ اُس کے اخلاق اپنے اندر لے لیتا ہے اگر اچھے ہیں تو اچھے اور بُرے ہیں تو بُرے اور یہی راز ہے اس حدیث کا المرء علیٰ دین خلیلہ فلینظر من یخالل یعنی آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے تو چاہئے کہ ہر شخص غور کر لیا کرے کہ میں کس سے دوستی کر رہا ہوں اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دوست کا اثر دوست کے دین پر ضرور پڑتا ہے اور یہ بات واقعات سے بھی ثابت ہوتی ہے کفار میں بہت سے آدمی ایسے بھی ہیں جو اسلام کو

حق جانتے ہیں لیکن اپنے ملنے والوں اور دوستوں کے شرم و لحاظ سے مسلمان نہیں ہوتے دیکھئے ان کی دوستی نے ان کو دین سے باز رکھا تو یہ سچ ہوا کہ آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے ایسے واقعات بہت ہیں اور بہت جگہ ایسا ہوا ہے کہ ایک مسلمان کسی بددین کے پاس اُٹھتا بیٹھتا رہا اور اس پر یہ اثر ہو گیا کہ نعوذ باللہ مرتد ہو گیا غرض یہ بالکل سچا مضمون ہے صحبت کے بارہ میں بڑی احتیاط چاہئے آدمی کبھی یہ نہ سمجھے کہ میرے اوپر کیا اثر ہو سکتا ہے ضرور اثر ہوتا ہے۔ اور اس طرح سے ہوتا ہے کہ خبر بھی نہیں ہوتی

اثر صحبت پر اشکال

اس پر ایک شخص نے ایک دفعہ اشکال کیا کہ جب صحبت میں یہ اثر ہے کہ ہر شخص میں دوسرے کے اخلاق آجاتے ہیں تو جب ایک نیک اور ایک بد کی باہم صحبت ہو گی تو بد کے اخلاق بھی نیک کی طرف متعدی ہوں گے اس لئے نیک کو بد سے بچنا ضروری ہوا اور بد کو صحبت نیک حاصل کرنے کا حکم ہے تو دونوں کا اجتماع کیونکر ہو گا حاصل یہ ہوا کہ نیک کو تو حکم ہے بد سے الگ رہنے کا اور بد کو حکم ہے صحبت نیک اختیار کرنے کا تو اس صحبت کے حاصل ہونے کی صورت کیا ہے میں نے کہا واقعی بیڈھب شبہہ ہے مگر اسی وقت دل میں جواب آگیا جس سے شبہہ حل ہو گیا اور یہ بات تجربہ اور واقعات کے دیکھنے سے ماخوذ ہے وہ یہ کہ

صحبت کا اثر ہونے کی شرط

صحبت کا اثر ہونے کے لئے تابعیت شرط ہے یعنی متبوع کا اثر ہوا کرتا ہے تابع پر نہ کہ تابع کا متبوع پر یہ ہے قاعدہ کلیہ اور یہی مدار ہے صحبت نیک کے حکم کا اور صحبت بد سے ممانعت کا حاصل یہ ہوا کہ بد کے پاس تابع ہو کر نہ جاؤ چنانچہ امراء کی صحبت سے جو اہل اللہ نے بہت اہتمام کے ساتھ منع کیا ہے اُس کے یہی معنی ہیں کہ اُن کو مقصود بنا کر اُن کے پاس نہ جاؤ اور اگر اس طرح جانا ہو کہ اُن کو مقصود نہ بنایا جاوے اور اُنکے تابع نہ بننا پڑے تو کچھ حرج نہیں مثلاً وعظ و نصیحت کے لئے یا کسی معاملہ کے لئے مثلاً اپنی کوئی چیز جیسے مکان یا جائداد وغیرہ بیچنا ہو اُسکے لئے جانا ممنوع نہیں کیونکہ یہ اُس کو مقصود بنانا نہیں ہے اسمیں ضرر نہ ہو گا مگر یہ میں بتلائے دیتا ہوں کہ یہ بھی جب ہے کہ وہاں جاکر کسی قسم کی بھی تابعیت پیدا ہو جانیکا خوف نہ ہو کیونکہ امراء کی صحبت میں اکثر ایک زہریلا مادہ یہ ہوتا ہے کہ وہاں جاکر ہر شخص کو تابع بننا پڑتا ہے۔

امراء کی صحبت کے مضر ہونے کی وجہ

اور ان کی ہاں میں ہاں ملانا پڑتی ہے اگر ذرا بھی اس بات کا خوف ہو تو اُس شخص کو جو اپنے قلب کی محافظت کرنے والا ہے ایسی جگہ نہ جانا ہی بہتر ہے یہ بات اہل علم کو خصوصاً خوب یاد رکھنی چاہیئے بعض وقت امراء اہل علم کو اس طرح بلاتے ہیں کہ علما کو تابع بنانا نہیں چاہتے بلکہ متبوع بنا کر بلاتے ہیں مثلاً وعظ کہنے کے لئے بلاتے ہیں یا دعوت کرتے ہیں اور ادب اور اکرام کے ساتھ بلاتے ہیں ظاہر ہے کہ اس میں آدمی تابع نہیں بنتا اور ظاہراً کچھ حرج نہیں معلوم ہوتا لیکن میں اہل علم کو مشورہ دیتا ہوں کہ اس معیار کو پیش نظر رکھیں اور خوب غور سے کام لیں کہ وہاں جا کر ہم کو کسی بات میں دبنا تو نہ پڑے گا اور کسی بات میں ہاں میں ہاں تو ملانا نہ پڑے گی اور کسی بات میں مداہنت اور سکوت عن الحق تو کرنا نہ پڑے گا اگر ذرا بھی اس بات کا اندیشہ ہو خواہ اس امیر کے جبروت اور سطوت کی وجہ سے یا اپنے ضعف قلب کی وجہ سے تو ہرگز نہ جائیں اور اگر بالکل اطمینان ہو کہ ان میں سے کوئی بات پیش نہ آئے گی تو مضائقہ نہیں مگر اس کے ساتھ اتنا پھر بھی میں کہے دیتا ہوں کہ گو ہر طرح کا اطمینان ہو لیکن پھر بھی امیر کی صحبت ان مفاسد سے خالی نہیں ہوتی الا ماشاء اللہ غرض میری یہ ہے کہ اہل علم کو اس میں نرمی نہیں برتنا چاہیئے اور ہر قسم کے اطمینان کی صورت میں بھی امراء کی صحبت میں تقلیل ضرور چاہیئے کیونکہ امراء کی صحبت میں خاصیت ہے متبوعیت کی یعنی ہر شخص کو تابع بنا لینے کی اور جب آدمی تابع بن گیا تو حسب قاعدہ مذکورہ نفس مسارقت ضرور کرے گا اور اس کے اخلاق کا تعدیہ ضرور ہوگا بحمد اللہ اب وہ اشکال حل ہو گیا کہ صحبت نیک کیسے حاصل ہو جبکہ نیک کو بھی حکم ہے صحبت بد سے بچنے کا حاصل حل کا یہ ہوا کہ نیک آدمی بد کا تابع ہو کر نہ رہے تو صحبت بد اُس کو مضر نہیں نہ اس سے بچنے کا حکم ہے بلکہ طالب اصلاح کو چاہیئے کہ خود تابع بنے اور اس کو متبوع بنا دے یہ تو اشکال درمیان میں آگیا تھا اصل بیان یہ تھا کہ صحبت ضرور موثر ہے اور یہ بات سائنس سے بھی ثابت ہے تو اگر اپنا خلاق کی اصلاح کرنا ہے تو کسی ایسے شخص کی صحبت اختیار کیجئے جو اخلاق حمیدہ رکھتا ہو اور اُس سے تعلق پیدا کیجئے اور اسکا اتباع کیجئے یہ ہے علاج جس سے بُرے اخلاق دُور

ہوتے ہیں اور اچھے اخلاق پیدا ہوتے ہیں اور نرے پڑھنے پڑھانے سے یہ کام کبھی نہیں ہوسکتا صحبت عجب چیز ہے صحبت جب شرائط کے ساتھ یعنی معہ قصد تابعیت پائی جاوے تو ضرور موثر ہوتی ہے تجربہ کرلیجئے کہ ایک غصیارا آدمی جو بات بات پر لوگوں سے لڑتا ہو چند روز ایک حلیم اور بردبار آدمی کے پاس بیٹھے تو اسمیں حلم پیدا ہوجائے گا یا اس کے برعکس ایک حلیم اور سرد مزاج آدمی کسی غصیارے آدمی کے یا کسی حکومت والے کے پاس چند روز بیٹھے تو اُس میں ضرور کچھ نہ کچھ تیزی اور گرمی پیدا ہوجائے گی حیادار آدمی کے پاس بیٹھنے سے حیا اور بے حیا آدمی کے پاس بیٹھنے سے بے حیائی اور بک بک کرنے والے کے پاس بیٹھنے سے بک بک کرنا اور فضول گوئی اور خاموشی اور باوقار آدمی کے پاس بیٹھنے سے سکوت اور وقار پیدا ہوتا ہے یہ آثار صحبت سے پیدا ہوتے ہیں اتنے لکھنے پڑھنے اور کتابوں کے دیکھنے سے نہیں ہوتے اس کی وجہ یہ ہے کہ کتاب میں تو ایک مضمون دیکھا جو اس وقت ذہن میں آگیا پھر جاتا رہا اور صحبت میں واقعات پیش آتے ہیں جس سے اس کا استحضار بار بار ہوتا ہے مثلاً حلیم شخص کے پاس بیٹھوگے تو بار بار اس کو صبر و تحمل کرتے دیکھوگے اور اُس کے فوائد بھی دیکھوگے اور متعدد مرتبہ اس کا استحضار ہوگا تو تم بھی صبر کرنے لگوگے یہ فرق ہے نرے صحبت اور علم میں یہاں وہ لفظ پھر یاد رکھئے کہ صحبت کا اثر جب ہی ہوتا ہے جبکہ اُس شخص کو جسکی صحبت اختیار کی ہے متبوع بناؤ نرا پاس آنا جانا کافی نہیں اسی کو میں نے کہا تھا کہ پیر کے سایہ میں آنے کے معنی یہ نہیں کہ دھوپ سے اُٹھکر اسکی چھاں میں آجائے بلکہ اُس سے تعلق پیدا کرنا اور اس کے اتباع کا قصد کرنا مراد ہے یہ مطلب ہے ظل پیر کا اس کا اثر اس طرح ہوتا ہے کہ جب تم نے اُس کو بڑا سمجھا اور متبوع بنایا اور اپنے آپ کو تابع بنایا اور وہ علوم میں بھی کامل ہے اور عمل میں بھی تو اُس کے پاس رہنے سے علوم کان میں پڑیں گے مثلاً غصہ کا علاج معلوم ہوگا کہ جب غصہ آوے تو آدمی کو چاہئے کہ وہاں سے ٹل جاوے اس سے جوش فرو ہوجاتا ہے یا یہ کہ غصہ کسی خطا پر آتا ہے اس وقت یہ سمجھے کہ جیسے وہ شخص میرا خطاوار ہے ایسے ہی

بقاء اثر صحبت کے لئے پڑھنے پڑھانے سے مفید ہوتا ہے

غصہ کا علاج

میں بھی تو کسی کا خطاوار ہوں یہ خیال آتے ہی غصہ فرو ہو جائیگا یہ نکتے کان میں
پڑیں گے اور وقت پر رہبری کریں گے جب بار بار یہ باتیں کان میں پڑیں گی تو کہاں
تک اثر نہ ہوگا ایک وقت چوکو گے دو وقت چوکو گے تیسری دفعہ تو اصلاح ہو ہی
جائیگی اور چند روز میں انشاء اللہ غصہ کے روکنے کی قدرت حاصل ہو ہی جائے گی
یہ سبب تو ظاہری ہے اہل اللہ کے پاس رہ کر اصلاح ہونے کا کہ ان کی صحبت میں اچھی
اچھی باتیں کان میں پڑتی رہیں گی اور کبھی نہ کبھی اثر کریں گی ایک سبب باطنی بھی ہے
وہ یہ ہے کہ جب تم اُن کے پاس رہو گے اور تعلق بڑھا لو گے تو اُن کو تم سے محبت
ہو جائے گی تو اس سے دو طرح اصلاح ہو گی ایک تو یہ کہ وہ دعا کریں گے اور
اُن کی دعا مقبول ہوتی ہے تو حق تعالیٰ تم پر فضل فرما دیں گے اور اکثر یہ ہے کہ ان کی دعا
باذن حق ہوتی ہے تو ان کے مُنہ سے دعا نکلنا اس بات کی علامت سمجھنا چاہئے کہ حق
تعالیٰ کے فضل ہونے کا وقت ہی آگیا دوسری وجہ بڑی خفی ہے وہ یہ کہ تمہارے اعمال
میں اُن کی محبت سے برکت ہو گی اور جلد جلد ترقی ہو گی جو کام چار دن میں ہوا ایک
دن میں ہو گا اور بہت جلد اصلاح ہو جائے گی یہ ایسی بات ہے جس کو سائنس والے
نہیں سمجھ سکتے لیکن اگر وہ چاہیں تو بہت آسانی سے سمجھ بھی سکتے ہیں یہ لوگ ہر بات
میں نظیر مانگا کرتے ہیں دلیل سے ان کی سمجھ میں بات نہیں آتی اس کی نظیر بھی لیجئے وہ
یہ کہ ہم دیکھتے ہیں کہ مقناطیس میں ایک قوت جاذبہ ہے جس سے وہ لوہے کو کھینچ لیتا
ہے ہم کو اس کی کنہ بتلانے کی کوئی ضرورت نہیں ہم ایسے نظیر دیتے ہیں جو ان کے ہاتھوں
میں موجود ہے اس کی وجہ وہ خود بھی نہیں بیان کر سکتے مگر اس قوت جاذبہ کا انکار
نہیں کر سکتے کیونکہ ان کے سامنے موجود ہے بس یہی قوت جاذبہ اہل اللہ کے قلب
میں ہے جو طالب کو اور ان سے تعلق رکھنے والے کو ایسا ہی کھینچ لیتی ہے جیسے مقناطیس
لوہے کو کھینچ لیتا ہے لیجئے اب باطنی برکت کا بیان اہل سائنس کی سمجھ کی موافق بھی ہو گیا
یعنی اُن کے قلب میں ایک قوت کشش ہے جو طالب کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور انکا
قلب حق تعالیٰ سے ملا ہوا ہے تو نتیجہ یہ نکلا کہ طالب کے قلب کو اُن کی صحبت اور

برکت کا عقلی ثبوت

اہل اللہ کی صحبت سے اعمال میں برکت ہونے کا عقلی ثبوت

تعلق سے حق تعالیٰ کا قرب ہو جاتا ہے تو اُن کی صحبت سے نفع ہونے کے چار سبب ہوئے اُن کے پاس جاکر علوم نافعہ کا کان میں پڑنا اُن کے افعال کی تقلید کرنا انکی دعا اُن کی برکت جسکو میں نے سبب خفی کہا تھا اور جس کا بیان بحمداللہ بقدر ضرورت ہو گیا اہل اللہ کے پاس رہنے سے ان چار صورتوں سے اثر ہوتا ہے یہ بات کسی اور طرح حاصل نہیں ہو سکتی اسی واسطے کہا تھا ؎ نفس نتواں کشت الا ظل پیر - مولانا نے حصر کر دیا ہے اصلاح کو صحبت شیخ میں اور یہ بالکل سچی اور واقعی بات ہے کہ اصلاح بدون کسی کو بڑا بنائے ہوئے نہیں ہو سکتی بہت سے پڑھے لکھے اور دیندار لوگ بھی اس بات میں غلطی پر ہیں یوں سمجھتے ہیں کہ بس کتابوں کا پڑھ لینا اور مطالعہ میں رکھنا اصلاح کے لئے کافی ہے یاد رکھو کہ اور کتابیں تو کیا وہ کتابیں بھی جو اسی فن اصلاح اخلاق کی ہیں جیسے احیاء العلوم وغیرہ ان سے بھی اصلاح نہیں ہو گی جب تک کسی کے ماتحت نہیں بنو گے اور جب تک کوئی روک ٹوک کرنے والا نہ ہو گا اور جب تک کوئی یہ کہنے والا نہ ہو گا کہ تم بڑے نالائق ہو یہ حرکت کیوں کی یاد دکھو محض ایک بات کی بُرائی معلوم ہو جانے سے وہ بات چھوٹ نہیں جاتی دیکھو شرابی شراب پیتا ہے حالانکہ جانتا ہے کہ شراب بُری چیز ہے مگر اس جاننے سے شراب چھوٹتی نہیں ہاں اس سے چھوٹتی ہے کہ کوئی اس سے بڑا اس پر مسلط ہو اور جب یہ شراب پیئے تو تھوڑی سی گوشمالی کر دیا کرے اس میں اثر ہے اور اُس میں نہیں دیکھئے شراب جس کو پینے والا خود بھی بُرا جانتا ہے بدون کسی بڑے کے دباؤ کے نہیں چھوٹتی تو وہ بُرائیاں جن کی بُرائی خود فاعل کو بھی معلوم نہیں وہ بغیر دوسرے کی روک ٹوک کے کیسے چھوٹ سکتی ہیں اور وہ صفات جن کا اختیار کرنا نفس پر بہت شاق ہے نفس اُنکا خوگر بدون دباؤ کے کیسے ہو سکتا ہے جیسے تواضع جس کا ذکر ہو رہا تھا کیونکہ تواضع کے معنی چھوٹا بننے کے ہیں آدمی چھوٹا بننا کبھی گوارا نہیں کرتا تو جب تک کوئی بڑا اسپر مسلط نہ ہو اور یہی معنی ہیں ماتحت ہونے کے اُس وقت تک تواضع پیدا نہیں ہو سکتی غرض ترے علم سے اصلاح نہیں ہو سکتی بار بار ٹکرائی کرنے اور عادت ڈالنے سے ہوتی ہے اور عادت بدون دوسرے کو بڑا بنائے

اصلاح صحبت شیخ

ہوئے نہیں ہوسکتی اور اصل الاصول تمام اخلاق ذمیمہ کی کبر ہے اور اس کے شعبے اسقدر مخفی ہیں کہ بڑے بڑے علم والوں کو بھی پتہ نہیں چلتا جیسا کہ میں نے بیان کیا کہ بہت سے لوگوں میں کبر بصورت تواضع ہوتا ہے اور اس وصف میں اہل علم زیادہ حصہ رکھتے ہیں اور دیا سلائی کے مصالحہ کی طرح یہ مادہ سب میں موجود ہے کسی کو بے فکر نہ ہونا چاہئے نہ معلوم کس وقت رگڑ لگ جاوے اور جل اُٹھے اور سب خان و مان کو پھونک دے یہ کبر وہ چیز ہے جو سبب ہوا ہے ابلیس کے کافر ہونے اور رجیم ہونے کا حق تعالیٰ نے اسکے اور اس کے تمام شعبوں کی بُرائی بیان فرمائی ہے قبیل مثنوی المتکبرین میں اور چونکہ تمام اخلاق ذمیمہ کبر ہی سے پیدا ہوتے ہیں جیسا کہ تجربہ سے معلوم ہوتا ہے اور وقت وسیع ہوتا تو بقدر ضرورت بیان بھی کر دیتا تو اس اشارہ ہو گیا تمام اخلاق کے اصلاح کی ضرورت کے طرف یہاں تک بیان تھا کفار کی حالت کا قیامت میں اب آگے مومنین کی حالت کا بیان ہے فرماتے ہیں وسیق الذی اتقوربہم الی الجنۃ زمرًا۔ اس کا لفظی ترجمہ تو یہ ہے اور ہنکائے جائیں گے وہ لوگ جو حق تعالیٰ سے ڈرتے تھے یعنی مومنین جنت کے طرف گروہ کے گروہ ہنکائے جانے میں ایک معنی زبردستی کے پائے جاتے ہیں جو مسوق کی تذلیل کو مستلزم ہے گویا یہ معنی ہوئے کہ زبردستی دھکے دے کر مومنین کو جنت کی طرف لیجایا جائیگا حالانکہ اہل جنت کی تذلیل خلاف واقعہ سے عقل کے بھی خلاف ہے کیونکہ جنت محل اکرام ہے نہ محل تذلیل اور نقل کے بھی خلاف ہے کیونکہ ایک آیت میں صاف آیا ہے اولئک فی جنت مکرمون اسواسطے وسیق الذین اتقوا کے تفسیر میں مفسرین نے یہ لفظ لکھا ہے اے بلطف یعنی اہل جنت کو جنت کی طرف زبردستی لیجایا جائیگا مگر نہ تذلیل کے طور پر بلکہ لطف اور اکرام اور خوشی کے ساتھ جیسے کوئی اپنے بہت عزیز دوست کو بغل میں ہاتھ ڈالکر گھر کی طرف کھینچتا ہے کہ چلو جی جلدی کرو تم کو جانا پڑیگا ہم تم کو ہرگز نہیں چھوڑینگے اسی طرح اہل جنت کو فرشتے تقاضا کر کے جلدی جلدی بہشت کی طرف لے چلیں گے تو یہ سوق عزت کی بات ہے نہ ذلت کی اس کو سوق کہا گیا یہ مشاکلۃ کیونکہ اول گروہ کے

لئے سوق کا لفظ آچکا ہے گو دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے اس میں اشارہ ہو گیا
اس بات کی طرف کہ صورۃً دو چیزوں کا یکساں ہونا حقیقۃً یکساں ہونے کو مستلزم نہیں
سوق اہل جنت کے لئے بھی ہو گیا اور اہل دوزخ کے لئے بھی مگر دونوں میں باہم
کچھ نسبت نہیں اور یہ بات اخلاق میں بھی بہت مطرد ہے کہ خلق محمود و مذموم میں بہت
تشابہ ہوتا ہے اسی واسطے میں بار بار کہہ چکا ہوں کہ کسی مبصر کے سپرد کرو اپنے آپ
کو اپنی رائے کے بھروسہ پر نہ رکھو بسا اوقات تواضع حقیقت میں تکبر ہوتا ہے غرض
سوق دونوں گروہ کے لئے ہوگا مگر وہاں عذاب کے طرف ہوگا اور یہاں ثواب کے
طرف زمرًا کے معنی وہی ہیں جو پہلے گذرے یعنی جماعتیں کی جماعتیں حتیٰ اذا جاؤہا وفتحت
ابوابہا و قال لہم خزنتہا سلام علیکم طبتم فادخلوہا خلدین واؤ وفتحت کا حالیہ ہے یا عاطفہ
ہے اور دوسرے معطوفات اسی پر مترتب ہیں اور دونوں تقدیروں پر یہ سب جملے
اذا کے تحت میں ہیں اور ترکیب میں شرط میں آگے جزا ان کی بیان نہیں کی گئی کہ جب
یہ سب کچھ ہوگا تو کیا ہوگا یہ سب جنت کے باہر ہوگا جیسا کہ ادخلوا سے معلوم ہوتا ہے
کیونکہ ادخلوا صیغہ امر ہے جو چاہتا ہے استقبال کو اس کی تقریر پہلے فادخلوا ابواب
جہنم میں ہو چکی ہے جزا کے بیان نہ کرنے میں اشارہ اس طرف ہے کہ آگے ایک بات ہو تو
بیان کی جاوے جائے کیا کیا ہے کہاں تک بیان کیا جاوے نیز یہ کہ جو کچھ ہے وہ بات
کہنے کی ہے ہی نہیں جب دیکھو گے تب ہی سمجھ میں آوے گی یہ مضمون اس حدیث میں
صراحتہً موجود ہے اعددت لعبادی الصالحین مالا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر
علی قلب بشر یعنی حق تعالیٰ فرماتے ہیں میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے وہ چیزیں
تیار کی ہیں جو نہ کسی آنکھ نے دیکھیں اور نہ کسی کان نے سنیں اور نہ کسی کے دل میں
اس کا خیال آیا۔ پھر اگر وفتحت کا واو عاطفہ ہو تو یہ معنی ہوں گے کہ جنت کے دروازے
پہلے سے کھلے ہوئے نہوں گے بلکہ اُس وقت کھلیں گے جبکہ اہل جنت اُن کے پاس آویں گے
جیسے دوزخ کے دروازوں کے متعلق تھا کہ اُس وقت کھولے جاویں گے جس وقت
اہل جہنم اُن کے پاس آویں گے سو جہنم کے دروازے پہلے سے کھلے نہ ہونے کی وجہ

تو اور پر معلوم ہوئے اور جنت کے بارہ میں بھی ہمارے استاد رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کو اختیار کیا ہے کہ جنت کے دروازے بھی پہلے سے کھلے ہوئے نہ ہوں گے بلکہ بعد میں کھولے جاویں گے اور اسمیں چند نکتے ہیں ایک تو یہ نکتہ کہ عادت ہے کہ دفعتہً نعمت پر نظر پڑنے سے حظ زیادہ ہوتا ہے مثلاً ایک صورت تو یہ ہے کہ کسی کو ایک لاکھ روپیہ ملنے والا ہے اول اُس کو خبر ملی کہ کلکتہ میں میرا اتنا روپیہ ہے پھر وہاں سے اس کی روانگی کی خبر ملی کہ وہاں سے چلدیا پھر معلوم ہوا کہ الٰہ آباد بنک میں آگیا ہے پھر معلوم ہوا کہ مراد آباد کے خزانہ میں آگیا ہے حتی کہ لاکر سامنے رکھدیا گیا تو اس کو خوشی تو ضرور ہوگی مگر اتنی جتنی اس صورت میں ہوگی کہ ایک شخص کو مطلق خبر نہیں اور وہم و گمان بھی نہیں کہ میرا کہیں اتنا روپیہ ہے یک لخت کوئی سب روپیہ سامنے لاکر رکھدے کہ یہ تم کو ملا ہے اس صورت میں ایسا حظ ہوگا کہ عجب نہیں مارے خوشی کے شادی مرگ ہو جاوے ایسے واقعات ہوئے بھی ہیں یہی وجہ ہے کہ بعض جگہ کسی ملزم کو پھانسی کا حکم ہوا پھر اپیل میں رہائی کا حکم ہوا تو اس حکم کو یک لخت نہیں سنایا گیا اس وجہ سے کہ ناامیدی کے بعد ایک دم یہ خبر سُن کر کہیں مارے خوشی کے مر نہ جائے اس کی وجہ زیادت حظ و سروری ہے معلوم ہوا کہ ایکدم نعمت پر نظر پڑنے میں زیادہ حظ ہوتا ہے بہ نسبت نظر تدریجی کے اسواسطے جنت کے دروازے بند ہوں گے اور جب جنتی اس کے پاس پہونچیں گے تب ایک دم کھول دئے جائیں گے اور ایک نکتہ ہے اُس کے سمجھنے کے لئے دو مقدموں کے ملانے کی ضرورت ہے وہ یہ کہ اہل جنت جنت میں جانے کے بعد باہر نہیں نکلیں گے ایسی جگہ میں سے کون نکلنا گوارا کرتا ہے ہاں اہل دوزخ بعض بعض دوزخ میں سے نکلیں گے اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو چند روز کے بعد نجات پاکر نکالے جائیں گے غرض اہل جنت اندر جانے کے بعد پھر باہر نہ نکلیں گے ایک مقدمہ یہ ہوا اور ایک مقدمہ یہ ہے کہ جنت باہر سے بھی مزین ہے اگرچہ عادت یہ ہے کہ باغ کو باہر سے نہیں سجایا کرتے جیسا کہ مشہور ہے ع بنقاش احتیاجے نیست دیوار گلستاں را۔ مگر وہاں ایسا نہیں ہے وہاں اندر سے تو جنت ہے ہی جیسی ہے باہر سے بھی مزین اور مرصع ہے اور یہ ظاہر ہے کہ

باہر کی زینت ایسی نہیں ہوسکتی جیسی اندر کی ہوگی کیونکہ اندر کی زینت مقصود اصلی ہے اور باہر کی بالتبع اور مقصود اور تابع میں فرق ہوتا ہے تو اگر دروازے جنت کے پہلے سے کھول دئے جاویں تو اندر کی زینت کے سامنے باہر کی زینت کو کون دیکھے اسواسطے اول دروازے بند ہوں گے تاکہ باہر کی زینت کو بھی دیکھ لیں پھر کھولدئے جاویں گے کیونکہ پھر اندر سے باہر کون آوے گا نیز اس واسطے بھی جنت کے دروازے پہلے سے کھلے ہوئے نہ ہوں گے کہ جہنم میں تو لوگ بجبر و اکراہ جاویں گے تو اگر دروازے کھلے ہوئے ہونے کی کوئی وجہ ہوسکتی ہے تو جہنم کے لئے ہوسکتی ہے کہ سب سامان عذاب کا تیار ہوگا صرف ڈھکیل دینے کی ضرورت ہوگی اگر دروازے بند ہوں تو شاید کچھ دیر لگے اور یہاں تو خوشی سے جاویں گے اور ہر قسم کا اطمینان ہوگا تو مزے لیتے ہوتے اور سیر کرتے ہنستے بولتے ہوئے جاویں گے تو کیا جلدی ہے کہ دروازے پہلے سے کھلے ہوئے ہوں باہر کی سیر کرکرا کے جب اندر جانا چاہیں گے کھولدئے جائیں گے ان میں بعض نکتے حضرت استاذنا علیہ الرحمۃ کے ارشاد فرمائے ہوئے ہیں یہ تقریر اس صورت میں ہے کہ وفتحت کا واؤ عاطفہ لیا جاوے کیونکہ اسی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دروازے پہلے سے کھلے ہوئے نہ ہوں گے اور اگر واؤ کو حالیہ لیا جاوے تو حال قید ہوتا ہے عامل کے لئے تو معنی یہ ہوں گے کہ آئیں گے جنت کے پاس اس حال میں کہ دروازے کھلے پڑے ہوں گے اس صورت میں اس کا یہ مدلول ہوگا کہ دروازے پہلے سے کھلے ہوئے ہونگے اس کے لئے دوسرا نکتہ ہوگا کہ وہ بھی لطف سے خالی نہیں وہ یہ ہے کہ جنت مشتاق ہوگی اہل جنت کی جیسے کوئی بڑا عزیز مہمان گویا کسی کا بچہ مدت کے بعد دور دراز سے آوے تو اس کے لینے کے لئے ماں گود پھیلائے بیٹھی ہوتی ہے تو جیسے جنتی مشتاق ہیں جنت کے جنت بھی ان کی مشتاق ہے اور اس میں جو کچھ خدم وحشم حور و غلمان ہیں وہ سب بھی مشتاق ہیں۔ یہ مضمون حدیث سے بھی ثابت ہے۔ یہ تو اہل جنت کے لئے لذت جسمانی ہوئی کہ ایک قول پر دروازے بند ہوں گے اور سیر کرتے ہوئے اور باہر کی آرائش دیکھتے ہوئے اطمینان کے ساتھ جاویں گے پھر ایک دم دروازے کھولدئے جاویں گے یا دوسرے قول پر

جنت کے دروازے کھلے ہوئے ہونے کا نکتہ

دروازے کھلے ہوئے ہوں گے اور جنت اور ما فیہا ان کی مشتاق ہوں گی آگے لذت روحانی کا بیان ہے وقال لہم خزنتہا کہیں گے ان سے وہاں کے کارکن یعنی فرشتے سلام علیکم طبتم فادخلوہا خلدین۔ یہ اکرام ہے ان کا اور اظہار عظمت ہے کہ فرشتے ان کو سلام کریں گے اور مبارکباد دیں گے کہ تم اچھے رہے اب چین کرو اور جنت میں چلو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کیسی خوشی کا وقت ہے اہل جنت جوش میں آکر کہیں گے الحمد للہ الذی صدقنا وعدہ حق تعالیٰ کا شکر ہے جس نے ہم سے اپنا وعدہ پورا کیا ایمان لانے پر ہم سے جنت کا وعدہ کیا تھا سو اس کو کر کے دکھا دیا یہاں ایک معقول شبہ ہے وہ یہ کہ حق تعالیٰ کا وعدہ پورا ہونا تو واجب اور ضروری ہے اُسکے خلاف ہونا محال ہے پھر اس پر احسان ماننے اور شکر کرنے کے کیا معنی جو چیز ضروری اور یقینی ہے وہ تو ضرور ہی واقع ہوگی چاہے کوئی خوش ہو یا ناخوش اول تو یہ شبہ کسی نمک حرام ہی کو ہو سکتا ہے ورنہ سوچنے کی بات ہے کہ وعدہ کے بعد اس کا پورا ہونا یقینی سہی لیکن شروع سے وعدہ ہی کیوں کیا گیا ہمارا خدا تعالیٰ کے ذمہ کیا آتا تھا جو ہم سے وعدہ کیا گیا خود ہی مہربانی فرمائی کہ ہم کو ایک وعدہ کا امیدوار بنایا یہ وعدہ بھی ایک فضل ہے اور اس کا ایفاء بھی جو کہ اس وعدہ پر مرتب ہے دوسرا فضل ہے دوسرے یہ کہ وعدہ تو کیا تھا مگر کس شرط سے کیا تھا یعنی اُس کے ساتھ کچھ شرط بھی تھی اُس شرط کا پورا کر دینا یہ تو واجب نہ تھا اس کو محض اپنے فضل سے پورا کیا مان لیا جائے کہ ایمان لانا آپ کا فعل تھا مگر اُس پر جزاء موعود کا مترتب ہونا موقوف تھا اُس کے باقی رہنے پر اور یہ بقاء ایمان آپ سے نہیں ہو سکتا تھا یہ اُدھری سے فضل ہوا کہ اُس کو باقی رکھا گیا ممکن تھا کہ حق تعالیٰ اُس کو باقی نہ رکھتے تو اس صورت میں اُس جزا کے بھی آپ مستحق نہ ہوتے اور اُس وعدہ کا پورا ہونا جو ایمان پر کیا گیا تھا ضروری نہ ہوتا کیونکہ اس کی شرط نہ پائی گئی لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ اس شرط کو موجود کیا گیا اور اُس پر اس وعدہ کا ایفاء کیا گیا یہ محض فضل سے ہوا یا نہیں تو اب یہ احسان ماننا بالکل بجا ہوا کہ شکر ہے خدا کا جس نے اپنا وعدہ ہم سے پورا کیا

اہل جنت کے خوش ہونے پر ایک شبہ

اور یہ ہی معنی ہیں اس سوال کے ربنا وآتنا ما وعدتنا علیٰ رسلک ولا تخزنا یوم القیمۃ انک لا تخلف المیعاد کیونکہ اس پر بھی یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ جب وعدہ کر لیا گیا تو پھر اُس کے پورا کرنے کا سوال کیا معنی وہ تو خود ہی پورا ہوگا اُس کے خلاف تو ہو ہی نہیں سکتا پھر مانگنے کی کیا ضرورت ہے اس کا جواب بھی یہی ہے کہ وعدہ بیشک کیا گیا ہے لیکن وہ وعدہ مشروط ہے بقاء ایمان کے ساتھ تو سوال درحقیقت اس بات کا ہے کہ یا اللہ ہم کو رسولوں کے طریقوں پر قائم رکھنا تاکہ اس وعدہ کے ہم مستحق ہوں تیسرے ایفاء جو واجب ہے تو واجب علی اللہ نہیں ہے کہ موجب احسان نہ ہو واجب من اللہ ہے اور وہ موجب احسان ہو سکتا ہے واورثنا الارض اور وارث بنایا ہمکو زمین کا اس زمین سے مراد جنت کی زمین ہے کیونکہ جنت ہی کا بیان ہو رہا ہے نیز آگے اس کی تصریح تتبوأ من الجنۃ میں موجود ہے اس سے معلوم ہوا کہ جنت میں بھی زمین ہے اور اس کے مقابلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب زمین ہے تو آسمان بھی ہے اور یہ ثابت ہے کہ جنت کے لئے خلود ہے تو اس کے آسمان اور زمین کے لئے بھی خلود ہوا تو اس سے ایک اور آیت کا اشکال بھی رفع ہوتا ہے وہ آیت وہ ہے جسمیں اہل جنت اور اہل دوزخ دونوں کے لئے یہ لفظ ہے خلدین فیہا ما دامت السموات والارض جس کا ترجمہ یہ ہے کہ جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں اُس وقت تک رہیں گے جسوقت تک زمین و آسمان رہیں گے جس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ جنت اور نار دونوں میں قیام کے لئے ایک خاص مدت مقرر ہے جو کہ مدت ہے بقاء سماوات وارض کی اور جب کوئی مدت مقرر ہوئی تو خلود کہاں رہا اور یہ دوسری تصریحات کے خلاف ہے اس اشکال کے جواب کے لئے لوگوں نے تاویلیں کی ہیں ایک تاویل جو تفسیر مذکور کی بناء پر ہے یہ ہے کہ سماوات وارض سے مراد جنت کے آسمان اور زمین ہیں اور جنت کے لئے خلود ہے تو ان کے واسطے بھی خلود ہے تو گو دونوں فریق کے لئے مدت مقرر کی گئی مگر وہ مدت خود لامتناہی ہے تو ان کا رہنا بھی لامتناہی ہوا اور یہی معنی مخلود کے ہیں

باوجود دوزخ کے ہمیشہ رہنے کے اللہ تعالیٰ سے رسولوں کی معرفت مانگیں

جنت میں زمین آسمان بھی ہیں

ہمیشہ رہنا جنت اور دوزخ کا سماوات وارض کے ہمیشہ رہنے پر موقوف نہیں

تو یہ معنی ہوئے کہ اہل جنت اور اہل دوزخ جنت اور دوزخ میں رہیں گے جبتک دونوں کے آسمان اور زمین کا وجود ہے اور ان کا وجود کب تک ہے ہمیشہ کے لئے ہے اور ان کا رہنا بھی ہمیشہ کے لئے ہوا باقی اس آیت میں جو لفظ الا ماشاء ربک وارد ہے مختصراً اُس کو بھی سمجھ لینا چاہئے یہ استثناء ہے خلود سے معنی یہ ہیں کہ خلود ہوگا مگر اُن کے لئے جن کو حق تعالیٰ نہ چاہیں تو اس سے ظاہراً سمجھ میں آتا ہے کہ کوئی جنت سے نکالا بھی جاویگا حالانکہ یہ خلاف واقع اور خلاف تصریحات نصوص ہے اس کی توجیہ یہ بیان کی گئی ہے کہ استثناء کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں ایک وہ جو بعض اہل نار کے لئے ہوگی بعض لوگ (یہ عصاۃ مؤمنین ہیں) گناہوں کی وجہ سے چند روز کے لئے جہنم میں جاویں گے پھر نکال لئے جاویں گے تو خلود نہ ہوا یہ تو اہل جہنم کے لئے ہے اور اہل جنت کے لئے خلود نہ ہونے کی یہ صورت ہوگی کہ بعض گنہگار اولاً جہنم میں جاویں گے پھر جہنم سے نکالکر جنت میں جاویں گے اور جنت میں ہمیشہ بطور خلود کے رہیں گے اور کبھی نکالے نہ جاویں گے مگر یہ خلود انکا ابتدا کی طرف سے اُن لوگوں کے خلود سے کم ہے جو ابتداءً جنت میں جاویں گے تو خلود جنت بھی بعض کے لئے اسی طرح استثناء کا مصداق بن سکتا ہے یہ تاویل اکثر لوگوں نے لکھی ہے ما دامت السموات والارض کی اور بعض اہل زیغ اس قید کو دیکھ کر اس کے قائل ہوگئے کہ جنت اور نار فنا ہوجاویں گے اور خلود سے مراد مکث طویل لے لیا اور یہ کہا کہ گو جنت اور نار کا ہزاروں لاکھوں برس قیام رہے مگر اخیر میں فنا ہوجائیں گے لیکن یہ بالکل غلط اور اہل حق کے عقیدہ کے خلاف ہے اہل حق سب خلود ہی کے قائل ہیں اور انھوں نے اس آیت ما دامت السموات والارض میں وہی تاویل کی ہے جو میں نے بیان کی اس تاویل سے معنی بن گئے اور اشکال رفع ہوگیا مگر ایک معنی اور بھی ہوسکتے ہیں (ابتدا میں میں نے کہا تھا کہ آج کے بیان میں میں اپنی طرف سے کچھ نہ کہوں گا مگر عادت پڑی ہوئی ہے کہ جب کوئی مضمون قلب میں آجاتا ہے تو بلا بیان کئے طبیعت نہیں مانتی علت جاتے ہی جاتے جاوے گی تو اسوقت

مادامت السموات والارض میں نکتہ

میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے اُس کو میں بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ تاویل مذکور بن تو گئی اور اشکال رفع ہو گیا لیکن اس عنوان سے فائدہ کیا نکلا خلدین فیہا کے بعد مادامت السموات والارض کی ضرورت کیا تھی یہ کیوں فرمایا کہ ہمیشہ رہینگے جب تک جنت کے آسمان زمین رہیں گے بیان خلود کے لئے تو خلدین فیہا بھی کافی تھا اس عنوان سے تو خواہ مخواہ ایک اشکال پیدا ہو گیا یہ جملہ نہ ہوتا تو کوئی بھی اشکال نہ ہوتا یہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ تاکید ہے خلود کی یہ ایسا ہے جیسے کسی کو کہیں تمھیں گانوں دیا پوچھا گیا کب تک کے لئے جواب دیا جب تک گانوں ہے اسکے معنی یہ نہیں ہوئے کہ مدت کی تحدید کر دی کہ جب تک گانوں آباد ہے اس وقت تک یہ زمین اُس کو دی اور جب گانوں اُجڑ جاوے تو واپس لے لی جاوے گی۔ بلکہ یہ لفظ اس واسطے کہا گیا ہے کہ عادت یہ ہے کہ گانوں مدتوں رہتا ہے آدمی کی عمر سے زیادہ گانوں کی عمر ہوتی ہے تو یہ مراد ہے کہ تمھیں تمام عمر کے لئے اور ہمیشہ کے لئے دیا گیا غرض یہ کہنا کہ جب تک گانوں ہے اس معنی میں آتا ہے کہ ہمیشہ کے لئے دیا گیا اور کبھی واپس نہیں لیا جائیگا قرآن شریف میں محاورات کی رعایت بہت ہے تو مادامت السموات والارض سے مراد تحدید نہیں بلکہ وہ ہی معنی مراد ہیں جو اس لفظ سے مراد تھے کہ جب تک گانوں ہے رہا یہ کہ ان دو ہی چیزوں کو کیوں بیان کیا یعنی سماوات اور ارض کو یوں کیوں نہ فرمایا مادامت الجنت اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ مکان میں چھت اور فرش اصل ہوتا ہے تو تمام اجزا میں سے ان اجزا کا نام لیا جو اصل ہیں تو اب یہ ایسا ہو گیا جیسے کسی کو گانوں میں گھر دیں اور کہیں یہ گھر تمھیں دیا اس وقت تک کے لئے جب تک کہ یہ گانوں ہے کہ اس سے مراد یہی ہوتی ہے کہ ہمیشہ کے لئے اور گانوں کا نام اس واسطے لیا گیا ہے کہ اگر گھر کا نام لیتے اور یوں کہتے کہ جب تک گھر ہے تو ہمیشگی پر دلالت نہ ہوتی کیونکہ گھر منہدم ہونے والا ہے اور گانوں منہدم ہونے والا نہیں تو گانوں کا نام لینے سے ہمیشگی پر دلالت ہو گئی اسی طرح جنت کے ان اجزا کا نام لیا جو اصل اور عمود ہیں اور بہ نسبت دیگر اجزاء

کے عادتاً دیر پا ہوسکتے ہیں تو اس سے اور تاکید ہوگئی خلود کی یہ نکتہ ہوا ما دامت السمٰوٰت والارض میں واللہ اعلم) واورثنا الارض مالک بنا دیا ہم کو زمین کا یعنی جنت کی زمین کا جب کہ آگے تصریح موجود ہے اور کسی خاص حصہ کا مالک نہیں بنایا بلکہ نتبوأ من الجنۃ حیث نشاء جنت میں سے جہاں ہم چاہیں جگہ لے سکتے ہیں یہ آزادی ہوگی کہ جہاں جسکا جی چاہیگا وہاں پہنچ جائیگا ایسا نہ ہوگا جیسے کوئی نظر بند ہوتا ہے کہ کسی ایک باغ میں یا ایک شہر میں رہتا ہے کہ اس سے باہر نہیں جاسکتا اہل جنت کے لئے کوئی حد نہ ہوگی بے قید کھلے آزاد ہوں گے جہاں چاہیں جائیں جو چاہیں کریں دوستوں سے ملیں نہ خانہ میں رہیں دیواروں سے لپٹیں چھت پر چڑھیں غرض کسی قسم کی روک ٹوک نہ ہوگی کسی بات سے دل مارنا نہ پڑے گا عجب لطف ہوگا بقول مولانا محمد یعقوب صاحب کے چھوٹی سی خدائی ہوگی چھوٹی سی کے معنی یہ ہیں کہ حقیقی خدائی میں تو سب کچھ اختیار اور ارادہ سے ہوتا ہے اور اس میں اُن کے اختیار سے تو کچھ نہ ہوگا مگر مرضی کے موافق سب کچھ ہوجاویگا یعنی جس چیز کو ان کا جی چاہے گا فوراً حق تعالیٰ اس کو حکم دیں گے اور وہ ہوجاے گی یہی معنے ہیں اس آیت کے لکم فیہا ما تشتہیہ الانفس و تلذ الاعین ترجمہ تمہارے واسطے اے اہل جنت جنت میں وہ ہے جس کو تمہارا دل چاہے اور جس سے آنکھیں لذت پائیں ما کا لفظ عام ہے تو جو کچھ کسی کا جی چاہے وہی ہوگا مثلاً چھت دار مکان میں بیٹھے ہیں اور دل چاہا کہ چھت نہ رہے تو چھت فوراً ہٹ جائیگی یا میدان میں ہیں اور جی چاہا کہ اس جگہ چھت دار مکان ہوتا تو فوراً خدائے تعالیٰ کے حکم سے ایک آن میں جیسا مکان خیال میں آیا تھا ویسا ہی موجود ہوجائیگا اور جی چاہا کہ سائبان نہ رہے تو فوراً ہٹ جائیگا ایک پرند خوبصورت درخت پر بیٹھا ہے جی چاہا کہ اس کے کباب کھاتے بس یہ خیال آنا تھا اور وہ کباب بن کر قاب میں تیار ہوکر سامنے آگیا مزے سے کھائے لطف یہ کہ یہاں کباب کھائے گئے اور اُدھر دیکھتے ہیں کہ وہی پرند بزرگوار بیٹھے چہچہا رہے ہیں جنت کی ہوا میں حیات ہے جیسے کسی نے کشمیر کی تعریف میں کہا ہے ؎

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر در آید گر مرغ کباب ست کہ بابال و پر آید

(یہ عرفی کا شعر ہے) یہ کشمیر کے بارہ میں تو مبالغہ ہے اور جنت کے بارہ میں حقیقت ہے قرآن شریف میں اس کی تصریح موجود ہے اکلہا دائم یعنی اس کے میوے ہمیشہ رہنے والے اور غیر فانی ہیں میوہ درخت سے ٹوٹ کر آنے کے بعد کھالیا جائے گا اور درخت پر بھی موجود رہے گا اس پر ایک معقولی صاحب نے اعتراض کیا کہ جب وہ کھالیا گیا تو فنا ہو گیا۔ پھر دوام کہاں رہا میں نے کہا دوام نوعی مراد ہے نہ کہ شخصی یعنی جس کو کھایا وہی نہیں رہیگا بلکہ اوسی جنس کا دوسرا اُس کی جگہ فوراً پیدا ہو جائیگا تو دائم صحیح رہا غرض جو چاہیں گے فوراً موجود ہو جائے گا دھوپ چاہیں تو دھوپ ہو جائے گی سایہ ہٹ جائیگا اس سے مراد دنیا کی سی دھوپ نہیں جس سے تکلیف ہو بلکہ وہاں کی سی دھوپ جو جنت کے لائق ہے جس سے تکلیف بالکل نہ ہو یہ اسواسطے کہہ دیا کہ شاید کوئی اعتراض کرے کہ قرآن میں تو صاف موجود ہے لایرون فیہا شمسا ولا زمہریرا یعنی اہل جنت جنت میں نہ دھوپ پائیں گے اور نہ سردی اس سے معلوم ہوا کہ جنت میں دھوپ نہ ہوگی اور میں نے کہا کہ کوئی دھوپ کو چاہے تو جنت میں دھوپ بھی ہو جائے گی مطلب یہ ہے کہ ایسی دھوپ نہ ہوگی جس سے تکلیف ہو زمہریر کے مقابلہ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کیونکہ زمہریر سخت سردی کو کہتے ہیں تو مطلب یہ ہوا کہ وہاں نہ ایسی چھاں ہوگی جس سے سردی لگے اور نہ ایسی دھوپ ہوگی جس سے گرمی لگے پس ایسی دھوپ کا ہونا جو موجب تکلیف نہ ہو اس آیت کے خلاف نہ ہوا اور وہ بھی ہر وقت نہیں بلکہ اگر کسی کا جی دھوپ کو چاہے تو ہو جائے گی بعضوں کا دل چاہیگا کہ ہمارے بیٹا ہوتا (ہائے کوئی بے اولاد ہوگا) یہ بھی ہو جائیگا وہاں کیا دیر لگتی ہے فوراً تیار پلا پلایا برابر کا فرزند موجود۔ کسی کا کھیتی کو دل چاہے تو آناً فاناً میں کھیتی تیار اور غلہ کھایا ہوا صاف شدہ سامنے آکر ڈھیر ہو گیا یہی سوال حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا گیا تو ایک شخص نے کہا کہ یہ کھیتی مانگنے والا کوئی انصاری ہوگا یہ اسواسطے کہا کہ انصار اہل زراعت تھے میں نے اپنے استاذ علیہ الرحمۃ

اکھلہا دائم پر ایک معقولی کا شبہ

جنت میں دھوپ بھی ہوگی

جنت میں اولاد بھی ہوگی

سے سُنا ہے اُن کی نظر بہت وسیع ہے غالباً کسی روایت میں دیکھا ہوگا کہ جنت میں یہ بھی ہوگا کہ ایک پھل ہاتھ میں لیا کھانے کے لئے اور اُس میں سے ایک دم ایک حور نکل آئی السلام علیکم پس دیکھ کر طبیعت پھڑک گئی بعض میں سے ایک جوڑا پوشاک کا نکلی آہ یا یہ بھی ایک حظ ہے کہ ایک نامعلوم چیز دفعۃً پیدا ہو جاوے نعمت کے ملنے سے خوشی تو ہر طرح ہوتی ہے لیکن اگر اس طرح ملے کہ اس کا وہم و گمان بھی پہلے سے نہ ہو تو عجب حظ ہوتا ہے ایک رئیس کا قصہ اپنے استاذ علیہ الرحمۃ سے سُنا ہے کہ ان کے یہاں دو قصباتی مہمان آئے تو باورچی نے اُن کے سامنے ناشتہ لاکر رکھا جس میں صرف ایک دسترخوان ڈیڑھ بالشت کا اور ایک چھوٹا پیالہ قورمہ کا اور ایک تشتری بیٹھے چانول کی اور چار پتلی پتلی چپاتیاں اس مختصر ناشتے کو دیکھ کر مہمانوں کا جی جل گیا اور دل میں کہا کہ یہ رئیس لوگ جیسے خود کم کھاتے ہیں جسکی وجہ دودھ گھی کی کثرت ہے ایسے ہی دوسروں کو بھی سمجھتے ہیں خیر جبراً قہراً وہ چانول اور چپاتیاں جھلا کر جلدی سے ختم کر دیں اور چپ ہو کر بیٹھ رہے خادم نے کہا حضرت نوش فرمایئے یہ اور جل گئے اور کہا کیا کھائیں اُس نے پیالہ کو اُٹھا کر توڑ کر سامنے رکھدیا یہ نمکین بالائی جمائی ہوئی تھی اس کے بعد اس تشتری کے بھی ٹکڑے کر کے آگے رکھ دئے وہ میٹھی بالائی تھی پھر دسترخوان اُٹھا کر ٹکڑے کر کے سامنے رکھدیا کہ جناب ابھی تو بہت کھانا موجود ہے آپ گھبرایئے نہیں یہ دسترخوان باقرخانی روٹی تھی پورا دسترخوان اُن سے کھایا بھی نہ گیا اور پیٹ بھر گیا تب اُنکی آنکھیں کھلیں دیکھئے اگر پہلے ان مہمان صاحب سے کہدیا جاتا کہ دسترخوان یہ ہے اور پیالہ یہ ہے تو اتنا حظ نہ آتا جتنا کہ دفعۃً معلوم ہونے کے بعد کھانے سے ہوا اس سے ثابت ہوا کہ نعمت کا ایک غیر متوقع صورت اور نئی طریق سے نمودار ہونا باعث زیادت حظ کا ہوتا ہے اسکے واسطے کوششیں کی جاتی ہیں اور روپیہ خرچ کیا جاتا ہے۔ ایک مسلمان راجہ نے ایک مرتبہ لفٹنٹ گورنر کے لئے کسی کاریگر سے ایک مٹھائی کا انار بنوایا جسکی صورت بالکل انار کی سی تھی دانے بھی ویسے ہی تھے چھلکا بھی ویسا ہی تھا مگر تھی سب

مٹھائی ایک انار کے بنوانے میں ڈیڑھ سو روپیہ خرچ ہوئے تھے (دیکھئے خدا تعالیٰ کی نعمتیں کہ دو سو روپیہ میں ایک انار تیار ہوا اور پھر بھی نقلی کا نقلی کہ نہ اس میں دانہ اصلی جیسا نہ گٹھلی اصلی جیسی بس صورت ہی صورت تھی اور خدا کے بنائے ہوئے اصلی انار جن کی برابر یہ دو سو روپیہ کا انار کبھی نہیں ہو سکتا پیسہ کے دو دو آتے ہیں سبحان اللہ) اور ایک شخص نے بیان کیا کہ کسی دعوت میں ایک قاب میں چنبیلی کے پھول لائے گئے کہ وہ حقیقت میں چاول پکے ہوئے تھے کاریگر کی صنعت اور محنت دیکھئے کہ کوئی مصالحہ تیار کیا جس میں ایک ایک چاول کو آدھا آدھا ڈبو کر پکایا تھا اس کے اثر سے وہ آدھا پھول کی طرح کھل گیا اور آدھا ڈنڈے کی طرح رہ گیا اور بالکل یہ معلوم ہوتا تھا کہ قاب چنبیلی کے پھولوں سے بھری ہوئی ہے پھول اُٹھانے کے لئے ہاتھ ڈالا گیا تو معلوم ہوا کہ چاول ہیں اور کھانے کی چیز ہے دیکھئے کتنا بکھیڑا کیا گیا صرف اسواسطے کہ نیا حظ حاصل ہو اسی طرح جنت میں طرح طرح سے نئے حظ حاصل ہوں گے پھل میں سے کوئی پرند خوش الحان نکل آیا یا کوئی حور نکل آئی تاکہ اہل جنت کو ایک جدید حظ حاصل ہو سبحان اللہ تبتوا من الجنۃ حیث تشاء ترجمہ ہم جنت میں جہاں چاہیں جا سکتے ہیں اہل جنت سیر کرتے پھریں گے اور بالکل آزادی ہوگی جہاں چاہیں پھریں اور جہاں چاہیں رہیں کہیں روک ٹوک نہ ہوگی بالکل مخلے بالطبع ہوں گے اس آزادی کا ترجمہ کسی مسخرہ نے آوارہ گردی کیا تھا خیر لفظی ترجمہ تو بُرے عنوان سے یہ ہو سکتا ہے مگر یہ وہ آوارہ گردی نہیں ہے جو دنیا میں بُری سمجھی جاتی ہے کیونکہ آوارہ گردی دنیا میں اس وجہ سے عیب ہے کہ مانع عن الکمالات ہے دنیا میں ضرورت ہے انسان کو بہت سے کمالات حاصل کرنے کی پڑھنے لکھنے کی صنعت وحرفت حاصل کرنے کی روپیہ کمانے کی مکان بنانے کی اولاد حاصل کرنے کی وغیرہ وغیرہ اور ان سب کی تحصیل چاہتی ہے مشغولیت اور مصروفیت کو جس سے آوارہ گردی مانع ہوتی ہے لہذا عیب سمجھی جاتی ہے اور جنت میں کوئی کمال حاصل کرنا نہیں ہے وہاں ہر چیز کا ذمہ حق تعالیٰ نے لیا ہے۔ ہمکو کسی مصروفیت اور مشغولیت کی ضرورت

ایک دعوت میں چنبیلی کے پھول چاولوں کے بنائے گئے

اہل جنت جہاں چاہیں جا سکیں گے آزادی کا ترجمہ کسی نے کیا آوارہ گردی

دنیا کی اور جنت کی آزادی کا فرق

نہیں تو وہاں ادھر اُدھر آزاد پھرنا جس کو آوارہ گردی سے تعبیر کیا تھا کسی کمال کی تحصیل میں مانع نہیں بلکہ تمام کمالات کے حصول کا ثمرہ ہے کہ ہم ایسے فارغ ہیں کہ کسی کمال کی تحصیل باقی نہیں پھر آزادی سے کیوں نہ پھریں اس واسطے خوشی میں کہتے ہیں تبوأ من الجنۃ حیث نشاء اس میں یہ بھی داخل ہے کہ اہل جنت آپس میں احباب سے بھی مل سکیں گے۔ امام شافعی صاحب فرماتے ہیں کہ مجھے جنت کی اُس وقت سے تمنا ہوگئی جب سے سُنا ہے کہ وہاں دوستوں سے ملاقات ہوسکے گی اس سے معلوم ہوا کہ دوستوں سے ملنا بڑی چیز ہے اور ایسی نعمت ہے جسکی وجہ سے جنت کی تمنا کی گئی گویا جنت ذریعہ ہے دوستوں سے ملنے کا تو دوستوں سے ملنا لذات جنت کا مکمل ہوا مگر وہی دوست جو خدائی دوست ہیں فنعم اجر العاملین ط ترجمہ پس کیسا اچھا اجر ہے عمل کرنے والوں کا اس سے معلوم ہوا کہ یہ جنت اور ما فیہا جو کچھ ملا ہے یہ سب عمل کی بدولت ملا ہے بڑی چیز عمل ہے جس سے آجکل غفلت ہے عوام کی تو کیا شکایت کی جاوے اس واسطے کہ وہ علم ہی نہیں رکھتے جو شخص ایک چیز کو جانتا ہی نہیں وہ اگر اس کے متعلق کوئی غلطی کرے تو چنداں تعجب کی بات نہیں تعجب اس شخص سے ہوتا ہے جو جانتا ہے اور پھر غلطی کرتا ہے ایک شخص وہ ہے کہ زہر کو پہچانتا اور جانتا ہی نہیں وہ اگر کھالے تو کچھ تعجب نہیں اور اُس شخص سے بہت تعجب ہوگا جو زہر کو پہچانتا اور جانتا ہے اور پھر کھاتا ہے گو اس پر چاندی کا ورق لپیٹکر یا قند چڑھاکر اور کیوڑہ اور بیدمشک کی خوشبو دیکر کھاتا ہو اس کو کوئی معذور نہیں کہے گا آجکل خدا کا نام لینے والے اور طریق کو جاننے والے دو گروہ ہیں اہل علم اہل احوال بلفظ دیگر علماء اور فقراء ایک گروہ علم پر مرتا ہے اور ایک فریق احوال پر علما اس میں مست ہیں کہ پڑھے جاؤ اور پڑھائے جاؤ فلانے کا قول اس میں یہ ہے اور فلانے کا یہ ہے اور بڑی دوڑ ان کی قیل و قال ہے جسکی نسبت کہا گیا ہے ؎

علم ظاہر سر بسر قیل ست و قال ۔۔۔ نے از و کیفیتے حاصل نہ حال

جنت کی بدولت اعمال ہے

جنت میں ملاقات احباب کی تمنا ہے

احباب سے ملاقات جنت کے لئے بمنزلہ ذریعہ کے ہے

جنت کی بدولت ملنا

دو گروہ علماء و فقراء

علماء کا حال

ان کا خیال اس طرف کبھی نہیں جاتا کہ کسی چیز کا علم مقصود بالذات بھی ہوتا ہے یا مقصود کسی خاص چیز سے تمتع ہے اور علم صرف اسکا ذریعہ ہے مثلاً مٹھائی ایک لذیذ چیز ہے اور قوی اور کثیر الغذا شے ہے تو کیا صرف اس کی ماہیت کا جان لینا یا اسکے خواص کا جان لینا مقصود ہے اور یہیں انتہا کر دینا چاہئے یا مقصود مٹھائی کا کھانا اور اس سے لذت اُٹھانا اور بدن کو پرورش کرنا ہے اور اُس کی ماہیت اور خواص کا علم ان اغراض کے حصول کا ذریعہ ہے ظاہر بات ہے کہ مقصود اور کام کی بات ثانی ہے نہ کہ اول علما اسی غلطی میں مبتلا ہیں کہ علم دین کو مقصود سمجھ رکھا ہے اور تمتع بالدین کو نہیں میں ان دونوں میں فرق بتاتا ہوں اور وہ کچھ غامض بات نہیں فرق وہی ہے جو مٹھائی کی ماہیت اور خواص کے جاننے اور مٹھائی کے کھانے میں ہے اصل غلطی یہ ہے کہ دین نام رکھا ہے صرف احکام دین کے جاننے کا اور جب یہ حاصل ہے تو سمجھتے ہیں کہ ہم کو دین حاصل ہے حالانکہ دین نام ہے اس تعلق کے درست کرنے کا جو بندہ اور حق تعالیٰ کے درمیان میں ہے جس کے لئے مختصر اور جامع لفظ عبودیت ہے اس کے حاصل کرنے کا نام دین ہے اور یہ کوئی ایسی بات نہیں جو بلا اہتمام حاصل ہو جائے بلکہ اس کے لئے کچھ طریقے ہیں جنکو خود خدائے تعالیٰ نے بتایا ہے اور وہ ایسے طول طویل اور غامض ہیں جن کے بتانے اور سمجھانے کے لئے انبیا علیہم السلام کو بھیجنے کی ضرورت ہوئی وہ مدرک بالرائے نہیں اُن طریقوں کے جاننے کا نام علم دین ہے تو چونکہ یہ اچھی اور ضروری چیز کا علم ہے اس واسطے یہ بھی اچھا اور ضروری ہے لیکن مقصود بالذات نہیں بلکہ محض ذریعہ ہے تو ذریعہ میں مست ہو جانا مقصود سے رہجانا ہے اور اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک حلوائی کامل فن ہے اور بڑا استاد ہے تمام شہر اس کا شاگرد ہے کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ مٹھائی ایسی نہیں جس کا بنانا وہ نہ جانتا ہو اور سارے عمر اُس نے یہی کام کیا کہ مٹھائی بنائی اور بیچی اور لوگوں کو کھلائی لیکن میں بقسم کہتا ہوں کہ اگر اُس نے مٹھائی کو مُنھ میں نہ رکھا ہو تو سارے عمر میں اُسکا منھ میٹھا ایک دفعہ بھی نہ ہوا ہوگا۔ اس سے تو وہ شخص اچھا ہے جس کو مٹھائی بنانی تو ایک بھی نہیں آتی مگر لڈو اُسی سے خرید کر یا مانگ کر یا جسطرح بھی

علماء مقصود علم کو سمجھ رکھا ہے نہ تمتع بالعلم کو

مقصود اصلی عبودیت ہے

ہو گو دمیں بھر رکھے ہیں اور کھا رہا ہے اور مزے لے رہا ہے اور کھا کھا کر موٹا ہو رہا ہے
اُس جاننے والے سے یہ نجاننے والا اچھا کہ مزے تو لے رہا ہے اور مقصود اس کو حاصل ہے
یہی حالت ان عالم صاحب کی ہے کہ سارے عمر علم دین کی خدمت میں صرف کی اور
علم کو بڑھاتے چلے جاتے ہیں اور تمام شہر انکا شاگرد ہے ہزاروں کو ان سے فیض ہو رہا ہے
مگر حقیقت حال یہ ہے کہ یہ اُس حلوائی کی طرح گدی پر چڑھے بیٹھے ہیں اور شاگردوں کو بھی
ہتلا رہے ہیں اور مٹھائی تمام شہر کو بھی کھلا رہے ہیں مگر خود کبھی نہیں کھائی تو واللہ باللہ
ان کا مُنہ میٹھا نہیں ہوئے کا ہزاروں آدمی ان کی بدولت دیندار ہو جاویں گے مگر
ان کو دین کا ذائقہ بھی نہیں معلوم ہوئے کا پس دین نام اس تعلق کا ہے جو حق تعالےٰ
کے ساتھ ہے جس کا نام عبودیت ہے جس کی ضد تکبر ہے اہل علم اس کو غور کریں کہ
ان میں عبودیت ہے یا اس کی ضد بس اس کی تفصیل میں زیادہ نہیں کرتا کیونکہ وہ علم
رکھتے ہیں اور ان کی ماہیتوں کو وہ خود جانتے ہیں بس شکایت میں اس کی کرتا ہوں
کہ اپنے احوال میں غور کیوں نہیں کرتے اور کیوں ہر وقت نگرانی نہیں رکھتے اور اگر خود
سمجھ میں نہیں آتا تو کسی فن کے جاننے والے سے کیوں نہیں مشورہ کرتے اور
کیوں اس کے سامنے اپنے حالات عرض نہیں کرتے تاکہ وہ بتلائے کہ اتنا حصہ
اس میں عبودیت کا ہے اور اتنا تکبر کا علم کو منتہائے عروج کیوں قرار دے لیا ہے
مگر جیسا کہ دوسروں کی اس سے اصلاح کرتے ہیں اپنی بھی تو کریں مٹھائی بیچ بیچ کر
دوسروں کا مُنہ میٹھا کرتے ہیں اپنا بھی تو کریں اب سمجھ میں آگیا ہوگا کہ علم دین اور
تمتع بالدین میں کیا فرق ہے تمتع بالدین مقصود ہے علم دین بالذات مقصود نہیں ہاں
علم ذریعہ ہے تو ذریعہ کو حاصل کر کے بیٹھ نہ رہو ذریعہ کو مقصود نہ بناؤ بلکہ اُس سے
وہ چیز حاصل کرو جسکا وہ ذریعہ ہے سیڑھی بناؤ چھت پر چڑھنے کے لئے بدون اسکے
کام نہ چلیگا مگر سیڑھی بنانے ہی میں نہ رہ جاؤ بلکہ چھت پر بھی تو چڑھو اور سیڑھی
بھی اتنی ہی بناؤ جتنی چھت پر چڑھنے کے لئے کافی ہو نہ یہ کہ ہزاروں گز لمبی بنائے
جاؤ اور ساری عمر اس میں صرف ہو جاوے چاہے چھت پر بارش ہوتی رہے اور

ٹپک ٹپک کر گر ہی پڑے اور سارے گھر کو لے بیٹھے غرضکہ علم ذریعہ ہے عبودیت حاصل کرنے کا اس کو خود مقصود مت بناؤ بلکہ اس کے ذریعہ سے عبودیت حاصل کرو اور اس کو اتنا نہ بڑھاؤ کہ ساری عمر اس میں صرف ہو جاوے مقصود کی تکمیل رہجاوے اور نفس و شیطان تمہارا کام تمام کر دیں اور ایسی حالت میں موت آجاوے بس مقصود پر نظر رکھو خوب سمجھ لو کہ اگر عالم اور محقق نہ ہو سکے تو کچھ حرج نہیں اور بندہ ہو گئے تو حرج ہے عبودیت حاصل کرو اور یہ ہی سمجھو کہ عبودیت نام صرف نماز روزہ کا نہیں بلکہ اصلاح باطن اور تہذیب اخلاق بھی اس کا جزو ہے بلکہ جزو اعظم ہے تمام اجزاء دین کی تکمیل کا نام دین ہے عبادات معاملات معاشرات عادات اخلاق سب دین ہی ہیں صرف عبادات پر بھی بس نہ کرو نرے علم پر بس کرنا تو کیا یہ تو فرقہ علماء کی کوتاہی کا بیان ہوا اب لیجئے فقرا کو کہ وہ صرف کیفیت و حال میں مست ہیں علمانے علم کو مقصود سمجھا تھا انھوں نے حال کو مقصود سمجھا ہے حالانکہ مقصود ابھی دور ہے اگر کسی کو کشف ہونے لگا یا رقت طاری ہونے لگی یا انوار نظر آنے لگے یا دست غیب یا اور کوئی کرامت حاصل ہو گئی تو بس دوڑ ختم ہو گئی اور حاصل ہو گئی اب ان کو اعمال کی ضرورت ہی نہیں رہی گویا اعمال اس واسطے کئے جاتے تھے کہ یہ کیفیت حاصل ہو جاویں صاحبو واقع میں اس کا عکس ہے کہ مقصود اعمال ہیں اور یہ کیفیات اس واسطے طاری ہوتے ہیں کہ اعمال کا شوق بڑھے اس کی مثال ایسی ہے کہ بخار کے لئے دوا دیجاتی ہے مگر بعض وقت وہ کڑوی ہوتی ہے تو اس سے مریض کو نفرت ہوتی ہے اس واسطے اس پر قند چڑھا دیتے ہیں تاکہ خوش ذائقہ معلوم ہو اور طبیعت قبول کرلے یا سونے چاندی کے ورق لپیٹ دیتے ہیں تاکہ خوش منظر ہو جاوے اور مریض خوشی سے کھالے اب کوئی قند کو اور سونے چاندی کے ورق کو مقصود سمجھ لے اور اسی کا طالب اور خریدار رہے اور اسی کو طبیب سمجھے جو قند اور ورق دے تو یہ غلطی ہو گی یا نہیں اصل مقصود بخار کی دوا ہے چاہے کیسی ہی کڑوی کیوں نہ ہو اور اسی سے بخار کو فائدہ ہو گا

فقراء کی کوتاہی

اعمال کے مقصود کیفیات نہیں بلکہ کیفیات کے مقصود اعمال ہیں

قند اور ورق اُس پر ہوں تو خوشگواری کا باعث ہے اور نہ ہوں تو مقصود میں کچھ خلل نہیں قند اور ورق کی تلاش میں اتنا مت پڑو کہ اصل دوا ہی سے رہجاؤ اور اسی کو طبیب کی قابلیت اور شفقت کا معیار مت سمجھو ایسا نہ ہو کہ اس دھوکہ میں بخار بڑھ جاوے اور ہڈیوں میں رچ جاوے اُس وقت یہ قند اور ورق کام نہ آدیں گے غرض کام کی چیز دوا ہے اور قند و ورق صرف حلق میں اُتر جانے کے معین ہیں اب سمجھو کہ حالات اور کیفیات قند اور ورق کے مثل ہیں کہ طالب کے لئے سلوک میں باعث از دیاد شوق ہوتے ہیں یہ خود مقصود نہیں ہیں کہ انکے حاصل ہونے کے بعد اصل چیز یعنی تقرب الی اللہ کی ضرورت نہ رہے اور تقرب الی اللہ عبودیت سے ہوتا ہے۔ عبودیت کا حاصل ابھی باقی ہے اور عبودیت نام ہے اعمال کا یعنی دین کے اجزاء خمسہ کی تکمیل کا جو کہ عبادات اور معاملات اور عادات اور معاشرات اور اخلاق کا مجموعہ ہے اصل دوا یہ ہے اور کیفیات اور حالات قند و ورق ہیں ان پر مت پھولو ان کو ذریعہ اور معین سمجھو اور مقصود پر نظر رکھو نری کیفیات سے کچھ نہیں ہوتا عُرفی سچی کہہ گیا ہے ؎

عُرفی اگر بگریہ میسر شدے وصال صد سال میتواں بتمنا گریستن

یہاں تک دونوں فریق کی کوتاہی کا بیان ہو گیا سو یاد رکھو کہ جنت اور جو کچھ آخرت میں ملیگا وہ عمل سے ملیگا نہ علم اور حال سے اسی واسطے کہتے ہیں فنعم اجر العاملین وترى الملئكة حافين من حول العرش يسبحون بحمد ربهم۔ ترجمہ اور دیکھو گے فرشتوں کو پرے کے پرے عرش کے آس پاس کہ تسبیح کرتے ہوں گے حق تعالیٰ کی اور حمد کرتے ہوں گے تسبیح کہتے ہیں تنزیہ کو صفات رذیلہ سے اور تحمید کہتے ہیں اثبات صفات جمیلہ کو وقضی بينهم بالحق ط ترجمہ اور بندوں کے درمیان یہ حکم اور فیصلہ بالکل صحیح طور پر کیا ہوا ہوگا یعنی اُن کے اعمال کی یہ جزا ہوگی کسی کا حق مارا نہ جاویگا قضی کے لفظ سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ جو کچھ ہوگا خدائے تعالیٰ کے حکم سے ہوگا اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کی حکومت اور الوہیت اور اہل جنت کی عبودیت اب بھی معدوم نہ ہو

جائے گی الوہیت تو کیا ختم ہوتی اُس کا ظہور بھی ختم نہ ہوگا یہ اُس کا ظہور ہی تو ہے کہ فرشتے تسبیح اور تحمید برابر کرتے ہوں گے جیسا کہ اب کرتے ہیں اور اُس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ جب فرشتے ذکر کرتے ہوں گے تو اہل جنت بھی ذکر کرتے ہوں گے کیونکہ ذکر تمام نعمتوں سے اعلیٰ نعمت ہے جب یہ فرشتوں کو نصیب ہے تو اہل جنت کو کیوں نصیب نہ ہوگی اصل مقصود تو جنت سے نعمتیں ہی دینا ہے اور مستقل نصوص سے بھی ان کا مشغول ذکر ہونا ثابت ہے۔ لایسمعون فیہا لغوا ولا تاثیما الا قیلا سلاما سلاما وقالوا الحمد للہ الذی اذہب عنا الحزن وعوضہم فیہا سبحانک اللہم۔ اور خود اس مقام پر ہے۔ وقالوا الحمد للہ الذی صدقنا وعدہ۔ ہاں اہل جنت اس کے مکلف نہ ہونگے یعنی ایسا نہ ہوگا جیسا دنیا میں ہے کہ یہاں ذکر کرنے کا حکم ہے اور طبیعتوں میں تقاضے اس کے خلاف رکھے ہوئے ہیں جو ذکر سے مانع ہوتے ہیں اور اُن کی وجہ سے ذکر کے لئے قصد و اہتمام کی ضرورت ہوتی ہے اور ذکر سے یہاں تکان بھی ہوتا ہے مگر وہاں نہ قصد کی ضرورت ہوگی نہ اہتمام کی نہ ذکر سے کچھ تکان ہوگا بلکہ ذکر داخل طبیعت ہوگا اور اندر سے خود طبیعت کے فعل سے ذکر برابر ہوتا رہیگا جیسے یہاں سانس لینے کا حال ہے کہ یہ بھی ایک حرکت ہے اور بہت سے اعضاء کے فعل سے اس کا وجود ہوتا ہے مگر اس کے لئے قصد کی ضرورت ہے نہ کسی اہتمام کی حتیٰ کہ سوتے میں بھی خود بخود جاری رہتا ہے اور نہ اس سے کچھ تکان ہوتا ہے بلکہ قوت اور بقائے حیات سب اس پر موقوف ہے اسی طرح جنت میں ذکر ہوگا کہ سانس کے ساتھ خود تسبیح اور تحلیل سب جاری ہوگی ذاکرین کے لئے بڑے مزے کی بشارت ہے کہ وہاں پاس انفاس جاری ہوگا اور بے تکان ہر وقت مزے لیں گے اور دنیا کی طرح کسی وقت تھک کر بند کرنے کی ضرورت نہ ہوگی اور فرشتوں کے ذکر میں اہل جنت کو ایک لطف اور ہے جس کو عشاق جانتے ہیں وہ یہ ہے کہ محبوب کا ذکر اپنے زبان سے تو لذیذ ہے ہی محبوب کے ذکر کا دوسرے سے سُننا بھی لذیذ ہے اہل ذکر اور اہل قلب اسی واسطے تو سماع پر مرتے ہیں سماع سے مراد سماع مروج مع مزامیر نہیں

اہل جنت کا ذکر فرشتوں کے ذکر کی تابع ہوگا

اہل جنت کے سامنے فرشتوں کے ذکر کا تذکرہ

لاحول ولا قوۃ یہ تو ایسا ہے جیسے فیرینی میں غلیظ ملا دینا ذکر مامور بہ اور محمود شے ہے جیسے فیرینی لطیف اور مرغوب چیز ہے اس میں مزامیر کو ملا دینا ایسا ہے جیسے فیرینی میں غلیظ ملا دینا جو کثیف اور نامرغوب اور قابل نفرت چیز ہے سماع سے مراد اچھی آواز کے ساتھ دوسرے سے کوئی اچھا کلام سُن لینا مثلاً قرآن شریف کسی خوش آواز قاری سے سننا یا کوئی شعر اشعار متعلق سلوک دوسرے سے سن لینا چونکہ ذاکر اپنی زبان سے ذکر کہتے کہتے اُس سے ایسا مانوس ہو جاتا ہے کہ اُس سے التذاذ باقی نہیں رہتا یعنی اُسکی لذّت کا حس نہیں رہتا اُس وقت کان سے جو ذکر سنتا ہے اُس سے زیادہ لذت پاتا ہے حتی کہ اضطرار کی سی حالت ہو جاتی ہے کہ بلا اس کے چین ہی نہیں آتا حقیقی سماع یہ ہے جسمیں لوگوں نے اس قدر غلو کیا ہے کہ محتاج بیان نہیں اس کی اصل یہ ضرور ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوسرے سے قرآن سُنا تھا بس اس کو بعض لوگوں نے آڑ بنا کر تمام لہو ولعب اور منہیات کا دروازہ کھول دیا انصاف سے دیکھئے اس سے تو صرف اُتنا ہی سماع ثابت ہوتا ہے جتنا میں نے بیان کیا اور اگر اس میں کوئی توسع کرے تو ایسا ہوگا جیسے حضور سے کھانا پینا بھی ثابت ہے تو کیا اس سے گندی چیزوں کے کھانے کا بھی ثبوت ہو جاوے گا غرض محبوب کے ذکر کا سُننا بھی لذیذ ہے اسواسطے فرشتے ذکر کرتے ہوں گے تاکہ یہ لذت بھی اہل جنت کو حاصل ہو جنت میں حوروں کا گانا بجانا بھی ہوگا کیونکہ یہ بھی لذت سے خالی نہیں مگر کہاں حوروں گا گانا بجانا کہاں ملائکہ کی تسبیح اور ذکر وہاں مذاق بالکل صحیح ہوں گے اس لئے جو لذّت ذکر میں آوے گی وہ گانے بجانے میں نہیں آوے گی اور قضی بینہم کو ماقبل سے ربط یہ ہے کہ یہ بمنزلہ ذکر نتیجہ بعد القیاس کے ہے جیسے کہا جاتا ہے العالم حادث لانہ متغیر وکل متغیر حادث فالعالم حادث پہلے العالم حادث کو بصورت دعوے کے لایا جاتا ہے پھر اُس پر دلیل قایم کی جاتی ہے جسکو قیاس کہتے ہیں اُس سے وہ دعوے ثابت ہو جاتا ہے اب اُس کو پھر دہراتے ہیں اور اب اس کو نتیجہ کہتے ہیں ان آیات میں توحید کا اثبات تھا اور شرک کی نفی تھی قل افغیر اللہ تامرونی اعبد ایہا الجاہلون ولقد

اوحی الیک والی الذین من قبلک لئن اشرکت لیحبطن عملک ولتکونن من الخاسرین
میں یہ دونوں دعوے مذکور ہیں اس کو آئندہ آیات کے ساتھ تعلق ہے جو دعوے
کو دلیل کے ساتھ ہوتا ہے جیسے العالم حادث کو لانہ متغیر حادث کے ساتھ تعلق ہے
آئندہ آیات میں معاد کا ذکر ہے اور یہ ذکر جیسا کہ میں نے شروع میں بیان کیا تھا۔ اسی
مضمون توحید کی تاکید کے لئے لایا گیا ہے تاکہ قدرت حق تعالیٰ کی ثابت ہو جاوے
اور اس خیال کا موقعہ کسی کو نہ رہے کہ حق تعالیٰ کسی بات سے عاجز ہیں اور اُس بات
کے لئے دوسرے خدا کی ضرورت ہے جیسا کہ بعض مشرکین نے کہا تھا کہ سات معبود
ہیں بڑے بڑے کاموں کے لئے خدا ہے جو آسمان میں ہے۔ اور معمولی کاموں کے لئے اور ہیں معاد کے تمام
کارخانہ کے بیان سے ظاہر ہو گیا کہ کمال بھی حق تعالیٰ ہی کے لئے ہے اور آثار کمال بھی حق تعالےٰ
ہی کے لئے ہیں کوئی تصرف کسی دوسرے کے لئے نہیں ہے اس سے ربوبیت کے آثار بھی ظاہر ہو گئے
اور الوہیت کے بھی اور اس سے توحید کی تاکید ہو گئی اور ثابت ہو گیا کہ تکوین بھی
حق تعالیٰ ہی کا حق ہے اور تشریع بھی تکوین اثر ربوبیت ہے اور تشریع اثر الوہیت
مضمون معاد سے ان سب باتوں کی اچھی طرح تاکید ہو گئی اب ان دونوں لفظوں
پھر اُوسی توحید اور ربوبیت اور الوہیت کے مضمون کا اعادہ کیا گیا ہے چنانچہ
وقضی بینہم میں الوہیت کا بیان ہے اور الحمد للہ رب العلمین میں ربوبیت کا اور
کلام کو ختم کیا مضمون ربوبیت پر اس سے کس قدر رافت و رحمت ٹپکتی ہے معاد کا
بیان ختم ہوا میں نے اول ہی میں کہدیا تھا کہ ان آیات سے مقصود اثبات توحید اور
نفی شرک کا بیان کرنا ہے اور ساتھ ساتھ حق تعالیٰ نے شکایت کی ہے اپنے حقوق
نہ پہچاننے کی اور یہ حقوق بہت ہیں اُن کے پہچاننے کے لئے علم کی ضرورت ہے اور
اور ایک قسم کے علم کی ضرورت نہیں بلکہ متعدد علوم کی ضرورت ہے علم عقائد کی اور
علم احکام کی عبادات کی معاملات کی عادات کی اخلاق کی اور ان علوم کے لئے بعض
اُن علوم کی بھی ضرورت ہے جو از جنس مبادی ہیں جن کو علوم آلیہ کہتے ہیں جیسے صرف
ونحو معقول فلسفہ ان سب کی تعلیم کے جو مجالس متکفل ہیں اُن ہی کا نام مدارس ہے

اس سے مدارس کی ضرورت ثابت ہوگئی چنانچہ اس ضرورت کو محسوس کرکے جابجا مدارس قائم کئے گئے ہیں۔ جو فیض اُن سے ہو رہا ہے وہ سب کو معلوم ہے ان مدارس کے ضرورت یاد دلانے اور شوق تازہ کرنے کے لئے ہر سال یہ علمی جلسے ہوتے ہیں اس سے ان مجالس کی بھی ضرورت ثابت ہوگئی غرض یہ ہے کہ کوئی کام بدون کئے نہیں ہوتا اہل مدارس جو کام کر رہے ہیں اس میں دو وجہ سے ضرورت ہے سب کے شریک رہنے اور ہمدردی کرنے کی ایک تو یہ کہ یہ کام ایک کے کرنے کا نہیں ہے علما کا کام درس تدریس ہے تو دوسروں کا کام مالی امداد ہونا چاہئے۔ اگر علما دونوں کام کریں تو ایک بھی نہیں ہوگا۔ دوسرے یہ کہ یہ کام صرف علما کی ضرورت سے نہیں کیا جاتا کیونکہ دین کی ضرورت صرف علما ہی کو نہیں ہے بلکہ ہر ہر فرد مسلمان کو اس کی ضرورت ہے تو کیا وجہ ہے کہ تمام کام علما ہی کے ذمہ ڈال دیا جاوے انصاف سے دیکھئے تو انھوں نے ایسا بار اپنے ذمہ لے رکھا ہے جو آپ سے نہیں اُٹھ سکتا۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ اگر وہ کام جو آپ کر رہے ہیں علما کرنے لگیں تو خیر میں یہ تو نہیں کہتا کہ آپ سے اچھا کریں گے اگر اس دعوی کی بھی گنجائش ہے کیونکہ جس کام کو عوام کر سکتے ہیں اس کو اہل علم کیوں نہیں کر سکتے) تاہم برا بھلا تو کر ہی لیں گے اور وہ کام جو علما کر رہے ہیں اگر آپ کریں تو برا بھلا بھی نہیں کر سکتے لہذا آپ کو ان کا ممنون ہونا چاہئے اور غنیمت سمجھنا چاہئے کہ انھوں نے آپ کے ذمہ ہلکا کام رکھا ہے اور خود بھاری کام لے لیا ہے غرض آپ اپنا کام تن دہی سے کئے جائیے۔ وہ اپنا کام کر رہے ہیں اس طرح اس دینی کام کی تکمیل ہو سکتی ہے اور سب کو دینی فیض پہنچ سکتا ہے یہ سب کا کام ہے تو سب کو بٹانا چاہئے۔ اور یہی نکتہ چینی سو یہ اُن کا کام ہے جو خود بھی کام کرنا نہیں چاہتے اور دوسرے کو بھی کام کرنے نہیں دیتے اُن کے دل میں دین کی ضرورت ہی نہیں ہے لہذا اس کے ذرائع کی بھی ضرورت نہیں ہے اسی لئے ان ذرائع کے نہ ہونے سے اُن کے دلوں پر کچھ الم اور قلق کا اثر نہیں ہوتا۔ اس نکتہ چینی کے متعلق مفصل سے بیان کیا جاتا اور میں بعض واضح مثالوں سے اس کی خرابی سمجھاتا مگر بعض مثالیں ایسی ہیں کہ موجب ناگواری ہو سکتی ہیں۔ اس واسطے ایک لطیف مثال پر بس کرتا ہوں جس سے توضیح مطلب ہو جاویگی

اور ناگواری بھی نہ ہوگی۔ وہ یہ ہے کہ یہ اُن کی نکتہ چینی ایسی ہے جیسے فرشتوں نے کہا تھا جب اُن کو خبر دیگئی کہ ہم زمین میں آدم کو خلیفہ بنانے والے ہیں تو انھوں نے کہا۔ اتجعل فیہا من یفسد فیہا۔ یعنی اے اللہ آپ اس کو خلیفہ بنائیں گے جو فساد کرے گا۔ اسکا حاصل یہ ہے کہ فرشتوں نے ایک مصرت اُن کے خلیفہ ہونے کی بیان کردی یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اس کے بعد حق تعالیٰ نے کیا کیا اُن کے کہنے کا اتباع نہیں کیا اور اس اشکال سے حضرت آدم علیہ السلام کی خلقت کو ملتوی نہیں کر دیا آپ کا مذاق اسوقت مدارس کے بارہ میں فرشتوں کے مذاق کے موافق ہے کہ آپ نے بھی ایک خرابی کی وجہ سے کام بند کر دینا مناسب سمجھا جیسے ملائکہ نے فساد کے اندیشہ سے حضرت آدم علیہ السلام کی بعثت کو موقوف کر دینے کی رائے پیش کی تھی مگر حق تعالیٰ نے اُس مصرت پر نظر نہیں فرمائی بلکہ مصلحت کو مقدم رکھا اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ اگر کسی کو مدرسہ کے متعلق کوئی اشکال بھی ہے تو یہ کیا ضرور ہے کہ مدرسہ کو جڑ سے اُڑا دینے کی کوشش کی جاوے۔ اُس خرابی کی اصلاح کی کوشش کیوں نہ کی جاوے آخر جو منافع اور مصالح اور ضرورتیں مدرسہ کے ساتھ وابستہ ہیں وہ کیسے پوری ہوں آپ کا ذہن تو وہاں گیا جہاں فرشتوں کا گیا کہ مصرت کی وجہ سے کام کو جڑ سے اُڑا دیا جاوے اس میں آپ پر اعتراض نہیں کیا جاتا بلکہ تعریف کی جاتی ہے کہ آپ کا مذاق فرشتوں کا سا مذاق ہے لیکن اس کے مقابلہ میں دوسرا مذاق اس سے بھی اعلیٰ موجود ہے وہ وہ ہے جس طرح حق تعالیٰ کا ارادہ ہوا کہ مصلحت کا القا کیا جاوے اور خرابی کو رفع کیا جاوے یہ مذاق ظاہر ہے کہ اعلیٰ اور ارفع ہے ایسا ہی آپ بھی کیجئے کہ اصلاح کیجئے اور جڑ سے نہ اُڑائیے جڑ سے اُڑانے پر ایک انبیاء کا قصہ یاد آیا کہ ابنیاء کی پینک میں تھے ایک مکھی اُن کی ناک پر بار بار آکر بیٹھتی تھی کئی دفعہ اُڑایا مگر بعض مکھی ضدی ہوتی ہے کہ جہاں سے اُڑاؤ وہیں آکر بیٹھتی ہے یہ بہت تنگ ہوئے اور ایک دفعہ غصہ میں آکر اپنی ناک کو استرے سے کاٹ ڈالا اور کہا لے حرامزادی اب بیٹھ کہاں بیٹھے گی ہم نے تیرا اڈا ہی نہیں رکھا حضرت یہ جڑ سے اُڑانا تو ایسا ہے کہ مکھی کا تو کچھ بھی نہ بگڑا ان حضرت کی ناک گئی اسی طرح آپ مدرسہ کو جڑ سے اُڑا دیں گے تو علما کا کیا بگڑے گا ابواب رزق بہت سے ہیں وہ اور کوئی مشغلہ تلاش کرلیں گے مگر آپکی ناک جاتی رہے گی یعنی دینی فیض سے

محروم ہو جاویں گے۔ اس پر کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ ہم نکتہ چینی اور اعتراض نہیں کرتے بلکہ اصلاح ہی چاہتے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں اُس سے مخالفت مقصود نہیں میں اس کے متعلق ایک اصول عرض کرتا ہوں اس کو پیش نظر رکھ کر جو کچھ کرنا ہو کیجئے وہ یہ ہے کہ معاملہ خدا کے ساتھ درست کرو جو کچھ کرو اس میں یہ دیکھ لو کہ اس میں ہماری غرض اور نفسانیت شامل ہے یا نہیں اور کسی کے کہنے سننے کی پروا مت کرو خدا کو حاضر ناظر جانکر بات کہو اگر تمہارا دل گواہی دیتا ہے کہ ہمارا معاملہ حق تعالیٰ کے ساتھ صاف ہے اور اس میں کوئی غرض اور خواہش شامل نہیں ہے تو شوق سے کہو اس وقت وہ ضرور ایسی بات ہو گی جو اصلاح کے متعلق ہو گی مگر میں اس کی کچھ علامتیں بھی بتائے دیتا ہوں کیونکہ بعض وقت اپنے ہی فعل میں التباس ہو جاتا ہے۔ اور آدمی سمجھتا ہے کہ یہ میرا فعل خالصاً لوجہ اللہ ہے حالانکہ اُس میں بہت سی نفسانیتیں شامل ہوتی ہیں ایک علامت تو یہ ہے کہ جو بات لوجہ اللہ ہوتی ہے وہ دل آزار پیرایہ میں نہیں ہوتی نہ سخت لہجہ میں ہوتی ہے بلکہ ایسی شفقت اور ہمدردی کے ساتھ ہوتی ہے جیسے باپ بیٹے کا کوئی عیب دیکھتا ہے تو اُس کو آہستہ سے علیحدگی میں سمجھاتا ہے اور کسی کے سامنے گاتا نہیں پھرتا نہ اخباروں میں شایع کرتا ہے حتےٰ کہ اگر دس برس بھی بیٹا اُس کا کہنا نہ مانے تب بھی اس کو یہ گوارا نہ ہوگا کہ کوئی دوسرا آدمی اُس کے عیب کو سُن لے اور جب سمجھائیگا علیحدگی میں سمجھائے گا ایسا نہ ہوگا جیسے آج کل مدرسوں کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ ذرا سی بات خلاف طبع پائی اور چٹ سے اشتہار مخالفت میں شایع کر دیا اخباروں میں دھوم مچادی اور ساتھ کے ساتھ لکھتے جاتے ہیں کہ ہم کو اصلاح مقصود ہے ہم مدرسہ کے بدخواہ نہیں ہیں صاحبو اس علامت کو پیش نظر رکھکر دیکھئے۔ کیا آپ کا برتاؤ اپنے بیٹے کے ساتھ یہی ہوتا ہے کہ ذرا سا عیب اس میں دیکھیں اور اخبار میں شائع کر دیں اور کیا اس کو بھی اسی لہجہ میں سمجھاتے ہیں جس لہجہ میں مدرسہ والوں سے گفتگو کرتے ہیں اگر حق پسند آدمی ہے تو وہ اسی سے ہیئت اور نفسانیت کو پہچان سکتا ہے اور ایک علامت یہ ہے کہ آدمی غور کرکے دیکھے کہ اگر میں ان کی جگہ ہوتا جو مدرسہ میں ہیں اور وہ میری جگہ ہوتے اور وہ مجھ پر اعتراض کرتے تو کیا ان کے اعتراض کو میں ٹھنڈے دل سے سنتا یا مجھے اس سے ناگواری

ہوتی خدا کو حاضر ناظر جانکر اس پر نظر کرے اگر دل میں دوسرے کے اعتراض سے ناگواری پائے تو سمجھ لینا چاہئے کہ تم میں اہلیت اور اصلاح کچھ نہیں ہے صرف تعنت ہے اور یہ جتلانا چاہتے ہو کہ ہم بھی اہل رائے ہیں۔ اور ایک علامت اہلیت کی یہ ہے کہ اپنی بات پر بہت اصرار نہیں ہوتا۔ صرف حق کو واضح کر دینا اور سمجھا دینا ہوتا ہے دیکھو حق تعالیٰ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جا بجا فرمایا ہے۔ لست علیہم بمصیطر ولا تسئل عن اصحاب الجحیم۔ ولا تحزن علیہم۔ فان اعرضوا فما ارسلناک علیہم حفیظا ان علیک الا البلاغ۔ وغیرہ وغیرہ جب کفار کے ساتھ بھی یہ معاملہ تعلیم فرمایا گیا ہے تو اہل اسلام کے ساتھ تو کیا ہونا چاہئے پس جس کو مدرسہ کی اصلاح مقصود ہوگی وہ ایک بار اپنی رائے پیش کر کے اس پر اصرار نہ کرے گا نہ مدرسہ والوں کے درپے ہوگا یہ علامتیں ایسی ہیں جن سے للّٰہیت اور نفسانیت میں بخوبی فرق کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ آدمی انصاف پسند ہو اور عناد نہ رکھتا ہو دین کے کام میں شیطانیت اور نفسانیت کو شامل نہ کرو حق تعالیٰ کے ساتھ معاملہ صاف رکھو اگر معاملہ حق تعالیٰ کے ساتھ درست ہے اور للّٰہیت کے ساتھ بات کہی گئی ہے تو بات دل کو لگ جاتی ہے اور ہر شخص کے دل پر اثر کرتی ہے اور یہ بات ایک ہی فریق سے نہیں کہی جاتی ہے بلکہ دوسرے فریق سے بھی بلکہ ہر شخص سے کہی جاتی ہے کہ جو کام کرو خلوص اور للّٰہیت سے کرو نفسانیت سے نہ کرو ورنہ برکت جاتی رہتی ہے چاہے کیسا ہی نیک کام ہو اور چاہے ذرا سا کام ہو مگر خلوص کے ساتھ ہو تو اس میں برکت ہوتی ہے چاہے اس کا کوئی بھی معاون نہ ہو دیکھو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جس وقت آپ نے تبلیغ اسلام کا کام شروع کیا ہے کونسا مجمع تھا کیا اُمید کی جا سکتی تھی کہ یہ کام چلے گا مگر اس میں خلوص ہی خلوص تھا اس کا نتیجہ دیکھ لیجئے کہ کام ایسا چلا کہ آج تمام عالم میں حضور کے غلام موجود ہیں کوئی خطہ ایسا نہیں جہاں مسلمان نہ ہوں میں تو اہل مدرسہ سے یہ عرض کرتا ہوں کہ مخالفین کے اعتراضات کے دفعیہ وغیرہ کی بھی کوشش نہ کریں یہ بھی ایک مشغلہ ہے اپنا کام خلوص سے کئے جاویں سب شور و غل آپ ہی دب جاویں گے۔ اب دعا کیجئے ختم ۱۰ بجے ۵۵ منٹ۔

(ایک علم غیر منقول) بعد وعظ خواجہ عزیز الحسن صاحب نے حضرت والا سے سوال کیا کہ حضور نے بیان فرمایا ہے کہ جنت میں کسی کو کھیتی کی خواہش ہوگی تو فوراً کھیتی تیار ہو کر خرمن میں غلہ کا انبار موجود ہو جائے گا اس میں کیا حظ ہوگا حظ تو اس میں ہو سکتا ہے کہ زمین جوتی گئی کاشت ہوئی کھیتی ہری ہری پیدا ہوئی کاٹی گئی تب دانہ تیار ہوا ایک عرصہ تک مشغلہ رہا بہت سے لوگ جمع رہے ہنسنا بولنا رہا علیٰ ہذا جنت میں اولاد کی خواہش کسی کو ہوگی تو فوراً برابر کا لڑکا پلا پلایا تیار ہو جاوے گا۔ اس میں بھی کیا حظ ہوگا حظ تو بتدریج پرورش کرنے میں ہوتا ہے فرمایا وہاں مذاق بالکل صحیح ہوں گے اصل مقصود پر نظر ہوگی حصول مقصود سے حظ ہوگا یہ یہاں کی بد مذاقی ہے کہ ذرائع میں لطف آتا ہے حالانکہ اُن میں مصائب بھی ہیں کہیں بیل مر گیا کہیں پانی کم برسا کھیتی خراب ہو گئی علیٰ ہذا کہیں حمل کی تکلیف کہیں وضع کی کہیں بچہ کی بیماری کی دنیا میں طبیعتیں ان ہی بکھیڑوں کی خوگر ہو گئی ہیں اس واسطے حظ آتا ہے جیسے بھنگی کے دماغ میں خلیظ کی بو بس جاتی ہے تو اس سے اس کی طبیعت مانوس ہو جاتی ہے ورنہ یہ بکھیڑے کوئی حظ کی چیز نہیں اور یہ بھی عرض کیا کہ حوریں نہایت ہی حسین ہوں گی فرمایا جی ہاں اُن کے حسن کا بیان نہیں ہو سکتا حور دراصل ایک دوسری ہی مخلوق ہے از جنس انسان نہیں ہے جنت کی مخلوق ہے عورتوں کے ساتھ اُس کو اس لئے تشبیہ دی گئی ہے کہ اور کوئی نظیر اُس کی یہاں موجود نہیں ثم بحمد اللہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصالحات۔

(التماس کاتب) یہ وعظ احقر نے اپنے عزیز بھائی مولوی حکیم محمد یوسف مرحوم کے طرف سے لکھا ہے عزیز مرحوم وعظ نویسی کے بہت دلدادہ تھے۔ پیشۂ طبابت چھوڑ کر بے حد محنت اور جانفشانی کے ساتھ مختصر نویسی سیکھی اور تھانہ بھون میں حضرت والا کے قدموں میں جا پڑے اور وعظ لکھتے رہے بہت سے وعظ اُن کے لکھے ہوئے آپ کی نظر سے گذرے ہوں گے مگر اُن کی عمر نے وفا نہ کی اور ۱۳۳۹ھ میں انھوں نے انتقال کیا حضرت مدظلہ کو اُن کے ساتھ اس قدر اُنس تھا کہ بعد انتقال بارہا فرمایا کہ بعض اپنے عزیزوں کا رنج میرے

دل سے بھول گیا۔ مگر مولوی یوسف کا رنج نہیں بھولتا۔ ناظرین دعاء فرماویں کہ حق تعالیٰ اس وعظ کا ثواب اُن کو پہونچاویں اور جنت الفردوس میں اُن کو اعلیٰ درجہ عطا فرماویں اور جس کسی کو اس وعظ سے کتابت کا یا تصحیح کا یا طبع کا کوئی تعلق ہو سب پر نظر رحمت فرماویں اور حضرت مدظلہٗ کے فیض مواعظ کو تا بمدتہائے دراز قائم رکھیں "این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد"۔ یہاں ایک خواب بھی لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے جو از جنس مبشرات ہے۔ بعد انتقال عزیز مولوی محمد یوسف مرحوم کے احقر محمد مصطفےٰ نے ایک روز بحالت اطمینان خواب میں دیکھا کہ عزیز موصوف سخت بیمار ہیں اور حضرت مولانا مدظلہٗ اُن کے پاس تشریف لائے ہیں ایک شخص نے آکر کہا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ مولوی یوسف کی شان میں ایک قصیدہ آسمان سے اُترا ہے وہ قصیدہ اُس شخص نے سب کے سامنے پڑھا جس میں ایک مصرع یہ بھی تھا "آنکہ نامش یوسفِ جنت نشاں" اس قصیدہ کو سُن کر حضرت مولانا نے فرمایا کہ اس کی تعبیر یہ ہے کہ مولوی یوسف اس مرض سے جانبر نہیں ہوں گے اس کو سنکر مولوی یوسف پر رنج کا اثر ہوا لیکن طبیعت کو سنبھال کر کہا کہ میں حق تعالیٰ کے حکم پر بخوشی راضی ہوں اس کے بعد احقر کی آنکھ کھل گئی وہ قصیدہ پورا یاد تھا چاہا کہ فوراً اٹھ کر پنسل کاغذ لیکر لکھ لوں لیکن اُٹھتے اُٹھتے سب ذہن سے اُتر گیا۔ صرف مصرعہ مذکور یاد رہ گیا تعبیر اس کی بالکل ظاہر ہے حق تعالیٰ اُس کو وقوع میں لائیں اور حضرت مولانا کا اُن کے سامنے یہ لفظ کہنا کہ تعبیر یہ ہے کہ مولوی یوسف جانبر نہ ہوں گے اور اُن کا صبر کرنا دلیل شہادت نصیب ہونے کی ہے خدا ہمچنیں کناد اور حضرت مولانا کا یہ دلشکن لفظ بحالت مرض اُن کے سامنے کہنا خلاف رحم و شفقت نہیں ہے کیونکہ بجنسہٖ یہی واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی منقول ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس حضور بوقت وفات تشریف لائے اور آسمان کی طرف دیکھکر فرمایا کہ تم اس مرض سے جانبر نہیں ہو گی انھوں نے عرض کیا میں حق تعالیٰ کے حکم کو بخوشی قبول کرتی ہوں اس کے بعد رحلت فرما گئیں۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اس واقعہ کو دیکھ ہی رہی تھیں کمال تعجب ہوا کہ باوجودیکہ حضور کو اُن سے خاص محبت تھی مرتے وقت ایسا دلشکن لفظ کیوں فرمایا آخر

بعد اُن کی وفات کے حضور سے پوچھا کہ اس میں کیا مصلحت تھی ارشاد فرمایا میں نے ان کا نامۂ اعمال دیکھا تو کوئی نیکی ایسی نہ تھی کہ اُس میں نہ ہو سوائے شہادت کے اس واسطے میں نے یہ تدبیر کی کہ اُن کو ایک رنج پہونچایا جاوے اور وہ اُس پر صبر کریں اور شہادت سے بھی محروم نہ جائیں چونکہ اس وعظ میں زیادہ تر جنت ہی کا بیان ہے اور ایسا بیان ہے کہ شاید حضرت والا کے دوسرے کسی وعظ میں جنت کا ایسا بیان نہیں ہوا اس واسطے یوسف جنت نشان کے ایصال ثواب کے لئے یہ وعظ انسب ہوا نیز یہ وعظ دوسرے وعظوں سے طریقہ بیان میں ممتاز اور نئی شان کا ہے جیسا کہ وعظ شروع میں تحریر کیا گیا ہے اور یوسف مرحوم وعظ کے زیادہ دلدادہ تھے۔ اس واسطے بھی اُن کے لئے مناسب ہوا۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔ مرحوم نے ایک لڑکا خورد سال چھوڑا ہے اور اُن کی تمنا تھی کہ خدائے تعالیٰ اس کو عالم باعمل کریں ناظرین اُس کے لئے بھی دعا فرماویں۔ ربنا اغفر لنا و لاخواننا الذین سبقونا بالایمان و لا تجعل فی قلوبنا غلاً للذین آمنوا ربنا انک رؤف الرحیم۔ وصلی اللہ تعالیٰ علی رسولہ النبی الامی الکریم۔ آمین

ادع الی سبیل ربك بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی احسن

الاحیاء

کا

پہلا وعظ مسمّٰی بہ

المعرق والرحیق للمحرق والغریق

منجملہ ارشادات جامع شریعت وطریقت حضرت

مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی دام فیضہٗ

(عبدالواسع جعفری کے اہتمام سے)

مطبع انوار احمدی واقع الہ آباد سے شایع ہوا

قیمت سالانہ ۔ر قیمت وعظ ۱۸ر معہ محصول ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

المعرق والرحیق للمحرق والغریق

این	ماذا	الاحشات
کہاں ہوا	کیا مضمون تھا	متفرقات
سجو خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون۔		
۱۲ رجب ۱۳۳۷ھ بروز شنبہ بوقت صبح		
۳ گھنٹہ ۵ منٹ		
مرزا بیگ برلاس		
بعض اہل خانقاہ کی درخواست پر	انسان پر دو کیفیتیں طاری ہوا کرتی ہیں کبھی شوق کبھی سکون دونوں میں حکمتیں ہیں اپنے لئے کوئی خاص صورت تجویز نہ کرنا چاہئے وصول دونوں سے ہوجاتا ہے اور بعض میں زیادہ بھی ہر کیفیت کے مناسب ہوگی	کرنل خلیفہ محمد شجاعت علی خان صاحب
		کس نے محفوظ کیا
		سامعین کی تعداد

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان

سیدنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم۔ اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط ان الابرار یشربون من کأس کان مزاجھا کافورا ہ عینا یشرب بھا عباد اللہ یفجرونھا تفجیرا ہ یوفون بالنذر ویخافون یوما کان شرہ مستطیرا ہ ویطعمون الطعام علی حبہ مسکینا ویتیما واسیرا ہ انما نطعمکم لوجہ اللہ لا نرید منکم جزاءً ولا شکورا ہ انا نخاف من ربنا یوما عبوسا قمطریرا ہ فوقٰھم اللہ شر ذلک الیوم ولقٰھم نضرۃ وسرورا ہ وجزاھم بما صبروا جنۃ وحریرا متکئین فیھا علی الارائک ط لا یرون فیھا شمسا ولا زمھریرا ہ ودانیۃ علیھم ظلٰلھا وذللت قطوفھا تذلیلا ہ ویطاف علیھم بانیۃ من فضۃ واکواب کانت قواریرا ہ قواریرا من فضۃ قدروھا تقدیرا ہ ویسقون فیھا کأسا کان مزاجھا زنجبیلا ہ عینا فیھا تسمی سلسبیلا

اس وقت مجھ کو جس مضمون کا بیان کرنا ہے وہ ان آیات کا مدلول نہیں ہے مگر علم اعتبار کے طور پر ان آیات کو اس مضمون سے ایک مناسبت لطیفہ ہے اور اسی لطافت کی وجہ سے ان کو پڑھا یا گیا ہے۔ ہر چند کہ ان آیات کی دلالت قواعد شرعیہ سے اس مضمون پر کافی نہیں ہے مگر وہ مضمون دیگر نصوص صریحہ میں منصوص ہے اور اس کا مقتضاء یہ تھا کہ اسوقت میں انھیں آیات کی تلاوت کرتا جن آیات کی دلالت اس مضمون پر صریح ہے مگر اس کو تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کوئی نئی بات نہ معلوم ہوتی اور جی یہ چاہا کرتا ہے کہ بیان میں افادۂ جدیدہ ہو اس لئے میں نے ان آیات کو جدید فائدہ کے لئے تلاوت کیا ہے تاکہ اس مضمون پر ایک لطیف استشہاد ہو سکے اس لطافت کی غرض سے میں نے ان آیات کو بیان کے لئے اختیار کیا۔ اب وہ مضمون سننا چاہیئے جو کہ بہت ضروری ہے گو اس وقت کا بیان محض اس مضمون کی ضرورت کی وجہ سے نہیں ہو رہا۔ بلکہ بعض طالبین کی استدعاء کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ مگر بات یہ ہے کہ محض استدعاء بیان کے لئے محرک کافی نہیں بلکہ استدعاء کے بعد جب کوئی ضروری مضمون بھی ذہن میں آجاتا ہے اس وقت بیان ہوتا ہے پس

مضمون کی ضرورت کو بھی بیان میں دخل ضرور ہے۔ اور اس مضمون کا اصل خطاب اہل ذکر کے ساتھ مخصوص ہے کیونکہ اس کی ضرورت سالکین کو جو اللہ کا نام لینے والے ہیں زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ اس لئے میں اس کے بیان کے لئے یہ مجلس جس میں سالکین کثرت سے ہیں اختیار کی ہے گو استدعاء پرسوں (جمعرات کو) ہوئی تھی اور شاید مستدعی نے قرب جمعہ کی وجہ سے یہ خیال کیا ہوگا کہ بیان جمعہ میں ہوگا۔ اور شاید اسی خیال سے استدعاء بھی جمعہ کے قریب کی گئی۔ کیونکہ وہ دن بھی ایسا ہے جس میں اہل علم کی عادت بیان کرنیکی ہے مگر میں نے چند وجوہ سے کل بیان نہیں کیا۔ ایک تو کچھ طبیعت اچھی نہ تھی اور میں نے وعدہ اسی شرط پر کیا تھا کہ اگر طبیعت میں نشاط ہوا تو بیان کردوں گا کو نشاط کا پیدا ہونا جی کے سمجھانے پر ہے جب آدمی کسی کام کا ارادہ کرلیتا ہے تو نشاط بھی پیدا ہو ہی جاتا ہے۔ پس یہ کوئی مانع قوی نہ تھا۔ مگر وعدہ نشاط ہی پر معلق تھا۔ اور اصل وجہ کل نہ بیان کرنے کی یہ تھی کہ جمعہ کے دن مجمع عام ہوتا ہے اور اس مضمون کا تعلق زیادہ تر خاص جماعت سے ہے۔ وہی مقصود بالخطاب ہیں۔ دوسرے جمعہ میں اجتماع ایک دعوت عامہ للصلوۃ کی بنا پر ہوتا ہے۔ لوگ نماز کی غرض سے آتے ہیں اس کے بعد اگر بیان کیا جاتا ہے تو بعض لوگوں کو شرما شرمی بیٹھنا پڑتا ہے آزادی نہیں رہتی اور جمعہ کے علاوہ کسی دن میں بیان کیا جائے تو دعوت عامہ کی وجہ سے اجتماع نہ ہوگا بلکہ دعوت خاصہ سبب ہوگی اور یہاں تو دعوت خاصہ بھی نہیں ہوئی بلکہ اتفاقاً (یا خود کسی سے سن سنا کر) سب لوگ جمع ہوگئے ہیں۔ تو اس صورت میں جو کوئی سنیگا آزادی سے سنے گا۔ کیونکہ وہ خاص اسی غرض کے لئے آیا ہے۔ بہرحال چونکہ اس مضمون کی ضرورت اہل ذکر ہی کو محسوس ہوتی ہے اس لئے یہ خاص وقت اس کے لئے مقرر کیا گیا۔ عام وقت اور عام مجمع اختیار نہیں کیا گیا اور یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اسکی ضرورت اہل ذکر ہی کو محسوس ہوتی ہے سبکو محسوس نہیں ہوتی ورنہ درحقیقت مضمون عام ضرورت کا ہے سب مسلمانوں کو اس کی ضرورت ہے مگر کیا کیا جائے آج کل مسلمانوں نے عموماً ذکر اللہ کو چھوڑ رکھا ہے ایک خاص جماعت ہی ذاکر رہ گئی ہے ورنہ کیا ذکر اللہ بھی ایسی چیز ہے جو کسی خاص جماعت سے مخصوص ہو۔ اس کی تو ہر مسلمان کو ضرورت ہے اگر

سب ذاکر ہوتے تو اس مضمون کے مخاطب بھی سبھی ہوتے مگر افسوس کہ آجکل عموماً مسلمان ذکر سے غافل ہیں رات دن دنیا ہی کے دھندے میں لگے رہتے ہیں۔ یہ نہیں کہ ان کو وقت نہیں ملتا۔ اے صاحب وقت تو اتنا ملتا ہے کہ اس کو ادھر اُدھر کاٹتے پھرتے ہیں مگر یہ کہئے کہ وقت کی قدر ہی نہیں اور ذکر کی طلب ہی نہیں طلب وہ چیز ہے کہ اپنا وقت خود نکال لیتی ہے اور عام لوگوں کی میں کیا شکایت کروں ستم یہ ہے کہ سمجھدار لوگ بھی اس سے غافل ہیں اور سمجھدار لوگوں سے میری مراد اہل علم ہیں۔ کہ ان کو بھی پڑھنے پڑھانے اور تصنیف و وعظ گوئی ہی میں مزا آتا ہے ذکر سے جان چراتے ہیں پرسوں میرے پاس ایک صاحب کا خط آیا جو اہل علم ہی میں سے ہیں گو مشاہیر و ممتازین میں سے نہیں وہ لکھتے ہیں کہ اوراد سے میرا تو جی گھبراتا ہے کہ یہ کہاں کا جنم روگ لگا کہ روز صبح کو سورہ یٰسین پڑھو ظہر کے بعد ہر روز انا فتحنا پڑھو بعد عشا کے سورۂ ملک پڑھو اور روزانہ چکی کی طرح کئی ہزار دفعہ ذکر اسم ذات کرو۔ ہاں مطالعہ کتب میں بہت جی لگتا ہے مگر انھوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ میں اس وسوسہ کو دفعہ کرتا ہوں اور ہمت کر کے سب اوراد پورے کرتا ہوں یہ علم کا اثر تھا کہ وسوسہ کی غلطی پر متنبہ ہو گئے مگر میں کہتا ہوں کہ یہ وسوسہ ہی کیوں آیا کبھی روٹی کھانے کے متعلق وسوسہ نہ آیا کہ یہ روز گیہوں کی روٹی کھانا کہاں کا جنم روگ لگا۔ کبھی بیوی کے پاس لیٹنے میں یہ خیال نہ ہوا کہ یہ کہاں کا جنم روگ پیچھے لگ گئی اور اگر کوئی کسی پر عاشق ہو جائے اور معشوق اس کے پاس روزانہ آیا کرے تو کیا اس کو کبھی یہ خیال ہو گا کہ یہ کہاں کا جنم روگ پیچھے لگا کمبخت روز ہی آتا ہے ہرگز نہیں بلکہ وہ تو یہ بہانا ڈھونڈھے گا کہ اور تھوڑی دیر بیٹھے عاشق محبوب کے ساتھ مجالست اور محادثت میں کبھی اختصار کا طالب نہیں ہوتا بلکہ خدا سے یہ چاہتا ہے کہ وصل کی رات کبھی تمام ہی نہ ہو پھر وہ اس کی روزانہ آمد و رفت سے کیونکر گھبرا سکتا ہے دیکھئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جب سوال ہوا "وما تلک بیمینک یا موسیٰ" تو آپ جواب میں عرض کرتے ہیں "ہی عصای اتوکوء علیہا واہش بہا علی غنمی ولی فیہا مآرب اخریٰ" یہاں آپ نے ایجاز سے کام نہیں لیا بلکہ اطناب سے کام لیا مگر اطناب محل نہیں جس کو اسہاب کہا جائے بلکہ اطناب مفید جو کہ بلاغت کی ایک نوع ہے اور مفید کس کو

موسیٰ علیہ السلام کو۔ کیونکہ اس اطناب سے ان کو اپنے شوق کا اظہار مقصود تھا کہ جب محبوب کے ساتھ بات کا موقعہ مل گیا تو جہاں تک دائرۂ بلاغت میں رہکر کلام میں وسعت ہوسکے اُس کو وسعت دینا چاہیئے۔ اس لئے آپ نے عصا کے متعلق جتنی باتیں بیان میں آسکتی تھیں سب بیان کر دیں۔ یہ بھی اہل طریق کا ایک معمول ہے کہ وہ سوال کا جواب مقام ادب میں بھی پورا دیتے ہیں۔ گو اسمیں اطناب ہی ہو جائے البتہ ایسا اطناب نہ ہو جو بے کار و فضول ہو بلکہ جواب پورا ہو اور اطناب مفید ہو۔ آجکل یہ عجیب ادب نکلا ہے کہ بزرگوں کے سامنے گفتگو ادھوڑی کرتے ہیں آدھی بات زبان پر ہوتی ہے آدھی پیٹ میں کبھی جواب پورا ہی نہیں دیتے کیونکہ پوری بات کہنا خلاف ادب ہے سبحان اللہ اور تکلیف دینا بڑا ادب ہے ارے بھائی اگر ان کے سامنے بولنا بے ادبی ہو بھی تو امر کے بعد تو بے ادبی نہ رہے گی کیونکہ مشہور مسئلہ ہے " الامر فوق الادب " اول تو جواب پورا دینا بے ادبی ہے ہی نہیں اور اگر فرضاً ہو بھی تب بھی امر کے وقت تو امر کا بجالانا ہی ادب ہے۔ یہاں محض اہل حال کی ایک غلطی معلوم ہو گئی وہ یہ کہ بعض اہل حال بیماری اور مصیبت وغیرہ میں دعا نہیں کرتے اور اس کو خلاف ادب سمجھتے اور یوں کہتے ہیں ؎

چہ حاجت است بہ پیشِ تو حال دل گفتن کہ حالِ خستہ دلاں را تو خوب می دانی

کہ حق تعالیٰ کو تو سب کچھ معلوم ہے پھر دعا کی کیا حاجت ہے۔ سو وہ سن لیں کہ گو بظاہر تمہاری دلیل صحیح ہے اور اس کے لحاظ سے دعا کی ضرورت نہیں مگر ایک دوسری وجہ سے ضرورت ہے وہ کیا وہ ضرورت یہ ہے کہ محبوب کا امر ہے وہ چاہتے ہیں کہ تم بے ضرورت ہی ان سے مانگو اور اپنی احتیاج ظاہر کرو۔ گو وہ سب کچھ جانتے ہیں اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

از دعا نبود مراد عاشقاں جز سخن گفتن بآں شیریں دہاں

یعنی دعاء سے عاشقوں کی مراد صرف یہ ہوتی ہے کہ محبوب کے ساتھ کچھ دیر باتیں ہی کر لیں کیونکہ اس سے بڑھ کر کیا خوش قسمتی ہوگی کہ وہ خود دعا کا امر فرماتے ہیں تو وہ عاشق بڑا محروم ہے جس کو محبوب اجازت دے کہ ہم سے باتیں کرو۔ اور وہ مُنہ بند کرلے کہ آپ کو تو سب معلوم ہے۔ پھر میں کیوں کہوں۔ یہ تو خامی عشق کی دلیل ہے اگر عاشق ہوتے تو

اس موقعہ کو غنیمت سمجھتے کہ جب وہ بولنے کی اجازت دے رہے ہیں تو مجھ کو خوب بولنا چاہئے۔ اسی لئے امر کے بعد وہ خوب بولتے ہیں اور اتنا بولتے ہیں کہ دوسرے اس کو بے ادب سمجھنے لگتے ہیں اسی لئے مولانا فرماتے ہیں ؎

بے ادب ترنیست زو کس در جہاں با ادب ترنیست زو کس در نہاں

جہاں سے مراد علانیہ ہے۔ اور نہاں سے مراد باطن ہے یعنی عاشق سے بڑھ کر ظاہر میں کوئی بے ادب نہیں ہوتا (کیونکہ وہ ایسا سر ہو کر دعا کرتا ہے جیسے کسی سے لڑ رہا ہو) اور باطن میں اس سے بڑھکر با ادب کوئی نہیں ہوتا کیونکہ اس کے زیادہ بولنے کا منشا محبت ہے اور اس طریق میں محبت ہی بڑا ادب ہے (و دلیلہ قولہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ یحب الملحین فی الدعاء ۱۲)۔ مگر اتنا فرق ہے کہ محبت میں عارف توحدود کا خیال رکھتا ہے اور مجذوبین و مسلوب العقل لوگوں سے بعض کلمات حدود سے باہر بھی نکل جاتے ہیں مگر چونکہ منشاء اس کا بھی محبت ہی ہے۔ اس لئے وہ ظاہر میں بے ادب معلوم ہوتے ہیں مگر باطن میں ادب سے بھرے ہوئے ہیں ان پر ملامت کا حق نہیں گو تقلید بھی جائز نہیں بہر حال امر کے بعد عاشق کو سکوت جائز نہیں۔ جب وہ بولنے کا حکم کرے تو بولنا چاہئے۔ اس لئے یہ کسی ناقص کا کلام ہے ؎ چہ حاجت است بہ پیش تو حال دل گفتن الخ محقق کا کلام یہ ہے کہ ؎

از دعا نبود مرادِ عاشقاں جز سخن گفتن بہ آں شیریں دہاں

گفتگوے عاشقاں در کار رب جوششِ عشق است نے ترکِ ادب اور

اُس وقت بولنا ہی ادب ہے اور پوری بات کہنا ہی محبت کی علامت ہے اسی لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس مقام پر ایجاز سے کام نہیں لیا بلکہ اطناب کے ساتھ جواب دیا کیونکہ "وما تلک بیمینک یا موسیٰ" کے جواب میں اتنے لمبے جواب کی ضرورت نہ تھی صرف "ہی عصای" کہدینا کافی تھا بلکہ صرف "عصای" بھی کافی تھا "ہی" کا بڑھانا بھی اطناب ہے بلکہ "یاء متکلم" کی بھی ضرورت نہ تھی صرف "عصا" ہی کافی تھا۔ اور خیر اس کو اگر کوئی اطناب نہ مانے تو آگے "اتوکوء علیہا واہش بہا علی غنمی" تو یقیناً اطناب ہے کہ یہ میری لاٹھی ہے جس پر میں سہارا لیا کرتا ہوں اور اس سے بکریوں کے لئے پتے جھاڑا کرتا ہوں پھر اسی پر

بس نہیں بلکہ اتنا اور بڑھاتے ہیں۔ "ولی فیہا مآرب اُخری" کہ اس سے میرے اور بھی کام نکلتے ہیں۔ اس میں تفصیل کا موقع رکھ لیا کہ ایسی بات کہی جس سے پھر سلسلہ کلام کا تازہ ہوسکے کہ وہ پوچھیں ہاں صاحب وہ دوسرے کام کیا ہیں تو پھر اور باتیں بیان کروں یا بے پوچھے عرض کرسکیں کہ اس وقت جو عرض کیا تھا "ولی فیہا مآرب اخری" اِس وقت اس کی تفصیل عرض کرنا چاہتا ہوں۔ تو اس وقت اطناب کا منشاء صرف یہی تھا کہ عاشق محبوب کے ساتھ گفتگو میں اختصار نہیں کیا کرتا بلکہ یہ چاہا کرتا ہے کہ ایک منٹ کی بات ہو تو چار منٹ لگجائیں کیونکہ اسکو محبوب کے ساتھ گفتگو میں لطف آتا ہے جان میں جان آتی ہے تو وہ ایسے موقعہ میں تطویل کلام کے لئے موقعہ ڈھونڈا کرتا ہے۔

اسی طرح عارفین دعا ضرور کرتے ہیں جس سے مقصود محض حق تعالیٰ سے مناجات اور نیازمندی کی چپکے چپکے باتیں کرنا ہوتا ہے عارف کو تو دعا میں ثواب کا قصد بھی نہیں ہوتا گو اہل ظاہر کو اس سے وحشت ہو گی مگر میں سچ کہتا ہوں کہ عاشق کو محبوب سے باتیں کرتے ہوئے بجز لذت خطاب کے اور کسی طرف التفات نہیں ہوا کرتا۔ کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے جو اس مقام پر تطویل کی ہے تو اس سے ان کو ثواب کا قصد تھا۔ صاحب اس پر تو ان کو التفات بھی نہ ہوگا۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ عارفین کو ثواب سے استغناء ہوتا ہے ہرگز نہیں ان کا تو کوئی فعل بھی طلب ثواب سے خالی نہیں ہوتا۔ کیونکہ طلب ثواب کے معنی طلب رضا ہی تو ہیں اور طلب جنت اور طلب رضا واحد ہے اور ظاہر ہے کہ عاشق کا کوئی فعل طلب رضاء محبوب سے خالی نہیں ہوسکتا۔ پس عشاق کا دعاء کے وقت محض خدا تعالیٰ سے بات چیت کا قصد کرنا یہ بھی حقیقت میں طلب ثواب ہی ہے پس یوں کہنا چاہئے کہ ان کو ثواب کا قصد ہوتا ہے مگر ادھر خیال و التفات نہیں ہوتا جب محبوب عاشق سے کوئی بات کہتا ہے تو اس کا جواب دیتے ہوئے عاشق کو ثواب کی طرف التفات نہیں ہوسکتا گو فی نفسہ مقصود ضرور ہے اور اتنی بات تو ہم کو بھی حاصل ہے کہ گو ہماری نماز کچھ چیز نہیں ہے مگر نماز کے وقت ہم کو بھی ثواب پر التفات نہیں ہوتا گو اگر کوئی پوچھے کہ تم نماز کیوں پڑھتے ہو تو سوال کے بعد جواب میں یہی کہیں گے کہ ثواب کے لئے پڑھتے ہیں۔ اس سے

معلوم ہوا کہ ثواب کا قصد تو ہوتا ہے ورنہ یہ جواب کیوں دیتے مگر نماز پڑھتے ہوئے اسپر التفات بہت کم ہوتا ہے بس یہی مطلب ہے میرے اس قول کا کہ عشاق کو دعا میں ثواب کا بھی قصد نہیں ہوتا اور بھلا ثواب سے عاشق کو استغناء کیوں کر ہو سکتا ہے جب کہ سید العاشقین صلی اللہ علیہ وسلم روزانہ کھانے کے بعد یوں فرماتے تھے "غیر مودع ولا مستغنی عنہ ربنا" سبحان اللہ کیا عبدیت ہے کھانا کھا چکنے کے بعد اس کو اٹھاوینا چونکہ ایک قسم کے اعراض کو موہم ہو سکتا ہے تو آپ امت کو اس طرح دور کرتے ہیں کہ اے اللہ آپ کا شکر ہے کہ میرا پیٹ بھر گیا اور چونکہ اب کھانے کی گنجائش نہیں رہی اس لئے کھانے کو اٹھاتے ہیں ہمیشہ کے لئے رخصت نہیں کرتے شام کو پھر مانگیں گے اور ہم اس سے مستغنی نہیں ہوئے ہیں جب دنیوی نعمتوں سے بھی عشاق کو استغناء نہیں ہے تو ثواب سے ان کو کیونکر استغناء ہو سکتا ہے بعض جہلاء کی عادت ہے بزرگوں کے سامنے کچھ ہدیہ پیش کرتے ہیں تو یوں کہا کرتے ہیں۔ کہ ہے تو یہ حقیر ہدیہ اس قابل نہیں کہ پیش کیا جاوے آپ کو اس کی کیا ضرورت ہے نہ آپ کو اس کی پروا ہے۔ مگر ہماری خاطر سے قبول کر لیجئے۔ یہ نہایت سخت کلمہ ہے نعم الہیہ سے کسی کو استغناء نہیں مشایخ کی بزرگی بھی اسی وقت تک ہے جب تک اللہ تعالیٰ دونوں وقت کھانے کو دے رہے ہیں۔ اور جو یہ نہ ہو نہ معلوم کیا حالت ہو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب کا قصہ بیان فرماتے تھے۔ یہ شاہ عبدالعزیز صاحب کے بھائی ہیں مگر تقوی میں سب سے بڑھے ہوئے تھے گو شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرح زیادہ مشہور نہیں ہوئے کہ ایک دفعہ ایک شخص نے ان کے سامنے دھیلہ کی کوڑیاں ہدیہ میں پیش کیں آپ کو اس کی غربت پر رحم آیا اور غریب ہونا تو اسی سے ظاہر تھا کہ بیچارے نے دھیلے کی کوڑیاں پیش کیں تو آپ نے فرمایا کہ بھائی ان کو تم ہی اپنے کام میں لے آؤ۔ اس نے اصرار کیا کہ حضرت میرا تو جی یہ چاہتا ہے کہ آپ ہی ان کو قبول کر لیں میں نے آپ ہی کی نیت سے جمع کی ہیں۔ مگر آپ نے عذر کر دیا وہ بیچارہ واپس لے گیا۔ اس پر مبتلاء عتاب ہو گئے یا تو اس لئے کہ ایک مسلمان کی دلشکنی ہوئی تھی یا اس لئے کہ آپ کے نفس میں کوئی بات مخفی ہو گی ممکن ہے کچھ وسوسہ استغناء کا تحقیر ہدیہ کی

بناء پر آگیا ہو کہ میں یہ کوڑیاں لے کر کیا کروں بعض دفعہ نفس میں کچھ دقیقہ مخفی ہوتا ہے اور کسی عمل میں نفس کا کچھ شائبہ ہوتا ہے جس کی مبتلاء کو خبر نہیں ہوتی اسی لئے بعض دفعہ شیخ مرید کی کسی ادنی بات پر تشدد کرتا ہے جس سے مرید کو شبہہ ہو جاتا ہے کہ شیخ بڑے متشدد ہیں کہ ذرا ذرا سی بات پر مؤاخذہ کرتے ہیں مگر حقیقت میں وہ بات مرید کی نظر میں خفیف ہوتی ہے اور شیخ کی نظر میں شدید ہوتی ہے۔ کیونکہ اُس میں نفس کا جو کید ہے وہ مرید کی نظر سے خفی ہے اور شیخ کی نظر میں جلی ہے۔ حدیث میں آیا ہے۔ "الشرک اخفی فی امتی من دبیب النمل علی الصفا" کہ شرک میری امت میں چکنے پتھر پر چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ خفی ہے۔ بھلا اول تو چیونٹی کی چال ہی کیا ہوتی ہے پھر وہ بھی چکنے پتھر پر اس میں تو کچھ بھی اس کا احساس نہیں ہو سکتا تو جو مرض ایسا خفی ہو دوسرے تو اس کو کالعدم سمجھیں گے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو بھی شرک فرما رہے ہیں۔ تو کیا نعوذ باللہ حضورؐ بھی متشدد تھے کہ اتنی ذرا سی بات کو شرک سے تعبیر فرماتے ہیں ہرگز نہیں پھر حق تعالی کی نظر تو حضور سے بھی زیادہ ہے وہ تو اس سے بھی خفی تر کو جانتے ہیں۔ اس لئے بعض دفعہ حق تعالی کسی ایسی بات پر مؤاخذہ فرماتے ہیں جس کا قابل مؤاخذہ ہونا مبتلا کو معلوم نہیں ہوتا گو وہ کتنا ہی بڑا عارف ہو مبتلا کو بعض دفعہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس کام میں نفس کا کچھ شائبہ تھا۔ مگر حق تعالی کو معلوم ہوتا ہے اس لئے مواخذہ فرماتے ہیں۔ اور یہ بھی حق تعالی کی رحمت ہے عارفین پر کہ اُن کی بات بات پر مؤاخذہ فرمالیں۔ کیونکہ جس بچہ کو استاد روز ایک تھپی مار دیتا ہو یہ اس کی دلیل ہے کہ استاد کو اس پر شفقت ہے اور جس بچہ کو کبھی سزا نہ ملتی ہو اس پر خطرہ ہے کہ شاید استاد اُسے اپنے مکتب سے نکالنا چاہتا ہے۔ اُس کو آزاد چھوڑ دینا اس کی دلیل ہے کہ استاد کو اس سے محبت نہیں ہے اس لئے دنیا میں حق تعالی کی طرف سے کچھ مؤاخذہ ہوتا رہنا بھی رحمت کی دلیل ہے بلکہ اگر آخرت میں بھی مواخذہ ہو اور کسی مسلمان کو حق تعالی جہنم میں بھیجدیں تو یہ بھی ان کی رحمت ہے۔ کیونکہ قدر نعمت کسے داند کہ بمصیبتے گرفتار آید۔ نعمت کی قدر مصیبت کے بعد معلوم ہوا کرتی ہے۔ جو شخص جہنم کا عذاب بھگت کر جنت میں جائیگا اس کو جنت کی بہت قدر ہوگی۔ ایک حدیث کے متعلق اپنے استاد علیہ الرحمۃ کا ایک مضمون یاد آگیا جو اسی

اصل پر مبنی ہے۔ وہ حدیث یہ ہے کہ قیامت میں جب سب جنتی جنت میں اور جہنمی جہنم میں پہنچ جائیں گے تو جنت میں کچھ جگہ خالی رہ جائے گی اور جہنم بھی نہ بھرے گی تو جنت عرض کریگی کہ مجھ سے بھرنے کا وعدہ تھا تو مجھے بھرا جائے اور جہنم بھی یہی کہے گی کہ ہل من مزید۔ کچھ اور بھی ہے تو حق تعالیٰ جہنم کے لئے تو کسی نئی مخلوق کو پیدا نہ کریں گے بلکہ حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس میں اپنا قدم رکھدیں گے یہ متشابہات میں سے ہے ہم اس کا مطلب بیان نہیں کر سکتے۔ تو حق تعالیٰ کے قدم رکھنے سے جہنم سمٹ کر بھر جائے گی اور کہے گی قط قط یعنی بس بس میں بھر گئی۔ اور جنت کے لئے ایک نئی مخلوق پیدا کر کے اس میں آباد کر دینگے جس سے وہ بھر جائے گی جب یہ حدیث ہمنے پڑھی تو میں نے حضرت استاد سے عرض کیا کہ حضرت یہ لوگ تو ہمسے زیادہ خوش قسمت ہیں کہ بدون کچھ کئے بغیر مشقت کے جنت لے لیں گے کاش ہم انھیں میں سے ہو جاتے تو حضرت استاد نے فرمایا خدا نہ کرے کہ ہم ان میں سے ہوتے میاں وہ ہم سے زیادہ خوش قسمت نہ ہوں گے ہم ہی ان سے اچھے ہونگے واقعی ان حضرات کے علوم بھی عجیب ہیں جن کا دوسری جگہ کہیں پتہ نہیں فرمایا ہم دنیا کے مصائب جھیل کر جب جنت میں جائیں گے تو جوش میں کہیں گے "الحمد للہ الذی اذہب عنا الحزن ان ربنا لغفور شکور الذی احلنا دار المقامۃ من فضلہ لا یمسنا فیہا نصب ولا یمسنا فیہا لغوب ۵ انھیں یہ بات کہاں نصیب کیونکہ جہاں حزن ہو وہیں "اذہب عنا الحزن" کا بھی لطف ہے انھیں کیا لطف جن کو مشقت ہی نہیں ہوئی۔ وہ تو یہ سمجھیں گے کہ بس یوں ہی ہوتا ہوگا کہ پیدا ہوئے اور جنت میں بس گئے ان کو جنت کی قدر ویسی نہ ہو گی جیسی ہمیں ہوگی۔ تو اب سمجھ لو کہ جس شخص کو دنیا کی تکالیف کے ساتھ جہنم کا عذاب بھی بھگتنا پڑے اس کو دخول جنت کے وقت اذہب عنا الحزن کا لطف اوروں سے زیادہ حاصل ہوگا کنارہ کی قدر اور لذت اس شخص کو حاصل ہوتی ہے جو ڈوبنے کے بعد ساحل پر پہونچا ہو۔ اس کے دل سے ساحل کی لذت پوچھو اور جو شخص ڈوبا ہی نہیں اس کو ساحل کی قدر اور لذت اس کے برابر نہیں ہو سکتی۔ اب میں یہاں اپنا ایک قصہ ایک شبہ کے واقع ہونے کا اور اس کے جواب کے منکشف ہونے کا بیان کرنا چاہتا ہوں اور گو یہ مضمون متن میں بیان

کرنے کے قابل تھا تمہید میں بیان کرنے کا ارادہ نہ تھا۔ مگر اسی وقت یاد آگیا تو میں بیان کئے دیتا ہوں نہ معلوم پھر یاد رہے یا نہ رہے ایک دفعہ مجھ کو کچھ پریشانی سی پیش آئی تھی جیسا کہ زمانہ طلب میں عموماً اہل طریق کو پیش آیا کرتی ہے جبکہ وہ مجاہدات اور اذکار واشغال کچھ مدت تک کر لیتے ہیں اور ثمرہ محسوس نہیں ہوتا تو دل میں وصول کے لئے اضطراب اور بے چینی اور عجلت کا مضمون پیدا ہوتا ہے۔ یہی حالت باوجود مجاہدہ نہ کرنے کے براہ ہوس مجھ کو پیش آئی اور قلب میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہم اس قابل نہیں مگر الٹی سیدھی ہم کو حق تعالیٰ کی طلب بھی ہے گو عشق سعدی تا بزانو ہی کی مثل سہی شیخ سعدی نے ایک عاشق کو دیکھا تھا جو کسی محبوب کی طلب میں کوٹھے پر سے کود پڑا تھا۔ ٹانگ بھی ٹوٹ گئی تھی آپ نے قصہ پوچھا کہ یہ کیوں پڑا ہے کیسے ٹانگ ٹوٹ گئی لوگوں نے کہا کہ یہ اپنے محبوب کو دیکھ کر کوٹھے پر سے کود پڑا اس لئے چوٹ لگ گئی تو شیخ سعدیؒ بھی اسی زینہ کی ایک سیڑھی پر چڑھ کر کود پڑے اور فرمایا "عشق سعدی تا بزانو" کہ بھائی ہمارا عشق تو اتنا ہی ہے کہ ایک گز بلندی سے کود جائیں تو ایسے ہی گو ہماری طلب کامل نہیں مگر پھر بھی بحمداللہ کچھ تو ہے۔ ادھر حق تعالیٰ قادر ہیں۔ ان کو اسباب ووسائط کی کچھ ضرورت نہیں۔ وہ اگر چاہیں تو دفعۃً واصل کر سکتے ہیں ادھر وہ علیم بھی ہیں ہماری اس بےچینی اور اضطراب کی ان کو خبر بھی ہے۔ پھر رحیم بھی ہیں اس حالت پر ان کو رحم بھی آتا ہوگا پھر وصول میں دیر کیوں ہے جلدی کیوں نہیں ہو جاتا واقعی سچ فرمایا خلق الانسان عجولاً "انسان میں عجلت کا مادہ فطری ہے غرض ان مقدمات کے بعد وصول کی تاخیر سمجھ میں نہ آتی تھی کہ کس لئے ہے جب زیادہ الجھن بڑھی تو میں نے مثنوی سے فال لی اور اس فال کا یہ مطلب نہ تھا کہ میرے اعتقاد میں مولانا رومی نے آکر ورق لوٹ دیئے ہرگز نہیں بلکہ میرا اعتقاد یہ ہے کہ مولانا رومی متبرک بزرگ اور محقق تھے ان کا کلام بھی متبرک اور جامع ہے۔ حق تعالیٰ اس برکت کو اس طرح ظاہر فرما دیتے ہیں کہ اس میں سے کوئی موافق مضمون نکال دیتے ہیں چنانچہ مثنوی کھولتے ہی سرورق پر اس کا جواب موجود تھا۔ یہ بھی نہیں کہ سطریں گننے کی ضرورت پڑی ہو جس کا جی چاہے مثنوی مطبوعہ کھول کر دیکھ لے یہ اشعار سرورق پر لکھے تھے اور جواب بھی ایسا

بکلا کہ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ خود بھی زندہ ہوئے تو یہی جواب دیتے واقعی عجیب جواب ہے جس میں کمال یہ ہے کہ میرے مقدمات بھی [illegible] کو لئے گئے پھر جواب دیا گیا فرماتے ہیں ؎

چارہ مے جوید پئے من درد تو　　می بگنجودم دوش آوسرد تو

اس میں طلب اور علم کو تسلیم کیا گیا کہ بیشک تم کو طلب بھی ہے اور درد کے لئے چارہ کی تلاش بھی ہے اور مجھ کو اس کی خبر بھی ہے میں تمہاری آہ و فریاد کو سن رہا ہوں ؎

می توانم ہم کہ بے ایں انتظار　　رہ نمایم دادہم راہ گذار

تا ازیں طوفاں دوراں وارہی　　بر سر گنج وصالم پائی

اس میں قدرت کا ذکر ہے کہ یہ بھی مسلم ہے کہ ہم بدون کسی انتظار کے بھی واصل بنا سکتے ہیں اور ہم کو رحم بھی آتا ہے کہ تم کس طوفان بلا میں گرفتار ہو۔ جلدی وصول ہو جانے میں اس طوفان سے ابھی نجات ہو جائے گی۔ ان سب مقدمات کا مقتضاء تو یہی ہے کہ وصول میں دیر نہ ہوتی مگر ایک مقدمہ تمہاری نظر سے رہ گیا وہ یہ کہ جیسے ہم علیم و قادر و رحیم ہیں اسی طرح ہم حکیم بھی ہیں پس تم نے یہ تو دیکھ لیا کہ طلب و رحمت و قدرت کا مقتضا تعجیل تھی یہ نہ دیکھا کہ حکمت کا مقتضا تاخیر ہے آگے تاخیر کی حکمت کا بیان ہے اور واللہ عجیب حکمت ہے فرماتے ہیں ؎

لیک شیرینی و لذات مقر　　ہست بر اندازۂ رنج سفر

وہ حکمت یہ ہے کہ قرار گاہ پر پہونچنے کی شیرینی اور لذت مشقت سفر کے موافق محسوس ہوا کرتی ہے جس کو سفر میں زیادہ تعب اور مشقت ہوتی ہے اس کو منزل پر پہونچنے کے بعد اتنی ہی لذت بھی آتی ہے اور جس کو بدون تعب کے وصول ہو گیا ہو اسے منزل پر پہونچنے کی پوری قدر نہیں ہوتی ؎

زانکہ از فرزند خویشاں برخوری　　کز سفر بیے رنج و محنت ہا بری

جو مسافر کئی سال کے بعد اپنے گھر پر آتا ہے بیوی بچوں سے ملکر اس کو زیادہ خوشی ہوتی ہے پس یہ حکمت ہے تاخیر فی الوصول میں تاکہ تم کو وصول کی پوری قدر ہو اگر سستے ہی پہنچ جایا کرتے تو وصول کی بے قدری کرتے کیوں اس لئے کہ ؎

ہر کہ اوار زاں خرد ارزاں دہد ۔ گوہرے طفلے بقرصِ ناں دہد

اور جس شخص کو مشقت اور مصیبت کے بعد وصول ہوگا اس کی تو عمر بھر یہ حالت رہے گی کہ

بر دلِ سالک ہزاراں غم بود ۔ گر زباغِ دل خلالے کم بود

اس کو ذرا سی کوتاہی پہاڑ کی برابر گراں معلوم ہوگی اور جو آسانی سے پہنچ گیا ہے وہ اتنا پھونک پھونک کر قدم نہ رکھے گا کیونکہ عدم وصول کی بے چینی کا اندازہ ہی نہیں ہوا پس یہ جواب دیکھ کر میری تسلی ہوگئی اور تعجیل کا مضمون دل سے بالکل نکل گیا۔ کیوں کہ اس کی حکمت معلوم ہوگئی جو بہت بڑی حکمت ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے حضرات میں جو اہل تصرف بھی ہوئے ہیں وہ تصرف سے کام نہیں لیتے تھے اور کسی کو ایک توجہ سے واصل نہیں بناتے تھے۔ اس کی یہ وجہ نہیں کہ یہ حضرات صاحب تصرف نہ تھے جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بس یہ تو محض ملّا ہیں نماز روزہ کرلیتے ہیں ان میں تصرف وغیرہ کچھ نہیں یہ بالکل غلط ہے بحمداللہ ہمارے حضرات میں بڑے بڑے صاحب تصرف بھی ہوئے ہیں جن کو تصرّف کی کامل قدرت حاصل تھی مگر وہ اس سے کام نہیں لیتے تھے بلکہ طالبین ہی سے محنتیں پسواتے تھے۔ اور یہ چاہتے تھے کہ یہ خود محنت کرکے واصل بنیں۔ تاکہ وصول کی قدر ہو اور جو تصرف سے واصل ہوگا اس کو وصول کی قدر نہ ہوگی دوسرے بلا اذن تصرف کرنا کمال عبدیت کے بھی خلاف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھکر کون صاحب تصرف ہوگا اگر آپ تصرف کرتے تو سارے عالم کو ایک دم سے ولی بنا دیتے کسی کی مجال نہ تھی جو کفر کرسکتا مگر آپ نے اس سے کام نہیں لیا۔ حضرت ابوطالب کے متعلق آپ کی خواہش بھی تھی کہ یہ ایمان لے آئیں مگر آپ نے قوت تصرف کو استعمال نہیں کیا۔ تو خدا معاف کرے کہ ابوطالب کے نام کے ساتھ زبان سے حضرت ہی نکلتا ہے۔ حالانکہ وہ ایمان نہیں لائے مگر چونکہ ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت تھی اور محبت بھی ایسی کہ جاں نثار تھے اور چچا بھی تھے حضور کو بھی ان سے محبت تھی۔ اس لئے زبان پر ان کے نام کے ساتھ بیساختہ حضرت نکل جاتا ہے ابوجہل کے نام کے ساتھ کبھی نہیں نکلتا کیونکہ وہ آپ کا چچا تھا اگرچہ حقیقی نہ تھا مگر اس کے ساتھ ہی موذی بھی بہت تھا حضور کو اس نے بہت ایذا دی ہے اس لئے اس کے نام کے

سوال۔ ھذا الکلام مبنی علی ان الکمال ھو الاتیان بالافضل فی کل امر والاتیان بالافضل فی کل امر ھو الاتیان بالاول فقط والثانی لا یکون کمالا فی ذاتہ بل ھو نقص فی ذاتہ والکمال ھو الاتیان بالاول فقط وترک الثانی بالکلیۃ لانہ یدل علی قوۃ التصرف وعلی کمال حق الحبیب صلی اللہ علیہ وسلم۔

جواب۔ لیس فیہ نفی ذلک بل ھو اثبات بالاولویۃ لان ترک الاول لاجل الثانی لا یکون الا لکمال حق الحبیب صلی اللہ علیہ وسلم۔ (اشرف)

ساتھ کوئی تعظیمی لفظ نہیں نکلتا۔ ایسے ہی ابولہب کے نام کے ساتھ بھی نہیں نکلتا گو وہ حقیقی چچا ہے مگر ایذاء میں ابوجہل کے مثل تھا بعض لوگ سورۂ تبت کے پڑھنے سے کراہت کرتے ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ اس میں حضور کے چچا کی مذمت ہے اس کے پڑھنے سے آپ کو ایذاء ہوتی ہوگی (اور اس کے متعلق ایک خواب بھی مشہور ہے مگر جو خواب دلائل شرعیہ کے خلاف ہو وہ حجت نہیں ہوا کرتا بھلا حضور کو کلام الٰہی کے پڑھنے سے نعوذ باللہ کبھی ایذا ہو سکتی ہے ہرگز نہیں یہ مانا کہ وہ آپکا چچا تھا مگر ادھر یہ بھی تو دیکھو کہ حق تعالیٰ کے ساتھ حضور کو کیا علاقہ تھا پھر محبوب اگر اپنے کسی عزیز سے بغض رکھے تو کیا عاشق کو اس سے بغض نہ ہوگا ضرور ہوگا اور محبوب اگر اس عزیز کی مذمت کرے تو کیا عاشق کو اس سے ایذا ہوگی کبھی نہیں ہوگی بلکہ لذت آئے گی (ہاں یہ ضرور ہے کہ کسی خاص صورت کی تعیین کر لینا مناسب نہیں اس میں سورہ تبت اور اس کے غیر سب برابر ہیں۔ ممکن ہے کسی نے اسی سورت کو قرأۃ کے لئے ورد بنا لیا ہو۔ اس پر حضور نے بشرطیکہ خواب کا قصہ صحیح ہو لطیف عنوان سے خواب میں متنبہ فرمایا ہو ممکن ہے کہ اس شخص میں ادب کم ہو آپ نے بطور معالجہ کے اس کے لئے یہ تجویز فرمایا ہو ۱۲ جامع) بہرحال اگر آپ تصرف سے کام لیتے تو کم از کم اپنے عزیزوں پر تو ضرور اثر ڈال دیتے مگر حضور نے ایسا نہیں کیا۔ اسی سنت کا اتباع ہمارے حضرات کرتے ہیں وہ بھی تصرف سے کام نہیں لیتے اور اگر کبھی کسی متوسط نے ایسا کیا بھی تو اکابر نے اس کو مٹا دیا ہے چنانچہ حضرت جنید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ ہے کہ آپ ایک دفعہ کسی بادشاہ سے گفتگو کر رہے تھے ساتھ میں حضرت شبلی بھی تھے۔ اثناء گفتگو میں بادشاہ نے حضرت جنید کو کوئی سخت کلمہ کہا وہ تحمل سے کام لیتے رہے مگر حضرت شبلی سے نہ رہا گیا وہاں کوئی قالین بچھا ہوا تھا جس پر شیر کی تصویر بنی ہوئی تھی حضرت شبلی نے اس تصویر پر توجہ کا اثر ڈالا تو وہ سچ مچ شیر بنگیا حضرت جنید نے دیکھ لیا انھوں نے فوراً اس پر ہاتھ رکھ دیا تو وہ پھر مٹ گیا اور تصویر کی تصویر رہ گئی بادشاہ نے پھر کسی بات پر کوئی سخت کلمہ کہا حضرت شبلی نے پھر توجہ کی جس سے دوبارہ وہ تصویر سچ مچ شیر کی صورت بنگئی حضرت جنید نے پھر ہاتھ رکھ کر اس کو مٹا دیا کئی بار ایسا ہوا حتیٰ کہ ایک دفعہ

بادشاہ کی نظر بھی شیر پر پڑ گئی تو اس کا رنگ فق ہو گیا۔ اس نے بھاگنے کا ارادہ کیا تو حضرت جنید نے تسلی کی کہ آپ نہ گھبرائیں اس کی مجال نہیں کہ میرے ہوتے ہوئے آپ کو کچھ بھی کہہ سکے آپ ہمارے بادشاہ ہیں۔ آپ کو حق ہے کہ ہمیں جو چاہیں کہیں میں کبھی آپ کے مقابلہ میں تصرف نہ کروں گا۔ یہ شبلی بچہ تھا اس سے تحمل نہ ہوا اس نے تصرف سے کام لے لیا۔ مگر میں اپنے سامنے اس کے کسی تصرف کو آپ پر چلنے نہ دونگا بالکل بے فکر رہیں حضرت جنید نے تو اسکو بے فکر کر دیا مگر اس کو ان حضرات کی حقیقت بھی معلوم ہو گئی کہ خدا تعالیٰ نے ان کو کتنی قوت عطا کی ہے بس اس کے بعد سنبھل سنبھل کر باتیں کرنے لگا پھر کوئی گستاخی نہیں کی سو ہمارے اکابر تو ایسے ہوئے ہیں کہ خود تو تصرف کیا کرتے اگر کسی چھوٹے نے کیا بھی تو اس کو مٹا دیا غرض وہ تصرف اس لئے نہیں کرتے کہ اول تو اس میں سالک کو نعمت کی قدر نہیں ہوتی کیونکہ قدر تو بعد مشقت ہی کے ہوتی ہے دوسرے پھر وہ ہمت توڑ دیتا ہے پس توجہ ہی کے سہارے پر چلتا ہے تیسرے یہ طریقہ خلاف سنت بھی ہے حضرات انبیا علیہم السلام کبھی تصرف سے کام نہ لیتے تھے۔ (اس مقام پر پہنچکر حضرت مولانا کو ماقبل کا ربط یاد نہ رہا تو جامع وعظ سے دریافت فرمایا تو اس نے اطلاع کی کہ یہ مضمون اس پر چلا تھا کہ خدا تعالیٰ کا مواخذہ بھی رحمت ہے خواہ دنیا میں ہو یا آخرت میں اسپر فرمایا کہ ۱۲ جامع! میں یہ بیان کر رہا تھا کہ حق تعالیٰ کی طرف سے بندہ پر کبھی گرفت ہو جانا بھی رحمت ہے جیسے حضرت شاہ عبدالقادر صاحب کے ساتھ معاملہ پیش آیا جس کی تفصیل ابھی آتی ہے اسی پر یہ مضمون چل پڑا تھا کہ وصول میں تاخیر ہونا بھی رحمت ہے اس میں بھی بہت سی حکمتیں ہیں اور اسی حکمت کے ضمن میں اپنے اکابر کے تصرف نہ کرنے کی وجہ بھی بتلا دی تھی اب میں اصل مضمون کی طرف عود کرتا ہوں کہ شاہ عبدالقادر صاحب نے اس غریب کا ہدیہ جو دہیلہ کی کوڑیاں تھیں واپس کر دیا تو اس پر حق تعالیٰ کی طرف سے عتاب ہوا کہ اسی دن سے تمام فتوحات بند ہو گئیں اور فاقہ پر فاقہ گذرنے لگا اول تو انھوں نے اس کو حکمت خاص پر محمول کیا کہ شاید رفع درجات کے لئے یہ معاملہ ہو رہا ہے مگر پھر تنبہ ہوا کہ نہیں یہ تو عتاب ہے عارف کو خدا تعالیٰ نے ایک نور دیا ہے

وہ اس سے سمجھ لیتا ہے کہ کونسی مصیبت رفع درجات کے لئے آئی ہے اور کونسی عتاب کی وجہ سے آئی ہے۔ (جس کی ایک علامت یہ ہے کہ جس مصیبت کا منشاء عتاب نہ ہو بلکہ رضا ہو اُس سے قلب میں اضطراب اور بے چینی نہیں پیدا ہوتی اور جس کا منشا عتاب ہوتا ہے اس سے بے چینی اور پریشانی بڑھتی ہے) غرض آثار سے وہ سمجھ گئے کہ یہ فتوحات کی بندش کسی عتاب کی وجہ سے ہے پھر سوچنے سے خیال آیا کہ فلاں دن اس غریب کی کوڑیاں واپس کر دی تھیں شاید یہ بات ناپسند ہوئی ہے بس اسی وقت گھبرا کر بلایا اور خود سوال کیا کہ بھائی وہ دھیلہ کی کوڑیاں ہمیں دیدو آہ یا تو دینے سے بھی نہ لیا تھا یا خود اس سے مانگ رہے ہیں ؎

ایں چنیں شیخے گدائے کو بہ کو عشق آمد لا اُبالی فنا لقوا

واقعی یہ عشق بھی بہت ناچ نچاتا ہے وہ بیچارہ یہ سنکر باغ باغ ہو گیا اور کہا مولانا واقعی مجھے آپ کے انکار سے بہت کلفت ہوئی تھی اور میں نے ابتک وہ کوڑیاں خرچ نہیں کیں دل نے گوارا ہی نہیں کیا کہ ان کو خرچ کروں ابتک ویسی ہی رکھی ہیں آپ نے کہا بس جلدی لے آؤ اب میں اس کلفت کا تحمل نہیں کر سکتا جو تم کو ایذا دینے سے مجھے پہنچ رہی ہے چنانچہ اس نے وہ کوڑیاں دیں اور آپ نے خوش خوش لے لیں بس اُسی دن سے فتوحات کا دروازہ کھل گیا صاحبو! عارفین کی تو یہ شان ہوتی ہے کہ وہ دھیلہ کی کوڑیوں سے بھی مستغنی نہیں ہیں اور اگر کبھی ذرا بھی کسی ادنی نعمت سے استغناء کا وسوسہ پیدا ہو جائے تو پھر خود مانگتے ہیں۔ پھر ان کو دعا میں ثواب یا جنت سے استغناء کیونکر ہو سکتا ہے اس لئے یہ جو مولانا نے فرمایا ہے کہ ؎

از دعا نہ بود مرادِ عاشقاں جز سخن گفتن بہ آں شیریں دہاں

اس کا مطلب کوئی یہ نہ سمجھے کہ ان کو لذت خطاب کے سوا جنت یا ثواب کی طلب اور پروا نہیں ہوتی ہرگز نہیں پروا تو ان کو ہر چیز کی ہے ہاں غلبہ لذت و خطاب میں بعض دفعہ ثواب وغیرہ کی طرف التفات نہیں ہوتا۔ جیسا کہ میں نے نماز کی مثال سے اس کو واضح کر دیا تھا اور یہ مضمون دعا کا اس پر چلا تھا۔ کہ عاشق محبوب کے روز روز آنے اور دیر تک بات چیت کرنے سے نہیں گھبرایا کرتا۔ بلکہ وہ تو اس کا موقعہ ڈھونڈا کرتا ہے کہ کسی طرح

اور دیر تک باتیں ہوں جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے جواب میں اسی لئے اطناب سے کام لیا تھا اس پر درمیان میں ان سالکین کی غلطی ظاہر کردی تھی جو دعا کو ترک کر دیتے ہیں اور بتلا دیا تھا کہ گو حق تعالیٰ کو سب کچھ معلوم ہے اور تمہارے بتلانے اور مانگنے کی ضرورت نہیں مگر محبت کا مقتضاء یہ ہے کہ جب محبوب بولنے کی اجازت دے تو بات چیت کے موقعہ کو غنیمت سمجھے اور خوب عرض و نیاز کرے اور جو چاہے مانگے (یعنی حدود میں رہکر ۱۲ جامع) غرض عاشق کبھی محبوب کے روز روز آنے سے نہیں گھبرایا کرتا جیسا کہ ہم روز روز دو وقت روٹی کھانے سے نہیں گھبراتے تو حیرت ہے کہ ہم لوگ روٹی سے تو مستغنی نہیں ہیں مگر ذکر سے مستغنی ہیں۔ یہاں تک کہ بعض اہل علم بھی خط میں لکھتے ہیں کہ اوراد سے جی گھبراتا ہے کہ یہ کہاں کا جنم روگ لگا جس کا تذکرہ ابھی کیا تھا افسوس ان لوگوں نے دنیا کے کاموں کو کبھی جنم روگ نہ سمجھا دیکھئے جو لوگ کسی کام پر ملازم ہیں وہ روزانہ اسی کام پر لگتے ہیں کوئی روز آٹے کی مشین چلاتا ہے کوئی روز تعمیر کے کام پر جاتا ہے آخر اس کو جنم روگ کیوں نہیں سمجھا گیا بس یوں چاہئے کہ ہر دن نیا کام کیا جائے ایک ہی کام روز روز کیوں کیا جاتا ہے اس کا منشا صرف یہ ہے کہ ان کاموں کو تو مفید اور ضروری سمجھتے ہیں۔ اس لئے عمر بھر روزانہ کرنے سے بھی نہیں گھبراتے اور ذکر کو مفید اور ضروری نہیں سمجھتے۔ اس لئے وہ جنم روگ معلوم ہوتا ہے حضرت یہ ہماری بدقسمتی ہے ورنہ ذکر ایسی چیز ہے کہ مسلمان کو تو اس سے کبھی غفلت نہ ہونا چاہئے تھی غالباً حضرت خواجہ عبید اللہؒ احرار کا ارشاد ہے کہ مجھے بہت زمانہ کے بعد معلوم ہوا کہ عالم میں اہل غفلت بھی ہیں ورنہ ابتداء سے میں یہ سمجھتا تھا کہ سب لوگ ذاکر ہیں۔ خدا سے غافل کوئی نہیں خواجہ صاحب بچپن ہی سے صاحب نسبت تھے مادرزاد ولی تھے اُن پر کبھی غفلت گذری ہی نہیں اس لئے وہ سمجھتے تھے کہ سب ایسے ہی ہوتے ہوں گے بعد میں معلوم ہوا کہ دنیا میں اہل غفلت بھی ہیں اس نمونہ کے ایک بزرگ اس زمانہ میں بھی ہوئے ہیں مولانا رفیع الدین صاحب مہتمم مدرسہ دیوبند رحمۃ اللہ علیہ کے والد صاحب مادرزاد ولی تھے۔ ایک دفعہ کوئی گوجر ان کی بھینس چرا لے گیا حضرت نے تلاش کیا تو لوگوں نے اسی پر شبہہ ظاہر کیا کہ حضرت فلاں شخص لے گیا ہے۔ آپ نے اس سے فرمایا کہ بھائی ہماری بھینس اگر لی ہو تو دے دو

اس نے قسم کھالی کہ حضرت میں نے آپ کی بھینس نہیں لی کسی نے جھوٹ موٹ میرا نام لے دیا ہے آپ کو یقین آگیا اور لوگوں سے کہا کہ اس نے نہیں لی وہ تو قسم کھاتا ہے یہاں تو وہ قسم کھا کر بری ہو گیا مگر خدا تعالیٰ سے کیونکر چھوٹتا غیب سے اس پر افتاد پڑی طور نقصان پر نقصان اموات پر اموات ہونے لگیں سمجھ گیا کہ یہ حضرت کے سامنے جھوٹی قسم کھانے اور اُن کو تکلیف پہونچانے کا وبال ہے آخر جھک مار کر آیا اور اقرار کیا کہ حضرت میں نے آپ کی بھینس چرائی تھی میری خطا معاف کر دیجئے فرمایا کہ تو نے تو قسم کھا کر کہا تھا میں نے نہیں لی کہا میں نے جھوٹی قسم کھالی تھی یہ سنکر حضرت گھبرا گئے اور فرمایا اللہ کسوں (یعنی اللہ کی قسم یہ پرانا محاورہ تھا) مجھے تو آج خبر ہوئی کہ مسلمان جھوٹی قسم بھی کھا سکتا ہے پہلے بزرگوں کے محاورات سیدھے سادے ہوتے تھے۔ اللہ کی قسم کی جگہ اللہ کسوں کہتے تھے۔ تو بعض مادر زاد ولی اور صاحب استغراق آجکل بھی ہوتے ہیں بہر حال ذکر ایسی ہی چیز ہے کہ ہر مسلمان کو لازم ہونا چاہئے مگر بدقسمتی سے آجکل لازم نہیں رہا اس کی بھی ایک خاص جماعت رہ گئی ہے۔ سو اس مضمون کا تعلق ان ہی اہل ذکر سے ہے اس لئے اس کے لئے ایک خاص مجلس منعقد کی گئی ورنہ حقیقت میں یہ مضمون سب مسلمانوں کے لئے عام تھا اب اس کو سن لیجئے وہ مضمون یہ ہے کہ "اللہ تعالیٰ کے تمام افعال میں رضا چاہئے اور اپنی تجویز کو اُن میں دخل نہ دینا چاہئے" گو یہ بات سب کو معلوم ہے اور اعتقاداً سب ذاکرین اس کو مانے ہوئے ہیں مگر حالاً کبھی اس میں کوتاہی ہو جاتی ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ الوان محبت مختلف ہیں۔ کسی میں التہاب ہے اور کسی میں خمود ہے۔ یعنی بعض میں طلب کا لون کیفیت عشقیہ وشوقیہ کے ساتھ ہوتا ہے جس کا خاصہ ہے التہاب اور اضطراب یعنی سوزش وشورش اور بعض میں اُنس کے ساتھ ہوتا ہے۔ جس کا خاصہ ہے خمود اور برودت تو کبھی صاحب خمود اپنے کو التہاب واحتراق سے خالی دیکھ کر یہ سمجھ لیتا ہے کہ میں محبت سے محروم ہوں کیونکہ وہ محبت کو لون التہاب کے ساتھ مخصوص سمجھتا ہے پھر عجلت کی وجہ سے اپنے لئے التہاب کو تجویز کرتا ہے اور تمنا کرتا ہے کہ کسی طرح میرے اندر بھی التہاب پیدا ہو اور جب کسی حکمت سے حق تعالیٰ اس میں یہ کیفیت پیدا نہیں کرتے تو یہ اپنے کو محبت سے

خالی اور محروم سمجھ کر مغموم رہتا ہے۔ مگر یہ اس کی غلطی ہے اس نے یہ نہیں سمجھا کہ محبت کا ایک لون بردھمود بھی ہے پس یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں محبت سے محروم ہوں ہرگز محروم نہیں ہو محبت سے تم بھی حصہ لئے ہوئے ہو۔ مگر اس کا رنگ دوسرا ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ یہ محبت سے اپنے کو خالی سمجھنے والا کیا کبھی ایک دن کی نماز بھی ترک کر سکتا ہے اگر کوئی اس کو ہزاروں روپیہ دے اور یہ کہے کہ آج نماز نہ پڑھو تو کیا یہ اُس کو گوارا کر سکتا ہے ہرگز نہیں کوئی مسلمان اس کو گوارا نہ کرے گا ہاں شرط یہ ہے کہ صاحب طلب ہو طالب دنیا نہ ہو ورنہ وہ تو ایک پیسہ میں بھی نماز کو بیچ دے گا ہزاروں کا تو کیا ذکر چنانچہ آجکل بہت مسلمان دین فروشی کر رہے ہیں اور بعض اہل علم بھی اس گناہ میں مبتلاء ہیں اتنا فرق ہے کہ عوام کی دین فروشی تو بصورت دنیا ہوتی ہے وہ گناہ کو گناہ کی شکل میں کرتے ہیں اور اپنے آپ کو گناہگار بھی سمجھتے ہیں۔ اور مولوی صاحب کی دین فروشی بصورت دین ہوتی ہے وہ گناہ کو طاعت بنا کر کرتے ہیں غلط فتوے دیں گے اور ٹھونس ٹھانس کسی کلیہ کے تحت میں اسے داخل کر دینگے ان سے تو وہ عوام ہی اچھے جو گناہ کر کے ڈرتے اور اپنے کو بُرا تو سمجھتے ہیں اور یہ مولوی صاحب تو طاعت بنا کر ڈرتے بھی نہیں کیونکہ اپنے نزدیک وہ گناہ کو شریعت کے موافق بنا چکے ہیں شاید اس پر کسی کو یہ سوال پیدا ہو کہ تم نے عوام کی دین فروشی کو علماء کی دین فروشی سے اچھا کیونکر کہدیا۔ اور ان کو صاحب خشیت اور مولویوں کو خشیت سے خالی کیونکر بنا دیا حالانکہ نص سے معلوم ہوتا ہے کہ خشیت تو علماء ہی میں ہوتی ہے جہلاء میں نہیں ہوتی چنانچہ حق تعالیٰ اس کی تصریح فرماتے ہیں۔ "انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء" اس کا جواب یہ ہے کہ آیت میں علم خشیت کے لئے شرط ہے علت نہیں ہے۔ اس کی تقسیر میں لوگ غلطی کرتے ہیں کہ علم کو علت خشیت سمجھتے ہیں اس لئے اس پر یہ اشکال بھی وارد ہوتا ہے کہ آیت کا مقتضاء تو یہ ہے کہ کوئی عالم خشیت سے خالی نہ ہو۔ اور کسی مولوی سے گناہ کا صدور نہ ہو حالانکہ اس کے خلاف مشاہدہ ہوتا ہے۔ یہ اشکال پہلے مجھے بھی ہوتا تھا پھر خود بخود قلب پر یہ بات وارد ہوئی کہ اس حصر کا مفہوم تو یہ ہے کہ "لایخشی اللہ من عبادہ الا العلماء" جس کا خلاصہ یہ ہوا کہ "لاخشیۃ الا بالعلم" نہ کہ "لاعلم الا بالخشیۃ" پس یہ حصر ایسا ہو گیا جیسا کہ حدیث میں آیا ہے

"لاصلوٰۃ الا بطہور" کہ نماز بدون وضو کے نہیں ہوتی۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ نماز کا جہاں وجود ہوگا وضو کے ساتھ ہوگا بدون وضو کے نہ ہوگا۔ یہ تو مطلب نہیں کہ جب وضو کا وجود ہو تو اس کے ساتھ نماز کا وجود بھی لازم ہو اسی طرح یہاں پر علم شرط خشیت ہے کہ جہاں خشیت ہے وہاں علم ضرور ہے گو وہ مولوی بھی نہ ہو کیونکہ جاہل بھی خدا سے ڈرتا ہے تو اُسے کم از کم عذاب ہی کا علم ہے تو خشیت بدون علم کے اس کو بھی نہیں ہوئی باقی یہ ضرور نہیں کہ جہاں علم ہو وہاں خشیت لازم ہو کیونکہ علم اس کی علت نہیں اور علت کا وجود تو معلول کے وجود کو مستلزم ہوتا ہے مگر شرط کا وجود مشروط کے وجود کو مستلزم نہیں ہوتا ہاں انتفاء شرط انتفاء مشروط کو بیشک مستلزم ہوتا ہے سو ایسی نظیر کوئی نہیں دکھا سکتا کہ کہیں خشیت کا وجود بدون علم کے ہو گیا ہو تو علم لوازم خشیت سے ہوا نہ کہ خشیت لوازم علم سے بہر حال اس آیت کی تفسیر میں بہت لوگوں نے غلطی کی ہے اس لئے میں نے متنبہ کر دیا اور یہاں سے معلوم ہوا کہ علوم معقولہ سے فہم قرآن میں بہت سہولت ہو جاتی ہے چنانچہ شرط اور علت کا نام سنتے ہی طلبہ فوراً سمجھ گئے ہوں گے کہ دونوں میں کتنا بڑا فرق ہے یہ کام کی بات تھی اس لئے درمیان میں بیان کر دی گئی۔ غرض جو لوگ طالب دنیا ہوں اُن کا تو ذکر نہیں مگر طالب حق جو صاحب عمود ہی ہو ہرگز کسی طمع کی وجہ سے نماز کو قضا نہیں کر سکتا پس اس کا اپنے کو محبت سے خالی سمجھنا غلط ہے۔ اگر محبت سے محروم ہوتا تو نماز سے اتنی محبت نہ ہوتی اور طالب ہو کر بھلا محروم کیونکر ہو سکتا ہے میں تو دعوے سے کہتا ہوں کہ طالب کبھی محروم نہیں ہوتا کیونکہ حق تعالےٰ کا وعدہ ہے "من تقرب الی شبرا تقربت الی ذراعا ومن تقرب الی ذراعا تقربت الیہ باعا" یعنی جو میری طرف ایک بالشت بھر قریب ہوتا ہے میں ایک ہاتھ اس سے قریب ہوتا ہوں اور جو ایک ہاتھ قریب ہوتا ہے میں ایک باع یعنی دونوں کھلے ہوئے ہاتھوں کی مقدار اس سے قریب ہوتا ہوں اور یہاں چونکہ طلب موجود ہے تو قصد قرب بھی موجود ہے اور اس پر وعدہ ہے عطای تقرب کا تو محرومی نہیں ہو سکتی بلکہ یقیناً یہ شخص مقرب ہے۔ گو اس کا تقرب بصورت تنزل ہی ہو اور گو اس کے زعم میں خلو اور محرومی ہو کیونکہ عروج قرب حق کی یہ بھی ایک قسم ہے کہ تنزل کی صورت میں ہو مولانا فرماتے ہیں کہ ؎

گفت پیغمبر کہ معراجِ مرا نیست از معراج یونس اجتبا
قرب نزدیکی ببالا رفتن است قرب حق از قید ہستی رستن است

مولانا نے حدیث لاتفضلونی علی یونس بن متی کی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ اس کے عموم میں یہ بھی ہے کہ حضور فرماتے ہیں کہ میری معراج کو یونس علیہ السلام کی معراج پر فضیلت نہ دو کیونکہ جس طرح قرب حق کی ایک صورت پستی سے بلندی کی طرف جانا ہے اسی طرح ایک صورت یہ بھی ہے کہ بلندی سے پستی کی طرف جائے قرب حق صورت عروج ہی میں منحصر نہیں بلکہ کبھی بصورت نزول بھی ہوتا ہے اگر قرب ہمیشہ بصورت عروج ہی ہوا کرتا تو حق تعالیٰ "واسجد واقترب" نہ فرماتے بلکہ واسجد وابتعد فرماتے کیونکہ سجدہ میں تو بلندی کی طرف نہیں جاتا بلکہ بندہ پستی کی طرف جاتا ہے اگر یہ بعد ہوتا تو حق تعالیٰ اسپر "واقترب" کو مرتب نہ فرماتے حالانکہ نص میں صراحۃً سجدہ کو سبب قرب فرمایا گیا ہے معلوم ہوا کہ قرب کبھی بصورت نزول بھی ہوتا ہے پس تم یہی سمجھو کہ تم کو اسی صورت سے قرب عطا ہوا ہے۔ صاحب اگر تم خدا سے دور ہوتے تو وہ طاعات و ذکر کی تم کو کبھی توفیق نہ دیتے۔ اور یہ طلب تمہارے اندر پیدا نہ کرتے یہ مضمون حضرت حاجی صاحب نے بیان فرمایا تھا۔ واقعی حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایسے شبہات کے حل کرنے کے امام تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ فرمایا کہ جو شخص حج کرکے یہ وسوسہ رکھے کہ نہ معلوم میرا حج قبول ہوا یا نہیں وہ بڑا بدگمان ہے۔ اگر حق تعالیٰ کو قبول حج منظور نہ ہوتا تو وہ تم کو اپنے دربار تک آنے بھی دیتے دور ہی سے دھکے دیدیتے جیسا کہ ہزاروں کو باوجود وسعت و دولت کے حاضری کی توفیق نہیں دی جب حق تعالیٰ نے تم کو اپنے گھر تک بلا لیا تو امید قوی رکھو کہ انشاء اللہ حج قبول ہے اور حدیث میں ہے "انا عند ظن عبدی بی" اس قاعدہ سے امید ہے کہ اگر تمہارا حج قابل قبول بھی نہ ہو تو اس گمان نیک کی برکت سے قبول ہو جاویگا اسی طرح ایک دفعہ ایک ذاکر نے عرض کیا کہ حضرت میں چوبیس ہزار دفعہ ذکر اسم ذات کرتا ہوں مگر کچھ نفع نہیں معلوم ہوتا۔ فرمایا یہ کیا تھوڑا نفع ہے کہ تم کو اس قدر ذکر کی توفیق دی سبحان اللہ اس سے زیادہ اور کیا حاصل ہوگا غرض جو شخص طلب میں مشغول ہے وہ یہ نہ سمجھے کہ میں صرف طالب ہی ہوں اور اسی طلب سے کام کر رہا ہوں بلکہ یہ سمجھنا چاہئے کہ حق تعالیٰ کو بھی اس سے

محبت ہے صاحب حق تعالیٰ ہی کی محبت سے آپ کام کرتے ہیں اگر ان کو محبت نہ ہوتی تو آپ کی کیا مجال تھی جو طلب میں مشغول ہوتے اور ذکر و طاعات بجالاتے اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

آب کم جو تشنگی آور بدست تا بجوشد آبت از بالا و پست

یعنی پانی کی تلاش کم کرو اور اپنے اندر تشنگی پیدا کرو جہاں تشنگی ہوگی وہاں پانی خود بخود پہونچ جائیگا۔ آگے فرماتے ہیں کہ جس طرح پیاسے پانی کے طالب ہیں اسی طرح پانی بھی ان کا طالب ہے۔ ؎

تشنگاں گر آب جویند از جہاں آب ہم جوید بعالم تشنگاں

مطلب یہ ہے کہ ہر محب محبوب بھی ہوتا ہے اور ہر طالب مطلوب بھی ہوتا ہے تم تنہا اپنے ہی کو طالب نہ سمجھو بلکہ تمہارا بھی کوئی طالب ہے اور اسی کی طلب کے اثر سے تمہارے اندر طلب پیدا ہوئی ہے فرماتے ہیں ؎

ہر کہ عاشق دید پیش معشوق داں کیں بہ نسبت ہست ہم این و ہم آں

پس اتنا فرق ہے کہ تمہارا عشق تو ایسا ہے کہ تم نے دنیا میں غل مچا دیا ڈھول پیٹ دیے کہ ہائے ہم مرے ہائے ہم چلے تم نے تو ایک شور برپا کر دیا اور معشوق کا عشق مخفی ہے وہ ڈھول نہیں پیٹتے فرماتے ہیں ؎

عشق معشوقاں نہاں است و ستیر عشق عاشق باد و صد طبل و نفیر
لیک عشقِ عاشقاں تن زہ کند عشق معشوقاں خوش و فربہ کند

تمہارے عشق کی شان تو یہ ہے کہ اس سے چہرہ زرد ہو گیا لبوں پر خشکی آگئی اضطراب اور بےچینی بڑھ گئی اور عشق محبوب کی شان عدم تغیر و عدم تأثر ہے۔ پس فربہ کند کہنا مجاز ہے اور مطلب یہ ہے کہ وہاں تاثر اور تغیر نہیں ہے جیسا عاشق کو کیفیت عشق سے تاثر و تغیر ہوتا ہے جیسے گریہ و آہ و زاری و زردیِ رنگ و رُخ وغیرہ۔ اور چونکہ عدم تاثر و عدم تغیر کے لئے عادۃً مخلوق میں فربہی لازم ہے تو مولانا نے بطور کنایہ کے لازم بولکر ملزوم کا قصد کر لیا اور یہ کوئی جرم نہیں قرآن و حدیث میں ایسے محاورات کا استعمال بکثرت موجود ہے حدیث میں آتا ہے کہ قیامت میں حق تعالیٰ بندہ سے فرمائیں گے "مرضت فلم تعدنی و استطعمک فلم تطعمنی"

کہ میں بیمار ہوا تو میری عیادت کو نہ آیا میں نے کھانا مانگا تو نے دیا نہیں مومن عرض کریگا یارب کیف اعودک وکیف اطعمک وانت رب العالمین" کہ الٰہی میں آپ کی عیادت کیسے کرتا اور آپکو کھانا کیسے کھلاتا آپ تو رب العالمین ہیں۔ اور ان تغیرات سے منزہ ہیں ارشاد ہوگا کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا اور اس نے تجھ سے کھانا مانگا تھا سو تو نے اس کی عیادت نہ کی نہ اُسے کھانا دیا اور اگر تو اس کو پوچھنے جاتا اور اس کی خدمات کرتا" لوجدتنی عندہ" تو مجھے اسکے پاس ہی پاتا بتلایئے یہ مجاز کا استعمال ہے یا نہیں ورنہ کیا حق تعالیٰ پر مرض کا حقیقی اطلاق صحیح ہوسکتا ہے ہرگز نہیں (علی ہذا قرآن میں حق تعالیٰ کے لئے رؤف ورحیم اور غضب وغیرہ کا جو استعمال ہے کیا اس کو حقیقت پر حمل کیا جاسکتا ہے۔ کبھی نہیں علماء نے خود تصریح کی ہے کہ ان صفات کا حمل حق تعالیٰ پر غایات کے اعتبار سے ہوتا ہے نہ کہ مبادی کے اعتبار سے ۱۲) پھر صوفیہ ہی نے اگر مجاز کا استعمال کرلیا تو کیا قصور ہوگیا ان علماء خشک سے خدا بچائے کہ خواہ مخواہ صوفیہ پر دھڑا دھڑ کفر کے فتوے لگانے لگے حالانکہ اس سے بڑھ بڑھ کر نصوص میں الفاظ موجود ہیں اور رات دن یہ خود اس میں تاویلیں کرتے ہیں پھر صوفیہ کے کلام میں تاویل کرلینے اور کنایہ ومجاز پر حمل کرنے سے ان کو کیا چیز مانع ہوئی۔ یہ ضرور ہے کہ بعض صوفیہ سے دین کا ضرر بھی ہوا ہے مگر غیر محققین سے باقی محققین سے کبھی ضرر نہیں ہوا محقق ایک جگہ اگر مجاز کا استعمال کرتا ہے تو دوسری جگہ اس کی حقیقت کو واضح کردیتا ہے چنانچہ یہاں تو مولانا نے عشق الٰہی کی ایک مثال بیان کردی اور دوسری جگہ ان تمثیلات سے براءت ظاہر کی ہے فرماتے ہیں ؎

اے بروں از وہم وقال قیل من　　خاک بر فرق من وتمثیل من

اس کے بعد تمثیل کا عذر بیان کرتے ہیں کہ جب یہ تمام تمثیلات ناقص ہیں تو پھر ان کو بیان کس لئے کیا جاتا ہے۔ تو فرماتے ہیں ؎

بندہ نشکیبد ز تصویر خوشت　　ہر دمت گوید کہ جانم مفرشت

یعنی بندہ کو بدون آپ کے تصور کے صبر نہیں آتا اور تصور بدون مثال کے ہو نہیں سکتا کیونکہ غائب کا تصور کسی نہ کسی صورت ہی سے ہوگا مگر وہ صورت عین حق نہ ہوگی بلکہ

محض مثال ہوگی آخر نماز میں جو تم حق تعالیٰ کا تصور کرتے ہو تو کیا یہ ذات کا تصور ہے ہرگز نہیں بلکہ مثال کا تصوّر ہے ورنہ وہ تو وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے جو بھی مثال خدا کی ہمارے ذہن میں آتی ہے۔ حق تعالیٰ سب سے پاک ہیں اسی لئے صوفیہ یوماً فیوماً ترقی کی وجہ سے روزانہ تصور سابق سے توبہ و استغفار کرتے جاتے ہیں۔ کیونکہ ترقی کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ مثال سابق ناقص تھی اسی کو ایک آزاد صوفی نے اس عنوان سے بیان کیا ہے جو ظاہر میں بہت وحشت ناک ہے۔ واقعی بعضوں کا جی ہی چاہتا ہے کہ اُن پر فتوے لگے مگر وہ محض عنوان ہی کے درجہ میں وحشت ناک ہے مطلب وحشت ناک نہیں وہ کہتے ہیں ؎

بیزارم ازاں کہنہ خدائی کہ تو داری ہر روز مرا تازہ خدائے دگرے ہست

ظاہر میں تو شرک معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہر دن نیا خدا ہے اور تمہارے پرانے خدا سے میں بیزار ہوں مگر مطلب یہ ہے کہ تم کو چونکہ ترقی نہیں ہوئی اس لئے ساری عمر ایک ہی مثال سے حق تعالیٰ کا تصور کرتے رہتے ہو اور مجکو روزانہ ترقی ہے اس لئے مجھے ہر دن نئی مثال سے تصوّر ہوتا ہے۔ غرض مجاز کا استعمال جس طرح قرآن و حدیث میں ہے یوں ہی صوفیہ کے کلام میں بھی ہے۔ اس سے متوحش ہونا دلیل ناواقفیت ہے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ تم اپنے کو صرف طالب ہی نہ سمجھو بلکہ خدا تعالیٰ کو بھی تم سے محبت ضرور ہے۔ اور اُسی محبت کا یہ اثر ہے کہ تم کو طلب دیدی پھر اپنے کو محروم کیوں سمجھتے ہو۔ پس میں نے حضرت حاجی صاحب کے ارشاد سے اور مولانا رومی کے اقوال سے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "من تقرب الی ذراعاً تقربت الی باعاً" سے بلکہ یوں کہو کہ حق تعالیٰ سے کیونکہ یہ حدیث قدسی ہے جو حق تعالیٰ ہی کا ارشاد ہے قرآن میں اور حدیث قدسی میں صرف اتنا فرق ہے کہ وہ قرآن متلو ہے اور یہ متلو نہیں ہے۔ یہ ثابت کر دیا ہے کہ طالب کبھی محروم نہیں ہوتا تو حیرت ہے کہ یہ شخص باوجودیکہ اسمیں آثار محبت موجود ہیں۔ (یعنے طلب اور قصد ۱۲) پھر اپنے کو محبت سے خالی سمجھتا ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی کو شراب پلائی گئی ہو مگر زیادہ تیز نہ ہو تو وہ یوں سمجھے کہ مجھے سوڈا پلایا گیا ہے۔ جیسے رڑکی میں اس کا عکس ہوا تھا۔ کہ وہاں ایک مولوی صاحب گئے اور رات کو ایک مسجد

میں وعظ کہا اگلے دن ایک تاجر نے انکی دعوت کی تو یہ اس کی دوکان پر گئے اس وقت وہ تاجر سوڈے کی بوتل پینے کے واسطے کھول رہا تھا پہلے پہل سوڈے کی بوتلوں کی ڈاٹ باہر کی طرف بڑے زور سے کھلتی تھی۔ تو اس کی تیزی سے مولوی صاحب یہ سمجھے کہ شراب پی رہا ہے آپ نے اس کو نصیحت کی کہ ہم سے محبت کرتے ہو اور شراب پیتے ہو اس نے کہا یہ شراب نہیں ہے بلکہ سوڈا ہے ان کو یقین نہ آیا کہ بھلا ایسا جوش شراب کے سوا بھی کسی چیز میں ہو سکتا ہے۔ اس نے پھر یقین دلایا غرض بڑی مشکل سے انکو یقین آیا۔ کہ واقعی سوڈا ہی ہے۔ اب اس تاجر نے مولوی صاحب سے بھی کہا کہ ایک بوتل آپ بھی پی لیں اول تو انھوں نے انکار کیا مگر اصرار کے بعد ایک بوتل پی لی تھوڑی دیر کے بعد تاجر نے یہ شرارت کی کہ بیٹھے بیٹھے جھومنے لگا مولوی صاحب نے پوچھا کہ جھومتے کیوں ہو۔ کہا یہ تو شراب تھی مجھے اس کا نشہ چڑھنے لگا ہے۔ اب تھوڑی دیر میں آپ بھی اسی طرح جھومیں گے۔ بس یہ سن کر مولوی صاحب کا تو رنگ فق ہو گیا اور کہنے لگے اللہ کے واسطے مجھے کسی کوٹھری میں بند کر دے تاکہ مجھے نشہ کی حالت میں کوئی دیکھنے نہ پائے لوگ کیا کہیں گے کہ رات تو یہ وعظ کہہ رہے تھے اور اب شراب پینے لگے اور خدا کے واسطے کسی سے کہنا نہیں میں تو پہلے ہی شراب سمجھکر تمھیں بھی اس سے روکتا تھا مگر تم نے دھوکہ سے مجھے پلا دی تاجر نے کہا کہ اب تو جو ہونا تھا ہو چکا اب ذرا لوگ بھی تو آپ کا تماشا دیکھیں مولوی صاحب رونے لگے اور اس کی بہت خوشامدیں کرنے لگے تب وہ ہنس پڑا اور کہا مولوی صاحب آپ تو بہت ہی بھولے نکلے کہ ساری بوتل پینے کے بعد بھی آپ کو یہ احتمال باقی رہا کہ شاید یہ شراب ہی ہو میں تو آپ سے ہنسی کر رہا تھا آپ گھبرائیں نہیں۔ بڑی کوشش سے ان کو اطمینان ہوا۔ تو جیسے ان مولوی صاحب نے سوڈے کی بوتل کو شراب سمجھ لیا تھا ایسے ہی بعض سالکین شراب محبت پی کر یوں سمجھتے ہیں کہ ہم نے سوڈا پی رکھا ہے صاحب یہ تمھاری غلطی ہے کہ تم شراب کو سوڈا سمجھتے ہو محض اس لئے کہ اسمیں تیزی کم ہے سو یاد رکھو کہ شرابیں مختلف ہیں۔ کسی میں تیزی کم ہوتی ہے کسی میں زیادہ اسی لئے کسی میں التہاب ہے اور کسی میں نہیں جس میں التہاب نہیں ہوتا وہ اپنے کو محبت سے خالی اور

محروم سمجھنے لگتا ہے غرض بعض دفعہ محبت ایسی لطیف کیفیت کے ساتھ ہوتی ہے جس کا خود صاحب محبت کو بھی پتہ نہیں چلتا مگر پہچاننے والا پہچان لیتا ہے سو اس حالت میں آپ کو محقق کی بات مان لینی چاہئے۔ اسی محبت کی کمی کے تو ہم پر دو واقعے یاد آگئے ایک دفعہ حضرت مولانا گنگوہیؒ نے مولانا محمد قاسم صاحبؒ سے فرمایا کہ میں اپنے اندر حاجی صاحب کی ایسی محبت نہیں پاتا۔ جیسے مریدوں کو شیخ سے ہوا کرتی ہے تو مولانا محمد قاسم صاحب نے اس کا عملی جواب دیا کہ اول تو اس بات کو ٹال گئے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے تھوڑی دیر میں فرمایا کہ مولانا مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ماشاء اللہ آپ حاجی صاحب سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ بس یہ سن کر مولانا گنگوہیؒ گھبرا گئے اور فرمایا توبہ کرو توبہ کہاں میں اور کہاں حاجی صاحبؒ میں تو اُن کی خاک پا کے بھی برابر نہیں مجھے آپ کی اس بات سے سخت تکلیف پہونچی۔ تو مولانا محمد قاسم صاحب نے فرمایا کہ آپ تو یہ کہتے تھے کہ مجھے حاجی صاحبؒ سے محبت نہیں پھر اتنی توبہ استغفار اور گھبراہٹ کیوں ہے مولانا نے فرمایا جزاک اللہ وقتی تمہارے اس بات سے مجھے معلوم ہو گیا کہ بہت محبت ہے تو مولانا نے زبانی جواب نہ دیا بلکہ عملی جواب دیا کیوں اس لئے کہ ؎

گرچہ تفسیر زباں روشن گراست لیک عشق بے زباں روشن تراست

بعض دفعہ زبانی جواب سے وہ بات حاصل نہیں ہوتی جو بے زبانی سے حاصل ہوتی ہے اسی طرح ایک بار حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کاندھوی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک رئیس نے گڑھی پختہ میں عرض کیا کہ حضرت حدیث میں آیا ہے کہ جب تک آدمی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیوی بچوں اور ماں باپ سب سے زیادہ محبت نہ ہو اسوقت تک وہ مسلمان نہیں ہوتا تو مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور کے ساتھ ان لوگوں سے زیادہ محبت نہیں ہے بلکہ اُن سے کم ہے اس لئے اندیشہ ہوتا ہے مولانا مظفر حسین صاحب نے بھی اس کا عملی جواب دیا کہ اول حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ شروع کیا اُن رئیس کو حضور کے تذکرہ میں مزہ آنے لگا تو درمیان میں مولانا نے فرمایا کہ آپ کے والد صاحب بھی بڑے اچھے آدمی تھے مجھے ان کی ایک حکایت یاد آگئی بس یہ سُن کر وہ رئیس کہنے لگے کہ حضرت یہ بیچ میں

آپ نے کیا بات شروع کردی بھلا حضور کے تذکرہ میں میرے والد کا ذکر کیسا وہی حضور کی باتیں کیجئے جو اب تک کر رہے تھے۔ مولانا نے فرمایا کہ آپ کو تو اپنے والد کا تذکرہ بہت ناگوار ہوا۔ کہا بھلا حضور کے تذکرہ میں کسی کا ذکر کیونکر گوارا ہو سکتا ہے۔ فرمایا تم تو کہتے تھے کہ مجھے حضور کے ساتھ ماں باپ سے زیادہ محبت نہیں پھر حضور کے ذکر میں ان کے تذکرہ سے ناگواری کیوں ہوئی معلوم ہوا کہ حضور کے ساتھ سب سے زیادہ محبت ہے مگر وہ ایسی رگ وپی میں سرایت کی ہوئی ہے کہ پتہ نہیں چلتا موقعہ پر اس کا ظہور ہوتا ہے اب تو رئیس صاحب کی آنکھیں کھل گئیں اور کہا مولانا واقعی آپ نے خوب سمجھایا۔ دلائل سے اس طرح سمجھ میں نہ آتا جیسا آپ نے عملاً سمجھا دیا۔ تو حضرت واقعی بات یہی ہے کہ مسلمان کو اللہ ورسول کے ساتھ سب سے زیادہ محبت ہوتی ہے اگر باپ ماں یا بیوی بچے نعوذ باللہ خدا اور رسول کی شان میں کچھ بے ادبی اور گستاخی کا کلمہ کہدیں اس وقت دیکھئے آپ کی کیا حالت ہوتی ہے کہ آپ ان کو کچا کھا جائیں گے اور تن بدن میں آگ لگ جائیگی۔ اگر بیوی بچوں کی محبت زیادہ ہے تو اُس وقت وہ کہاں چلی جاتی ہے۔ موقعہ پر معلوم ہو جاتا ہے کہ مسلمان کو اللہ ورسول سے زیادہ کسی کی محبت نہیں جبھی تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں "والذین آمنوا اشد حباً للہ" مگر اس کا دعویٰ نہ کرنا چاہئے کہ ہم کو اللہ ورسول کی محبت سب سے زیادہ ہے بس دل کو تو سمجھا لو مگر زبان سے دعویٰ نہ کرو اور نہ اتنی تواضع کرو۔ کہ اپنے کو محبت سے خالی ہی سمجھنے لگو بس یہاں تو خاموشی ہی چاہئے خود کچھ فیصلہ کرو بلکہ اپنے آپ کو کسی کے سپرد کردو اور جو کچھ وہ فیصلہ کردے اسپر مطمئن رہو ؎

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خود را عیسیٰ نتواں گشت بہ تصدیق خرے چند

بزرگوں نے لکھا ہے کہ جب کوئی تم سے پوچھے کہ تم کو خدا سے محبت ہے یا نہیں تو سکوت کرو کچھ جواب نہ دو کیونکہ انکار تو کفر ہے اس لئے کہ اس میں تکذیب ہے حق تعالیٰ کے قول "والذین آمنوا اشد حباً للہ" کی اور اقرار دعویٰ ہے اور دعویٰ پر کبھی پکڑ ہو جاتی ہے امتحان ہونے لگتا ہے گو تحدث بالنعمہ کے طور پر محبت کا ظاہر کرنا دعویٰ نہیں مگر بعض دفعہ تحدث بالنعمہ اور دعویٰ کی صورت ایک ہو جاتی ہے لہجہ کے ذرا سے فرق سے بات بدل جاتی اور تحدث نعمت دعویٰ

بجا تا ہے اور دعوی اس طریق میں بہت سخت چیز ہے حضرت سمنون محب رحمۃ اللہ علیہ کا قصہ ہے کہ ایک دفعہ غلبۂ حال میں ان کے منہ سے یہ نکل گیا ؎

فلیس لی فی سواک حظ فکیف ما شئت فاختبرنی

کہ مجھے آپ کے سوا کسی چیز میں حظ نہیں ہے۔ آپ جس طرح چاہئے مجھے آزمایئے بس فوراً امتحان شروع ہو گیا اور امتحان بھی ایسا سخت جس کی انسان کو برداشت مشکل ہے یعنی پیشاب بند ہو گیا۔ پیشاب بند ہونیکی ایسی تکلیف ہوتی ہے کہ الامان سارے طبیب اور ڈاکٹر عاجز ہو گئے مگر کسی طرح بند نہ کھلا کیونکہ وہ تو امتحان تھا اور دعا اس لئے نہ کرتے تھے کہ محبوب روٹھے ہوئے تھے۔ بس ان کے دعوی کی حقیقت تو ظاہر کر دی پھر خود ہی رحم فرمایا اور ادھر ہی سے دعا کی اجازت ہوئی مگر اجازت بھی اس طرح نہیں ہوئی کہ ان سے کہا ہو یا بلا واسطہ ان کے پاس پیغام بھیجا ہو بلکہ اس طرح اجازت ہوئی کہ رات کے وقت ایک فرشتہ کو حق تعالیٰ نے بھیجا جس نے رات بھر حضرت سمنون کی آواز میں دعا کی ؎

خوش تر آں باشد کہ سر دلبراں گفتہ آید در حدیث دیگراں

سننے والوں کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حضرت سمنون ہی دعا کر رہے ہیں صبح کو مریدوں نے آکر عرض کیا کہ حضرت کیا رات کو آپ دعاء کر رہے تھے۔ فرمایا تمھیں کیسے معلوم ہوا کہا آپ کی آواز آرہی تھی۔ آپ سمجھ گئے کہ اُدھر سے دعا کی اجازت ہو گئی ہے۔ مگر اب بھی خود دعا نہیں کی کیونکہ ادھر سے اجازت بواسطہ ہوئی تھی تو آپ نے بھی بواسطہ دعا کی واقعی محبوب کے انداز بھی عجیب و غریب ہوتے ہیں جن کو عشاق ہی سمجھتے ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست بسیار شیوہا ست بتاں را کہ نام نیست

حضرت سمنون نے اس انداز کو سمجھ لیا کہ جب ادھر سے بواسطہ اجازت دی گئی ہے تو مجھے بھی بواسطہ دعا کرنا چاہئے ابھی بلا واسطہ دعا کی اجازت نہیں چنانچہ آپ نے بھی فرشتوں جیسے آدمیوں کو واسطہ بنایا یعنی معصوم بچوں کو بس روز مکتب میں جاتے اور بچوں سے کہتے "ادعوا لعمکم الکذاب" اے بچو اپنے چھوٹے چچا کے لئے دعا کرو۔ چچا تو اسواسطے کہا کہ عرب میں بڑی عمر والے کو عم ہی کہا کرتے ہیں۔ اور کذاب اس لئے کہا کہ دعوی کو نباہ تو سکے۔ تو صاحبو!

یہاں دعوی کا کام نہیں اور زیادہ تواضع بھی اچھی نہیں کہ اپنے کو محبت سے خالی کہنے لگو بس یہاں تو خاموشی ہی مناسب ہے واقعی محبت کا راستہ بھی عجیب ہے حاجی صاحب فرماتے ہیں ؎

ارے یار وجسے کہتے ہیں اُلفت قیامت ہے قیامت ہے قیامت

اور ایک عاشق نے عشق کی حقیقت کو خوب ہی بیان کیا ہے ؎

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن دل بدستِ دگرے دادن وحیراں بودن

بس یہاں تو یہی کرنا چاہئے کہ دل ان کو سپرد کرکے خود حیران کھڑا منھ تکا کرے زبان سے اقرار کرے نہ نفی کرے اس سے اگلا شعر بہت سخت ہے اہل ظاہر اس سے متوحش ہوں گے مگر مجمع خاص ہے اور اس سے پہلے میں بیان کرچکا ہوں کہ صوفیہ مجاز اور کنایہ کا استعمال کثرت سے کرتے ہیں۔ تو امید ہے کہ غلط فہمی نہ ہوگی۔ پھر میں اس کا مطلب بھی بیان کردونگا تو استبعاد رفع ہو جائیگا کہتے ہیں ؎

سوی زلفش نظرے کردن و درویش دیدن گاہ کافر شدن و گاہ مسلمان بودن

اس میں زلف سے مراد تجلیات جلالیہ ہیں اور رُخ سے مراد تجلیات جمالیہ اور کفر سے مراد فناء ہے اور اسلام سے مراد بقا ہے کیونکہ کفر میں جہل بالتصدیق ہوتا ہے اور اسلام میں علم و تصدیق ہوتی ہے اسی طرح حالت فناء میں کچھ خبر نہیں رہتی تو وہ مشابہ جہل کے ہے اور بقاء میں واردات و علوم کا ادراک ہوتا ہے وہ مشابہ تصدیق اسلام کے ہے۔ غرض یہاں بولنے چالنے کا موقع نہیں ہے حیرت ہی حیرت ہے۔ بس گلا گھونٹ کر حجرہ بند کرکے بیٹھو اور ان کی طرف متوجہ رہو۔ نواب شیفتہ خوب فرماتے ہیں ؎

چہ خوش ست با تو بزمے بہ نہفتہ ساز کردن در خانہ بند کردن در شیشہ باز کردن

پس سالکین کو چاہئے کہ ہر حالت میں راضی رہیں اور زبان کو بند رکھیں نہ اپنے کو صاحب محبت کہیں نہ خالی اور محروم کہیں میں نے بتلا دیا کہ طالب محروم نہیں ہوا کرتا دیکھو کہیں تمہارے خالی کہنے پر وہ واقعی خالی ہی نہ کردیں اور بالفرض اگر تم کو محبت ہی نہ ہو جب بھی خاموش ہی رہو جب محبت تقسیم ہوگی تو تم کو بھی ملجائے گی۔ کیونکہ چپکا کھڑے رہنے والے پر بھی رحم آجاتا ہے دیکھو جب مٹھائی تقسیم ہوتی ہے تو بعضے بچے تو اُچھلتے کودتے اور چلاتے

ہیں کہ ہمیں بھی دو اور بعضے بیچارے چپکے کھڑے رہتے ہیں۔ تو ان پر بھی تقسیم کرنے والوں کو رحم آیا کرتا ہے کہ یہ بچہ بیچارہ کچھ نہیں بولتا خاموش کھڑا ہے اس کو ضرور دینا چاہئے تو اسکو خاموشی کی وجہ سے اوروں سے پہلے حصہ ملجاتا ہے۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ اگر بالفرض تم میں محبت نہ بھی ہو جب بھی دعوی یا لفی سے چلاؤ نہیں صورت سوال بنکر چپکے بیٹھے رہو انشاءاللہ تم پر رحم کرکے ایک دن محبت عطا کر دیجائے گی صاحبو! یہ الوان محبت ہیں۔ کسی میں التہاب واضطراب ہے اور یہ بھی انھیں کا رنگ ہے۔ اور کسی میں جمود و خمود ہے یہ بھی انھیں کا رنگ ہے۔ میں دوبارہ مولانا کا شعر یاد دلاتا ہوں ؎

عشق معشوقاں نہان است بستیر عشق عاشق باد و صد طبل و نفیر

تو صاحب خمود کو خوش ہونا چاہئے کہ اس کو عشق محبوب کا خاص رنگ عطا ہوا ہے اور ایک حالت تردد و حیرت کی ہے اس پر بھی راضی رہنا چاہئے یہ بھی محبت کا ایک رنگ ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

در تردّد ہر کہ او آشفتہ است حق بگوشش او معما گفتہ است

اس کے کان میں کوئی معما کہدیا ہے کہ سوچتے رہو وہ بیچارہ اسی کو سوچ رہا ہے جیسے ہمجولوگ آپس میں پہیلی کہا کرتے ہیں جس کو دوسرا گھنٹوں سوچتا ہے۔ ایک اور عاشق اس مضمون کو دوسرے عنوان سے کہتے ہیں ؎

بگوش گل چہ سخن گفتہ کہ خنداں است بعندلیب چہ فرمودہ کہ نالاں است

تو صاحب ان کے مختلف الوان ہیں کسی کو ہنسا رکھا ہے اور کسی کو رُلا رکھا ہے۔ بس جس کو وہ ہنساتے ہیں وہ رونے کی ہوس نہ کرے اور جس کو وہ رُلاتے ہیں وہ ہنسنے کی خواہش نہ کرے۔ جس کو جس حال میں رکھیں راضی رہے خود کچھ تجویز نہ کرو۔ کہ ہائے میرے اندر التہاب ہوتا اضطراب ہوتا یا صاحب التہاب یوں کہے کہ میرے اندر برد و خمود ہوتا۔ ان تجویزوں کو چھوڑو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تدبیر نہ کرو۔ تدبیر ضرور کرو۔ مگر تدبیر کے یہ معنی نہیں کہ حالت موجودہ سے راضی نہ رہو۔ بلکہ تدبیر کے یہ معنی ہیں کہ کسی محقق سے اپنا حال کہدو۔ پھر جو وہ کہے اس کا اتباع کرو۔ اور یہی تدبیر ہے۔ اور جب تک حق تعالیٰ خود تمکو بصیرت

نہ دے دیں اس وقت تک محقق کا اتباع کرتے رہو اس کے بعد بے فکر رہو۔ طالب کو محرومی کا وسوسہ بھی نہ لانا چاہیئے۔ انشاء اللہ طالب ضرور واصل ہو کر رہے گا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ کوئی جلدی ہوتا ہے اور کوئی دیر سے کیونکہ آج اگر کسی پہلوان کی چار سیر خوراک ہے تو ایک بچہ یہ ہوس نہ کرنے لگے کہ میں بھی آج ہی سے چار سیر کھانے لگوں تو اس کا انجام یہ ہے کہ وہ دو دن میں ختم ہو جائیگا۔ اس لئے ہر شخص کو اتنی ہی خوراک دیجاتی ہے جس کا اس کو تحمل ہے۔ ؎

چار پارا قدر طاقت بار نہ　　بر ضعیفاں قدر ہمت کار نہ
طفل را گر ناں دہی بر جائے شیر　　طفل مسکیں را ازاں ناں مردہ گیر

بچہ کو تو یہی مناسب ہے کہ اسوقت دودھ ہی پیتا رہے پھر جب رفتہ رفتہ بڑا ہو گا اس دن وہ بھی اس پہلوان کی طرح سیروں ہضم کر لیگا۔ جلدی مناسب نہیں تم یہ چاہتے ہو کہ تمہیں خمود و جمود کی جگہ شوق و ذوق و التہاب و اضطراب کا رنگ عطا ہو جائے یہ تمہاری غلط تجویز ہے تم کو کیا خبر کہ شوق و ذوق کے غلبہ میں تمہارا کیا حال ہوتا۔ اب تو ایمان بھی سلامت ہے ممکن ہے کہ غلبہ شوق میں تمہارا ایمان بھی رخصت ہو جاتا ؎

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن　　کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

بس حق تعالیٰ خود ہی ہر ایک کی تربیت اس کے مناسب حال طریقہ سے فرماتے ہیں ہم کو سمجھنا چاہیئے کہ جو صورت ہمارے لئے تجویز کی گئی ہے یہی بہتر ہے۔ شوق و ذوق بیشک عجیب آثار ہیں۔ لیکن بعضی دفعہ خطرناک بھی ہیں۔ اس لئے ہر ایک کے مناسب نہیں ہوئے قربان جائیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پھر قربان ہو جیے آپ کے کہ آپ نے شوق کی دعا بھی فرمائی تو کن قیود کے ساتھ۔ فرماتے ہیں "والسائلک شوقا الی لقائک فی غیر ضراء مضرۃ ولا فتنۃ مضلۃ" یعنی میں آپ سے شوق لقا مانگتا ہوں مگر اس طرح جس میں نہ ضراء مضر ہو۔ گمراہ کن فتنہ ہو لوگ حدیثوں سے تصوف نہیں سمجھتے حالانکہ حدیث و قرآن ہی میں تصوف ہے اور کہیں نہیں۔ حضور نے اس جگہ شوق کے لئے دو قیدیں بیان فرمائی ہیں۔ ایک یہ کہ "ضراء مضرۃ" نہو میرے ذوق میں اس کی یہ تفسیر ہے کہ اس سے

جسمانی تکالیف پیدا نہ ہوں، دوسرے یہ کہ فتنۂ مضلہ نہ ہو۔ اس میں آپ نے بتلادیا کہ شوق کا ہر درجہ مطلوب نہیں بلکہ بعض درجات خطرناک بھی ہیں تفصیل اس کی یہ ہے کہ بعض دفعہ شوق کے غلبہ سے ایک ضرر تو جسم کا ہوتا ہے وہ یہ کہ جو شعشۂ عشق سے بدن گھلنے لگتا ہے جیسے تپ دق سے گھلتا ہے۔ کہ حرارت اندر ہی اندر جسم کو کھا لیتی ہے۔ اور یہ دنیا کو بھی مضر ہے دین کو بھی کیونکہ ترقی مطلوب میں جسم کو بھی بڑا دخل ہے۔ مدعیان تصوف اس کو نہیں سمجھتے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جسم جس قدر لاغر و ضعیف ہوگا اوسی قدر روح لطیف ہوگی اور ترقی روح سے ہوتی ہے یہ غلط ہے ترقی مطلوب صرف روح سے کبھی نہیں ہوسکتی ورنہ روح تو عالم بالا میں بدون جسم کے پہلے سے موجود تھی اگر ترقی مطلوب کا مدار صرف روح پر تھا تو اُس کو جسم میں مقید کرکے کیوں بھیجا گیا بس عالم ارواح ہی میں رکھا جاتا معلوم ہوا کہ ترقی مطلوب کی بعض فرد بدن ہی کے ذریعہ سے ہوتی ہے کیونکہ روح مجرد سے نماز کیونکر ادا ہوتی نماز تو جسم ہی کے ذریعہ سے ہوسکتی ہے اور اگر روح کو بقول متکلمین مادی ہی مان لیا جاوے تب بھی اس سے روزہ مثلاً کیونکر ادا ہوتا کیونکہ متکلمین بھی اس کے قائل ہیں کہ روح گو مادی ہے مگر نہایت لطیف ہے جیسے ملائکہ سو جیسے فرشتوں کو بھوک پیاس نہیں لگتی اسی طرح روح کو بھی نہیں لگتی تو روزہ کا صدور تو روح سے کبھی نہ ہوسکتا وعلی ہذا۔ بہت سے اعمال جسم پر موقوف ہیں۔ اس لئے حفاظت جسم بھی ضروری ہے اسی لئے سید العاشقین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "ان بجسدک علیک حقا" اور جو محققین حضورؐ کے مزاج شناس ہیں وہ فرماتے ہیں کہ ذاکر کو دودھ گھی خوب کھانا چاہئے اور تمام رات نہ جاگنا چاہئے مگر آجکل بھلا صوفیہ تو یہ چاہتے ہیں کہ بس جسم کو مار دو تاکہ خدا جلدی ملجاوے۔ جی ہاں ضرور ملیں گے وہ تو فرماتے ہیں "لا تقتلوا انفسکم" تو شوق میں ایک ضرر تو یہ ہوتا ہے کہ جسم کو امراض لگ جاتے ہیں جس سے اعمال نہیں ہوسکتے۔ اور جب اعمال نہ ہوئے تو ترقی بھی نہ ہوگی۔ شاید کسی کو یہاں یہ شبہ ہو کہ حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مرض کی حالت میں زیادہ اعمال نہ بھی ہوں تو اعمال صحت کا ثواب برابر ملتا رہتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ترقی اعمال پر موقوف نہیں بدون اعمال کے بھی ہوسکتی ہے

جواب یہ ہے کہ حدیث سے تو صرف پہلے اعمال کا ثواب ملنا معلوم ہوتا ہے۔ اس سے ترقی قرب کہاں ثابت ہوتی ہے۔ یہ دعوی آپ بدون نص کے کیسے کرتے ہیں اور کسی عمل کا ثواب مل جانا اس کو مستلزم نہیں کہ جو ترقی خود مباشرت عمل سے ہوتی وہی اب بھی ہوگی (دیکھو تین دفعہ قل ہو اللہ پڑھنے کا ثواب پورے قران کے برابر ہے تو کیا اس سے یہ لازم آگیا کہ تین دفعہ قل ہو اللہ کہنے سے ترقی بھی اتنی ہی ہوتی ہے جتنی پورے قران کی تلاوت سے ہوئی ہے یا صبح کی نماز کے بعد طلوع شمس تک ذکر اللہ کرنے کا ثواب حج و عمرہ کے برابر ہے تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس شخص کو وہی قرب ہوگا جو حج و عمرہ کرنے والے کو ہوتا ہے یہ دعوی بلا دلیل ہے ۱۲) دوسرے اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حالت مرض میں باوجود قلت اعمال کے ترقی بھی مثل صحت کے ہوتی ہے تو یہ بھی بدون اعمال کے نہیں بلکہ اعمال ہی کی وجہ سے ہے کیونکہ حالت صحت میں اعمال ہو چکے ہیں۔ اسی کے ساتھ حالت مرض کو ملحق کر دیا گیا اگر ملحق بہ نہ ہوتا تو یہ الحاق کیسے ہوتا معلوم ہوا کہ اصل سبب ترقی اعمال ہی ہیں۔ دوسرا ضرر یہ ہوتا ہے کہ حالت شوق میں بعض دفعہ انسان حق تعالیٰ سے بہت کھل جاتا ہے پھر نہ معلوم کیا کیا بکنے لگتا ہے۔ جیسے بعض اہل اولال ہوئے ہیں۔ گو ان سے خود مواخذہ نہ ہو مگر اضلال تو ضرور ہوتا ہے کہ دوسرے اس کی وجہ سے گمراہ ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی نقص ہے علاوہ ازیں بعض دفعہ غلبہ اولال میں حد سے نکلکر خود بھی یہ شخص گمراہ ہو جاتا ہے کیوں کہ کسی وقت ایسا غلبۂ حال نہیں ہوتا جسمیں زبان پر قابو نہ ہو مگر زبان سے بے ساختہ کچھ نکل جاتا ہے جس میں یہ اپنے کو معذور سمجھتا ہے اور واقع میں معذور نہیں ہوتا تو مواخذہ میں گرفتار ہو جاتا اور بارگاہ قرب سے نکال دیا جاتا ہے اس لئے حضور نے شوق کی طلب میں یہ دو قیدیں بڑھا دیں سبحان اللہ حضور نے ان دو جملوں میں معانی کو کس طرح قید فرمایا ہے کہ دو لفظوں میں تمام مضرات سے پناہ مانگ لی غرض غلبۂ شوق میں یہ آفات ہیں اس لئے تم اپنے لئے کچھ تجویز نہ کرو اور اگر تم کو غلبۂ شوق نہ عطا ہوا ہو تو سمجھ لو کہ شاید تمہارے لئے غلبۂ شوق میں کوئی آفت ہوتی اس لئے خداء تعالیٰ نے تم کو برد و خمود میں رکھا وہی ہر حالت کی حکمتوں کو سب سے زیادہ جانتے ہیں ؎

آنکس کہ ترا نگرت نمی گرداند او مصلحت ترا ز تو بہتر داند

اور اگر کسی کو شوق کا غلبہ عطا ہوا ہو تو وہ اسی میں راضی رہے۔ وہ جمود و خمود کو طلب نہ کرے ممکن ہے کہ اس کے واسطے یہی ضروری ہو۔ کیونکہ بعضے انجن تو ہوا سے چلتے ہیں اور بعضے انجن آگ سے چلتے ہیں ممکن ہے کہ اس کے انجن کے لئے حرارت ہی کی مناسبت ہو اگر یہ حرارت سے خالی ہو گیا تو کھڑا کا کھڑا رہ جائیگا جیسا کہ حضرت عراقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

صنمارہ قلندر سنرداز بمن نمائی کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

بہر حال محبت کا ایک رنگ التہاب ہے اور ایک رنگ خمود بھی ہے۔ بس صاحب خمود بھی اپنے کو محروم نہ سمجھے اب میں ان دونوں نسبتوں کی مثال دیتا ہوں کہ ان میں ایک تو لون چشتیہ ہے۔ (یعنی التہاب و اضطراب) اور ایک لون نقشبندیہ ہے (یعنی برد و خمود) پس اگر کوئی صاحب حرارت نہ ہو وہ گھبرائیں نہیں بلکہ یہ سمجھ لے کہ مجھے لون نقشبندیہ حاصل ہے گو وہ چشتیہ کا مرید ہو کیونکہ یہ ضرور نہیں کہ چشتیہ سے چشتیہ ہی پیدا ہوں بلکہ کبھی چشتیہ سے نقشبندی پیدا ہوتے ہیں۔ اور کبھی نقشبندیہ سے چشتی پیدا ہوتے ہیں جیسے مرغی کے نیچے بطخ کے انڈے رکھدو تو بچے بطخ ہوں گے کہ وہ تو ذرا بڑے ہو کر دریا میں تیریں گے اور ماں کھڑی منہ تکے گی وہ دریا میں تیر نہ سکے گی اور نہ بچے اس کے پاس رہ سکیں گے گو وہ کتنا ہی بلاتی رہے کیونکہ بطخ کے بچوں کو تو دریا ہی سے مناسبت ہو گی گو تربیت مرغی کے نیچے ہوئی ہو وہ اس کے بلانے سے خشکی پر نہیں رہ سکتے اسی طرح چشتی شیخ کے سارے مرید چشتی نہیں ہو سکتے بلکہ بعضے نقشبندی ہوں گے ان کو پانی سے مناسبت ہو گی اور بعضے چشتی ہوں گے اُن کو آگ سے مناسبت ہو گی۔ ہاں کوئی قیاس فاسد کرے تو اور بات ہے جیسے ایک احمق شخص نے کسی کو دیکھا تھا کہ وہ کڑی دکھا کر بھینس کو ڈیو ڈیو کر رہا تھا۔ اس نے پوچھا کہ میاں تم کڑی کو کیوں دکھا رہے ہو کہا اسے دیکھکر بھینس کنارہ پر آجائے گی۔ ایک دفعہ اُن حضرت کی چارپائی ندی میں بہ گئی۔ تو آپ دوڑکر گھر سے پیڑھا لائے اور اُسے چارپائی کو دکھا کر ڈیو ڈیو کرنے لگے کسی نے کہا میاں یہ کیا

کہنے لگے کہ یہ چارپائی کا بچہ ہے اُسے دیکھکر وہ چلی آئے گی۔ اسی طرح ایک شخص تاڑ کے درخت پر چڑھ گیا تھا اس کو چڑھنا ہی آتا تھا اُترنا نہ جانتا تھا جب اُترا نہ گیا تو شور کرنے لگا کہ مجھے اتار دو میں گرا لوگ حیران ہوئے کہ کس طرح اُتاریں تو بوج بجگڑ کو بلایا اُس نے کچھ دیر سوچ کر کہا بس تدبیر سمجھ میں آگئی اس کے پاس ایک رسّا پھینکو چنانچہ پھینکا گیا پھر اس سے کہا کہ اسے کمر میں مضبوط باندھ لے اس کے بعد لوگوں سے کہا کہ زور سے مجھ کو مارو وہ سسرا نیچے گرا اور گرتے ہی مر گیا لوگوں نے بوج بجگڑ سے کہا کہ یہ تمنے کیا کیا کہا افسوس ہے کہ اس کا وقت ہی آگیا تھا ورنہ ہم نے تو اس طرح کنوئیں میں سے بہت آدمی نکالے ہیں سو یہ تو قیاس فاسد ہے ورنہ حقیقت یہی ہے کہ ہر شخص کی طبیعت جدا ہے اور اس کے لئے طریقہ تربیت بھی الگ ہے سب کو ایک لاٹھی نہ ہانکنا چاہیئے۔ یہ میں نے اس واسطے کہدیا کہ شاید کوئی شخص چشتیہ سے مرید ہو اور صاحب حرارت نہ ہو۔ بلکہ صاحب سکون ہو تو وہ یہ سمجھنے لگے کہ میں نہ تو نقشبندی ہو سکتا ہوں کیونکہ چشتیہ سے مرید ہوں اور نہ چشتی ہوں کیونکہ صاحب سکون ہوں تو بس میں کورا ہی ہوں صاحب کورا تو نہیں ہے ہاں کورا بیشک ہے کہ اس کے پاس دولت موجود ہے مگر اندھا ہے خواہ مخواہ اپنے کو محروم سمجھتا ہے تو یہ غلطی ہے کیونکہ یہ ضرور نہیں کہ چشتیہ سے چشتی ہی پیدا ہوں نقشبندی نہ پیدا ہوں بلکہ یہاں ہر ایک سے دونوں طرح کے رنگ حاصل ہوتے ہیں۔ یہاں اَب و وَلَد میں مناسبت ضروری نہیں جیسا کہ ابوّت و بنوّت ظاہریہ میں بھی مناسبت تامہ ضروری نہیں چنانچہ کالے سے گورے اور گورے سے کالے پیدا ہوتے کبھی باپ احمق ہوتا ہے اور بیٹا ذہین کبھی برعکس مگر بعضے ایسے جامد ہوتے ہیں کہ نقشبندی خاندان میں بیعت ہو کر چشتی بننا گوارا نہیں کرتے بعضے چشتی سلسلہ میں مرید ہو کر نقشبندی بننا گوارا نہیں کرتے۔ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ایک نقشبندی کے مرید نے قبض کی شکایت کی حضرت نے اس کو ذکر جہر بتلایا کہنے لگا میں تو نقشبندی ہوں میں ذکر جہر کیونکر کروں فرمایا پھر مت کرو سو یہ محض جہالت ہے صاحب نقشبندی اور چشتی میں حنفیہ شافعیہ کا سا اختلاف نہیں ہے جو حنفی یوں کہے کہ میں امام کے پیچھے فاتحہ کیوں کر پڑھوں میرے مذہب میں تو حرام ہے۔ بلکہ ان دونوں میں ایسا اختلاف ہے

جیسا اطباء اور ڈاکٹروں میں ہوتا ہے۔ اب اگر طبیب یونانی کوئی ڈاکٹری دوا بتلائے یا ڈاکٹر کوئی یونانی دوا بتلائے تو کیا حرج ہے۔ اسی طرح اگر کوئی نقشبندی ذکر جہر کو کسی کے لئے نافع بتلائے یا کوئی چشتی اپنے کسی مرید کو ذکر خفی بتلائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہمارے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں کوئی تقیید نہ تھی ہر شخص کے لئے اُس کے مناسب تجویز فرماتے تھے کسی کو بالجہر کسی کو بالسر کسی کو تلاوت قرآن کسی کو تکثیر نوافل کسی کو خدمت خلق۔ چنانچہ بعض کے لئے صرف اس کو نافع فرماتے تھے کہ تم اہل خانقاہ کی روٹی گوشت لادیا کرو۔ پس مشایخ اور طالبین کو ایسا ہونا چاہئے یہ نہیں کہ نقشبندی خاندان میں داخل ہوئے ہیں تو اب جہر کو حرام سمجھ لیں چاہے کیسی ہی ضرورت ہو یا چشتی ذکر خفی کو حرام سمجھ لیں چاہے کسی کے واسطے جہر مناسب ہو یا نہ ہو مشایخ کو محقق اور مجتہد ہونا چاہئے اور طالبین کو مقلد بنکر رہنا چاہئے ان کو اپنی تجویز کا دخل نہ دینا چاہئے۔ پس لوگوں کو تجویز کا خبط ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک صاحب مجھے خط میں لکھتے ہیں کہ ہم کو شغل اسم اللہ کی اجازت دے دی جائے میں نے جواب میں لکھا کہ اگر آپ کو اتنی بات حاصل ہے کہ خود اپنے لئے معمول تجویز کرلیں تو پھر کسی سے رجوع کی آپ کو کیا حاجت ہے۔ طب میں بڑا کام تو تشخیص ہی ہے اور تشخیص کے بعد علاج کرلینا کیا مشکل ہے۔ جب یہ معلوم ہوگیا کہ اس شخص میں فلاں خلط کا غلبہ ہے اور وہ سبب مرض ہے جس کے لئے مبردات و مفرحات کا استعمال مفید ہوگا تو اس کے بعد تو جس کا دل چاہے علاج کرے کیا یہ بھی کوئی طریقہ ہے علاج کا کہ تشخیص تو خود کریں اور علاج دوسرے سے کرائیں۔ اس طریق میں تو یہ ہونا چاہئے کہ بس حال بیان کرکے مردہ بدست زندہ ہوجاؤ اپنی تجویز اور تشخیص کو دخل مت دو مولانا فرماتے ہیں ؎

چوں گزیدی پیر۔ ہیں تسلیم شو ہمچوں موسی در طریق خضر رو

بعض نسخوں میں غلطی سے پیر ہن لکھدیا ہے جس کے یہ معنی ہوں گے کہ جب خلعت خلافت ملجاوے تب پیر کا کہنا ماننا چاہئے اس سے پہلے نہ مانے یہ بالکل غلط ہے بلکہ یہ دو لفظ الگ الگ ہیں ؎ چوں گزیدی پیر۔ ہیں تسلیم شو + کہ جب کسی کو پیر بنالو تو اب اپنے کو بالکل سپرد کردو۔ اسم اللہ وغیرہ یا کوئی شغل خود تجویز نہ کرو۔ اس مقام پہ افادۂ جدیدہ

کی غرض سے لفظ انخد کی تحقیق بھی بیان کر دینا مناسب ہے۔ بہت لوگوں کا اور پہلے میرا بھی یہی خیال تھا کہ یہ لفظ دو حرفوں سے مرکب ہے ان حرف بمعنی ہے جو ہندی لفظ اور حد لفظ عربی سے جس کے معنی ترکیبی غیر محدود ہیں اور یہ خیال تھا کہ چونکہ اس شغل میں جو صوت مسموع ہوتی ہے وہ غیر محدود ہے۔ اس لئے اس کو انخد کہا جاتا ہے۔ بعضے اس کو غیبی صوت سمجھتے ہیں اور ملکوتی صوت کہتے ہیں ممکن ہے کہ کسی کے لئے صوت ملکوتی بھی منکشف ہوتی ہو۔ مگر صوت حق تو ہرگز نہیں ہے بعض جہلاء نے اس کو صوت حق سمجھا ہے یہ غلط ہے چنانچہ اس خیال کے لوگوں نے شیخ سعدیؒ کے ایک شعر کی تفسیر اسی صوت سے کی ہے وہ شعر یہ ہے

الست ازازل ہمچناں شاں بگوش بفریاد قالوا بلےٰ در خروش

یہ تفسیر بالکل صحیح نہیں ہے اور اس کو صوت حق سمجھنا بالکل غلط ہے کیونکہ کلام الٰہی صوت و حروف سے منزہ ہے شیخ فرید عطار رحمۃ اللہ علیہ جو بڑے عارف اور محقق ہیں فرماتے ہیں ع قول اور سالمن نے آواز نے + اور یہی علماء اہل سنت کا قول ہے۔ کہ کلام الٰہی کے لئے صوت نہیں ہوئی اور شغل انخد میں صوت ہوتی ہے۔ پس یہ صوت حق نہیں ہو سکتی۔ حقیقت یہ ہے در اصل یہ صوت ناسوتی ہے جو تموج ہوا سے پیدا ہوتی ہے کان بند کرنے سے اندر ہوا محبوس ہو جاتی ہے اس سے آواز پیدا ہو جاتی ہے۔ بعض لوگوں نے اس کو صوت حوض کوثر کہا ہے اور اس کے متعلق ایک حدیث بھی بیان کرتے ہیں اول تو اس حدیث کے ثبوت کا حال معلوم نہیں (قال الجامع اثناء الوعظ قد صححہ العزیزی فی شرح الجامع الصغیر ۱۲ منہ) اور اگر حدیث ثابت بھی ہو جیسا کہ ابھی معلوم ہوا کہ عزیزی نے اس کی تصحیح کی ہے تو وہ تشبیہ پر محمول ہے کہ حوض کوثر کی آواز اس صوت کے مشابہ ہے یہ مطلب نہیں کہ بعینہٖ یہی صوت حوض ہے یہ تو حقیقت صوت میں کلام تھا۔ لفظ کے متعلق تحقیق یہ ہے کہ یہ لفظ اصل میں انادی ہے جو ہندی لفظ ہے بمعنی قدیم اصل میں یہ شغل جوگیوں سے لیا گیا ہے چونکہ یکسوئی پیدا کرنے میں بہت نافع ہے۔ اس لئے بعض مشائخ نے اس کو اختیار کیا تھا اور جوگیوں کا عقیدہ یہی تھا کہ یہ صوت قدیم ہے اسی لئے وہ اس کو انادی کہتے تھے مگر وہ لوگ مشرک ہیں ان کی بات قابل قبول نہیں اور غالباً مشائخ نے اسی واسطے اس کو نادی سے

انحد کر دیا تاکہ عقیدہ جوگیہ کا ابطال ہو جائے اور انحد کہنا غلط نہیں کیونکہ غیر محدود کی دو قسمیں ہیں ازلی اور ابدی سو مشائخ کی مراد انحد بمعنی ابدی رہے کہ جانب مستقبل میں یہ غیر محدود ہے چنانچہ اگر عمر بھر کان بند رکھے جائیں تو یہ صوت ختم نہیں ہوتی پس یہ غیر محدود بمعنی لاتقف عند حد ہے اور ابدیت حدوث کے منافی نہیں بلکہ اس کے مناسب صرف انہ ہے اور وہ ان کی مراد نہیں خوب سمجھ لو چونکہ یہ کام کی تحقیق تھی اس لئے میں نے اس پر تنبیہ کر دیا ممکن ہے بعض لوگ غلطی میں پڑے ہوئے ہوں بہرحال طالب کو خود کوئی شغل تجویز نہ کرنا چاہئے بلکہ ہر طرح اپنے کو شیخ کے سپرد کر دے اور اس کی تجویز میں چون وچرا نہ کرے کیونکہ اس طریق کا زیادہ مدار اعتماد پر ہے۔ بلکہ میں ایک اور بات پر متنبہ کرتا ہوں وہ یہ کہ طالب کو شیخ کے ساتھ علمی مباحث میں بھی گفتگو نہ کرنا چاہئے کیونکہ اس میں ردوقدح انکار و اقرار کی صورت ہوتی ہے جو شان طلب کے منافی ہے ہاں طالب علم کو استاد سے خوب چون وچرا کرنا چاہئے کیونکہ استاد اشکالات علمیہ کے حل کرنے کو پہلے سے آمادہ ہو کر بیٹھتا ہے اور شیخ اس کام کے لئے تیار ہو کر نہیں بیٹھتا۔ وہ دوسرے کام کے لئے ہے جہاں عمل کی ضرورت ہے۔ باتوں کی ضرورت نہیں پس شیخ کے ساتھ کان ہو کر رہنا چاہئے اور استاد کے ساتھ زبان ہو کر۔ ہمارے مولانا فرماتے تھے کہ ہر طالب علم کہ چون وچرا نکند وہر روز مسئلے کہ چون وچرا کند ہر دو را بچر اگاہ باید فرستاد۔ پس شیخ سے استاد کا کام نہ لو۔ سونار سے لوہار کا کام نہ لو اس کے سامنے لوہا مت لاؤ۔ بلکہ سونا چاندی لاؤ تاکہ وہ خوبصورت جھومکے اور کرن پھول اور جھومر تیار کر کے تمہارے کان اور سر پر لگا دے پس یہ بڑی غلطی ہے کہ کسی کے پاس طالب بنکر نجائیں اور اس کو شیخ بنائیں پھر اس سے کام لیں۔ دوسرے صاحبو! ماں سے ماما کا کام نہ لو کہ اس میں ایک میم اور ایک الف زیادہ ہو گئے مگر عزت تو گھٹ گئی کیونکہ ماں کو ماما بنانا ذلت تجویز کرنا ہے۔ لہذا شیخ سے علمی مباحث میں گفتگو نہ کرنا چاہئے مگر آجکل طالبین اس کا خیال نہیں رکھتے ہاں گاہے گاہے ادب کے ساتھ ہو تو اس کا بھی مضائقہ نہیں یا عرصہ تک پاس رہنے سے دونوں کی طبیعت کھل گئی ہو تب بھی حرج نہیں کیونکہ انشراح کے بعد پھر ایک نازکی سی حالت ہو جاتی ہے اور مقام ناز کے

احکام جدا ہیں۔ اس وقت جتنا چاہے بولو اور جو چاہے پوچھو کچھ مضائقہ نہیں اسی کو کہتے ہیں ؎

ای خانۂ نیاز نہ چلنے سے تو مچل　　یعنی مقام ناز ہے جس چال چاہے چل

مگر ایسے لوگوں کو شیخ کے ساتھ مباحث علمیہ میں گفتگو کرتا ہوا دیکھ کر دوسرے اپنے کو اُن پر قیاس نہ کریں ورنہ وہی مثال ہوگی جیسے ایک شخص تھا جس کی بیوی اس کی کچھ زیادہ خاطر و مدارات نہ کرتی تھی۔ ایک دفعہ اُس نے ایک ولایتی کو دیکھا جو اپنے گھوڑے کو دانہ کھلا رہا تھا۔ گھوڑا شوخی میں اِدھر اُدھر مُنہ مارتا تھا اور ولائتی اس کو چمکار کر کہہ رہا تھا کھاؤ۔ بیٹا کھاؤ یہ بے وقوف سمجھا کہ شاید گھوڑے کی اس ہیئت کو بھی خاطر و مدارات میں کچھ دخل ہے دل میں سوچا کہ آج سے ہم بھی اسی طرح کھایا کریں گے۔ گھر پہونچ بیوی سے کہا کہ آج ہم گھوڑے بنیں گے ہماری اگاڑی پچھاڑی باندھو اور ایک توبڑے میں کھانا بھر کر ہمارے منہ پر چڑھاؤ ہم اِدھر اُدھر مُنہ ماریں گے تو تم کہنا کھاؤ بیٹا کھاؤ۔ اس غریب نے تمام احکام کی تعمیل کی یہ گھوڑے کی طرح بحالت رکوع کھڑے ہوئے اور دم کی جگہ ایک جھاڑو باندھی گئی مُنہ پر توبڑا چڑھایا گیا۔ اگاڑی پچھاڑی باندھی گئی اور اب اس نے ولائتی کے گھوڑے کی طرح شوخی کرنا شروع کی اور بیوی کہتی جاتی کھاؤ بیٹا کھاؤ۔ یہ اور اُچھلے کودے پیچھے کہیں چراغ رکھا تھا۔ اس سے جھاڑو میں آگ لگ گئی۔ یہانتک کہ بدن کے کپڑوں تک پہونچ گئی۔ اب میاں تو بندھے جوڑے کھڑے تھے وہ کیونکر آگ سے بچتے بیوی بھی اُن ہی کی طرح بے وقوف تھی یہ حال دیکھ کر کوٹھے پر جا چڑھی اور محلہ والوں کو پکارا ارے دوڑیو میرا گھوڑا جلا۔ محلہ والوں نے دل میں کہا کہ کم بخت کو کھانے کے لئے تو ملتا نہیں اس کے یہاں گھوڑا کہاں سے آیا معلوم ہوتا ہے کہ ویسے ہی شرارت سے چیخ رہی ہے یہ کسے خبر تھی کہ وہ شوہر کو گھوڑا کہہ رہی ہے۔ آخر کار میاں وہیں جل کر مرنڈا ہو گئے یہی حال ناقص کا ہوتا ہے جب وہ اپنے کو کامل پر قیاس کرنے لگے مولانا فرماتے ہیں ؎

نازِ را روے بباید ہچو درد　　چوں نداری گرد بدخوئی مگرد

زشت باشد روے نازیبا و ناز عیب باشد چشم نابینا و باز
پیش یوسف نازش و خوبی مکن جز نیاز و آہ یعقوبی مکن

طالب کو شیخ کے سامنے نہایت ادب سے رہنا چاہئے اور کسی کو اُس کے سامنے بولتا ہوا دیکھکر اپنے کو اُس پر قیاس نہ کرنا چاہئے۔ کیونکہ وہ ایک خاص حالت انشراح پر پہنچ چکا ہے اس کا بولنا اور بحث کرنا سب ادب میں داخل ہے۔ اور تمھارا بولنا بے ادبی میں داخل ہوگا۔ اور بے ادب کا اس طریق میں کچھ کام نہیں ؎

بے ادب را اندریں رہ بار نیست جائے او بر دار شد در دار نیست

یعنی بے ادب کی جگہ دار پر ہے (یعنی سولی پر) اور دار کے اندر (یعنی گھر میں) اُس کے لئے جگہ نہیں صاحبو بزرگوں نے جو شیوخ کے آداب لکھے ہیں وہ لغو نہیں ہیں اور اُن تمام آداب کا خلاصہ یہ ہے کہ شیخ کا جی بُرا نہ کرو اس کے قلب کو مکدر نہ کرو ورنہ تم کو فیض بھی گدلا ہی پہونچے گا۔ حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ فرماتے تھے کہ شیخ میزاب رحمت ہے جس کے واسطے سے تمکو فیض پہونچتا ہے۔ پس میزاب رحمت کو میلا مت کرو ورنہ فیض بھی گدلا ہو کر آئیگا۔ یہ خلاصہ ہے اُن آداب کا مشایخ نے اپنی پرستش نہیں کرائی بلکہ تم کو خالص و مصفا زلال رحمت پلانا چاہتے ہیں اور اُس کا یہی طریقہ ہے کہ اس کا دل میلا نہ کرو۔ پس ایک حق شیخ کا یہ بھی ہے کہ طالب اپنی رائے اور تجویز کو دخل نہ دے تم یہ مت سوچو کہ میرے واسطے غلبۂ شوق مناسب تھا اور ابتک حاصل نہیں ہوا۔ یا التہاب و اضطراب کی مجھے ضرورت تھی اور یہ بات پیدا نہیں ہوئی۔ بس تم تو اطلاع و اتباع سے کام رکھو جب تمھارے سر پر ایسا شفیق موجود ہے جو یوں کہتا ہے ؎

من غم تو میخورم تو غم مخور بر تو من مشفق ترم از صد پدر

پھر تم کو کسی فکر اور سوچ کی کیا ضرورت ہے۔ اس کو حالات سے اطلاع کر کے بے فکر رہو اور اگر شیخ پر ایسا اعتماد نہیں ہے تو یہ بدگمانی ہے اور ؎

بدگمانی کردن و حرص آوری کفر باشد پیش خوان مہتری

اس کا انجام بجز محرومی کے کچھ نہیں۔ طالب کو شیخ پر اعتماد کلی رکھنا چاہئے۔ کہ یہ جو کچھ

بتلاتا ہے اُسی میں میرا نفع ہے۔ بعض لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ شیخ محض ہماری تسلی کے واسطے یہ کہدیتے ہیں کہ وساوس کا کچھ حرج نہیں۔ ان پر التفات نہ کرو۔ التہاب واضطراب نہ ہونے کا بھی مضائقہ نہیں۔ تم کو مقصود حاصل ہے یاد رکھو یہ سراسر بدگمانی اور شیخ پر رہزنی کا الزام ہے۔ ارے شیخ کو تمھاری جھوٹی تسلی کرنے سے کیا ملتا ہے اُس کی جوتی کو کیا غرض پڑی ہے کہ وہ جھوٹی باتوں سے تم کو لبھالے کیا تم سے اُس کو کچھ جائداد بٹوانا رہگئی ہے اس کی تو یہ حالت ہے ؎

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند　　آنچہ استاد ازل گفت ہمان میگویم

وہ تم کو وہی طریقہ بتلاتا ہے جو اُس کے دل پر تمھارے مناسب القا ہوتا ہے۔ وارثان انبیاء کی تعلیم کی وہی شان ہے جو تعلیم انبیاء کی شان ہے کہ ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود　　گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

اتنا فرق ہے کہ انبیاء وحی سے کہتے ہیں جو قطعی ہے اور اہل اللہ وارد والہام سے کہتے ہیں جو ظنی ہے۔ باقی اپنی طرف سے وہ کچھ نہیں کہتے۔ تم تو یہی سمجھو گو وہ کبھی اجتہاد بھی کرے اور اگر وہ اجتہاد میں غلطی کرے گا تو خود کبھی متنبہ ہوکر اصلاح کردے گا تم کو اسمیں دخل دینے کا حق نہیں ہے یہ تو اُس تعلیم کے متعلق گفتگو ہے جو تربیت باطن کے متعلق ہو اور اگر کوئی مسئلہ فقہی اجتہادی ہو تو اس میں بھی شیخ کی غلطی پکڑنے کا ہر طالب کو حق نہیں صرف اہل علم کو حق ہے وہ بھی ادب کے ساتھ بے ادبی اور گستاخی کا ان کو بھی حق نہیں اور اہل علم میں بھی ان کو حق ہے جس سے شیخ کی طبیعت کھلی ہوئی ہو۔ وہ جس طرح چاہیں غلطی پکڑیں کیونکہ ایسے لوگ ادب کی حدود سے نہ نکلیں گے۔ اس طریق میں مچلنے روٹھنے اور لڑنے جھگڑنے کی تو گنجائش ہے مگر گستاخی و بے ادبی کی گنجایش نہیں نہ اسلئے کہ شیخ کو اس کی وجہ سے اپنی کسر شان کا خیال ہوگا یا تم سے عداوت ہوجائیگی۔ ہرگز نہیں جس پر یہ اثر ہوتا ہو وہ شیخ بنانے کے قابل نہیں کیونکہ ؎

دریاے فراوان نشود تیرہ بسنگ　　عارف کہ برنجد تنک آبست ہنوز

عارف تو اپنے کو سب سے بدتر سمجھتا ہے۔ وہ کسی کی بے ادبی سے برا نہیں مان سکتا

بلکہ یہاں بے ادبی اور گستاخی کی اس لئے گنجائش نہیں کہ اس سے شیخ کو تمہاری طلب میں شک ہو جائیگا اور وہ یہ سمجھے گا کہ اس شخص کو مجھ سے تعلق اور محبت نہیں ہے۔ کیونکہ طلب و محبت کے لئے کچھ آثار و شرائط ہیں۔ اور بے ادبی و گستاخی اُن کی اضداد ہیں۔ اور شیخ کو طالب کے متعلق یہ خیال ہو جانا کہ اس کو مجھ سے محبت نہیں میزاب رحمت کے تکدر کا سبب ہے۔ اس پر وہ تم کو اپنی مجلس سے نکال کر باہر کر دے گا۔ کہ تم کو طالبین میں داخل ہونے کا حق نہیں۔ ہاں اجنبی بنکر آؤ پھر جتنا چاہو بُرا بھلا کہو۔ طالب بنکر گستاخی کرنا نفاق اور دھوکہ دہی ہے۔ اور اگر تم عالم نہیں ہو تو پھر فقہی اجتہادی مسائل میں شیخ کی غلطی ہرگز نہ نکالو نہ ادب سے نہ بے ادبی سے کیونکہ مسائل اجتہادیہ میں فقہاء کا اختلاف ہوتا ہے۔ تو ممکن ہے شیخ نے کسی دوسرے فقیہ کے اجتہاد کو راجح سمجھا ہو اس میں تم دخل دینے والے کون ہو۔ اب میں ختم کے قریب آگیا ہوں۔ خلاصہ میرے بیان کا یہ ہے کہ محبت کے دو لون ہیں۔ ایک التہاب و اضطراب جو نسبت چشتیہ کا رنگ ہے اور ایک برودت و خمود جو نسبت نقشبندیہ کا رنگ ہے۔ پس طالب کو ہر حال میں راضی اور خوش رہنا چاہئے۔ اور اپنے کو کسی حال میں محبت سے خالی اور محروم نہ سمجھنا چاہئے۔ درمیان میں اعتماد علی الشیخ کا مسئلہ اسی کی توضیح کے لئے بیان کر دیا گیا تھا۔ اب میں اول وہ آیت پڑھتا ہوں۔ جس میں یہ مضمون منصوص ہے۔ پھر وہ آیت پڑھوں گا جو میں نے تلاوت کی ہیں۔ جن سے استشہاد لطیف کے طور پر اس مضمون کو مناسبت ہے۔ دراصل آج کا فورز نجبیل کے متعلق ایک نکتہ میری سمجھ میں آیا۔ جس کے لئے مجھے اپنی کتاب مسائل السلوک دیکھنے کی ضرورت پڑی جس میں آیت قرانیہ سے مسائل تصوف کو ثابت کیا گیا ہے تو میں اس میں دیکھنا چاہتا تھا کہ کافور و زنجبیل کے متعلق جو نکتہ میری سمجھ میں آیا ہے۔ کسی صوفی نے اس پر تنبیہ کی ہے یا نہیں۔ کیونکہ مسائل السلوک میں منقول مضامین بھی بکثرت ہیں۔ گو زیادہ اپنے ہی اقوال ہیں۔ اور میرے قلب پر جب کوئی بات وارد ہوتی ہے تو میں یہ چاہا کرتا ہوں۔ کہ سلف کے کلام سے اس کی تائید بھی مل جاوے تو اچھا ہے۔ کیونکہ ہمارے علوم وہی قابل اعتبار ہیں۔ جو علوم سلف سے مؤید ہوں مگر

اس وقت جلد دوم نہ ملی اور یہ مضمون اگر ہوتا تو جلد دوم ہی میں ہوتا کیونکہ یہ آیت جس میں زنجبیل و کافور کا ذکر ہے جلد دوم ہی میں ہوسکتی تھی۔ جب اخیر کی جلد نہ ملی تو میں نے ویسے ہی بے ضرورت جلد اول کو دیکھا اتفاق سے شروع صفحہ پر ایک اور آیت نکل آئی جس میں یہ مضمون صریح تھا اس سے مجھے بہت ہی خوشی ہوئی۔ کیونکہ نص میں تصریح ہونے کے بعد کسی کی تائید کی کیا ضرورت ہے۔ اہل علم کو مضامین علمیہ میں وہ لذت آتی ہے کہ کسی چیز میں بھی نہیں آتی۔ جب کوئی نیا علم حاصل ہوتا ہے تو واللہ سلطنت ہفت اقلیم اسکے سامنے گرد معلوم ہوتی ہے۔ جبھی تو کہتے ہیں ؎

تا بدانی ہر کرا یزدان بخواند ۔۔۔ از ہمہ کارِ جہاں بے کار ماند

اب لوگ ان سے دنیا کے خرافات میں شرکت چاہتے ہیں بھلا یہ حماقت نہیں تو کیا ہے۔ بہرحال یہ مضمون صراحتہً مل جانے سے مجھے بڑی مسرت ہوئی اور یہ میرا کمال نہیں۔ بلکہ استعداد کرنے والوں کی کشش ہے۔ کہ اُن کے افادہ کے لئے حق تعالیٰ یہ علوم عطا کر دیتے ہیں۔ مشائخ کو غرہ نہ کرنا چاہئے۔ کہ ہمارے اوپر یہ علوم و واردات فائض ہو رہے ہیں۔ صاحب یہ طالبین کی کشش ہے۔ اُن کی تربیت کے لئے حق تعالیٰ یہ علوم مشائخ کو عطا فرماتے ہیں۔ جیسے ماں کی پستان میں بچہ کی کشش سے دودھ اترتا ہے۔ اگر بچہ دودھ نہ پیئے تو دو چار دن میں چھاتیاں اکڑ کر سوکھ جائیں گی اور دودھ خشک ہو جائیگا۔ اسی طرح طالبین نہ ہوں تو مشائخ پر بھی واردات بند ہو جائیں۔ (مگر یہ بات مشائخ کے سمجھنے کی ہے طالبین یہ اعتقاد نہ رکھیں ان کو مضر ہوگا۔ وہ شیخ ہی کا کمال سمجھیں اپنا کمال نہ سمجھیں ۱۲) بھلا اور تو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ انما انا قاسم واللہ یعطی۔ کہ میں تو صرف بانٹنے والا ہوں اور دینے والے حق تعالیٰ ہیں بس یہی اعتقاد مشائخ کو رکھنا چاہئے کہ ہم محض واسطی التقسیم ہیں ہمارا ذاتی کمال کچھ نہیں انما انا قاسم پر ایک لطیفہ یاد آیا۔ ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمتہ اللہ علیہ حج کو تشریف لیگئے تو بعض خدام بھی ساتھ ہولئے جن میں سے بعض کے پاس توزاد راہ تھا اور بعض کے پاس کچھ نہ تھا انھوں نے آکر مولانا سے عرض کیا کہ ہمارا بھی حج کو جی چاہتا ہے مگر سامان کچھ نہیں۔ مولانا بڑے خلیق تھے فرمادیتے

کہ بھائی چلے چلو جو میرا حال وہی تمہارا حال یہاں تو یہ رنگ تھا اور مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ رنگ تھا کہ ایک صاحب نے مولانا سے یہی عرض کیا کہ حضرت میرا بھی حج کو جی چاہتا ہے فرمایا کچھ سامان بھی پاس ہے۔ کہا کچھ نہیں صرف توکل پر چلتا ہوں۔ مولانا نے فرمایا جاؤ بیٹھو بڑے توکل والے ہو بس جس وقت سب لوگ ٹکٹ لیں گے تم بابو کے سامنے توکل کا پوٹلہ رکھ دینا کہ اس میں سے ٹکٹ کا دام نکال لو۔ حضرت مولانا گنگوہی میں لون نبوت تھا۔ اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب میں رنگ ولایت تھا۔ اور واقعی انتظام تو مولانا گنگوہی ہی کے طرز میں ہے۔ خود ہم نے ایسے توکل والوں کو دیکھا ہے کہ جہاز میں اور مکہ جدہ پہونچکر توکل کے بجائے ان میں محض تاکل رہ جاتا ہے۔ بس جہاں کوئی دسترخوان بچھا کر بیٹھا اور یہ متوکل صاحب اس کے سر پر سوار ہوئے کہ یا شیخ لقمہ اتنی عرض تو جہاز ہی سے سیکھ لیتے ہیں۔ میں نے کہا ہاں بھائی تم شیخ ہی کو لقمہ بنالو اسے ہی کچے کو کھا جاؤ۔ راستہ میں یہ لوگ بہت تنگ کرتے ہیں۔ اس سفر میں اول کھانا پکانا ہی موت ہے نہ معلوم کس مصیبت سے تو کھانا تیار ہوتا ہے اور جب کھانے بیٹھو تو چار طرف سے یا شیخ لقمہ یا شیخ لقمہ مجھے تو ان لوگوں پر بڑا غصہ آتا تھا۔ کہ جب ان پر حج فرض تھا نہ قناعت و توکل میسر تھا تو یہ آئے کس لئے۔ غرض مولانا محمد قاسم صاحب کسی سے انکار نہ فرماتے تھے۔ اس لئے اُن کے ساتھ بہت لوگ ہوگئے۔ اب راستہ میں جہاں مولانا کو فتوحات ہوتیں اور ہدایا ملتے تو سب ساتھیوں کو بلا کر تھوڑا تھوڑا تقسیم فرمادیتے کسی نے عرض کیا حضرت اپنے واسطے بھی تو کچھ رکھ لیجئے تو بے ساختہ فرمایا انما انا قاسم واللہ یعطی سبحان اللہ کیا پاکیزہ لطیفہ ہے۔ کہ میں تو قاسم ہوں دنام بھی قاسم ہی تھا) اور اللہ دینے والا ہے میرے پاس جو کچھ آتا ہے سب ساتھیوں ہی کی غرض سے آتا ہے۔ مولانا کے یہاں ایسے لطیفے کثرت سے رہا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مولانا کی مجلس میں کچھ مٹھائی تقسیم ہو رہی تھی اور ہم نے سنا ہے کہ مولانا کی مجلس میں کھانا پینا مٹھائی بانٹنا اکثر رہا کرتا تھا۔ کوئی مجلس بہت کم اس سے خالی ہوتی تھی تو ایک دفعہ مولوی محمد فاضل صاحب پیلی مٹھائی تقسیم کر رہے تھے اخیر میں کچھ بچ گئی تو مولانا فرماتے ہیں۔ الفاضل

للقاسم۔ کیا عجیب لطیف جملہ ہے جس کے چند معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ بچا ہوا بانٹنے والا کا ہے دوسرے یہ کہ بچا ہوا مسمّٰی بہ قاسم کا ہے یعنی میرا تیسرے یہ کہ مسمّٰی بہ فاضل مسمّٰی بقاسم کے لئے ہیں۔ لام تخصیص کا ہے یعنی ایک دوسرے کے لئے مخصوص ہے (مولوی فاضل صاحب مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے خاص مخلص شاگرد تھے ۱۲) چونکہ مجلس بے تکلفی کی تھی اور مولانا نے مزاح کا موقعہ دیدیا تھا تو مولوی فاضل صاحب نے بھی لطیفہ کا جواب دیا کہا نہیں الفاضل للفاضل والقاسم محروم۔ اس کے بھی چند معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ بچا ہوا مسمّٰی فاضل کا ہے یعنی میرا اور مسمّٰی بقاسم محروم ہیں یعنی آپ۔ دوسرے یہ کہ بچا ہوا اس شخص کا ہے جو فاضل ہے (یعنی مولانا) اور بانٹنے والا محروم ہے۔ میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ جب شیخ و طالب میں بے تکلفی اور انشراح ہو چکا ہو تو پھر مذاق اور دل لگی اور شوخی سب کی گنجائش ہے۔ لیکن ہر ایک اپنے کو دوسرے پر قیاس نہ کرے خیر یہ تو انما انا قاسم پر ایک لطیفہ یاد آگیا تھا میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس مضمون کا صراحۃً بتلانا میرا کمال نہیں بلکہ استدعاء کرنے والوں کی کرامت ہے۔ بہرحال اس مضمون کو حق تعالیٰ نے اس آیت میں صراحۃً بیان فرمایا ہے جو سورۂ (ہود) کی آیت ہے۔ ولئن اذقنا الانسان منا رحمۃ ثم نزعناہا منہ انہ لیؤس کفور ط ولئن اذقناہ نعماء بعد ضراء مسّتہ لیقولن ذہب السیئات عنی انہ لفرح فخور ط الا الذین صبروا وعملوا الصالحات اولئک لہم مغفرۃ واجر کبیر (پ ۱۲ ع ۲) (ترجمہ) اور اگر ہم انسان کو اپنی مہربانی کا مزہ چکھا کر اس سے چھین لیتے ہیں تو وہ ناامید اور ناشکر ہو جاتا ہے۔ اور اگر اس کو کسی تکلیف کے بعد جو اُس پر واقع ہوئی ہو کسی نعمت کا مزہ چکھا دیں تو کہنے لگتا ہے کہ میرا سب دکھ درد رخصت ہوا۔ (اب) وہ اترانے لگتا (اور) شیخی بگھارنے لگتا ہے مگر جو لوگ مستقل مزاج ہیں اور نیک کام کرتے ہیں (وہ ایسے نہیں ہوتے) ایسے لوگوں کے لئے بڑی مغفرت اور بڑا اجر ہے۔ اس میں حق تعالیٰ نے انسان کا ایک طبعی خاصہ بیان فرمایا ہے کہ اس کی حالت یہ ہے کہ اگر ہم اس کو کسی رحمت کا مزہ چکھا کر اُس سے چھین لیتے ہیں تو وہ ناامید اور ناشکر ہو جاتا ہے۔ یہاں رحمت عام ہے رحمت ظاہرہ و باطنہ دونوں کو کیونکہ اس جگہ اس کو اطلاق کے ساتھ ذکر فرمایا ہے اور دوسری جگہ

تصریح فرمائی ہے کہ رحمت کی دو قسمیں ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ ہوالذی اسبغ علیکم نعمہٗ ظاہرۃ وباطنۃ ط کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے اوپر اپنی نعمتوں کو کامل کیا ہے ظاہری بھی اور باطنی بھی نعمت ظاہرہ کے معنی یہ ہیں کہ محسوس ہو اور باطنہ وہ ہے جو محسوس نہ ہو خواہ دینی نعمت ہو یا دنیوی نعمت باطنہ دینیہ کی مثال تو شوق و ذوق وغیرہ ہے ایسے ہی انس و اطمینان وغیرہ رنگ مختلف ہیں کسی نعمت کا رنگ کیفیت عشقیہ جنسیہ کے ساتھ ہے۔ اور کسی کا سلوک و معرفت عقلیہ کے طور پر باقی نعمت ہونے میں دونوں برابر ہیں اور نعمت باطنہ دنیویہ کی مثال عقل و شعور و ادراک و تمیز و ذکاوت و فطنت و علم وغیرہ ہے۔ بہرحال یہاں نعمت باطنہ سے اصطلاح تصوف تو مراد ہے نہیں مگر صوفیہ جن کو نعم باطنہ کہتے ہیں وہ بھی اس میں داخل ضرور ہیں گو ان میں انحصار نہ ہو۔ اور منّا کی قید سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں رحمت غیر مکتسبہ موہوبہ مراد ہے۔ جس میں اختیار انسان کو دخل نہ ہو کیونکہ نعمت مکتسبہ اختیاریہ کے سلب پر رنج کرنے کی ممانعت نہیں نہ اس پر یہ وعید ہے مثلاً کوئی شخص نماز پڑھتا روزے رکھتا ہے۔ پھر کسی دن یہ نعمت سلب ہو جائے کہ نماز روزہ فوت کر دے تو اس پر رنج ہونا چاہئے اور اس رنج کرنے پر کوئی وعید نہیں ہے یہ وعید تو رحمت موہوبہ غیر مکتسبہ کے سلب پر رنج و پریشانی کرنے کے متعلق ہے چنانچہ منارحمۃ اس کا قرینہ ہے اور وجہ اسکی یہ ہے کہ امور غیر اختیاریہ پر مواخذہ نہیں ہے۔ نہ سلباً نہ وجوداً۔ اگر کوئی نعمت موہوبہ بدون اس کے اختیار کے سلب ہو جائے تو اس سے کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔ نہ قرب میں کمی ہوگی۔ اور اگر کوئی مصیبت و نقمت بدون اسکے اختیار کے پیدا ہو جائے۔ تو اس پر بھی مواخذہ نہ ہوگا۔ نہ قرب میں کمی آئے گی۔ بشرطیکہ اپنے اختیار کو ذرا دخل نہ دے مثلاً بُرے بُرے وسوسے از خود آنے لگیں یا کسی مخلوق سے اضطرار عشق ہو جائے تو اُس پر کوئی مواخذہ نہ ہوگا اور یہ نہ کہا جائے گا کہ تم کو بے اختیار بھی وسوسے کیوں آئے اور بے اختیاری عشق کیوں ہوا۔ بلکہ اگر اس میں اختیار کو دخل نہ دیا جائے۔ تو عشق مجازی بھی رحمت ہو جاتا اور عشق حقیقی کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ غرض عدم اختیار کی صورت میں نقمت بھی نعمت ہے

اور جیسے امراض جسمانی میں اجر ملتا ہے کیونکہ اُنسے تکلیف ہوتی ہے اسی طرح امراض باطنیہ میں بھی اجر ملتا ہے اگر اُن کے بڑھانے کی کوشش نہ کرے بلکہ ازالہ وامالہ کی فکر کرے اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

عاشقی گرزیں سر و گرزاں سرست عاقبت ما را بداں شہ رہبرست

اور یہی مطلب مولانا جامی کے اس ارشاد کا ہے ؎

فتاب از عشق رو گرچہ مجازی است کہ آں بہر حقیقت کارسازی است

اگر اول الف با تا نخوانی ز قرآں حرف خواندن کے توانی

یعنی اگر بے اختیار عشق مجازی کسی میں پیدا ہو جائے تو اُس میں گھبراتے نہیں کیوں کہ اس درجہ میں وہ بھی کام کی چیز ہے۔ اگر احتیاط رکھے تو وہ عشق حقیقی کا زینہ بن جاتا ہے باقی یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ عشق مجازی کو از خود لپٹا لو بلکہ اگر لپٹ جائے تو اُس سے کام لو چنانچہ شیخ سعدی رح از خود لپٹانے کی تو صاف صاف نفی کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

سوم باب عشق ست و مستی و شور نہ عشقے کہ بندند بر خود بزور

شیخ سعدی رحمۃ اللہ نے جو گلستان و بوستان میں عشق مجازی کی کچھ حکایتیں لکھدی ہیں اس سے بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں۔ کہ خدانخواستہ شیخ بھی آجکل کے لوگوں کی طرح عشقبازاور امردوں کو گھورنے والے تھے۔ اور وہ عشق مجازی کو مطلقاً اچھا کہتے تھے یہ بالکل غلط ہے۔ شیخ نے جہاں کہیں عشق مجازی کی مدح کی ہے یا ایسے عشاق کی حکایتیں لکھی ہیں اس سے مراد وہی عشق ہے جو از خود بلا اختیار لپٹ جائے اور اپنے اختیار سے نہ لپٹایا جائے۔ چنانچہ باب عشق کے شروع ہی میں فرماتے ہیں۔ ع نہ عشقے کہ بندند بر خود بزور

اور ایک مقام پر فرماتے ہیں ؎

ندادند صاحبدلاں دل بہ پوست وگرابلہے داد بے مغز اوست

وہ تو ایسے شخص کو جو از خود مخلوق کو دل دے ابلہ اور بے مغز فرمارہے ہیں۔ پھر وہ اس کی مدح یا تعلیم کیونکر کرسکتے ہیں۔ بلکہ فرماتے ہیں ؎

مکن بد بہ فرزند مردم نگاہ کہ ناگاہ فرزندت آید تباہ

کہ دوسروں کے لڑکوں کو بُری نگاہ سے نہ دیکھو پھر وہ بھی تمہارے لڑکوں کو اس نگاہ

سے دیکھیں گے واقعی جو شخص دوسروں کی اولاد سے بُرا تعلق رکھتا ہے دوسرے بھی اس کی اولاد سے ویسا ہی تعلق کرتے ہیں۔ اگر کوئی یہ چاہے کہ میرا لڑکا لوگوں سے محفوظ رہے تو اس کو چاہئے کہ دوسروں کی اولاد سے بُرا تعلق نہ رکھے بہرحال شیخ امرد پرست نہ تھے جیسا کہ جاہلوں کا خیال ہے انھوں نے تو ایک جگہ ایک امرد پرست کی حکایت بطور ذم کے لکھی ہے کہ بقراط کا ایک زاہد پر گذر ہوا جو بیہوش پڑا تھا بقراط نے پوچھا کہ اسے کیا ہوا یہ کیوں پڑا ہے لوگوں نے کہا کہ ایک حسین لڑکے کو دیکھ کر اسے نور خداوندی کا مشاہدہ ہوا تو وجد سے بیہوش ہو گیا۔ بقراط نے کہا کہ اسکو امرد ہی میں خدا کا نور نظر آیا۔ میرے اندر نہ نظر آیا یہ جھوٹا ہے۔ محض نفس کی شرارت سے یہ اُس پر عاشق ہوا ہے۔ اگر قدرت خدا کے مشاہدہ سے عاشق ہوا ہوتا تو اس کی نظر میں امرد اور ڈاڑھی والا دونوں برابر ہوتے اور گو بقراط کا قول خود کوئی حجت نہیں۔ مگر فلسفی کے قول کی تائید محقق کوئی کردی تو اس کو صحیح کہا جائیگا۔ چنانچہ اس حکایت کو نقل کرکے شیخ سعدی فرماتے ہیں ؎

محقق ہماں بیند اندر ابل کہ در خوبرویان چین و چگل

بہرحال مشائخ نے جس عشق مجازی کو عشق حقیقی کا زینہ کہا ہے وہ وہ ہے جس کا نہ حدوث اختیاری ہے نہ بقا اختیاری ہے۔ یعنی نہ اس کو اختیار سے پیدا کیا گیا نہ اختیار سے باقی رکھا گیا ہے کہ نہ تو محبوب کے دیکھنے کو جاتا ہے نہ اُس کی آواز سننے کا قصد کرتا ہے۔ نہ سامنے آنے جانے پر قصداً نظر کرتا ہے نہ ارادہ سے اس کا خیال لاتا ہے۔ اگر ایسا کرے تو انشاء اللہ بہت جلد حق تعالیٰ کا عشق اس کے قلب میں جوش زن و موجزن ہوگا۔ اور یہ بھی نہ ہوا تو یہ شخص بڑا مجاہد ہوگا۔ مجاہد بھی واصل ہے اور ایک حدیث اس کے متعلق مشہور ہے گو صحت کا حال معلوم نہیں جس میں اس کو شہید کہا گیا ہے۔ من عشق فکتم وعف فمات فھو شہید (قلت قال فی المدارالمنتشرۃ لہ طرق من حدیث ابن عباس قلت اخرجہ الحاکم فی تاریخ نیسابور والخطیب فی تاریخ بغداد وابن عساکر فی تاریخ دمشق واخرجہ الخطیب ایضا من حدیث عائشہ بلفظ من عشق

فعف ثم مات مات شہیدا و اورد الدیلمی بلا اسناد عن ابی سعید العشق من غیر ریبۃ کفارۃ للذنوب (ہر ص ۲۰۸ - ۱۲ جامع) اس میں دو شرطیں بیان کی گئی ہیں ایک عفت جسکے معنی ہیں معاصی سے بچنا اور معاصی کی چند مثالیں میں نے بیان کردی ہیں جن سے عشق میں بچنا ضروری ہے۔ دوسری کتمان یعنی عشق کو چھپانا یہ اسواسطے ضروری ہے تاکہ دوسرے کی (یعنی محبوب کی) بدنامی نہ ہو خصوصاً اگر عورت سے عشق ہو جائے تو وہاں کتمان بہت ضروری ہے۔ کیونکہ اس صورت میں لوگوں کے گمان بہت دور دور پہنچتے ہیں۔ کہ شاید دونوں میں ملاقات ہوئی ہوگی۔ پھر اس سے عورت کی بہت بدنامی ہوتی ہے اور کسی کو بلا وجہ بدنام کرنا یا بدنامی کا سبب بننا گناہ ہے اور یہاں سے معلوم ہوا کہ جب عشق مجازی میں گھٹ گھٹ کر مرجانا شہادت ہے بوجہ تحمل مشقت شدیدہ کے تو عشق حقیقی میں گھٹ کر مرنا شہادت کیوں نہ ہوگا کیونکہ اس میں بھی عشق مجازی سے مشقت کم نہیں ہوتی بلکہ زیادہ ہوتی ہے یہ جو نسبت شوقیہ ہے یہ آگ جیسی ہے۔ دل کو بھون کر رکھدیتی ہے چنانچہ ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

غلام آں کلہا تم کہ آتش افروزد

اسی لئے نسبت چشتیہ کبھی آگ کی صورت میں مکشوف ہوتی ہے کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بجلی گر پڑی ایک شخص نے مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا تھا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میرے اوپر بجلی گری فرمایا۔ مبارک ہو نسبت چشتیہ حاصل ہوگی۔ تو جو اس میں مرجائے وہ حریق نار کے مشابہ ہے اور نسبت سکون پانی جیسی ہے جو نہایت ٹھنڈی ہوتی ہے چنانچہ کبھی اسکا انکشاف بارش کی شکل میں ہوتا ہے کبھی دریا کی شکل میں۔ اسی واسطے نقشبندیہ پانی کا مراقبہ بتلایا کرتے ہیں کہ یوں تصور کرے کہ گویا قلب پر عرش سے ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے۔ ہم بحمد اللہ دونوں کے یہاں گئے ہیں چشتیہ کے پاس بیٹھ کر تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا آگ برس رہی ہے۔ اُن کی باتوں سے اور توجہ سے حرارت بڑھتی تھی۔ اور نقشبند میں مولانا رفیع الدین صاحب کے حلقہ میں بھی بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے وہ نقشبندی تھے بعض مرتبہ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے قلب پر برف رکھدیا ہو اور یوں خیال

ہوتا تھا کہ شاید فرشتوں میں بھی ایسی ہی برودت وسکون کی کیفیت ہوگی جیسی اسوقت ہمارے اندر ہے اور جس طرح آگ سے کبھی موت کی نوبت آجاتی ہے۔ اسی طرح پانی بھی کبھی ڈبو دیتا ہے۔ چنانچہ سکون وانس کے غلبہ سے بعض دفعہ استغراق پیدا ہوجاتا ہے جسمیں انسان تدبیر بدن نہیں کرسکتا۔ نہ کھانے کے ہوش رہتے ہیں نہ پینے کے اسکا وہی حال ہوتا ہے جو پانی میں ڈوبنے والیکا ہوتا ہے کہ گھٹ گھٹ کر جان دیتا ہے غرض غلبہ ہر کیفیت کا قاتل ہے پھر یہ لوگ شہید کیوں نہ ہوں گے ضرور ہوں گے تو اب سالک کو کسی حال میں پریشان نہ ہونا چاہئے۔ خواہ غلبۂ شوق ہو یا غلبۂ انس ہو ہر حال میں راضی رہے ایک دن وصول ضرور میسر ہوگا اور نہ بھی ہوا اور یوں ہی طلب میں گھٹ گھٹکر مرگیا۔ خدا کے راستہ میں اگر جان بھی جائے تو کیا ہوا پھر اسوقت یہ شہید ہوگا اور شہید بھی واصل ہوتا ہے۔ اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ نسبت چشتیہ آگ کے مشابہ ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ چشتیہ میں برودت نہیں ہوتی یا نقشبندیہ میں حرارت نہیں ہوتی بلکہ دونوں نسبتیں ساتھ ساتھ ہوتی ہیں جیسے جسم میں حرارت وبرودت دونوں ساتھ ساتھ مجتمع ہوتی ہیں۔ البتہ غلبہ ایک کو ہوتا ہے چشتیہ میں حرارت کا غلبہ ہوتا ہے۔ اور نقشبندیہ میں برودت کا دونوں نے شراب پی رکھی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ شراب میں پانی کا جزو بھی ہوتا ہی ہے لیکن چشتیہ کی شراب میں تو سکھیا ملا ہوا ہے۔ جس سے حرارت بڑھ جاتی ہے اور نقشبندیہ کی شراب میں افیون ملا ہوا ہے جس سے برودت کا اثر غالب ہوگیا عارف فرماتے ہیں ؎

ازاں افیوں کہ ساقی مے در افگند حریفاں را نہ سر ماند نہ دستار

معلوم ہوتا ہے کہ شراب میں افیون ملانے کا رواج تھا تو نقشبندیہ کی شراب ایسی ہی ہے اور ظاہر ہے کہ افیون کے ملجانے سے گو عارض برودت کا غلبہ ہوگیا مگر شراب کی حرارت بالکلیہ زائل نہیں ہوگئی۔ اور یہ فرق بھی دونوں نسبتوں میں ابتداء اور توسط میں نظر آتا ہے۔ اور انتہاء میں تو اہل شوق بھی اہل انس ہوجاتے ہیں یعنی چشتیہ بھی نقشبندی بن جاتے ہیں جیسے ہنڈیا ابتداء میں کھدکھد کرتی ہے اور پکنے کے بعد خاموش ہوجاتی ہے پس اخیر میں چشتیہ کی حالت بھی سکون کی ہوجاتی ہے مگر حرارت زائل نہیں ہوتی بلکہ

قوت ضبط بڑھ جاتی ہے پہلے اوپر بھی اثر تھا اب اندر ہی اندر کام کرتی ہے۔ چنانچہ ایک بار حضرت جنید رحمہ اللہ کی مجلس میں کسی نے کوئی شعر پڑھا جس پر بہت لوگوں کو وجد ہوا مگر حضرت جنید ویسے ہی سکون کے ساتھ بیٹھے رہے کسی نے عرض کیا کہ حضرت آپ کو وجد نہیں ہوا تو فرمایا۔ وتری الجبال تحسبہا جامدۃ وہی تمر مر السحاب یعنی قیامت میں تم پہاڑوں کو دیکھ کر یہ گمان کروگے کہ وہ اپنی جگہ پر جمے ہوئے ہیں حالانکہ وہ بادلوں کی طرح چلتے ہونگے۔ مطلب یہ تھا کہ حرکت تو ہم کو بھی ہو رہی ہے مگر دوسروں کو نظر نہیں آتی ہماری حرکت پہاڑ کیسی حرکت ہے۔ پھر فرمایا کہ ذرا میرے بدن کو ہاتھ تو لگاؤ بس ہاتھ لگانا تھا کہ خون کا فوارہ جسم سے نکل پڑا معلوم ہوا کہ آپ پر بھی وجد کا اثر بہت سخت ہوا تھا مگر ؎ کسی کے دل میں رہی اور کسی کے پار گئی۔ غرض جب حدیث میں عشق مجاز پر صبر کرنے والے کو شہادت کی بشارت دی گئی ہے تو عشق حقیقی کی تکالیف پر صبر کرنا شہادت کیوں نہ ہوگا۔ خصوصاً جبکہ کلفت باطنی کلفت ظاہری سے اشد ہے ایک محقق فرماتے ہیں ؎

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست — حالِ شیرانے کہ شمشیرِ بلا بر سر خورند

اور شیخ سعدی فرماتے ہیں ؎

خوشا وقت شوریدگانِ غمش — اگر تلخ بینند وگر مرہمش
گدایان او بادشاہی نفور — باسید حق اندر گدائی صبور
دمادم شرابِ الم درکشند — وگر تلخ بینند دم درکشند

ان کے قلب پر واللہ ہر دم آرے چلتے ہیں اور دم بخود رہتے ہیں یہ تو نقشبندیہ کا حال ہے آگے فرماتے ہیں ؎

سماع اے برادر بگویم کہ چیست — مگر مستمع را بدانم کہ کیست

آگے فرماتے ہیں ؎

چو تسلیم سر در گریباں برند — چو طاقت نماند گریباں درند

یہ چشتیہ کا حال ہے کہ اول تو وہ بھی ضبط سے کام لیتے ہیں جب طاقتِ ضبط نہیں

رہتی تو ہاتھ پیر مارتے ہیں۔ اور اگر یہ حدیث صحیح بھی نہ ہو تو وہ حدیث تو صحیح ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شہداء امت کی فہرست بیان فرمائی ہے کیونکہ امت میں شہداء بہت ہیں۔ صرف مقتول ہی شہید نہیں ہے حضور فرماتے ہیں۔ المطعون شہید والمبطون شہید والغریق شہید والحریق شہید اور ایک روایت میں ہے۔ ومن مات بہدم الدار ومن ماتت بجمع او کما قال ای فی النفاس او الحمل۔ یعنی جو طاعون میں مرے وہ بھی شہید اور جو پیٹ کی بیماری میں مرے جیسے ہیضہ وغیرہ وہ بھی شہید اور جو پانی میں ڈوب جائے وہ بھی شہید اور جو آگ میں جل جائے وہ بھی شہید اور جس پر مکان گر پڑے اور دبکر مر جائے وہ بھی شہید اور جو عورت بچہ کی وجہ سے مر جائے وہ بھی شہید ہے ان کے علاوہ اور بھی شہداء ہیں اور میرے نزدیک سب میں علت مشترکہ یہ ہے کہ کسی ایسی مشقت کا ورود ہو جس کا تحمل عادتاً دشوار ہو۔ چنانچہ جتنی نظیریں حضور نے بیان فرمائی ہیں ان سب میں ایسی مشقت ہے جس کا تحمل دشوار ہے۔ طاعون میں ایک آگ سی بدن میں لگ جاتی ہے۔ ہیضہ میں بھی سخت کرب و بے چینی ہوتی ہے ڈوبنے والا اور مکان سے دبکر مرنے والا گھٹ گھٹ کر جان دیتا ہے۔ وعلیٰ ہذا اور میں بتلا چکا ہوں کہ نسبت تشبیہ نار کے مشابہ ہے اور نسبت تشبیہ پانی کے مشابہ ہے اور شوق کی آگ اور انس کی برودت ظاہری آگ پانی سے اشد ہیں تو یہ بھی حریق و غریق کے مشابہ ہیں بلکہ یہ کہنا بھی بیجا نہیں کہ یہ مقتول بالسیف کے مشابہ ہیں کیونکہ مقتول بالسیف کے شہید ہونے کی بھی تو یہی علت ہے کہ اس نے ایسی مشقت کا تحمل کیا ہے جس کا تحمل عادۃً دشوار ہے اور اس علت کا قرینہ یہ ہے کہ حضور نے مقتول کے علاوہ اور بہت سوں کو شہید فرمایا ہے معلوم ہوا کہ مقتول کی شہادت کسی علت سے معلل ہے اور چونکہ وہ علت ان نظائر میں بھی موجود تھی اس لئے انکو بھی مقتول کے ساتھ ملحق کر دیا گیا اور میں بتلا چکا کہ ان سب میں علت مشترکہ بھی ہے یعنی ورود مشقۃ شدیدۃ یتعذر تحملہا عادۃً اور جب حکم معلل ہے تو جہاں یہ علت پائی جائے وہاں حکم کا قیاساً ثابت کر دینا غلط نہ ہوگا اور عشق حقیقی میں مشاق و آلام قتل بامر لسیف سے زیادہ ہیں مقتول بالسیف تو ایک دفعہ جان دیچکا تلوار چل گئی قصہ ختم ہوا اور یہاں یہ حال

ہے کہ ؎

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را ہر زمان از غیب جانِ دیگر است

جنپر کیفیات باطنیہ طاری ہوتی ہیں وہ جانتے ہیں کہ اُن پر کیا گذرتی ہے واقعی وہ تو نہ معلوم کتنی مرتبہ جیتے اور مرتے ہیں ایک عارف فرماتے ہیں انتم تخافون المعاصی ونحن تخاف الکفر۔ ظاہری تکالیف میں تو جان ہی کا خطرہ ہے۔ اور باطنی تکالیف میں ایمان کا خطرہ ہے اور یہ خطرہ سب سے اشد ہے۔ حضرت شبلیؒ نے ایک دفعہ کسی سالک سے پوچھا ای الصبر اشد کہ بتلاؤ سب سے زیادہ سخت کونسا صبر ہے۔ قال الصبر باللہ قال لا قال الصبر مع اللہ قال لا۔ یعنی اُس نے کہا کہ صبر باللہ بہت سخت ہے فرمایا نہیں۔ کہا صبر مع اللہ بہت سخت ہے فرمایا نہیں۔ قال فای الصبر اشد اس نے کہا پھر آپ بتلائیں کہ کونسا صبر اشد ہے فرمایا۔ الصبر عن اللہ۔ خدا سے صبر کر لینا زیادہ سخت ہے اور یہ کہکر ایک چیخ ماری اور بیہوش ہوگئے۔ ہائے اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

ای کہ صبرت نیست از فرزند و زن صبر کے داری ز ربّ ذوالمنن

ای کہ صبرت نیست از دنیای دوں صبر چوں داری ز نعم الماہدوں

واقعی خدا سے صبر نہیں ہو سکتا اور سب سے ہو سکتا ہے۔ اور سالک کو ہر وقت اس کا خطرہ رہتا ہے کہ کہیں یہ حالت پیدا نہ ہو جائے اس کو اپنی طلب پر ہمیشہ بدگمانی رہتی ہے کہ میرے اندر طلب ہے بھی یا نہیں اور اس غم میں نہ معلوم کتنی دفعہ ہلاک ہوتا اور جیتا ہے میں دوبارہ وہ شعر پڑھتا ہوں ؎

ای ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست حال شیرانے کہ شمشیر بلا بر سر خورند

ای صاحب جس راستہ پر وہ چل رہے ہیں واللہ وہ تلوار سے تیز اور بال سے باریک ہے اُن کی جان پر جو بنتی ہے اس کی کسی کو کیا خبر لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ مشائخ بڑے مزہ میں ہیں لوگ اُن کے ہاتھ چومتے ہیں تعظیم و تکریم کرتے ہیں ہدایا و تحائف لاتے ہیں بس یہ سب سے زیادہ بے فکر ہیں ارے تم کو اُن کے دل کی کیا خبر کہ خدا تعالیٰ کے کیا کیا معاملات اُن کے ساتھ پیش آتے ہیں اور کیسے کیسے خطرات اُن پر گذرتے رہتے ہیں بھلا

جس کے سر پر تلوار کھڑی ہو اس کو کسی کی تعظیم و تکریم یا ہاتھ پیر چومنے سے کچھ لطف آسکتا ہے یہ محض بدگمانی ہے اولیا اللہ کے ساتھ تو جب ان کی یہ حالت ہے تو کیا مقتول سیف اور حریق وغریق تو شہید ہوں اور یہ لوگ شہید نہ ہوں یہ بھی ضرور مقتول فی سبیل اللہ کی طرح شہید ہیں اور یہ میں قرآن کی تفسیر نہیں کرتا کہ۔ لا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء۔ میں اولیاء بھی داخل ہیں بلکہ علم اعتبار و قیاس کے طور پر کہتا ہوں کہ یہ بھی انھیں کے حکم میں ہیں اور یہ کوئی تنہا میری رائے نہیں بلکہ قاضی ثناء اللہ صاحب نے بھی تفسیر مظہری میں شہداء کے ذکر کے ساتھ فرمایا ہے۔ اذا کان ہذا حال المقتول بسیف الکفار فکیف بقتیل سیف الجبار۔ کہ جب مقتول سیف کفار کی یہ فضیلت ہے تو جو سیف جبار سے مقتول ہوا ہو اور تلوار عشق کا کشتہ بنا ہو اس کی تو کیا کچھ فضیلت ہوگی اس سے معلوم ہوا کہ میں اس مسئلہ میں متفرد نہیں ہوں بل لی فیہ سلف سلف میں بھی بعض کی یہی رائے ہے پس طالب کو گھبرانا نہ چاہئے۔ انشاء اللہ وہ ہر حال میں واصل ہے یا شہید ہے خواہ نسبت شوقیہ ہو یا نسبت انسیہ ہو ایک صورت میں وہ حریق ہے اور دوسری صورت میں غریق ہے اور دونوں کے لئے بشارت شہادت ہے (یہاں پہونچکر پھر حضرت مولانا نے کاتب سے ماقبل کا ربط دریافت فرمایا۔ کہ یہ مضمون کس بات پر بیان ہوا تھا اس نے عرض کیا کہ اس سے پہلے یہ ارشاد ہوا تھا کہ امور غیر اختیاریہ پر مواخذہ نہیں ہوتا فرمایا کہ ۱۲ جامع) میں یہ کہہ رہا تھا کہ مواخذہ کا مدار اختیار پر ہے اور بے اختیار کے تو اگر زحمت بھی پیش آئے تو وہ بھی رحمت ہے۔ جیسے عشق مجازی اور وساوس اور خمود وغیرہ تو امور غیر اختیاریہ سے انسان کو پریشان نہ ہونا چاہئے۔ مگر انسان کی عادت یہ ہے کہ یہ رحمت موہوبہ غیر مکتسبہ کے سلب سے بھی پریشان ہوتا ہے اور یہ حالت ہوتی ہے۔ انہ لیئوس کفور۔ کہ ناامید ہو جاتا اور ناشکرا بن جاتا ہے۔ چنانچہ کسی میں التہاب و اضطراب کی کیفیت نہ ہو تو وہ اپنے کو محبت سے خالی و محروم سمجھ کر وصول سے ناامید ہو جاتا ہے حالانکہ یہ کیفیات غیر اختیاریہ ہیں ان کے ہونے نہ ہونے پر کچھ بھی مدار نہیں پھر یہ شخص ناامیدی کیساتھ ناشکری بھی کرتا ہے کہ جن افعال اختیاریہ کی حق تعالیٰ نے اس کو

توفیق دے رکھی ہے۔ اُن کی قدر نہیں کرتا اور اُن کو اپنے لئے قرب واصول کا کافی ذریعہ نہیں سمجھتا۔ ایک عادت تو انسان کی یہ ہے دوسری عادت یہ ہے۔ ولئن اذقناہ نعماء بعد ضراء مسته لیقولن ذہب السیئات عنی۔ کہ اگر پریشانی کے بعد حق تعالیٰ اسکو راحت دیدیں تو بے فکر ہو کر کہتا ہے کہ بس اب تو مجھ سے مصیبت ٹل گئی اور یہ شکر کے طور پر نہیں کہتا بلکہ اس طرح کہتا ہے۔ انہ لفرح فخور۔ یعنی خوش ہو کر اترا تا ہے کہ اب تو بلا ٹل گئی بس اب کیا ہے کام مار لیا چنانچہ بعض لوگ مقدمہ دائر ہونے کی حالت میں تو متفکر و پریشان رہتے ہیں حق تعالیٰ سے دعائیں کرتے اور بزرگوں سے وظیفے پوچھتے پھرتے ہیں۔ اور جہاں مقدمہ جیت گئے تو اُس کو خدا کی نعمت نہیں سمجھتے بلکہ اترا کر کہتے ہیں کہ صاحب ہمارے گواہ بڑے پکے تھے حاکم بڑا سمجھدار تھا اور ہمارے وکیل نے خوب بحث کی تھی یوں کہا اور یوں جواب دیا تھا۔ اس وقت ان لوگوں کی حالت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جیت کو اپنی سعی و کوشش کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ قبول دعا اور رحمت حق کا نتیجہ نہیں سمجھتے ارے تم کیسا وکیل لئے پھرتے ہو کہیں دوبارہ کیل نہ لگ جائے۔ خدا تعالیٰ کو پھر تمہارا ویسا ہی حال کر دینا کیا مشکل ہے مگر انسان کا خاصہ ہے کہ ماضی کو بہت جلد بھول جاتا اور آئندہ کے لئے بالکل بے فکر ہو جاتا ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ربکم الذی یزجی لکم الفلک فی البحر لتبتغوا من فضلہ انہ کان بکم رحیما۔ وان یمسسکم الضر فی البحر ضل من تدعون الا ایاہ فلما نجیکم الی البر اعرضتم وکان الانسان کفورا۔ تمہارا پروردگار وہ ہے جو تمہارے (فائدہ کے) لئے کشتیوں کو سمندر میں چلاتا ہے تو اسوقت خدا کے سوا تمہارے سب معبود (ذہن) سے غائب ہو جاتے ہیں (اور کسی تدبیر پر نظر نہیں رہتی اللہ ہی اللہ یاد رہتا ہے) پھر جب تم کو خشکی کی طرف بچا کر لے آتے ہیں تو اعراض کرنے لگتے ہو اور (واقعی) انسان ہے بڑا ناشکرا کہ اتنی جلدی پہلی حالت کو بھول جاتا ہے) آگے ارشاد فرماتے ہیں کہ تم کو یہ بے فکری کیوں ہو گئی۔ افامنتم ان یخسف بکم جانب البر او یرسل علیکم حاصبا ثم لا تجدوا لکم وکیلا۔ کیا تم کو اس سے بھی اطمینان ہو گیا کہ شاید خدا تعالیٰ خشکی ہی میں دھنسا دیں سخت ہوا بھیجدیں پھر تم کو کوئی بھی کارساز نہ ملے چنانچہ ابھی زلزلہ اور طوفان خشکی ہی میں آگیا تھا کانگڑا میں بعض مکان زمین کے اندر دھنس گئے اور بہت آدمی تباہ ہو گئے۔ جاپان

مین ایسا سخت زلزلہ آیا تھا کہ لاکھوں آدمی مرگئے اور کروڑوں کا نقصان ہوا۔ یہ تو خسف ہی کا نمونہ ہے اور سخت ہوا کا بھی نمونہ آچکا ہے۔ چنانچہ پچھلے دنوں اخبار میں یہ بات آئی تھی کہ ہردوئی میں ایسی سخت ہوا چلی جس سے بعضے آدمی اڑ گئے اور کہیں سے کہیں جاکر گرے اور وہ تو خشکی میں بھی طوفان بھیج سکتے ہیں۔ چنانچہ ابھی پہاڑوں سے چشمے اُبل پڑے تھے جن سے سخت طوفان برپا ہوا ہزاروں گانوں تباہ اور ہزاروں آدمی برباد ہوگئے۔ اور مویشیوں کا نقصان الگ رہا۔ آگے بڑے مزہ کی بات فرماتے ہیں کہ کیا تم کو اس سے بھی اطمینان ہوگیا کہ (شاید) حق تعالیٰ پھر دریا ہی میں تمکو بھیجدیں کوئی ایسی ضرورت آپڑے جس سے دوبارہ دریا ہی کا سفر کرنا پڑے جس کو ایک دفعہ چکھ چکے ہو۔ افامنتم ان یعیدکم فیہ تارۃ اخری فیرسل علیکم قاصفا من الریح فیغرقکم بما کفرتم ثم لا تجدوا لکم علینا بہ تبیعا۔ یہ تو ظاہری مصائب سے بے فکری کا جواب ہے اور باطنی خطرات سے بے فکری کا جواب بھی یہی ہے۔ کہ اگر کسی شخص کو آج کیفیت شوقیہ حاصل نہ تھی پھر حاصل ہوگئی تو وہ بے فکر کس بات پر ہوتا ہے۔ ارے جس خدا نے تم کو پہلے جمود و خمود کے دریا میں ڈبو رکھا تھا وہ پھر اسی دریا میں لوٹا سکتا ہے اور اگر یہ بھی نہ ہو تو وہ دوسری سخت گھاٹیاں تمھارے رستہ میں پیدا کرسکتا ہے کیونکہ جس طرح ظاہر میں دریا اور پہاڑ ہیں باطن میں بھی دریا اور پہاڑ اور دلدل ہیں ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

آسماں ہاست در ولایت جاں — کار فرمائے آسمان جہاں
در رہِ روح پست و بالا ہاست — کوہہائے بلند و صحرا ہاست

اور فرماتے ہیں ؎

غیب را ابرے و بادے دیگرست — آسمانے آفتابے دیگر است

مگر وہ دریا پانی کے نہیں ہیں نہ پہاڑ پتھر کے ہیں اور حزب البحر میں جو بحر الدنیا و بحر الآخرۃ کہا ہے وہ تشبیہ پر محمول ہے یہ مطلب نہیں کہ وہ ایسا ہی بحر ہے جیسا کہ دنیا کا غرض باطن میں بھی جبال و بحار ہیں۔ جن کو صوفیہ کبھی آیت قرآنیہ کے تحت میں بھی اشارۃً بیان کردیتے ہیں مگر تفسیر انہیں بلکہ اعتباراً۔ اسی طرح میں کہتا ہوں کہ جن چیزوں کا

خطرہ حق تعالیٰ نے اس جگہ اہل ظاہر کے لئے بیان فرمایا ہے باطن میں بھی تشبیہاً خطرات موجود ہیں پھر بے فکری کیسی غرض حالات غیر اختیاریہ کے سبب سے پریشانی بھی مذموم اور اُن کے حصول سے بے فکری بھی مذموم ہے۔ اسی کی حق تعالیٰ نے یہاں شکایت فرمائی ہے کہ انسان ایک حالت میں تو یؤس کفور بن جاتا ہے اور ایک حالت میں فرح فخور اور دیکھئے ان دونوں میں مقابلہ کیا اچھا ہے ہر حالت کے متعلق ایک صفت باطنی ہے ایک ظاہری ہے۔ سلب رحمت کے وقت تو یاس باطن میں ہوتا ہے اور کفر ظاہر میں اور عطائے نعمت کے وقت فرح باطن میں ہوتا ہے اور فخر ظاہر میں پس دونوں میں عجیب مقابلہ ہے آگے فرماتے ہیں کہ یہ حالت سب کی نہیں بعضے اس سے مستثنیٰ بھی ہیں۔ الا الذین صبروا وعملوا الصالحات۔ مگر وہ لوگ جو صابر ہیں۔ یہاں صبر کے معنی وہ نہیں ہیں جو عوام میں مشہور ہیں کہ کسی کے مرنے پر نہ روئے کیونکہ یہاں کون مراقبہ ہاں کیفیات مرگئی تھیں تو غیر یہ بھی اس کے عموم میں داخل سہی مگر نہ رونے ہی میں صبر کا انحصار نہیں ہے بلکہ صبر سے مراد استقلال ہے۔ یعنی اُن معمولات پر جمارہنا جو شارع اور نائب شارع نے تجویز کردئے ہیں۔ اُن پر ہر حالت میں پابندی کرنا چاہئے چاہے کوئی کیفیت حاصل ہو یا حاصل نہ ہو۔ نہ کسی کیفیت کے سلب سے پریشان ہوکر معمولات میں خلل ڈالو۔ نہ کسی کیفیت کے حصول سے بے فکر ہوکر معمولات میں کمی کرو یہ معنی ہیں صبر کے۔ آگے صبر کی علامت بیان کرتے ہیں کیونکہ دعوی صبر آسان نہیں کہ جسکا جی چاہے اپنے کو صابر کہنے لگے ؎

وجائز دعوی المحبۃ فی الھوی ولکن لا یخفی کلام المنافق

بلکہ اسکے لئے کچھ علامات و شرائط ہیں یعنی وعملوا الصالحات کہ اعمال صالحہ بجالاتے رہیں اور ظاہراً و باطناً معاصی سے بچتے رہیں جنمیں یاس و ناشکری اور بطر و فخر بھی داخل ہے اور نماز روزہ بھی داخل ہے پس جو شخص اوراد پر اکتفا کرکے طاعات کو بیکار سمجھنے لگے اور یہ دعوی کرے کہ اب مجھ کو نماز روزہ کی زیادہ ضرورت نہیں رہی مجھکو رسوخ نسبت حاصل ہوگیا ہے وہ جھوٹا ہے اُس کو رسوخ وغیرہ کچھ حاصل نہیں وہ نہ اعمال میں کوتاہی نہ کرتا اسی طرح

جو شخص طاعات واجبہ پر اکتفا کرکے اذکار و اشغال و معمولات زائدہ کو ترک کردے کہ انسے کچھ نفع تو ہوتا ہی نہیں۔ وہ بھی غیر مستقل اور ناقص فی المحبۃ ہے۔ صبر کے معنی یہ ہیں کہ معمولات مستحبہ اور طاعات واجبہ سب کو دواماً ادا کرتا رہے۔ بعض دفعہ آدمی اوراد سے گھبراتا ہے اور دوسرے نیک کاموں میں اسکا دل لگتا ہے اُس وقت اوراد کو ہرگز ترک نہ کرے کیونکہ دوسری طاعات کا شوق جو پیدا ہوا ہے وہ بھی ان ہی اوراد کی برکت سے اور اوراد کو ترک کردوگے تو چند روز میں دوسری طاعات کا بھی شوق نہ رہے گا میں نے ان اہل علم کو لکھا تھا کہ تم جو اوراد سے گھبراتے ہو اور لکھتے ہو کہ مجھے مطالعہ کتب میں مزہ آتا ہے تو کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ اوراد ہی کا اثر ہو کہ آپ کو مطالعہ کتب میں مزہ آتا ہے یہ جواب بطریق منع ہے مگر محض الزامی جواب نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اُن طاعات میں باہم علاقہ بھی ہے۔ کہ ایک طاعت سے دوسری کو قوت ہوتی ہے گو تم کو اس کی خبر نہ ہو ذاکرین اس کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ جس دن معمول پورا ہو جاتا ہے۔ اُس دن ہر کام میں طبیعت کو بشاشت اور نشاط ہوتا ہے۔ اور جس دن معمول ناغہ ہو جاتا ہے۔ اس دن کسی کام میں جی نہیں لگتا اُس وقت معلوم ہوتا ہے کہ اوراد کے کاموں میں جو نشاط ہوتا تھا وہ ورد کی برکت تھی مگر غلطی سے وہ شخص یوں سمجھتا ہے کہ مجھے اوراد کے کاموں سے خود دلچسپی ہے جی ہاں ذرا ورد کو چھوڑ کر دیکھو تو معلوم ہو کہ اوراد کے کاموں سے کتنی دلچسپی ہے۔ پس یاد رکھو کہ ان اوراد ہی کی برکت سے نماز میں جی لگتا ہے۔ انہی کے ذریعہ سے تلاوت قرآن میں مزہ آتا ہے وغیرہ وغیرہ اور اسکا امتحان یہ ہے کہ دو ایسے شخصوں کی حالت کا اندازہ کرکے دیکھو جن میں سے ایک صاحب ورد ہو اور ایک صاحب ورد نہ ہو تو آپ صاحب ورد کو فرائض و واجبات کے ادا میں چست پائیں گے گو خود ورد میں اُس کا دل نہ لگتا ہو اور غیر صاحب ورد کو اس کی برابر چست نہ پائیں گے تو کیا ورد کا یہ تھوڑا نفع ہے کہ اس کی برکت سے فرائض و واجبات میں چستی پیدا ہو جاتی ہے۔ پس یہ اوراد بے کار نہیں ہیں بڑے کام کی چیزیں ہیں جبھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مستحبات و سنن کی ترغیب دی ہے بلکہ اگر احادیث کو غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ حضور نے فرائض و واجبات سے

زیادہ سنن و مستحبات کی ترغیب و بیان فضائل کا اہتمام فرمایا ہے کیونکہ واجبات کو تو لوگ خود ہی کرتے ہیں اُن کے لئے زیادہ ترغیب کی ضرورت نہ تھی اور سنن و مستحبات کا لوگ خود اہتمام نہیں کرتے اور ہیں وہ بھی ضروری اور مفید اس لئے حضور نے ان کا بہت زیادہ اہتمام فرمایا ۱۲ جامع) ۔ اور اسی واسطے مشائخ نے بھی مستحبات کا بہت اہتمام فرمایا ہے چنانچہ اہل طریق کا ارشاد ہے من لا ورد لہ لا وارد لہ ۔ جس شخص کا کوئی ورد نہ ہو اُس پر کوئی وارد بھی نہ ہوگا اور یہ ایسی کھلی ہوئی بات ہے جسکے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں حقیقت میں صاحب واردات وہی لوگ ہیں جو اوراد کے پابند ہیں اور جو لوگ سوائے فرائض و واجبات کے کچھ نہیں کرتے ان پر واردات نہیں ہوتے (الا قلیل ۱۲) پس خوب سمجھ لو کہ جس طرح فرائض و واجبات کی ضرورت ہے ایسے ہی اوراد کی بھی ضرورت ہے گو دونوں کا درجہ برابر نہیں بلکہ فرائض و واجبات اصل اور اوراد ان کی فرع ہیں مگر اصل کا نفع اس فرع ہی کے ساتھ کامل ہوتا ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے آپ مسہل لینا چاہیں تو اُس کے لئے طبیب آپ کو ایک نسخہ لکھکر دیتا ہے یہ تو اصل مسہل ہے لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بھی کہدیتا ہے کہ دو چار گھنٹہ کے بعد مدوے کے لئے سونف کا عرق بھی نیگرم پینا یا یخ جلاپا یا کوئی گولی کھا لینا تو کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ مدوے کا رہے ہرگز نہیں مدوے کی بھی بہت ضرورت ہے ورنہ مسہل میں ضرور کسر رہے گی اسی طرح یہاں سمجھو کہ اوراد و نوافل فرائض کے لئے بمنزلہ مدوے کے ہیں ۔ اُس کا نفع اس کے ساتھ مل کر ہی کامل ہوتا ہے پس ان کی پابندی بھی بہت ضروری ہے ۔ اور یہی معنی ہیں صبر کے کہ آدمی اپنے معمولات پر مستقل رہے جو شخص ہر حالت میں اپنے معمولات پر جما رہے گا اور اعمال شرعیہ کا پابند رہے گا وہ کسی نعمت موہوبہ غیر اختیاریہ کے سلب سے یاس و کفران میں اور کسی نعمت موہوبہ کے عطا سے فرح و فخر میں مبتلا نہ ہوگا کیونکہ اس کی نظر میں اعمال مکتسبہ اختیاریہ مقصود بالذات ہونگے اور احوال موہوبہ غیر اختیاریہ مقصود بالذات نہ ہوں گے اور جو احوال موہوبہ کو مقصود بالذات سمجھتا ہے وہ ان کے حصول پر اعمال و معمولات میں اکثر کمی کر دیتا ہے ۔ اور سلب احوال پر یاس و کفران میں مبتلا ہو جاتا ہے آگے فرماتے ہیں ۔ اولئک لہم مغفرۃ و اجر کبیر ۔ اسمیں

اول مغفرۃ کو مقدم فرمایا۔ اس کا مزہ عشاق سے پوچھو غیر عشاق کو اس کی زیادہ قدر نہ ہوگی وہ تو سمجھیں گے کہ بس صبر اور اعمال صالحہ کا صلہ کیا ملا کہ گناہ بخشدئے گئے نہ جنت کا ذکر ہے نہ حور و قصور کا مگر عشاق کے دل سے اس کی قدر پوچھو کہ وہ اس کو سنتے ہی زندہ ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ تو طلب رضا ہی میں مرتے ہیں۔ اور جنت کی طلب بھی وہ رضا ہی کے لئے کرتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

با تو دوزخ جنت است اے دلربا بے تو جنت دوزخ ست اے جانفزا

اسی لئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اول یہ فرمایا گیا ہے۔ لیغفر لک اللہ ما تقدم من ذنبک وما تاخر۔ اہل ظاہر کو ما قبل سے اسکا ربط سمجھ میں نہیں آتا۔ کیونکہ اوپر فرمایا ہے۔ انا فتحنا لک فتحا مبینا۔ ہمنے آپ کو فتح مبین عطا کی ہے اور نمایاں کامیابی دی ہے اس کے بعد فرماتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ آپکے اگلے پچھلے گناہ بخشدیں تو اہل ظاہر یہاں چکراتے ہیں کہ بشارت فتح سے مغفرت کا کیا جوڑ ہے مگر عشاق نے اسکا ربط سمجھا ہے وہ کہتے ہیں کہ اصل میں تو فتح کے مضمون پر اتمام نعمت اور ہدایت و استقامت و نصرت و غلبہ کو متفرع کرنا مقصود تھا مگر چونکہ ان چیزوں کا مزہ حضور کو اسی وقت آسکتا تھا جبکہ پہلے یہ تسلی کردی جائے کہ حق تعالیٰ آپ سے راضی بھی ہیں۔ اس لئے ان بشارات کی لذت کامل کرنے کے لئے پہلے۔ لیغفر لک اللہ ما تقدم من ذنبک وما تاخر فرمایا گیا۔ اور یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر مذاق عشق غالب تھا۔ آپ کو سب سے پہلے اس کی فکر رہتی تھی کہ محبوب راضی بھی ہے یا نہیں اس لئے اول اسکا اطمینان دلاکر پھر دوسری بشارتوں کو بیان کیا گیا۔ ویتم نعمتہ علیک ویھدیک صراطا مستقیما وینصرک اللہ نصرا عزیزا۔ کہ اس فتح سے آپ پر نعمت کا تمام کرنا مقصود ہے۔ اور آپ کو صراط مستقیم پر پہونچانا۔ اور نصرت الٰہی کے ساتھ (مخالفین پر) پورا غلبہ دینا منظور ہے (یہ فتح بطور استدراج وغیرہ کے نہیں اور نہ یہ غلبہ عارضی ہے بلکہ کامل و مکمل ہے جسکے بعد مغلوبیت کا احتمال ہی نہیں۔ وقد کان کما قال فان الاسلام لم یزل فی العروج والظھور بعد ذلک الفتح ۱۲ جامع) اسی طرح یہاں بھی حق تعالیٰ نے عشاق کی رعایت سے مغفرت کی

بشارت کو مقدم فرمایا جب ادھر سے اطمینان ہوا اور معلوم ہو گیا کہ محبوب راضی ہیں تو اب عاشق کو بھوک لگی۔ اس سے پہلے تو کسی چیز کی بھی طلب و خواہش نہ تھی اب جنت وحور وغیرہ کی طلب ہوئی کہ حضرت ہمیں کچھ اور بھی ملیگا کیونکہ کریموں کا قاعدہ ہے کہ جس سے راضی ہوتے ہیں اس کو اپنی رضامندی کی کچھ نشانی بھی دیا کرتے ہیں جیسے خلعت وغیرہ تو ارشاد ہوتا ہے۔ اجر کبیرہ۔ اور ان کے لئے مغفرت کے ساتھ بڑا اجر بھی ہے (یہاں بھی عشاق کے مذاق کی رعایت ہے۔ اجر کی تفصیل نہیں کی کہ کیا ملے گا یہیں یہ فرمایا کہ بڑا اجر دیں گے۔ اور جس چیز کو محبوب بڑا کہدے پھر اُس کی بڑائی کی کیا انتہا ہے معلوم ہو گیا کہ وہ انعام ملیگا جو ہمارے وہم و گمان سے بھی باہر ہے ۱۲ جامع)

یہ تو مضمون مقصود کا بیان تھا اب میں آیات متلوہ سے اس مضمون کی لطیف مناسبت بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ یہاں حق تعالیٰ نے اہل جنت کے لئے دو چیزوں کا ذکر فرمایا ہے ایک یشربون من کأس کان مزاجها کافورا اور آگے فرمایا ہے۔ یسقون فیها کأسا کان مزاجها زنجبیلا۔ یعنی ایک جگہ تو فرماتے ہیں کہ جنت میں نیک بندے ایسی شراب کے جام پئیں گے جس میں کافور کی آمیزش ہو گی۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ ان کو ایسا جام شراب پلایا جائیگا جس میں زنجبیل کی آمیزش ہو گی (یعنی ادرک کی ۱۲) اس کے متعلق میرے خیال میں یہ بات آتی ہے کہ یہ اختلاف مزاج باعتبار اختلاف احوال کے ہے اس کی تفصیل کے لئے اول دو مقدمے سمجھ لیجئے ایک یہ کہ آخرت میں جزا کو عمل سے مناسبت ہو گی دوسرے یہ کہ نعمائے جنت صورتِ اعمال ہیں۔ اور یہ دونوں مقدمے سلف کے اقوال سے مؤید ہیں بلکہ اشارۃً احادیث سے بھی ان کا پتہ چلتا ہے اور اہل کشف کے اقوال تو اس میں بہت صریح ہیں مگر بعض علماء ظاہر نے بھی اسکو بیان کیا ہے چنانچہ ہذا الذی رزقنا من قبل کی تفسیر میں مفسرین نے چند اقوال نقل کئے ہیں۔ ایک یہ کہ نعمائے جنت صورۃ نعمائے دنیا کے مشابہ ہوں گے ان کو دیکھ کر جنتی کہیں گے کہ یہ تو وہی چیزیں ہیں جو ہم نے اس سے پہلے دنیا میں کھائی تھیں اور بعض نے کہا ہے کہ ثمرات جنت باہم متشابہ ہونگے۔ اس لئے ایک بار کسی چیز کو کھا کر پھر دوبارہ جب

کوئی چیز سامنے آئے گی تو صورۃ پہلے کے مشابہ ہونے کی وجہ سے کہیں گے کہ یہ تو ابھی کھائی تھی اور بعض نے کہا ہے کہ وہ نعمتیں اعمال کی صورت ہوں گی جن کو دیکھتے ہی سمجھ جائیں گے کہ آہا یہ تو وہی نماز ہے جس کی ہم کو دنیا میں توفیق ہوئی تھی اور وہ مناسبت ایسی ظاہر ہوگی جس کو صاحب عقل فوراً سمجھ جائیگا اور گو اس تفسیر کو علماء ظاہر نے زیادہ قبول نہیں کیا مگر اس کی تغلیط بھی نہیں ہوسکتی کیونکہ احادیث سے اسکا پتہ چلتا ہے۔ ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ ان الجنۃ قیعان وغراسہا سبحان اللہ والحمد للہ ولا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر۔ کہ جنت چٹیل میدان ہے اور اس کے درخت تسبیح وتحمید وغیرہ ہیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جنت کے درخت ان کلمات کی صورت ہیں اسی طرح بعض نصوص قرآنیہ میں ہے۔ ذوقوا ما کنتم تعملون۔ کہ چکھو ان چیزوں کو جو تم کرتے تھے اگر اس میں تاویل نہ کیجائے تو ظاہر نص ان لوگوں کی تائید کرتا ہے جو جزاء کو صورت اعمال کہتے ہیں باقی یہ مقدمات اقناعیہ ہیں۔ میں ان کی بنا پر دعوی نہیں کرتا اور نہ آیات کی تفسیر کرتا ہوں بلکہ ایک لطیف استشہاد علم اعتبار کے طور پر کرنا چاہتا ہوں بہرحال حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جنت میں جو شراب ملے گی اس میں کافور کی آمیزش ہوگی جیسا کہ دنیا میں بعض لوگ شراب میں سرور وکیف بڑھانے کے لئے کوئی مفرح چیز ملا لیا کرتے ہیں۔ جیسا کہ صاحب معلقہ کہتا ہے ؎

الا ہبی بصحنک فاصبحینا ولا تبقی خمور الاندرینا

مشعشعۃ کان الحص فیہا اذا ماء الماء خالطہا سخینا

آیت میں مزاجہا کے معنی آمیزش کے ہیں۔ مزاج طبعی مراد نہیں اللہ بچائے واعظین سے نہ معلوم وہ اس جگہ مزاج کے معنی میں کیا گڑبڑ کرتے ہوں گے آگے کافور کی تفسیر ہے عینا یشرب بہا عباد اللہ۔ اس میں عینا کافور سے بدل ہے یعنی وہ کافور ایک چشمہ کا نام ہے دنیا کی طرح کافور کی پڑیہ نہ ہوگی۔ یہاں تو کافور منجمد ہوتا ہے اور وہاں سیال ہوگا اور زنجبیل کا بھی وہاں ایک چشمہ ہے جس کا نام سلسبیل ہے وہ بھی کوئی منجمد چیز نہیں ہے بلکہ سیال ہے۔ اور قلیل عقد میں نہیں ہے بلکہ اس کا ایک چشمہ ہوگا۔ جیسے جنت میں

دودھ کی نہریں ہوں گی۔ اس پر دیانند نے ایک بیہودہ اعتراض کیا تھا کہ وہاں اتنی گائیں کہاں سے آئیں گی جنکے دودھ سے نہریں چل پڑیں گی۔ سبحان اللہ! یہ عقل ہے دوسرے ادیان کے مقتداؤں کی گویا ان کے نزدیک بدون تھن کے دودھ ہو ہی نہیں سکتا۔ میں کہتا ہوں کہ تھن میں دودھ کہاں سے آتا ہے کیا اس کے واسطے بھی کوئی دوسرا تھن ہوتا ہے اگر یہ ہے تو پھر تسلسل مستحیل لازم آئیگا۔ پر یہ مشاہدہ کے بھی تو خلاف ہے۔ بھلا تھن کے لئے دوسرا تھن کہاں ہوتا ہے۔ لہذا ضرور کہنا پڑیگا۔ کہ تھن میں بدون کسی تھن کے دودھ آگیا معلوم ہوا کہ دودھ کا پیدا ہونا تھن پر موقوف نہیں تو جس خدا نے یہاں خون اور گوبر میں سے ایسا لطیف دودھ نکالدیا کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ نہر میں دودھ پیدا کردے لہذا یہ اعتراض محض بے عقلی کا ہے ع

تو مشو منکر کہ حق بس قادرست

افسوس دوسرے ادیان والوں کو خدا تعالیٰ کی قدرت کا بھی علم نہیں جبھی تو اُنکے مقتدا ایسی بے سروپا باتیں کہتے ہیں۔ غرض کافور ایک چشمہ کا نام ہے جس کی حقیقت وہ نہیں ہے جو دنیا میں ہم دیکھتے ہیں بلکہ وہ نہایت عجیب وغریب شے ہے لیکن دنیا کی تمام چیزوں میں سے اُس کو کافور سے زیادہ مشابہت ہے ایسے ہی زنجبیل کی بھی حقیقت وہ نہیں جو ہم لوگ سمجھتے ہیں لیکن اسکو بھی تمام اشیاء میں زنجبیل دنیا سے زیادہ مناسبت ہے۔ اس کا ضرور قائل ہونا پڑیگا کیونکہ یہ قرب اوصاف ہی سبب ہوا ہے۔ اُسے کافور یا زنجبیل کہنے کا وہ نہ کچھ اور کہا جاتا لیکن فی الجملہ مناسبت ہونے سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اُس کے خواص اور مزہ وغیرہ بالکل ایسا ہی ہوگا جیسا دنیا کے کافور و زنجبیل کا ہوتا ہے بلکہ خواص اور مزہ اس کا علیحدہ ہے جو نہایت لذیذ و خوشگوار ہوگا۔ آگے فرماتے ہیں۔ یشرب بہا عباد اللہ۔ کہ اس چشمہ سے اللہ کے بندے پئیں گے۔ یہاں عباد اللہ سے یا تو ابرار ہی مراد ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اضافت تخصیص کے لئے ہے۔ یعنی اصل میں تو وہ خاص مقربین کے لئے ہوگا۔ مگر ابرار کو بھی اُن کے طفیل میں مل جائیگا۔ آگے فرماتے ہیں۔ یفجرونہا تفجیرا۔ یہ عجیب تماشا ہے

یعنی وہ چشمہ اپنی طبیعت سے نہ بہیگا بلکہ نیک بندوں کا تابع ہوگا اُن کے اشارہ پر چلیگا جہاں چاہیں لیجائیں گے اگر کہیں اونچے پر بیٹھے ہوں گے اور چشمہ کو وہاں بلائینگے تو فوراً اوپر پہنچ جائیگا کیونکہ جنت اور جنت کی ہر چیز ذی حیاۃ ہے۔ اہل کشف نے وان الدار الآخرۃ لھی الحیوان۔ کی یہی تفسیر کی ہے جسکی تائید بعض احادیث سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ ترغیب و ترہیب میں حضرت ابن عباس سے روایت ہے۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما خلق اللہ جنۃ عدن خلق فیھا لا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر قال لھا تکلمی فقالت قد افلح المومنون رواہ الطبرانی فی الکبیر والاوسط باسناد بن احمد ہما جید نیز اہل کشف نے فرمایا ہے کہ جہنم بھی ذی حیاۃ ہے وہ کوئی بیجان مکان نہیں ہے بلکہ جاندار اژدہے کی شکل میں ہے۔ اور اتنا بڑا ہے کہ اسمیں آسمان زمین سب آسکتے ہیں۔ جیسے سمندر میں بعض مچھلیاں جہازوں سے بھی بڑی ہیں اور اس قول کی تائید ان احوال سے ہوتی ہے جو جہنم کے متعلق احادیث میں وارد ہیں۔ مثلاً حدیث میں آتا ہے کہ قیامت کے میدان میں جہنم کو اس طرح لایا جائیگا کہ اُس کے ستر ہزار باگیں ہوں گی اور ہر باگ کو ستر ہزار فرشتے پکڑے ہوئے ہوں گے مگر اُس پر بھی وہ قابو سے باہر ہوگی۔ اور چیختی چلاتی آئے گی۔ سو بھلا بیجان چیز کے لئے بھی کہیں باگیں ہوتی ہیں۔ اور وہ بھی کہیں چیخا چلایا کرتی ہے اسی طرح حدیث میں جہنم اور جنت کا کلام کرنا بھی وارد ہے۔ اہل کشف کی اس تحقیق کے بعد ان احادیث میں تاویل کی کچھ حاجت نہیں رہتی نیز قرآن مجید میں نار کو ہل امتلأت کا خطاب اور ہل من مزید سے جواب مذکور ہے۔ نیز احادیث میں ہے کہ جو شخص جنت طلب کرتا ہے جنت اسکو طلب کرتی ہے اور جو شخص جہنم سے پناہ مانگتا ہے جہنم اس سے پناہ مانگتی ہے۔ اور صاحبو جن چیزوں کو ہم یہاں بے جان سمجھتے ہیں وہ بھی تو خدائے تعالیٰ کے سامنے ذی حیاۃ ہیں گو ہمارے سامنے جماد ہیں۔ چنانچہ قرآن میں وارد ہے۔ قلنا یا نار کونی بردا وسلاما علی ابراہیم۔ اور ہم نے کہا کہ اے آگ تو ابراہیم علیہ السلام کے لئے ٹھنڈی ہوجا اور سلامتی کا ذریعہ بنجا۔ اہل لطائف نے لکھا ہے کہ اگر سلامۃ فرمایا جاتا تو آگ اتنی ٹھنڈی ہوجاتی کہ

ابراہیم علیہ السلام کو اس کی برودت سے تکلیف پہونچتی۔ اب سلاماً کی قید کے بعد اتنی بھی ٹھنڈی ہوئی جو ناگوار نہ ہو۔ سو اسمیں حق تعالیٰ کا آگ کو خطاب کرنا مذکور ہے اور ظاہر ہے کہ خطاب ذی حیاۃ کو ہوا کرتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

آب و باد و خاک و آتش بندہ اند　　با من و تو مردہ با حق زندہ اند

اسی طرح آسمان و زمین و جبال وغیرہ سے حق تعالیٰ کا خطاب فرمانا نص میں مذکور ہے نیز ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کے علاوہ اور بھی واقعات ایسے ہوتے ہیں جن سے عناصر کا ذی حیاۃ ہونا معلوم ہوتا ہے۔ مفسرین نے اصحاب الاخدود کے قصہ میں لکھا ہے کہ ایک یہودی بادشاہ نے مسلمانوں کو مرتد ہونے پر مجبور کیا۔ جب لوگوں نے اس سے انکار کیا تو ظالم نے بہت سی خندقیں کھودیں اور اُن میں آگ جلائی اور مسلمانوں کو مجبور کیا کہ یا تو آگ کو سجدہ کرو ورنہ تم کو اسی میں ڈالدیا جائیگا۔ چنانچہ بہتوں نے انکار کیا۔ اور اُن کو آگ میں ڈالدیا گیا منجملہ ان کے ایک عورت بھی تھی۔ جس کی گود میں ایک شیر خوار بچہ تھا۔ اس کو بھی کفر پر مجبور کیا گیا۔ جب اس نے انکار کیا تو بچہ کو گود میں سے چھین کر آگ میں ڈالدیا گیا۔ اللہ اللہ کیسے پکے مسلمان تھے کہ ایسے سخت امتحانات میں بھی ثابت قدم رہے۔ پھر مرد بھی نہیں بلکہ عورتیں بھی بڑی پختہ تھیں ایک آجکل کے مسلمان ہیں جو ذرا سی تنگی اور افلاس سے پریشان ہو کر مرتد ہونے پر آمادہ ہو جاتے ہیں بس یوں کہئے کہ اُن کے دل میں اول ہی سے ایمان نہیں تھا ورنہ ایمان جب دل میں پیوستہ ہو جاتا ہے پھر نہیں نکل سکتا۔ غرض جب بچہ کو آگ میں ڈالا گیا تو اُس وقت ماں کو ذرا گھبراہٹ ہوئی اور اس کے قدم ڈگمگانے لگے اُسوقت حق تعالیٰ نے اسکی امداد فرمائی کہ بچے کو بولنے کی طاقت دیدی اور اُس نے اندر سے ماں کو پکارا ؎

اندر آ مادر کہ من اینجا خوشم　　گرچہ در صورت میان آتشم

اندر آ اسرار ابراہیم بیں　　کو در آتش یافت ورد و یاسمیں

کہ اے ماں تو بھی اندر آجا اور ذرا اندر آکر دیکھ یہاں تو عجیب و غریب باغ اور پھول پھلواریاں ہیں یہ سن کر عورت بھی از خود آگ میں کود پڑی اب کیا تھا یا تو مسلمان

آگ سے ڈر رہے تھے۔ یا پروانہ وار سب کے سب دمادم کودنے لگے اب یہ حال ہوا کہ سپاہی اُن کو روکتے تھے اور وہ زور کرکے خود آگ میں گرتے تھے یہ حالت دیکھکر بہت سے کافر بھی مسلمان ہوگئے اور کلمہ پڑھ کر آگ میں گرنے لگے۔ اس پر وہ یہودی جھلا اُٹھا اور آگ سے کہنے لگا کہ اے آگ تجھے کیا ہوا تو جلاتی کیوں نہیں۔ کیا تو آگ نہیں رہی کچھ اور بنگئی اُس وقت آگ نے جواب دیا ؎

گفت آتش من ہما تم آتشم　　اندر آ تو تا بہ بینی تا بشم

کہا میں تو وہی آگ ہوں ذرا تو اندر آ پھر میری تپش کو دیکھ باقی ان کے واسطے میں آگ نہیں رہی کیونکہ ان کو جلانیکا مجھے حکم نہیں ہے اس کے بعد آگ پھیلی اور جتنے کفار خندقوں کے کنارہ بیٹھے ہوئے تھے بادشاہ سمیت سب جل بھن کر خاک ہوگئے پس جمادات دنیا میں بھی حق تعالےٰ کے سامنے ذی حیاۃ ہی ہیں۔ گو ہم کو جماد نظر آتے ہیں اور آخرت میں ہم کو بھی ہر چیز ذی حیات معلوم ہوگی۔ اسی لئے جنت کے چشمے اور نہریں مسلمانوں کے اشاروں پر چلیں گے۔ جب یہ معلوم ہوگیا کہ نعماے جنت صورت اعمال ہیں۔ اور جزا کو عمل سے مناسبت ہوگی۔ تو اب سمجھئے کہ وہاں جو مسلمانوں کو شراب ملے گی وہ کس چیز کے مناسب اور مشابہ ہے یعنی وہ کونسا عمل ہے جس کی صورت عالم آخرت میں شراب ہے۔ تو اہل لطائف نے لکھا ہے کہ یہ محبت کی صورت ہے۔ محبت میں بھی ایک تیزی اور سرور اور کیفیت و مستی ہوتی ہے۔ شراب میں بھی یہی صفات ہیں تو وہ اس کی صورت ہے۔ مگر اس شراب کو دُنیا کی شراب پر قیاس نہ کرنا یہاں کی شراب تو ذی شرور ہے جس سے بیہودہ افعال و اقوال صادر ہوتے ہیں اور ہوش و حواس باختہ ہو جاتے ہیں۔ اور وہاں کی شراب طہور ہے کہ خود بھی پاکیزہ اور پینے والوں کو بھی پاکیزہ بنانے والی ہے۔ نہ اُس سے درد سر اور چکر ہوگا نہ عقل زائل ہوگی۔ لایصدعون عنہا ولاینزفون۔ مگر اس سے یہ مت سمجھنا کہ وہ شراب محض ہوگی جیسے پانی پی لیا ہرگز نہیں۔ بلکہ اس سے سرور و نشاط اس درجہ حاصل ہوگا جو یہاں کی شراب سے نہیں ہوسکتا منافع خمر سب اس میں علی وجہ الکمال ہوں گے۔ مگر مضار و نقصانات بالکل نہ ہوں گے

تو وہاں شین کے ساتھ ساتھ سین بھی ہوگا یہ نہیں کہ شین کے بجائے سین ہو یہ دنیا ہی کی ترکیب ہے جس میں شین اور سین آگے پیچھے ہیں۔ یکجا نہیں ہیں۔ وہاں دونوں ساتھ ساتھ ہوں گے یہاں کی شراب تو۔ یصدعن سبیل اللہ ہے اور وہاں کی شراب۔ یصدعن غیر اللہ ہے بہرحال اہل لطائف نے اس پر تو تنبیہ کی ہی ہے کہ شراب آخرت صورت محبت ہے لیکن اس پر کسی نے تنبیہ نہیں کی کہ اسکے لئے مزاج ایک جگہ کافور بتلایا گیا ہے اور ایک جگہ زنجبیل تو یہ مزاج کس چیز کی صورت ہے اور اس کو کس سے مناسبت ہے۔ اسکے متعلق میرے قلب پر یہ لطیفہ وارد ہوا ہے کہ یہ محبت کی انہی دونوں نسبتوں کا لون ہے کافور کو نسبت انس سے مشابہت ہے اور شراب کافور آمیز اُس لون محبت کی صورت ہے کیونکہ کافور بارد المزاج ہے اور زنجبیل کو نسبت شوق سے مشابہت ہے اور شراب زنجبیل آمیز اس لون محبت کی صورت ہے کیونکہ زنجبیل حار المزاج ہے اور شوق میں حرارت والتہاب ہوتا ہے لہذا یہ اس کے مناسب ہے جیسا کہ نسبت انس میں برد وخمود وسکون ہوتا ہے اور کافور اس کے مناسب ہے پس نقشبندیہ کو وہاں شراب کافور ملے گی اور چشتیہ کو شراب زنجبیل (یعنی ان کو زیادہ وہ اور ان کو زیادہ یہ ملے گی کیونکہ حرارت وسکون سے دونوں خالی نہیں ہاں ایک پر ایک کا غلبہ ہے سو اسکا مقتضا یہی ہے کہ دونوں کو دونوں شرابیں دی جائیں گی۔ مگر کثرت وقلت کا فرق ہوگا ۱۲ جامع)۔ اور دیکھئے جیسے یہاں نسبت سکون اور نسبت عشق کے آثار مختلف ہوتے ہیں۔ اسی طرح وہاں بھی دونوں کے ساتھ مختلف معاملہ ہوگا۔ چونکہ نسبت سکون میں غلبہ سحو کو ہوتا ہے اور اُنمیں اختیار وارادہ فنا نہیں ہوتا تو ان کے واسطے فرمایا گیا ہے یشربون من کاس کہ وہ خود جام شراب پئیں گے۔ اور نسبت عشق میں اختیار وارادہ باقی نہیں رہتا تو انکے متعلق ارشاد ہے۔ ویسقون فیہا کاسا کان مزاجہا زنجبیلا کہ یہ وہاں بھی خود نہیں پئیں گے بلکہ دوسرے ہی لاکر ان کو پلائیں گے یہ وہاں بھی مستی ہی میں رہیں گے۔ یشربون اور یسقون میں جو فرق ہے وہ اہل ذوق پر مخفی نہیں ہے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ میں نے اسکو تفسیر کے طور پر بیان نہیں کیا بلکہ اعتبار کے طور پر اہل لطافت کے مناسب یہ لطیفہ

بیان کر دیا ہے کہ کافور و زنجبیل کو ان دونوں نسبتوں کے رنگ سے مناسبت ہے اور جیسے کافور و زنجبیل جنت میں شراب کے ساتھ ملائے جائیں گے جس سے شراب کا اصل اور اُن کا فرع ہونا ظاہر ہو رہا ہے اسی طرح یہاں بھی سمجھئے کہ نسبت اُنس و نسبت عشق کے آثار میں جو اختلاف ہے کہ ایک میں غلبۂ حرارت ہے اور ایک میں برودۃ مقصود نہیں ہیں۔ بلکہ اصل مقصود محبت ہے۔ جو دونوں میں مشترک ہے پس صاحب سکون کو عدم التہاب سے پریشان نہ ہونا چاہئے اور نہ اپنے کو محبت سے خالی اور محروم سمجھنا چاہئے بلکہ یوں سمجھئے کہ شراب محبت مجھے بھی حاصل ہے۔ مگر اُسمیں کافور ملا ہوا ہے جسکی وجہ سے حرارت کا غلبہ نہیں ہوتا۔ پر اس کا حرج ہی کیا ہے۔ تم بھی اللہ تعالیٰ کے مقربین میں داخل ہو اور اُس جماعت میں سے ہو جن کو جنت میں کافور آمیز شراب دی جائیگی پس ہر حال میں راضی رہو۔ اور اپنی تجویز کو دخل نہ دو حق تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں کافور ملا کر پلاتے ہیں۔ اور جس کو چاہتے ہیں زنجبیل ملا کر پلاتے ہیں۔ واصل دونوں ہیں اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

عاشقے گر زیں سر و گر زاں سرست　　عاقبت ما را بداں شہ رہبر ست

میں نے پہلے اس بیان کا نام "الکافور والزنجبیل" تجویز کیا تھا اسی وجہ سے کہ اس میں نسبت مع اللہ کے دو اوان کا ذکر ہوا ہے۔ جن کو ان دونوں سے مناسبت ہے۔ مگر بعد میں پھر دوسرا نام تجویز کیا جو ذرا عام لوگوں سے غیر مانوس ہے یعنی (المعرق والرحیق للمغرق والحریق) اس میں معرق کو تو مغرق سے مناسبت ہے اور رحیق کو حریق سے معرق کہتے ہیں۔ اس شراب کو جس میں پانی ملایا گیا ہو اور مغرق کہتے ہیں غریق کو قاموس سے معلوم ہوا کہ مغرق اور غریق دونوں واحد ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ جو شخص دریائے سکون و خمود میں ڈوبا ہوا ہے یعنی صاحب نسبت انس اس کے لئے تو شراب آب آمیز ہے اور جو جلا بھنا رہتا ہے یعنی صاحب نسبت عشقیہ اس کے لئے رحیق ہے۔ یعنی شراب خالص کیونکہ لغت میں رحیق کے یہی معنی ہیں گو اس نام میں کافور و زنجبیل کی آمیزش پر اشارہ نہ ہو سکا مگر فرق پھر بھی ظاہر ہو گیا۔ کیونکہ جس شراب میں پانی ملا ہوا

ہو وہ خالص شراب سے تیزی میں کم ہوتی ہے پس اس نام سے یہ معلوم ہو گیا کہ غریق و حریق دونوں شراب خوردہ ہیں۔ مگر ایک نے تیز شراب پی ہے ایک نے پانی ملی ہوئی۔ محروم کوئی نہیں۔ میں نے اول یہ چاہا تھا کہ اس کا نام العریق والرحیق للغریق والحریق رکھوں کہ یہ بولنے میں ذرا سہل تھا۔ مگر لغت میں مجھ کو عریق کے معنی شراب آب آمیز نہیں ملے اور دوسرے جو معنی ملے وہ اس جگہ مناسب نہ تھے۔ اگر کسی کو لفظ عریق کا بمعنی معرق ہونا ثابت ہو جائے تو پھر یہ نام بہت اچھا ہے۔ میری نظر کتب لغت پر زیادہ نہیں ہے پس میرے پاس تو قاموس ہی ہے اسی میں سب ننگ و ناموس ہے اس میں مجھ کو یہ بات نہیں ملی ممکن ہے کہ کسی اور کتاب میں اس لفظ کا بمعنی معرق استعمال ہونا دستیاب ہو جائے۔ بہرحال اس وقت تو یہی نام میں نے تجویز کیا ہے۔ المعرق والرحیق للمغرق والحریق اور زیادہ تر اس نام کی رعایت سے میں نے سورۂ دھر کی آیات پڑھی ہیں۔ تاکہ میرا یہ لطیفہ قایم رہے۔ ورنہ اصل مقصود تو دوسری آیت میں مصرح تھا اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو اپنی محبت عطا فرمائیں خواہ اس رنگ کی ہو یا اُس رنگ کی آمین وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ سیدنا و مولانا محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین و آخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العالمین۔

ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلہم بالتی ہی احسن

الاحیاء

کا

تیسرا وعظ مسمّٰی بہ

مراقبۃ الارض

منجملہ ارشادات جامع شریعت وطریقت حضرت

مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی دام فیضہٗ

(عبدالواسع جعفری کے اہتمام سے)

مطبع انوار احمدی واقع الہ آباد میں شایع ہوا

قیمت سالانہ ۳ے، قیمت وعظ ہذا مع محصول ۲ے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الوعظ المقلب به مراقبة الارض

کہاں ہوا	کب ہوا	کتنی دیر ہوا	کس طرح ہوا	کیوں ہوا	کس
تھانہ بھون ضلع مظفر نگر میں حاجی عبدالرحیم صاحب کے مکان پر	۲۵ جمادی الاول ۱۳۳۲ھ	۲ گھنٹہ	تختہ پر بیٹھکر	صاحب خانہ کے بیان کیموجب انکے لڑکے کو دوشنبہ کے روز ظاہر ہوئی	
				انسان کی غفلت کا سبب مبدأ معاد سے بے خبری ہے	کیا مضمون تھا
				اس کا علاج کرنا چاہیئے جس کی سہل تدبیر یہ ہے کہ زمین پر	
				چلتے پھرتے یہ سوچے کہ ایک دن میں اس کے اندر رکھا جاؤں گا	
				سب سامعین کو ہوئی	
				اللھم لک الحمد عافنا واعف عنا وکان لہ	
				مرد تھے ۲۰ اور عورتیں ۴۰	

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ وبارک وسلم۔ اما بعد

فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ منہا خلقنا کم وفیہا نعیدکم و منہا نخرجکم تارۃ اخریٰ۔ یہ ایک آیت ہے سورہ طٰہٰ کی اسمیں حق تعالیٰ نے مخاطبین کی بعض حالتیں یاد دلاکر ان کو متنبہ فرمایا ہے اور وہ تین حالتیں ہیں جو اس آیت میں یاد دلائی گئی ہیں (۱) مبدأ کی حالت ہے (۲) معاد کی حالت ہے۔ (یعنی معاد اول کی جس کو موت کہتے ہیں) (۳) ایک حالت معاد اول کے بعد اور ہونے والی ہے جو معاد حقیقی ہے۔ چنانچہ ترجمہ سے یہ بات معلوم ہو جائیگی فرماتے ہیں کہ ہم نے تم کو اس زمین سے نکالا ہے اور اسی زمین میں تم کو لوٹا دیں گے۔ اور اسی زمین سے دوبارہ تم کو نکالیں گے۔ پس "منہا خلقنا کم" میں تو مبدأ کو یاد دلایا ہے۔ کہ تم کو اسی زمین کی اجزاء خاک وغیرہ سے پیدا کیا گیا ہے اور فیہا نعیدکم میں معاد اول کو یاد دلایا ہے کہ ایک وقت میں تم کو پھر اسی زمین کا پیوند کر دیا جائیگا۔ ظاہر ہے کہ انسان مرنے کے بعد زمین میں ہی ملجاتا ہے (خواہ دفن کیا جائے یا جلایا جائے۔ دونوں صورتوں میں خاک ہو کر یا راکھ ہو کر زمین ہی کا پیوند ہو جاتا ہے ۱۲) اور منہا نخرجکم تارۃ اخری میں معاد حقیقی کو یاد دلایا گیا ہے کہ جس طرح پہلے زمین سے تمہارا مادہ نکلا تھا۔ اسی طرح دوبارہ نکلیگا گو دونوں کی کیفیت میں فرق ہے (کہ پہلی مرتبہ عناصر اربعہ سے بواسطہ غذا اور ہضم کے مادہ منویہ کو اول نکالا گیا پھر اس کو رحم میں پرورش کر کے تدریجاً بڑھایا گیا حتی کہ ایک دن جیتا جاگتا انسان ہو گیا اور دوسری دفعہ یہ تدریجی کیفیت نہ ہوگی بلکہ دفعۃً سب اجزاء سمٹ کر جمع ہو جائیں گے اور پورا انسان بنکر کھڑا ہو جائیگا اُسوقت یہ نہ ہوگا کہ پہلے نطفہ ہو پھر رحم میں پرورش ہو پھر ماں کے پیٹ سے پیدا ہو بلکہ حکم ہوتے ہی دفعۃً کامل انسان بنجائیگا ۱۲) اس کے بعد پھر دوام و بقاء ہے اس کے بعد پھر کوئی اور حالت نہ ہوگی بلکہ یہی وجود ہمیشہ کے لئے باقی رہیگا اسی لئے یہاں کوئی اور حالت ذکر نہیں کی گئی اگر اس کے بعد بھی کچھ تغیر حال ہوتا تو اسکو بھی بیان کیا جاتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بس معاد حقیقی کے بعد پھر کچھ تغیر نہ ہوگا

اور میں اسی اشارہ پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ دوسری نصوص اور بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ معاد ثانی کے بعد پھر دوام و بقاء ہی ہے چنانچہ اہل جنت کے متعلق ارشاد ہے والذین آمنوا وعملوا الصالحات اولئک اصحاب الجنۃ ہم فیہا خالدون۔ اور کفار کے بارہ میں ہے۔ والذین کفروا وکذبوا بآیاتنا اولئک اصحاب النار ہم فیہا خلدون۔ غرض دونوں کے لئے خلود ہے۔ یعنی فنا نہیں بلکہ بقاء ہے اور بعض آیات میں دونوں فریق کے متعلق خلدین کے ساتھ ابدا بھی مذکور ہے جس میں دوام کی زیادہ تصریح ہو گئی۔ بہرحال یہ تین حالتیں ہیں جو اس جگہ ہمکو یاد دلائی گئی ہیں۔ اس مضمون کے اختیار کرنے کی یہ وجہ ہے کہ انسان جو بعض دفعہ خدا کی نافرمانی کرنے لگتا ہے تو اسکا زیادہ سبب یہی ہے کہ وہ اپنی اصلی حالت سے اور اس حالت سے جو اس کو آئندہ پیش آنیوالی ہے غافل ہے۔ غفلت ہی تمام نافرمانیوں کی جڑ ہے اور غفلت اس لئے ہے کہ وہ ان حالات سے یا تو ناواقف ہے اور یا اسکا استحضار نہیں کہ میں پہلے کیا تھا اور ایک دن کیا سے کیا ہو جاؤں گا۔ خیر مستقبل کا استحضار نہ ہونا تو چنداں عجیب نہیں کیونکہ اسکو ابھی دیکھا ہی نہیں چکھا ہی نہیں گو دوسروں کا انجام تو روزانہ نہیں تو مہینہ میں یا سال بھر میں آنکھ کے سامنے سے ضرور گذر جاتا ہے اور اسکا سب کو یقین ہے کہ ایک دن ہمارا بھی یہی انجام ہونا ہے مگر خیر پھر بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ تو دوسروں کا انجام دیکھا تھا ہم پر تو ابھی نہیں گذرا۔ اس لئے اس سے غفلت ہو جاتی ہے۔ مگر میں اس سے بڑھکر ایک اور بات کہتا ہوں وہ یہ کہ انسان کی عادت ہے کہ وہ ماضی کو بھی بھول جاتا ہے یعنی جو حالت اسپر گذر چکی ہے اس کو بھی یاد نہیں رکھتا بتلایئے یہاں کیا عذر ہے۔ صاحبو! ماضی کو تو ہر شخص دیکھ چکا اور چکھ چکا کیا آپ جیسے اس وقت بیٹھے ہیں ہمیشہ سے ایسے ہی تھے ہرگز نہیں بلکہ ایک وقت وہ بھی تھا کہ آپ میں چلنے پھرنے کی بھی طاقت نہ تھی بستر ہی پر پڑے موتتے تھے۔ کسی نے اٹھا دیا تو اٹھ گئے بٹھا دیا تو بیٹھ گئے کہیں رال بہ رہی تھی کبھی سنک چاٹ رہے تھے۔ خیر اس کو بھی جانے دیجئے کیونکہ آپ کہیں گے اُس وقت ہم کو ہوش ہی نہ تھا اس لئے یہ باتیں کس کو یاد ہیں۔ گو یہ عذر اس لئے

قابل قبول نہیں کہ دوسرے خبر دینے والے بکثرت موجود ہیں جو آپ کے سامنے آئے پتے کھول سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں بچوں کی حالت کا روزانہ آپ خود مشاہدہ کرتے ہیں کہ وہ کیونکر پیدا ہوتے اور کس طرح بڑھتے ہیں۔ اور ابتداء میں اُن کی کیسی قابل رحم حالت ہوتی ہے اور یہ بات یقینی ہے کہ آپ بھی ماں کے پیٹ سے اسی طرح پیدا ہوئے تھے اور یوں ہی گودوں میں پالے گئے تھے۔ پھر اس کا استحضار دشوار کیوں ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اچھا سات آٹھ برس کی عمر کے واقعات تو اکثر لوگوں کو یاد ہوتے ہیں اور دس گیارہ سال کے حالات تو ضرور ہی یاد ہوتے ہیں۔ ذرا ان ہی کو یاد کر لیجئے کہ اسوقت آپکی کیا حالت تھی اور اب کیا حالت ہے۔ اسوقت کھانے پینے کے سوا کسی بات کی بھی حس نہ تھی۔ لڑکوں میں واہی تباہی پھرا کرتے تھے۔ کہیں اینٹوں کا گھر بناتے تھے کبھی گلی ڈنڈے سے کھیلتے تھے۔ نہ سر کی خبر تھی نہ پیر کی۔ جانوروں کی طرح پھرتے تھے بھلا آج ہر شخص کی جو حالت ہے کہ کوئی ڈپٹی ہے کوئی تحصیلدار ہے کوئی رئیس ہے کوئی زمیندار ہے۔ کوئی شیخ ہے کوئی مدرس کوئی واعظ ہے کوئی مفتی کوئی کاریگر ہے کوئی انجینیر کوئی فلسفی ہے کوئی معقولی کیا اسوقت کسی کو یا خود اسکو یہ گمان و خیال ہو سکتا تھا کہ میری ایک دن یہ حالت ہو جائیگی ہرگز نہیں حضرت اس حالت میں اور اس حالت میں زمین و آسمان کا فرق نظر آئیگا۔ مگر انسان کی حالت یہ ہے کہ وہ مستقبل سے تو غافل ہے ہی زمانہ ماضی کو بھی بھول جاتا ہے اگر یہ ماضی کو بھی یاد رکھتا تو اسکی اصلاح کے لئے یہ بھی کافی تھا مگر یہ تو ابن الحال ہے۔ صرف حال ہی کو یاد رکھتا ہے۔ اور اسی میں مست ہو جاتا ہے شاید آپ کہیں کہ یہ تو اچھی حالت ہے کہ ماضی و مستقبل دونوں کو الگ کر کے ابن الحال ہو گیا۔ اور ابن الحال تو صوفی کو کہتے ہیں صاحب میں نے یہاں ابن الحال لغت کے اعتبار سے کہا ہے۔ اصطلاحی معنی کے اعتبار سے نہیں کہا جو صوفیہ کی عبارت میں مستعمل ہے اگر ہم ویسے ابن الحال ہوتے تو قسمت ہی اچھی ہو جاتی صوفیہ تو ابن الحال اُسے کہتے ہیں جو حقوق وقت کو ادا کرتا ہو۔ اور ہم ابن الحال ایسے ہیں جو وقت کو ضایع کرتے ہیں۔ گویا ابن تو ہیں مگر عاق و نافرمان مگر میں اس ابہام ہی کو قطع کئے دیتا ہوں

اور ابن الحال کے بجائے عبد الحال کہتا ہوں۔ کہ انسان ماضی و مستقبل سب کو بھلا کر بندۂ حال ہو گیا ہے اسکی حالت یہ ہے کہ اس وقت اگر راحت ہے تو اسی میں مست ہے اور اگر کلفت ہے تو خدا سے شکایت ہے ذرا سی بات میں وہ اُن تمام انعامات کو بھول جاتا ہے۔ جو زمانہ ماضی سے اب تک ان پر ہو چکے ہیں یہ بھی نہیں دیکھتا کہ پہلے میں کیا تھا اور اب کیا ہو گیا ہوں۔ خدا کا کتنا بڑا انعام ہے کہ اس نے مجھے جانور سے آدمی کیا اور آدمی بھی عاقل سمجھدار ہوشیار اور اس نے مجھے ابتک کیسی راحت سے رکھا ایک دن اگر کلفت بھی ہو گئی تو کیا ہوا ساری عمر تو آرام سے گذری ہے مگر توبہ ان گذشتہ واقعات کا تو خطرہ بھی نہیں آتا اس کی نظر تو صرف حال پر ہوتی ہے۔ اگر کھانے کو ملگیا تو خوش ہے مست ہے ورنہ گویا ان تلوں تیل ہی نہ تھا بس یہ شان ہے ؎

چوں گرسنہ می شوی سگ میشوی چونکہ خوردی تندو بدرگ می شوی

بھوک میں کتے کی طرح بھونکتا ہے اور پیٹ بھر کے کتے کی طرح غراتا ہے کسی حال میں راہ پر نہیں آتا اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ان الانسان خلق ہلوعا اذا مسہ الشر جزوعا و اذا مسہ الخیر منوعا۔ انسان بڑا ہی کم ہمت ہے اگر اس کو کلفت پہونچے تو ہائے واویلا مچاوے اور مال ملجائے راحت نصیب ہو جائے تو بخل کرنے لگے اسوقت بھی چین نہیں اب یہ سمجھتا ہے کہ نہ معلوم پھر بھی ملیگا یا نہیں لاؤ اسکو جمع کرلو۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں۔ اما الانسان اذا ما ابتلاہ ربہ فاکرمہ ونعمہ فیقول ربی اکرمن ○ واما اذا ما ابتلاہ فقدر علیہ رزقہ فیقول ربی اہانن۔ یعنی انسان کی یہ حالت ہے کہ جب حق تعالےٰ اس کو (نعمت سے) آزماتے ہیں اس پر بخشش و انعام فرماتے ہیں۔ تو کہتا ہے کہ میرے پروردگار نے میری خاطر کی مجھپر کرم کیا اور جب (تکلیف سے) آزماتے ہیں پھر اس پر روزی کی کھینچ کر دیں۔ تو کہتا ہے کہ میرے پروردگار نے مجھے ذلیل کر دیا۔ ذرا سی پریشانی میں پچھلے سارے انعامات بھول جاتا ہے۔ اور روزی ہی کے ملنے پر مقبولیت و قدر کا مدار سمجھتا ہے کہ خدا تعالیٰ کو میرے حال پر توجہ نہیں روز و شب اسی دھندے میں رہتا ہے کہ کسی طرح کھانے کو ملے چاہے کسی طرح ملے پھر جو کچھ اس کو ملتا ہے اسکو خدا پر اپنا حق

سمجھتا ہے حالانکہ حق تعالیٰ نے اس کو محض اپنے فضل سے عدم محض سے اوس کو ہست کیا اور ایسے وقت میں اسپر احسان کیا جبکہ یہ کچھ بھی نہ تھا ؎

ما نبودیم و تقاضا ما نبود لطف تو ناگفتہ ما می شنود

حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ہل اتی علی الانسان حین من الدھر لم یکن شیئاً مذکورا انسان پر ایک ایسا وقت آچکا ہے جس میں یہ کچھ بھی قابل ذکر نہ تھا۔ ۱۲ پھر اس کو اس حال میں پرورش کیا کہ یہ بالکل عاجز و کمزور تھا چلنے پھرنے کے بھی قابل نہ تھا۔ جانوروں سے بھی عاجز تھا وہ ماں کے پیٹ سے نکلتے ہی اپنے پیروں سے چلنے پھرنے لگتے اور منہ مارنے لگتے ہیں۔ یہ اتنا بھی نہ تھا پھر ایسے کمزور و عاجز کو خدا نے اتنا پالا ایسا پالا کہ آج بزعم خود خدا کے مقابلہ کے قابل ہو گیا اب کھا کھا کر معصیت پر کمربستہ ہو گیا گو یا خدا کوئی چیز ہی نہیں۔ گو اعتقاداً ایسا نہ سہی مگر حالاً تو ہے ہی اور بعض نے تو اعتقاداً و قولاً بھی ایسا ہی کر دکھایا۔ اپنی ہستی کو انھوں نے ایسا برقرار کیا کہ ہستی خدا کی نفی کر دی۔ چنانچہ نمرود اور فرعون خدا کی ہستی کی نفی کرتے تھے۔ اسی لئے فرعون کہتا ہے ما علمت لکم من الٰہ غیری کہ اپنے سوا میں کسی کو تمہارا معبود نہیں سمجھتا اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدا کا قائل ہی نہ تھا کیونکہ یہ تو کوئی بے وقوف سے بے وقوف بھی نہیں کر سکتا کہ خدا کو موجود مان کر پھر اپنے کو اُس سے بڑا سمجھے اور اس نے جو انا ربکم الاعلیٰ کہا ہے اس سے شبہہ نہ کیا جائے کہ وہ تو اپنے کو بڑا خدا کہتا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کا قائل تھا۔ پھر اپنے آپ کو رب اعلیٰ کہتا تھا بلکہ منشا اس قول کا یہ ہے جو قاضی ثناء اللہ صاحب نے تفسیر مظہری میں لکھا ہے کہ فرعون دہری تھا وہ کہتا تھا کہ خدا کوئی چیز نہیں بس جو جس کو تربیت کرتا ہے وہی اس کا رب ہے اولاد کو ماں باپ پالتے ہیں تو والدین اُن کے رب ہیں حاکم رعایا کی تربیت کرتا ہے وہ بلا کا رب ہے اور بادشاہ سب سے بڑا حاکم ہے تو وہ سب سے بڑا رب ہے اس لئے وہ اپنے کو رب اعلیٰ کہتا تھا۔ یعنی میں دنیا میں سب تربیت کرنیوالوں سے بڑا ہوں تو میں سب سے بڑا رب ہوں یہ مطلب تھا اس کے قول کا یہ نہیں کہ وہ خدا کا قائل تھا اور

پھر اپنے کو خدا سے بڑا سمجھتا تھا بلکہ وہ تو سرے سے خدا ہی کا منکر تھا اسی لئے اس نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا و ما رب العالمین (رب العالمین کیا چیز ہے خدا کون ہوتا ہے) وہ کمبخت خدا کی کنہ پوچھتا تھا اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ منکر صانع تھا۔ پھر موسیٰ علیہ السلام کا جواب قابل دید ہے آپ چونکہ عارف تھے بلکہ عارف کہنا بھی آپکی کسر شان ہے۔ اعرف العارفین تھے۔ (بلکہ یہ بھی کسر شان ہے رسول اور نبی تھے۔ جو منتہائے کمالات بشریہ ہے ۱۲) آپ نے جواب دیا۔ رب السموات والارض وما بینھما ان کنتم موقنین ۰ خدا وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے سب کا تربیت کرنے والا ہے۔ اگر تم یقین کرنا چاہتے ہو تو علم باری کے لئے اتنا جان لینا کافی ہے) آپ نے اس جواب میں اس مسئلہ پر متنبہ کر دیا۔ کہ کنہ ذات باری مدرک نہیں ہو سکتی بلکہ اس کا ادراک ہمیشہ بالوجہ ہوگا پس تیرا کنہ سے سوال کرنا حماقت ہے اور یہ تنبیہ اسطرح ہوئی کہ اگر کنہ ذات کا ادراک ہو سکتا تو موسیٰ علیہ السلام جواب میں کنہ ہی کو بیان فرماتے کیونکہ سوال اسی سے تھا۔ اور جواب کا مطابق سوال ہونا ضروری ہے۔ اگر سوال صحیح ہو خصوصاً ایسے موقعہ میں جہاں غیر مطابق جواب دینے سے عجیب کا بجز سمجھا جائے۔ اور حق پر تمسخر کیا جائے جیسا کہ یہاں ہوا کہ فرعون نے جواب بالوجہ کو سن کر تمسخر کیا اور قال لمن حولہ الا تستمعون۔ اپنے پاس والوں سے کہنے لگا۔ کہ تم سنتے بھی ہو کیسا جواب دیا یعنی میں تو کنہ پوچھتا ہوں آپ وجہ بیان کر رہے ہیں۔ مگر موسیٰ علیہ السلام نے اس پر بھی کنہ بیان نہیں کی بلکہ ایک وجہ اور بیان کر دی۔ قال ربکم ورب آبائکم الاولین۔ فرمایا کہ خدا وہ ہے جو تمہارا رب ہے اور تمہارے گذشتہ باپ دادوں کا بھی رب ہے فرعون اس پر جھلا کر کہنے لگا۔ ان رسولکم الذی ارسل الیکم لمجنون۔ کہ اے لوگو! تمہاری طرف جو رسول بھیجا گیا ہے وہ تو دیوانہ ہے۔ (کیونکہ ان کو سوال کے مطابق جواب دینا بھی نہیں آتا) میرا سوال کچھ ہے ان کا جواب کچھ ہے۔ اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ کنہ باری کا ادراک ممتنع ہے ورنہ موسیٰ علیہ السلام اس موقعہ پر ضرور بیان فرماتے مگر آپ نے بار بار وجہ ہی بیان کی (اور ایسی وجہ بیان کی جو اثبات وجود صانع کیلئے

بالکل کافی تھی چنانچہ اول تو یہ فرمایا کہ وہ آسمان وزمین کا اور ان کے مابین جو اشیا ہیں سب کا رب ہے اس میں فرعون پر اس خیال کی غلطی نمایاں کر دی کہ بس جو سبکی تربیت کرے وہی اس کا رب ہے۔ کیونکہ اگر یہی بات ہے کہ تربیت علت ہے۔ الوہیت کی تو بتلاؤ زمین و آسمان کو کس نے پیدا کیا آسمان میں سورج اور چاند اور ستارے اور زمین میں پانی ہوا آگ وغیرہ کس نے پیدا کی ظاہر ہے کہ تو یہ دعوی نہیں کر سکتا کہ میں ان چیزوں کا خالق ہوں کیونکہ یہ چیزیں کسی کے تابع نہیں ہیں اور مخلوق کا خالق کے لئے تابع ہونا ضروری ہے جب انکا رب نہیں اور کسی نہ کسی رب کا ہونا ضروری ہے اور ضرور کوئی اور ہی رب ہے۔ علی ہذا زمین میں جو درخت اور نباتات پیدا ہوتے ہیں۔ یہ کون پیدا کرتا ہے۔ اگر کہو کاشتکار پیدا کرتے ہیں تو یہ بداہۃ غلط ہے اور کاشتکار کا زمین کے درست کرنے اور پانی دینے اور بیج ڈالنے کے سوا اور کسی بات میں دخل نہیں اگر دخل ہے تو چاہئے کہ جتنا وہ چاہے اور جب چاہے فوراً پیداوار ہو جایا کرے حالانکہ اس کی مرضی کے موافق بارہا پیداوار نہیں ہوتی۔ معلوم ہوا کوئی ایسی ہستی ضرور ہے جس کے قبضہ میں یہ تمام چیزیں ہیں اور وہی سب کا خالق ہے جب منہ فرعون اس سے لاجواب ہو کر تمسخر کرنے لگا تو آپ نے دوسری وجہ بیان کی جسمیں صراحۃً اسکے قول سابق کا ابطال تھا فرمایا کہ وہ رب ہے تمہارا اور تمہارے پہلے بزرگوں کا اس میں بتلا دیا کہ تو جو ماں باپ کو اولاد کا رب اور حاکم کو رعیت کا رب کہتا ہے تو بتلا کہ باپ ماں کے مرنے کے بعد اولاد کیونکر زندہ رہتی ہے یہ عجیب تماشا ہے کہ رب تو مر جائے اور مربوب زندہ رہے اسی طرح حاکم بھی مرتے رہتے ہیں۔ تو ان کے مرنے سے رعایا کیوں نہیں مر جاتی خالق کے بغیر مخلوق کیونکر زندہ رہتی ہے۔ پھر اگر باپ ماں اولاد کے خالق ہیں تو جو سب سے پہلا باپ تھا اس کا خالق کون تھا۔ اگر وہ خود اپنا خالق تھا تو مر کیوں گیا اُس نے اپنے آپ کو زندہ کیوں نہ رکھا۔ جب وجود اسکے اختیار میں تھا تو اس نے اپنے وجود کو باقی کیوں نہ رکھا۔ کیونکہ موت کسی کو مرغوب نہیں طبعاً ہر شخص کو اس سے کراہت ہے۔ اور اگر پہلا باپ کوئی نہیں تو تسلسل مستحیل لازم آئیگا۔ علاوہ ازیں یہی

گفتگو ہر باپ کے متعلق ہے کہ اگر وہ اولاد کے خالق ہیں اور وجود ان کے اختیار میں ہے جس کو چاہیں دیدیں تو خود کیوں فنا ہو جاتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ جب تمہارا اور تمہارے آباؤ اجداد کا وجود اپنے قبضہ میں نہیں تو یہ نہ اپنے خالق ہو سکتے ہیں نہ کسی غیر کے تو ضرور تمہارا سب کا رب کوئی اور ہے۔ وہی رب العلمین ہے) جب فرعون اس پر بھی لاجواب ہوا اور وہی مرغی کی ایک ٹانگ ہانکتا رہا کہ یہ تو جواب بالکل نہ ہوا تو موسیٰ علیہ السلام نے تیسری وجہ اور بیان فرمائی۔ قال رب المشرق والمغرب ان کنتم تعقلون ۝ فرمایا کہ تربیت کرنیوالا ہر مشرق کی اور مغرب کی اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اس کی بھی اگر تم کو عقل ہو (تو اسی سے سمجھ لو کیونکہ یقیناً طلوع شمس و غروب شمس پر اور تبدل و تغیر مواسم و فصول پر کسی انسان کی قدرت نہیں انسان تو یہ چاہتا ہے کہ بارہ مہینہ ایسی حالت رہے نہ گرمی زیادہ ہو نہ سردی اور بہت دفعہ جب کوئی کام پورا نہیں ہوتا تو چاہا کرتا ہے کہ ابھی رات نہ آئے تو اچھا ہے مگر ان باتوں میں اس کے اختیار کو کوئی دخل نہیں معلوم ہوا کہ انکا کوئی رب ضرور ہے وہی رب العلمین ہے ۱۲) غرض موسیٰ علیہ السلام دبے نہیں کیونکہ صاحب حق دبا نہیں کرتا۔ ان پر علم کا رعب تو کیا ہوتا۔ سلطنت کا رعب بھی نہ ہوا صاحب حق اظہار حق میں کسی سے مرعوب نہیں ہوا کرتا۔ اس لئے آپ نے اسی جواب بالوجہ کو مختلف پہلوؤں سے اعادہ کیا (اور ہر دفعہ ایسی چبھتی ہوئی بات کہی جس کا فرعون کے پاس کچھ جواب نہ تھا ۱۲) یہاں سے معلوم ہوا کہ صاحب حق کو کسی مخاطب سے مرعوب ہو کر اپنا طرز نہ بدلنا چاہئے بلکہ حق بات ہی کو بار بار کہنا چاہئے یہ آجکل ہی کا طرز ہے کہ مجیب سائل کا اتباع کر کے اپنا طرز بدل دیتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ اخیر تک اپنی بات پر جمے رہے کہ جتنی دفعہ بولوگے جواب وہی سے ملیگا پھر ؎

چو حجت نماند جفا جوے را ۔۔۔ بہ پرخاش درہم کشد روے را

جب کوئی بات نہ چلی تو اب اس نے قوت سلطنت سے کام نکالنا چاہا۔ قال لئن اتخذت الٰھا غیری لاجعلنک من المسجونین۔ کہنے لگا کہ بس بس زیادہ نہ بولو اگر میرے سوا کسی کو خدا بناؤ گے تو میں تم کو جیلخانہ بھیجدوں گا۔ موسیٰ علیہ السلام یہاں بھی نہیں دبے

قال اولو جئتک بشئ مبین ۔ فرمایا کیا اگر میں کوئی صریح دلیل پیش کردوں (جس سے رب العلمین کی قدرت اور میری رسالت کی حقانیت علانیہ ظاہر ہو جائے) تب بھی (تو نہ مانیگا اور خواہ مخواہ ہی اپنی بات پر اڑا رہے گا) اس کے بعد اس نے معجزات ظاہر کرنے کا مطالبہ کیا ۔ آپ نے معجزات دکھلائے عصا کو زمین پر ڈالدیا وہ نمایاں اژدھا بنگیا ۔ جس کو دیکھکر فرعون ڈر کے بھاگنے لگا ۔ اور ساری خدائی ڈھیلی ہوگئی غرض فرعون کی ان تمام باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دہری تھا ۔ خدا کو مانتا ہی نہ تھا اسی طرح نمرود بھی منکر صانع تھا ۔ اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے مناظرہ کیا تھا کہ تم جو خدا کی ہستی کے مدعی ہو بتلاؤ خدا کیسا ہے ۔ قال ربی الذی یحیی ویمیت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ میرا رب ایسا ہے کہ وہی جلاتا ہے اور مارتا ہے (یعنی مارنا اور جلانا اس کے خاص کمالات میں سے ہے کوئی دوسرا ایسا نہیں کرسکتا اور عالم میں ان دونوں فعلوں کا وقوع مشاہد ہے ۔ پس خدا کا وجود بھی ضروری التسلیم ہے) وہ کوڑہ مغز جلانے اور مارنے کی حقیقت تو سمجھا نہیں کہنے لگا کہ یہ کام تو میں کرسکتا ہوں یہ کوئی خدا کی خاص صفت نہیں جس کے وجود سے خدا کا وجود تسلیم کرنا لازم آجائے کیونکہ میں بھی جلاتا ہوں اور مارتا ہوں چنانچہ جس کو چاہوں قتل کردوں یہ تو مارنا ہے اور جس واجب القتل کو چاہوں چھوڑ دوں یہ جلانا ہے پھر جیل خانہ میں سے دو واجب القتل قیدیوں کو بلا کر ایک کو رہا کردیا اور ایک کو مار ڈالا ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا کہ یہ تو بالکل ہی بھدی عقل کا ہے اسے جلانے اور مارنے کی حقیقت بھی معلوم نہیں حالانکہ جلانے کی حقیقت یہ ہے کہ بیجان چیز میں جان ڈالے نہ یہ کہ جاندار کو چھوڑ دے اسی طرح مارنا یہ ہے کہ زندہ کی جان اپنے اختیار سے نکالے اور گردن کاٹنے میں قاتل کے اختیار سے جان نہیں نکلتی اس کا کام تو صرف گردن کاٹنا ہے ۔ اس کے بعد بدون اس کے اختیار کے جان نکلتی ہے ورنہ پھر یہ بھی اختیار ہونا چاہیئے کہ گردن الگ کردے اور جان نہ نکلنے دے اور یہ گفتگو حضرت ابراہیمؑ نے اس لئے نہ چھیڑی کہ قرائن سے معلوم ہوگیا کہ یہ جلانے اور مارنے کی حقیقت تو سمجھیگا

نہیں یا سمجھ بھی گیا تو تسلیم نہ کریگا۔ اور خواہ مخواہ بحث میں الجھے گا۔ اس ضرورت سے دوسری دلیل کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ اچھا اللہ تعالیٰ آفتاب کو روز کے روز مشرق سے نکالتا ہے تو (اگر بزعم خود خالق ہے تو ایک ہی دن) مغرب سے نکال (کر دکھلا) دے۔ فبہت الذی کفر۔ اس پر وہ کافر الکا منہ تکنے لگا اور کچھ جواب بن نہ آیا پھر اس نے بھی وہی کیا جو فرعون نے کیا تھا کہ سلطنت کے زور سے کام لینے لگا اور حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈلوا دیا۔ جس کی گزند سے خدا تعالیٰ نے ان کو بچا لیا اور آگ کا مطلق اثر نہ ہوا اس جگہ دو سوال وارد ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ نمرود کو یہ کہنے کی تو گنجائش تھی کہ اگر خدا موجود ہے تو وہی سورج کو مغرب سے نکالدے پھر اس نے یہ کیوں نہ کہا جواب اس کا یہ ہے کہ اس کے قلب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تقریر سے بلا اختیار یہ بات پڑ گئی کہ خدا ضرور ہے اور یہ مشرق سے نکالنا اسی کا فعل ہے اور وہ مغرب سے بھی نکال سکتا ہے۔ اور یہ بھی بے اختیار اس کے دل میں آگیا کہ یہ شخص پیغمبر ہے اس کے کہنے سے ضرور ایسا ہو جائیگا۔ اور ایسا ہونے سے جہان میں انقلاب عظیم پیدا ہوگا کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ کہ یہ لوگ اس خارق عادت کو دیکھ کر مجھ سے منحرف ہو کر اُن کی راہ پر ہو لیں اور مذرا می حجت میں سلطنت ہاتھ سے جاتی رہے یہ جواب تو اس لئے نہ دیا اور کوئی دوسرا جواب تو تھا نہیں اس لئے حیران ہو کر منہ دیکھتا رہ گیا۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی حجت کیوں بدلی یہ تو داب مناظرہ کے خلاف ہے کیونکہ اس طرح تو گفتگو کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا بس جہاں مدعی کی دلیل پر نقض وارد ہوا وہ اس دلیل کو چھوڑ کر دوسری بیان کرنے لگے گا پھر اس پر نقض وارد ہوگا تو تیسری دلیل پیش کر دیگا وعلی ہذا القیاس۔ یوں تو سلسلہ غیر متناہی ہو جائیگا اسی لئے اہل مناظرہ نے مدعی کے لئے تبدیل حجت کو منع کیا ہے اس شبہہ کا جواب یہ ہے کہ اہل مناظرہ کے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ مدعی کو اپنی مصلحت سے تبدیل دلیل کی اجازت نہیں باقی خصم کی مصلحت سے کہ مثلاً وہ منجی ہے اور دلیل اول کو نموض کی وجہ سے

نہیں سمجھ سکتا۔ حجت کا بدلنا اور دوسری صحیح دلیل بیان کرنا جائز ہے بلکہ جہاں سمجھانا مقصود ہو وہاں ایسا کرنا واجب ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سمجھانا ہی مقصود تھا۔ اس لئے آپ نے دلیل خاص کو بدل کر سہل دلیل اختیار کی اور گو اہل مناظرہ نے اس کی تصریح نہیں کی مگر اُن کے قول کو اس پر محمول کرنا ضروری ہے کیونکہ جس طرح ایک مصلحت عقلیہ تبدیل کی عدم جواز کو مقتضی ہے۔ اسی طرح ایک مصلحت عقلیہ بھی تفہیم مخاطب اس کے جواز کو مقتضی اور ظاہر ہے کہ ہم نے پہلے قاعدہ کو محض اقتضاء عقل کی وجہ سے تسلیم کیا ہے ورنہ محض اہل مناظرہ پر کوئی وحی تھوڑا ہی نازل ہوئی ہے پھر کیا وجہ ہے کہ اقتضائے عقل کی وجہ سے اس قاعدہ میں استثناء کا قائل نہ ہوا جائے یہ گفتگو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کے متعلق تھی اب میں یہاں سے ایک فائدۂ جدیدہ پر متنبہ کرتا ہوں جو طلبہ کے کام کی بات ہے۔ وہ یہ کہ ابھی قریب زمانہ میں حیدرآباد سے ایک عالم نے جو میرے دوست بھی ہیں مجھے ایک خط میں لکھا تھا کہ میں ایک رسالہ میں یہ مضمون لکھنا چاہتا ہوں کہ وجود صانع کا اعتقاد فطری ہے اور اسکی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید پر دلائل قائم کئے ہیں مگر اثبات وجود صانع پر براہین و دلائل نہیں قائم کئے۔ جیسا کہ قرآن کے مضامین سے واضح ہے جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دلائل توحید کی تعلیم کی گئی ہے کہ ان میں اثبات صانع پر کوئی دلیل نہیں ہے پھر مجھ سے دریافت کیا تھا کہ اس مضمون کے متعلق تیری کیا رائے ہے میں نے لکھا کہ اس مدعی پر اس دلیل سے استدلال کرنا غلط ہے کیونکہ اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اثبات صانع پر دلائل قائم نہیں کئے مگر دوسرے انبیاء نے تو قائم کئے ہیں۔ اور وجہ اسکی یہ ہے کہ حضرات انبیا علیہم السلام طبیب کے مثل ہیں۔ کہ مرض کو دیکھ کر دوا دیتے ہیں سو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب دہری نہ تھے بلکہ مشرک تھے۔ اس لئے آپ نے اثبات صانع پر دلائل قائم نہیں کئے کیونکہ مخاطبین کو اس سے انکار نہ تھا ہاں توحید سے منکر تھے تو آپ نے اس پر دلائل قائم کئے اور دیگر انبیا کو بعض دہریوں سے بھی سابقہ پڑا ہے اس لئے انھوں نے توحید کے ساتھ اثبات

صانع پر بھی دلائل قائم کئے بس گو یہ مسئلہ فی نفسہ صحیح ہے کہ وجود صانع کا اعتقاد فطری ہے مگر اس پر حضور کے عدم استدلال سے استدلال کرنا صحیح نہیں کیونکہ اس پر خصم یہ کہہ سکتا ہے کہ حضور کو اس کی ضرورت نہیں پڑی اگر ضرورت پڑتی تو آپ اس پر بھی دلائل قائم کرتے جیسا کہ اور انبیاء نے کئے ہیں۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نمرود کے مقابلہ میں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے مقابلہ میں اثبات صانع پر ادلّہ قائم کئے جیسا کہ اوپر تفصیل کے ساتھ میں نے ابھی بیان کیا ہے اور گو اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ بطور دلیل علی الظنی کے ہوں۔ اور استدلال کے لئے احتمال بھی قادح ہے۔ اس لئے میں نے لکھا کہ اس مضمون کو رسالہ میں تو آپ شائع نہ کریں گو اپنے خیال میں صحیح سمجھتے رہیں۔ (تنبیہ اس لئے کر دی گئی کہ شاید کسی کو دیگر انبیاء کے دلائل میں جو قرآن کے اندر مذکور ہیں اثبات صانع پر دلیل دیکھ کر اور حضور کے دلائل میں نہ دیکھ کر یہ شبہہ ہو کہ اگر اثبات صانع پر دلیل کرنا ضروری تھا تو حضور نے کیوں نہیں قائم کی اور غیر ضروری تھا تو اور انبیاء نے کیوں قائم کی پھر وہ ایک دوسرے کی ترجیح اور مزیت ثابت کرتا اس لئے یہ بتلا دیا گیا کہ یہ اختلاف دلائل مخاطبین کے حالات کے اختلاف پر مبنی ہے پس اب کچھ شبہہ نہ رہا ۱۲)

غرض انسان کی غفلت اس حد تک پہنچی ہوئی ہے کہ بعضے منکر صانع بھی تھے۔ اس پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا کہ ایک بزرگ نے جو صاحب ادلال تھے اور ادلال کے معنی ناز کے ہیں یہ بھی ایک مقام ہے ولایت کا جو بعض اہل اللہ کو نصیب ہوتا ہے وہ صاحب دلال ہوتے ہیں یعنی بطور ناز کے حق تعالیٰ سے ایسی باتیں عرض کر دیتے ہیں جو دوسرا نہیں کر سکتا گو بعض دفعہ وہ ادلال دوسروں کے لئے اضلال ضاد کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ موقع متحمل کے ہوتے ہیں۔ اُن کو دال سے مناسبت نہیں ہوتی ضاد ہی سے مناسبت ہوتی ہے تو وہ بزرگوں کی ایسی باتوں سے گمراہ ہو جاتے ہیں۔ خیر ایک ایسے ہی بزرگ نے حق تعالیٰ سے سوال کیا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ منصور نے بھی انا الحق کہا تھا اور فرعون نے بھی انا الحق کہا تھا (کیونکہ انا ربکم الاعلی کا بھی وہی حاصل ہے جو انا الحق کا ہے ۱۲) تو بات ایک ہی تھی مگر منصور تو مقبول ہو گیا اور فرعون مردود ہو گیا وہاں سے جواب

عطا ہوا کہ تم سمجھتے نہیں دونوں میں بڑا فرق تھا منصور نے اپنے کو مٹا کر انا الحق کہا تھا اور فرعون نے ہم کو مٹا کر انا الحق کہا تھا یعنی منصور نے ایسی حالت میں انا الحق کہا تھا کہ اپنی ہستی اُن کی نظر سے غائب تھی اور ہستی خداوندی کے سوا کسی پر اُن کی نظر نہ تھی تو وہ اپنی نفی کر کے انا الحق کہتے تھے اور فرعون نے ایسی حالت میں انا ربکم الاعلیٰ کہا تھا کہ اُسوقت خدا کی ہستی اس کی نظر سے غائب تھی محض اپنی ہی ہستی پیش نظر تھی تو وہ ہستی خداوندی کی نفی کر کے اپنی ہستی کو ثابت کر رہا تھا۔ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ منصور کے انا الحق کے یہ معنی تھے کہ میں اور تمام عالم کچھ نہیں صرف خدا ہی کا وجود ہے۔ اور فرعون کے انا الحق کا یہ مطلب تھا کہ خدا کوئی چیز نہیں بس میں ہی ہوں جو کچھ ہوں۔ واقعی یہ جواب ایسا عجیب ہے کہ حق تعالیٰ ہی دے سکتے ہیں اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

گفت فرعونے انا الحق گشت پست گفت منصورے انا الحق گشت مست

فرعون تو اس بات سے مردود اور پست ہو گیا اور منصور مجذوب اور مست شمار ہوئے ؎

لعنت اللہ آں انا را در قفا (اور) رحمت اللہ ایں انا را در وفا

اس انا کے عقب میں تو لعنت ہے جو فرعون نے کہا تھا اور اُس انا پر رحمت ہے جو منصور نے کہا تھا۔ کیونکہ اس کا منشا وفا تھی وہ خدا کی ہستی کا حق ادا کر کے کہہ رہے تھے اور یہ گفتگو بہت طویل ہو گئی میں یہ کہہ رہا تھا کہ انسان کی عادت یہ ہے کہ وہ ماضی کو بھول جاتا ہے۔ اور اپنے اس ضعف و عجز کو یاد نہیں رکھتا جو ایک زمانہ میں اس پر گذر چکا ہے گویا حالاً یوں سمجھتا ہے کہ (نعوذ باللہ) حق تعالیٰ کو ماضی پر اب قدرت نہیں رہی جو حالت گذر گئی اب دوبارہ مجھے پیش نہیں آسکتی چنانچہ ایک مقام پر حق تعالیٰ نے انسان کی اسی عادت پر (کہ وہ ماضی کو بھول جاتا ہے) متنبہ فرمایا ہے ارشاد ہوتا ہے ربکم الذی یزجی لکم الفلک فی البحر لتبتغوا من فضلہ انہ کان بکم رحیما تمہارا رب ایسا (منعم) ہے کہ تمہارے (فائدہ کے) لئے کشتی کو دریا میں لے چلتا ہے۔ تاکہ تم اس کے رزق کو تلاش کرو۔ بیشک وہ تمہارے حال پر بہت مہربان ہے۔ واقعی دریا میں جہازوں

اور کشتیوں کا چلنا بڑی رحمت ہے۔ اس سے سفر میں کتنی آسانی ہوگئی ورنہ بس ہندوستان والے تو حج سے محروم ہی رہتے۔ یہ تو دینی ضرر تھا اور دنیوی ضرر یہ تھا کہ دوسرے ممالک کی چیزوں سے محروم رہتے۔ یہ جہازوں ہی کی تو برکت ہے کہ آج قسم قسم کی چیزیں اور راحت کے سامان دوسری ولایتوں سے یہاں آتے ہیں اور یہاں کی چیزیں باہر جاتی ہیں جس سے تجارت کو ترقی ہوگئی اور سمندر میں جہازوں کا چلنا محض خدا کی رحمت ہی ہے ورنہ بڑے سے بڑا جہاز پانی میں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تنکا بہ رہا ہو سمندر کی ایک موج بھی اس کے ڈبونے کے لئے کافی ہے اور اس وقت ساری مشینیں بیکار ہو جاتی ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے حفاظت فرماتے ہیں۔ ہاں کبھی بطور تنبیہ و امتحان کے طوفان میں بھی مبتلا کر دیتے ہیں جیسے خشکی میں بعض دفعہ اسی حکمت سے مصائب بھیج دیتے ہیں آگے اس امتحان کے متعلق ارشاد ہے۔ واذا مسکم الضر فی البحر ضل من تدعون الا ایاہ ط فلما نجیکم الی البر اعرضتم وکان الانسان کفورا اور جب تم کو دریا میں کوئی تکلیف پہونچتی ہے (جیسے موج اور ہوا کا طوفان) تو (اسوقت) بجز خدا کے اور جنتوں کی تم عبادت کرتے تھے سب غائب ہو جاتے ہیں۔ طوفان کے وقت کا فر ملحد بھی خدا کا قائل ہو جاتا ہے۔ جہاز کے کپتان بھی کہنے لگتے ہیں کہ حاجی بابا خدا سے دعا کرو۔ واقعی خدا کا وجود ایسا فطری ہے کہ طوفان کے وقت اضطراری طور پر ملحد کو بھی اس کا قائل ہونا پڑتا ہے اور کافر مشرک موحد ہو جاتا ہے اس وقت سارے دیوتا اور مہادیو وغیرہ دل سے نکل جاتے ہیں اور خدا ہی خدا رہجاتا ہے اور مسلمانوں کو اس وقت توبہ و انابت الی اللہ نصیب ہو جاتی ہے۔ ہر شخص گناہوں سے استغفار کرنے لگتا اور آئندہ کے لئے متقی بننے کا قصد کر لیتا ہے آگے فرماتے ہیں پھر جب تم کو خشکی کی طرف بچا لاتا ہے تو تم پھر خدا سے پھر جاتے ہو بس جہاں جہاز سے کنارہ پر اترے پھر بدستور سابق وہی حالت ہو جاتی ہے۔ مشرک شرک میں مبتلا ہو جاتا ہے اور ملحد خدا کا منکر ہو جاتا اور مسلمان گناہوں کا ارتکاب کرنے لگتا ہے حق تعالیٰ اس کی شکایت فرماتے ہیں۔ وکان الانسان کفورا کہ واقعی انسان ہے

بڑا ناشکرا ہے کہ ایسی جلدی منعم کا انعام اور اپنا عجز و نیاز سب بھولجاتا ہے یہی ہے ماضی سے غفلت کہ ایک مصیبت سے بچنے کے بعد انسان یہ سمجھ لیتا ہے کہ بس اب میں ہمیشہ کو بچگیا۔ دریا ہی تک مصیبت تھی۔ اب گھر پہونچکر سلامتی ہی سلامتی ہے۔ حق تعالیٰ آگے اس خیال کی غلطی ظاہر فرماتے ہیں۔ افامنتم ان یخسف بکم جانب البر او یرسل علیکم حاصبا ثم لا تجدوا لکم وکیلا ۝ (یعنی دریا سے نکلکر) کیا تم اس بات سے بھی بے فکر ہوبیٹھے ہو کہ اللہ تعالےٰ تم کو خشکی کی جانب میں لاکر زمین میں دھنسادے یا کوئی تند ہوا تم پر بھیجدے پھر تم کسی کو اپنا کارساز نہ پاؤ۔ چنانچہ قارون کو خشکی ہی میں دھنسایا گیا تھا اور اب بھی ایسے واقعات ہوجاتے ہیں کہیں زلزلہ سے آدمی زمین میں دھنس گئے کہیں بلیں نکل گئیں کہیں گھر کی دیواریں گر پڑیں اور دبکر مرگئے بعض دفعہ ایسی سخت ہوا آئی جس سے درخت اکھڑ گئے آدمی تلف ہوگئے کبھی ندی اور نالے چڑھ گئے جیسے خشکی ہی میں طوفان آگیا ہو چنانچہ ابھی ایسے واقعات ہوچکے ہیں۔ گنگا اور جمنا کے طوفان سے ہزاروں گانوں تباہ و برباد اور سیکڑوں جانیں تلف ہوگئیں پھر کس بات سے بے فکری ہے ارے جو خدا سمندر میں ڈبو سکتا ہے وہ ہر جگہ تم کو ہلاک کرسکتا ہے آگے بڑے مزے کی بات فرماتے ہیں۔ امنتم ان یعیدکم فیہ تارۃ اخری فیرسل علیکم قاصفا من الریح فیغرقکم بما کفرتم ثم لا تجدوا لکم علینا بہ تبیعا۔ یا تم اس سے بے فکر ہوگئے ہو کہ خدا تعالیٰ پھر تم کو دریا ہی میں دوبارہ لیجاوے (جس کا مزہ ایک بار چکھ چکے ہو اور یہ کچھ دشوار نہیں کیونکہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کوئی ضروری کام ایسا نکال دیں جسکی وجہ سے دریا کا سفر پھر کرنا پڑ جاوے انسان کے ارادہ کا بدلنا خدا کو کیا مشکل ہے رات دن مشاہدہ ہوتا ہے کہ آج ہم ایک قصد کرتے ہیں اور پھر اسکے خلاف کرنا پڑتا ہے میں خود اپنی حالت کہتا ہوں کہ ابھی قریب زمانہ میں جب ریلوں کے بند ہونے کا قصہ میں نے سنا تو یہ قصد کرلیا تھا کہ اس سال کہیں سفر نہ کروں گا مگر جناب پھر جانا ہی پڑا اور اسی حال میں جانا پڑا کہ ابھی تک بعض اطراف کی ریلیں رکی ہوئی تھیں صورت ہی ایسی پیش آئی کہ میں رک نہ سکا وہ یہ کہ الہ آباد میں میرے ایک دوست سخت بیمار تھے ان کے بچنے کی امید نہ رہی تھی

انھوں نے ایک صاحب کو یہاں بھیجا اور ان کی زبانی یہ پیام دیا کہ میری حالت نازک ہے اور تجھ سے ملنے کو جی بے اختیار چاہتا ہے جس طرح جانو فوراً چلے آؤ نہ معلوم پھر ملنا ہو یا نہ ہو قاصد نے ان کا اشتیاق کچھ اس طرح ظاہر کیا کہ مجھ سے نہ رہا گیا اور سفر کرنا ہی پڑا پھر خدا نے ایسا کیا کہ میں نے جاکر مریض زندہ ہی پایا اور مجھ سے مل کر ان کو بہت ہی خوشی ہوئی یہاں تک کہ طبیب نے بھی یہ کہدیا کہ ان کا آدھا مرض جاتا رہا (پھر واپسی کے چند روز بعد بیچارہ کا انتقال ہوگیا۔ خدا تعالیٰ مغفرت فرمائے اور ان کو اپنی رحمت سے نوازے آمین ۱۲) اور میں اس کو رحمت سمجھتا ہوں کہ حق تعالیٰ ہمارے ارادے توڑتے رہتے ہیں۔ جس سے بار بار اپنا عجز اور ضعف مشاہد ہوتا رہتا ہے اسی لئے ایک بزرگ فرماتے ہیں۔ عرفت ربی بفسخ العزائم۔ کہ میں نے اپنے خدا کو ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا کہ ہم لاکھ ارادے کرتے ہیں اور پختہ قصد کرتے ہیں مگر ایک قدرت ہے جو ان کو توڑ دیتی ہے۔ واقعی وجود صانع کے لئے یہ کافی دلیل ہے مگر انسان ایسا غافل ہے کہ پہلی حالت کو بہت جلد بھول جاتا ہے۔ چنانچہ میں اپنی ہی کہتا ہوں کہ ایک بار فسخ ارادہ کا نمونہ دیکھ چکا ہوں۔ مگر سفر سے واپس آکر پھر بھی قصد کر لیا ہے کہ اب نجاؤں گا استغفر اللہ بلکہ یہ خیال ہے کہ اگر مجبوری پیش نہ آئی تو نجاؤں گا اور جو مجبوری پیش آئی تو میں سمجھوں گا کہ اب خدا تعالیٰ ہی کو سفر منظور ہے اُس وقت ضرور جاؤں گا بلکہ اب تو میں ارادہ کرنے سے بھی ڈرتا ہوں بس خدا کے سپرد کر دیا ہے کہ وہ جیسے چاہیں تصرف فرمائیں۔ بندہ کا کام تفویض ہی ہے اور اسی میں راحت ہے۔ غرض حق تعالیٰ کو یہ کیا دشوار ہے کہ تم کو پھر دریا ہی میں بھیجدیں اور پہلے کی طرح پھر ہوا کا طوفان آجائے جو غرق ہی کرکے چھوڑے۔ بس یہ نادانی ہے کہ انسان ایک بلا کے ٹلنے سے بے فکر ہو جائے۔ مگر کچھ غفلت کا پردہ ایسا پڑا ہوا ہے کہ ماضی کو انسان بہت جلد بھول جاتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ بس وہ تو رفت و گذشت ہوا۔ اُسی لئے محاورہ میں کہا کرتے ہیں کہ الماضی لا یذکر حق تعالیٰ اس پر بھی قادر ہیں کہ حالت ماضہ کو پھر لوٹا دیں اور ان کو ترکیب کی بھی ضرورت نہیں جس میں کچھ دیر لگے ترکیب کی ضرورت

تو اس کو ہو جسے قدرت نہو وہ تو پورے قادر ہیں جب چاہیں پہلی ہی سی حالت کر دیں مگر آدمی اپنی غفلت سے ایسا بے فکر ہو جاتا ہے کہ گویا خدا کو ماضی پر قدرت ہی نہیں رہی (نعوذ باللہ منہ) لیکن اگر نسیان ماضی کے ساتھ انسان کو اپنے مستقبل کا ہی خیال رہے تو بھی اتنی غفلت نہ ہو مگر یہ تو ماضی اور مستقبل دونوں سے آنکھیں بند کر کے عبدالحال ہو گیا ہے پھر مستقبل میں بھی صرف موت کا خیال کافی نہیں کیونکہ اس کے قائل تو دھری اور مشرک بھی ہیں۔ مگر اس سے تو اُن کو کچھ نفع نہیں ہوا کیونکہ وہ موت کے بعد حیات ثانیہ کے قائل نہیں بس یوں سمجھتے ہیں کہ مر کر مٹی میں مل جائیں گے پھر نہ ثواب ہے نہ عذاب تو اس حالت میں خیال موت سے کیا نفع ہو سکتا ہے اسی لئے حق تعالیٰ نے مبدأ اور معاد اول کے بعد معاد ثانی کو یاد دلایا ہے چنانچہ "منہا خلقناکم" میں مبدأ کا ذکر ہے اور "فیہا نعیدکم" میں معاد اوّل کا اور "منہا نخرجکم تارہ اخری" میں معاد ثانی کا اور تینوں کو اس لئے جمع فرمایا کہ ملحدین تو مبدأ کا یعنی خدا کے خالق ہونے ہی کا انکار کرتے تھے۔ ان کے نزدیک تو موت وحیات کا مدار زمانہ کی گردش پر ہے چنانچہ قرآن میں بھی دہریوں کا یہ خیال نقل کیا گیا ہے مگر وہ یوں کہتے ہیں "وما یہلکنا الا الدہر" کہ ہم کو تو زمانہ کی گردش ہلاک کرتی ہے۔ سو مبدأ کا ذکر تو اس لئے فرمایا کہ ان کی اصلاح ہو اگرچہ یہ ضروری ہے کہ قرآن میں دہریوں سے تو زیادہ تعرض نہیں کیا گیا کیونکہ مخاطبین اس خیال کے بہت کم لوگ تھے زیادہ تر مشرکین ہی تھے۔ اور مشرکین خدا کے قائل ہیں مگر حیات ثانیہ کے قائل نہیں وہ موت وحیات میں خدا کا دخل تو مانتے ہیں مگر مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کے قائل نہ تھے اور اس کو مستبعد و محال سمجھتے تھے معاد ثانی کا اس لئے ذکر فرمایا اور اس مقام کے علاوہ بھی حق تعالیٰ نے قرآن میں جا بجا ان کے استبعاد کا جواب دیا ہے اور بہت اہتمام سے معاد ثانی کو ثابت فرمایا ہے چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے "وہو اہون علیہ" کہ معاد ثانی خدا تعالیٰ کو پہلی بار زندہ کرنے سے زیادہ آسان ہے کیونکہ پہلے تو یہ اجسام بقابلیت قریبہ قابل حیات نہ تھے اور اب تو ان میں حیات کی قابلیت قریبہ ہو گئی ہے کیونکہ زمانہ دراز تک اس سے تلبس ہو چکا ہے۔ پس دوبارہ زندہ کر دینا پہلی بار زندہ کرنے سے زیادہ

عجیب نہیں بلکہ اگر غور سے کام لیا جائے تو انسان کی حیات اولیٰ ایسی عجیب ہے کہ اگر ہر روز اُس کا مشاہدہ نہ ہوا کرتا تو لوگ اس کو نہایت مستبعد سمجھتے واقعی انسان کی پیدائش کا جو طریقہ رکھا گیا ہے وہ ایسا عجیب غریب ہے کہ اگر کسی حکیم اور فلسفی دماغ والے کو بچپن سے کسی تہ خانہ میں بند رکھا جائے اور وہاں اُس کو ہر قسم کے علوم و فنون میں ماہر کر دیا جائے مگر یہ مسئلہ نہ پڑھایا جائے کہ انسان کیونکر پیدا ہوتا ہے نہ کوئی اُس سے یہ تذکرہ کرے نہ وہ آنکھ سے اس منظر کو دیکھنے پائے پھر وہ جب تمام علوم و فنون میں کامل و ماہر ہو جائے اس وقت اُس سے کہا جائے کہ خبر بھی ہے کہ تم کس طرح پیدا ہوئے تھے پھر اُس کے سامنے یہ صورت پیدائش بیان کی جاوے کہ تم پہلے نطفہ کی شکل میں باپ کی پشت کے اندر تھے پھر وہ اس طرح تمہاری ماں سے ملا اور وہ نطفہ مائیہ رحم مادر میں پہونچا جہاں علقہ اور مضغہ بنا پھر اُس کے اندر جان پڑی اور خون حیض سے پرورش پاتا رہا پھر نو ماہ کے بعد جیتا جاگتا ماں کے پیٹ سے نکلا پھر خدا نے خون کو بشکل دودھ ماں کے پستان میں پہونچا دیا وہ تم کو پلایا گیا۔ دو سال تک تم کو دودھ سے غذا دی گئی پھر دودھ چھوڑا کر تدریجاً روٹی کا عادی کیا گیا اس طرح بڑھتے بڑھتے تم جوانی کے قریب پہونچے اس وقت تم کو خدا نے ایسی عقل دی جو پہلے نہ تھی واللہ وہ فلسفی اور حکیم اس صورت کو سنکر فوراً رد کر دیگا اور قسمیں کھائیگا کہ ایسا ہو نہیں سکتا بھلا چند قطرات مائیہ سے کہیں ایسا جسم بن سکتا ہے جس میں گوشت پوست ہڈیاں اور آنکھیں اور حواس ظاہرہ و حواس باطنہ ایسے ایسے موجود ہیں نیز جان پڑ جانے کے بعد ایک ذی روح کا پیٹ کے اندر پرورش پانا کیونکر ممکن ہے جہاں نہ ہوا کا گذر ہے نہ ایسی جگہ ہے جو حفظ صحت کے لئے کافی ہو ذی روح کا رحم مادر میں زندہ رہنا محالات سے ہے۔ حضرت میں سچ کہتا ہوں کہ اگر ہم لوگوں نے پیدائش کا طریقہ جانوروں میں اور بعض انسانوں میں دیکھا نہ ہوتا تو محض سنکر ہرگز یقین نہ آتا سو حیات اولیٰ اس قدر عجیب ہے بخلاف حیات ثانیہ کے کہ وہ اس قدر مستبعد نہیں کیونکہ آج کل بعض ڈاکٹروں نے تحقیق کیا ہے کہ موت کے بعد کچھ دیر تک جسم میں حیات کا اثر باقی رہتا ہے اور اس مدت کے اندر اندر کوئی مقوی دوا مردہ کے جسم میں داخل کر دی جائے

توحیات کا اثر پیدا ہو جاتا اور مردہ کو حرکت ہونے لگتی ہے۔ اور بعض دفعہ ایک دو گھنٹہ کے لئے وہ بات چیت بھی کر سکتا ہے۔ چنانچہ بعض مقامات پر ڈاکٹروں کو کامیابی بھی ہوئی ہے تو وہ تہ خانہ والا حکیم اس پر زیادہ حیرت نہ کریگا اور نہ ہم اور آپ اس پر حیرت کرتے ہیں۔ یہ تحقیق عجیب ضروری مگر ایسی موجب حیرت و استبعاد نہیں۔ جیسی حیات اولے ہے اب تو آپ کو مشاہدہ ہو گیا "ہوا ہون علیہ" کا کیونکہ جب ڈاکٹروں کو جن کی قدرت و حکمت خدا تعالیٰ کی قدرت و حکمت کے سامنے کچھ بھی نہیں اس میں کامیابی ہو گئی کہ جس انسان کو عام طور پر سب لوگ مردہ سمجھ چکے تھے وہ خاص میعاد کے اندر مقوی دوا سے اُس کو مثل زندہ کے کر دیتے ہیں تو حق تعالیٰ اگر ہزار دو ہزار برس کے بعد زندہ کر دیں تو کیا عجیب ہے۔ ممکن ہے کہ ڈاکٹروں کو جتنی دیر تک جسم میں اثر حیات کا ہونا معلوم ہوا ہے اُس کے بعد بھی حیات کا اثر جسم میں رہتا ہو مگر وہ نہایت ضعیف و قلیل اثر ہو جو آلات سے مدرک نہیں ہو سکتا پس حق تعالیٰ اُسی ضعیف اثر کو کسی بے حد مقوی شے سے بڑھا دیں اور مردہ ہزاروں برس کے بعد زندہ ہو جائے تو کیا عجب ہے۔ اور یہ بھی تقریب الی الفہم کے لئے کہہ دیا گیا ورنہ خدا تعالیٰ کو ان ترکیبوں کی کیا ضرورت ہے ان کا تو حکم دینا اور ارادہ کرنا ہی کافی ہے بہر حال حق تعالیٰ نے معاد ثانی کے بیان میں بہت اہتمام فرمایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف موت کا علم اصلاح حال کے لئے کافی نہیں بلکہ اسکے لئے علم معاد ثانی کی بھی ضرورت ہے۔ اور انسان کی غفلت کی وجہ یہی ہے کہ وہ اس سے غافل ہے اگر اس کا استحضار ہو تو غفلت نہ رہے ہم گو اعتقاداً معاد کے قائل ہیں مگر پھر غفلت اس لئے ہے کہ ہم کو معاد کا استحضار نہیں کسی وقت اس کو سوچتے نہیں بلکہ اگر کبھی خود بخود اس کی طرف خیال چلا بھی جاتا ہے تو جلدی سے دھکے دیدیتے ہیں اسکے خیال سے بھاگتے اور گھبراتے ہیں۔ اور ہر چند کہ پوری اصلاح تو حیات ثانیہ ہی کے استحضار سے ہوتی ہے لیکن اگر انسان معاد اول (یعنی موت) کو بھی یاد رکھے تو زیادہ غافل نہیں ہو سکتا بلکہ کچھ نہ کچھ اصلاح ضرور ہو جائے کیونکہ جس گھر سے نکلنا اور جاتا مقصد ہو اس میں دل نہیں لگ سکتا۔ دیکھو ملازمت کی حالت میں پردیس میں آدمی کرایہ پر

مکان لیکر رہتا ہے تو اُس مکان سے اس کو زیادہ دلبستگی نہیں ہوتی بس بقدر ضرورت اس کی مرمت کر لیتا ہے مگر یہ نہیں ہوتا کہ سارا سرمایہ اُسی کی زینت و آرائش میں لگا دے کیونکہ ایک دن اُس سے نکلنے کا ہر وقت خیال لگا ہوا ہے کہ نہ معلوم کس وقت تبدیلی کا حکم ہو جائے اور اس کو چھوڑ کر کہیں اور جانا پڑے تو خواہ مخواہ اس کے اندر ساری رقم کیوں لگائیے۔ ہاں ملازمت کے وقت اپنے وطن کے مکان کا ضرور خیال رہتا ہے اس کی مرمت و استحکام کے لئے ہر سال روپیہ صرف کرتے ہیں اور تعطیل میں آکر اس کی تعمیر شروع کرتے ہیں۔ اب اگر کسی شخص کو ہر دم موت کا دھیان رہے کہ ایک دن وطن کا گھر بھی ہم سے چھوٹنے والا ہے۔ تو یقیناً وہ اس گھر سے بھی زیادہ دل نہ لگائے گا اور یہ بھی انسان کی اصلاح کے لئے کافی ہے کیونکہ اصل ضرر دنیا سے دل لگانے کا ہے طبعی طور پر احتیاج کے سبب اس کی طرف میلان میں چنداں ضرر نہیں چنانچہ حیات دنیا سے اس درجہ میں خوش ہونے پر حق تعالیٰ نے ملامت نہیں کی بلکہ اس پر مطمئن ہونے اور دل لگانے پر ملامت فرمائی ہے اسی لئے ایک مقام پر کفار کے بارہ میں فرماتے ہیں "ان الذین لا یرجون لقاءنا ورضوا بالحیوٰۃ الدنیا واطمأنوا بہا والذین ہم عن آیاتنا غٰفلون" کہ وہ لوگ حیات دنیا سے راضی اور اُسی کے ساتھ مطمئن ہیں تو یہاں حق تعالیٰ نے "رضوا بالحیوٰۃ الدنیا" پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ "واطمأنوا بہا" بھی فرمایا معلوم ہوا کہ صرف رضا بالحیوٰۃ سبب غفلت نہیں بلکہ اس سے دلبستگی ہو جانا سبب غفلت ہے نیز سورہ توبہ کی آیت میں ارشاد ہے "مساکن ترضونہا احب الیکم" جس میں صاف دلالت ہے کہ مساکن مرضی ہونا مذموم نہیں اس کی احبیت مذموم ہے چنانچہ اس کی تفصیل عنقریب آتی ہے پس موت کے استحضار سے گو "رضا بالحیوٰۃ" کا ازالہ نہو مگر اطمینان و دلبستگی تو ضرور زائل ہو جاتی اور جب زندگی سے دلبستگی نہ رہے گی تو کسی وقت تو غفلت میں کمی آئے گی یہ نہیں ہو سکتا کہ موت کا دھیان رہتے ہوئے آدمی بالکل ہی غافل رہے اور اتنا بھی اصلاح کے لئے کافی ہے۔ صاحبو! اس پر ملامت نہیں ہے کہ ہم کو بیوی بچوں سے یا اپنے گھر سے محبت کیوں ہے اسکا تو مضائقہ نہیں میں آپ سے بیوی بچوں کو اور گھر بار کو نہیں چھڑاتا بلکہ ملامت اس پر ہے

کہ ہم کو انسی سے ساری محبت کیوں ہے خدا کے ساتھ تعلق کیوں نہیں دیکھئے حق تعالیٰ ایک مقام پر فرماتے ہیں "قل ان کان آباءکم وابناءکم وازواجکم وعشیرتکم واموال اقترفتموہا و تجارۃ تخشون کسادہا ومساکن ترضونہا احب الیکم من اللہ ورسولہ وجہاد فی سبیلہ فتربصوا حتی یأتی اللہ بامرہ" فرما دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بیویاں اور برادری اور وہ مال جنکو تم نے کمایا ہے اور وہ تجارت جس کے مندا پڑ جانیکا تم کو خطرہ رہتا ہے اور وہ گھر جن کو پسند کرتے ہیں تمکو اللہ اور رسول سے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا کوئی حکم (تمہاری سزا کے متعلق) بھیجیں اور اسمیں بیوی بچوں اور مال و دولت کی مطلق محبت پر وعید نہیں فرمائی بلکہ احبیت پر وعید ہے کہ یہ چیزیں اللہ اور رسول سے زیادہ محبوب نہ ہونی چاہئیں اور ان کی محبت اللہ اور رسول کی اطاعت سے مانع نہ ہونا چاہیئے۔ چنانچہ "مساکن ترضونہا" فرمانے کے بعد "احب الیکم من اللہ ورسولہ" فرمانا اس کا صریح قرینہ ہے جس سے معلوم ہوا کہ رضا بالمسکن پر وعید نہیں بلکہ اسکے بعد احبیت من اللہ ورسولہ پر ملامت ہے جیسا کہ اوپر والی آیت میں "رضا بالحیوٰۃ الدنیا" پر وعید نہ تھی بلکہ اطمینان و دلبستگی پر وعید تھی اور اس اطمینان و احبیت کا منشا وہی موت سے غفلت ہے۔ اگر موت کا خیال رہے تو ان چیزوں کے ساتھ اطمینان اور دلبستگی اور احبیت کا درجہ تو ہرگز نہ پیدا ہوگا اسی لئے اہل طریق فرماتے ہیں کہ معاد اول کا حاضر فی الذہن ہونا بھی دنیا سے دل برداشتہ ہو جانے اور کسی قدر اصلاح پر متوجہ کر دینے کے لئے کافی ہے مگر ستم یہ ہے کہ انسان اس سے بھی غافل ہے اور موت کے ساتھ مابعد الموت یعنی قیامت کا استحضار بھی ہو اور دوبارہ زندہ ہونے اور ثواب و عذاب اور حساب و کتاب ہونے کا بھی خیال ہو پھر تو کیا کہنا ورنہ کم از کم موت کا دھیان تو ضرور ہونا چاہئے جس سے کوئی ملحد یا دھری اور مشرک بھی انکار نہیں کر سکتا اسی لئے حق تعالیٰ نے موت کو یقین سے تعبیر فرمایا ہے "واعبد ربک حتی یاتیک الیقین" واقعی یہ ایسی یقینی ہے کہ اس کا کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا پس لذات کو مکدر کرنے اور غفلت کو کم کرنے کے لئے اسی کا استحضار بہت ہے اور اس کے استحضار میں کچھ دشواری بھی نہیں کیونکہ اس کا وقوع یقینی اور مشاہد ہے

اور اُس وقت کی بے بسی اور بے کسی کی حالت بہت دفعہ آنکھوں کے سامنے سے گذرتی رہتی ہے تو اس کا سوچنا بہت آسان ہے۔ کہ جس طرح دوسرا شخص مرکر بیکس و بے بس ہوگیا اور اُس کا سارا مال و دولت دھرا رہ گیا۔ اور بیوی بچے جائداد و مکانات سب اُس سے چھوٹ گئے اسی طرح ایک دن ہمکو بھی یہ سانحہ پیش آئیگا اور یہ خیال ایسا نہیں جو انسان کو بے فکر بیٹھنے دے دیکھئے فلاسفۂ یونان معاد ثانی کے قائل نہ تھے اور جس معاد کا برائے نام اُن کو اعتقاد تھا وہ کالعدم ہے کیونکہ ان کی معاد کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص علوم حقہ کو حاصل کرلے اور وہ علوم کیا ہیں محض یہ ہیں کہ افلاک نو ہیں اور وہ کردی ہیں اور انمیں ترتیب یہ ہے کہ سب کُرات میں اسفل کرۂ ارض ہے اُس کے اوپر کرۂ ماء اُس کے اوپر کرۂ ہوا پھر کرۂ نار ہے اور ان سب کو نو افلاک محیط ہیں جو ہر وقت متحرک ہیں پس جس کو یہ ترتیب عالم صحیح معلوم ہوا اور اخلاق اچھے ہوں اس کے دلکو مرنے کے بعد راحت ہوگی۔ یہ تو جنت ہے اور جس کو اس ترتیب سے جہل ہوا اور اخلاق بُرے ہوں اس کو اپنے اس اصل سے مرنے کے بعد تکلیف ہوگی یہ دوزخ ہے۔ سبحان اللہ علوم کیا عالی ہیں۔ جن کے جاننے اور نہ جاننے پر مدار راحت والم کا رکھا ہے بس وہی مثال ہے ؎

چو آں کرمیکہ در سنگے نہان است زمین و آسمان وے ہمان است

جو کیڑا ابھی تک پتھر کے اندر ہوا اس کا تو وہی آسمان ہے اور وہی زمین جیسے ماں کے پیٹ میں جب بچہ ہوتا ہے تو اسی کو بڑا مکان سمجھتا ہے اور وہاں سے دنیا میں آتے ہوئے روتا ہے یہی حال اُن فلاسفہ کے علوم کا ہے کہ بس ان کے یہاں ترتیب عالم کے جان لینے پر راحت کی انتہا اور اُس کے نہ جاننے پر الم کا مدار ہے نہ کمالات حقیقیہ سے بحث ہے نہ علوم مقصودہ سے اس حقیقت معاد پر خود حکماء ہی کی جماعت نے یہ اعتراض کیا ہے کہ وہاں تو سب کو حقیقت منکشف ہوجائیگی مرنے کے بعد تو کوئی بھی جاہل نہ رہیگا پھر صاحب جہل کو رنج و تکلیف کیوں ہوگی اس کا کچھ جواب نہیں دیا جاسکا غرض بایں ہمہ کہ یہ لوگ معاد ثانی کے صحیح طور پر قائل نہ تھے اور جس معاد کے قائل تھے وہ محض مہمل تھی مگر موت کے قائل تھے اور تھے عاقل تو اُسی کے استحضار سے اُن کی یہ حالت تھی کہ حکماء کے ایسے ایسے

واقعات منقول ہیں جیسے ہمارے اہل اللہ کے چنانچہ یہ لوگ خلوت نشین عزلت گزین ہوتے تھے۔ ریاضات اور مجاہدات بہت کرتے تھے۔ لذات دنیا و سامان عیش و عشرت سے بہت بچتے تھے۔ یہ آج کل ہی کی نئی حکمت ہے جس میں خلوت نشینی پر اعتراض کیا جاتا ہے اسکا نام حکمت نہیں بلکہ حکومت ہے آج کل ساری حکمت کا خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح ہو تمام دنیا کو مسخر کر لیا جائے چنانچہ بعضے کرۂ مریخ تک پہونچنے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ وہاں کی مخلوق کو بھی مسخر کیا جائے اور جس قدر ترقی صنعتوں میں ہو رہی ہے سب کا یہی خلاصہ ہے بس مادہ پرستی غالب ہے روحانیت کا پتہ بھی نہیں تو اس کو حکمت کہنا حکمت کے نام کو بدنام کرتا ہے۔ جس کو حکمت و دانائی سے ذرا بھی مس ہوگا وہ موت کا خیال کر کے دنیا سے ضرور دل برداشتہ ہوگا اور ترقی روحانیت کا ساعی ہوگا چنانچہ حکماء یونان کو گو صحیح حکمت تو حاصل نہ تھی مگر خیر وہ آجکل کی جدید حکمت سے بدرجہا اچھی تھی اُس کا یہ اثر تھا کہ وہ لوگ تزکیہ روح اور صفائی نفس کی بہت کوشش کرتے تھے۔ اسکے لئے خلوت نشینی اختیار کرتے تھے دنیا سے ان کا دل بجھ گیا تھا لذات کو ترک کرتے تھے افلاطون کی حکایت ہے کہ سالہا سال ایک پہاڑ پر رہا کرتا تھا کسی سے ملتا نہ تھا خدمت کے لئے صرف ایک شاگرد پاس رہتا تھا۔ جب کوئی افلاطون سے ملنا چاہتا تو اُسی شاگرد کو حکم دیتا کہ اس شخص کی تصویر ہمارے سامنے پیش کرو ظالم کو علم قیافہ ایسا صحیح حاصل تھا کہ تصویر سے پہچان لیتا تھا کہ اس شخص کے اخلاق و عادات کیسے ہیں یہ ملنے کے قابل ہے یا نہیں اگر ملنے کے لائق ہوتا تھا تو اندر آنے کی اجازت دیتا ورنہ صاف کہدیتا کہ تم ملنے کے قابل نہیں ہو۔ چاہے کوئی بادشاہ ہوتا یا وزیر مالدار ہوتا یا رئیس کسی کی پروانہ کرتا تھا حکماء کے استغنا کے واقعات بکثرت ویسے ہی ہیں جیسے ہمارے اہل اللہ کے ہیں حتی کہ اگر وہ واقعات لکھکر نام نہ ظاہر کیا جائے تو دیکھنے والے یہی سمجھیں گے کہ یہ کسی ولی اللہ اور بڑے بزرگ کے واقعات ہیں تو بات کیا تھی کہ موت کے خیال نے ان عقلاء کے دل کو دنیا سے سرد کر دیا تھا دنیا کی طمع و حرص اُن کے دل میں نہ رہی تھی اسی کا یہ اثر تھا کہ اہل دنیا سے اُن کو پورا استغنا تھا وہ کسی کی بھی پروانہ کرتے تھے صاحبو!

قاعدہ یہی ہے کہ جب دنیا سے دل خالی ہو جاتا ہے تو پھر آخرت ہی ذہن میں آئے گی کیونکہ دل کا بالکل خالی رہنا تو ممکن نہیں کچھ نہ کچھ اس میں ضرور رہے گا تو موت کے استحضار سے جب دنیا قلب سے نکل جائیگی تو آخرت کا خیال ضرور پیدا ہوگا۔ اس لئے اہل طریق کا قول صحیح ہے کہ فی الجملہ اصلاح کے لئے استحضار معاد اوّل بھی کافی ہے۔ اس پر شاید کسی کو یہ سوال ہو کہ حکماء یونان کے دل سے تو دنیا بالکل گئی تھی پھر اُن کے ذہن میں آخرت کیوں نہ آئی اس کا جواب یہ ہے کہ آئی تھی مگر ناتمام کیونکہ عقل صرف سے تو آخرت کا علم ناقص ہی ہو سکتا ہے بس جو ٹوٹی پھوٹی معاد عقل سے معلوم ہو گئی تھی اسی پر جمے رہے علم تام و صحیح کے لئے انبیا کے اتباع کی ضرورت تھی اور ان لوگوں نے انبیا علیہم السلام کا اتباع نہیں کیا گو تکذیب بھی نہیں کی بلکہ یہ کہتے تھے کہ "نحن قوم قد ہذبنا نفوسنا فلا حاجۃ لنا الی نبی یہذبنا" (یعنی ہم لوگ اپنے نفوس کو مہذب بنا چکے ہیں اس لئے ہم کو کسی مہذب بنانے والے کی ضرورت نہیں، ان لوگوں نے انبیا کو محض جہلا کے واسطے مانا تھا جیسا کہ یہود نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں کہا تھا کہ آپ نبی تو ہیں مگر امیین کے نبی ہیں (یعنی جہلاء عرب کے) ہمارے واسطے نبی نہیں ہیں ہم تو خود صاحب کتاب ہیں ہم کو نبی کی کیا ضرورت ہے ہمارے علماء نے اسکا خوب جواب دیا ہے کہ تم کو یہ تو تسلیم ہے کہ آپ نبی ہیں اور نبی سے صدور کذب محال ہے تو اب چلکر خود اُس نبی ہی سے پوچھ لو نا کہ آپ فقط امیوں کے واسطے مبعوث ہوئے ہیں یا تمام عالم کے واسطے پس جو وہ فرماویں اُسی پر فیصلہ ہے اس کا جواب یہود کے پاس کچھ نہیں تو ایسے ہی بعض حکماء نے انبیاء علیہم السلام سے ملاقات کی ہے اور چونکہ عاقل تھے اس لئے تکذیب نہیں کی بلکہ ان کی نبوت کو تسلیم کیا چنانچہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ افلاطون نے موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ پایا ہے اور وہ آپ سے ملا بھی ہے اور کچھ سوالات بھی کئے ہیں منجملہ ان کے ایک سوال یہ مشہور ہے کہ بتلایئے کہ اگر اللہ تعالیٰ تیر انداز ہوں اور فلک کمان ہو اور حوادث تیر ہوں تو ان سے بچکر کہاں جائے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تیر انداز کے پاس جا کھڑا ہو کیونکہ تیر اُسی کے لگتا ہے جو تیر انداز سے دور ہو اور جو اس کے پہلو میں کھڑا ہو اُس کے نہیں لگ سکتا

اس جواب پر فلاطون حیران ہوگیا اور کہنے لگا کہ یہ جواب نبی کے سوا کوئی نہیں دیسکتا میں تصدیق کرتا ہوں کہ آپ بیشک نبی ہیں۔ مگر عوام کے واسطے ہمارے واسطے نہیں۔ کیونکہ ہمنے تو اخلاق و علوم سے اپنے کو مہذب بنا لیا ہے اب ہم کو اس سے زیادہ تہذیب کی ضرورت نہیں ہاں ان لوگوں نے انبیاء کی تہذیب کو دیکھا نہیں ورنہ معلوم ہوجاتا کہ جسکو ہم تہذیب سمجھے ہوئے ہیں وہ محض تعذیب ہے اور اصل تہذیب انبیاء ہی کے پاس ہے نیز انھوں نے انبیاء کے علوم کو حاصل ہی نہیں کیا ہے ورنہ معلوم ہو جاتا کہ جن علوم پر ہم نازاں ہیں ان پر ناز کرنے کی حقیقت یہ ہے ؎

چو آں کرمیکہ در سنگے نہان است زمین و آسمان وے ہمان است

ایسے لوگوں کے بارے میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں "فرحوا بما عندہم من العلم" کہ جو ذرا سا علم انکے پاس ہے اسی پر اتراتے ہیں قاضی ثناء اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر مظہری میں لکھا ہے کہ اس کے عموم میں حکماء بھی داخل ہیں۔ بہرحال معلوم ہوگیا کہ حکماء کے دل سے بھی جب دنیا نکل گئی تھی تو آخرت ہی اُن کے ذہن میں آئی تھی مگر جیسی ٹوٹی پھوٹی حقیقت اُن کے پاس تھی ویسی ہی آئی اور ہم چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام ہیں تو ہمارے ذہن سے جب دنیا نکلے گی پھر آخرت کما حقہ صحیح طور پر ہمارے ذہن میں آئے گی کیونکہ حضور کی برکت سے آخرت کی صحیح اور تمام حالت ہم کو معلوم ہوچکی ہے غرض نسخے متعدد ہیں چاہے معاد ثانی کا استحضار کرو یا معاد اول کا کسی کا تو خیال کرو مگر افسوس ہم کسی نسخہ سے بھی کام نہیں لیتے۔ اور اگر کسی کو موت کا استحضار بھی اسوجہ سے دشوار معلوم ہوتا ہو کہ وہ مستقبل ہے ابھی تک اسکا وقت نہیں آیا اور معدوم کا تصور مشکل ہے تو میں آپ کو ایسے موجود کا تصور بتلاتا ہوں جس سے اس مستقبل کا تصور سہل ہوجاوے آپ اسی سے کام لیجئے وہ یہ کہ اہل تحقیق نے لکھا ہے کہ ہمارے اندر دو چیزیں ہیں ایک جسم ایک روح ان میں سے ایک سفلی ہے ایک علوی ہے اور ہر ایک کا مبدأ و معاد الگ الگ ہے جسم تو سفلی ہے اور اس کا مبدأ و معاد تو زمین ہی ہے چنانچہ یہ آیت بھی جو کہ میں نے تلاوت کی ہے اس کی دلیل ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں "منہا خلقناکم و فیہا نعیدکم" اور روح علوی ہے۔ اس کا مبدأ و معاد آسمان ہے وہ آسمان ہی سے

آئی ہے اور مرنیکے بعد آسمان ہی پر چلی جاتی ہے۔ کیونکہ روح سے مراد روح انسانی ہے جس سے ادراک معقولات ہوتا ہے۔ روح طبی مراد نہیں جو کہ دم سے متولد ہے۔ روح انسانی کو سفلی کوئی نہیں کہتا سب نے علوی مانا ہے یہ الگ اختلاف ہے کہ وہ مجرد ہے یا مادی اگر مجرد ہے جیسا کہ حکماء نے بھی کہا ہے کیونکہ جس چیز کو وہ نفس ناطقہ کہتے ہیں وہی روح انسانی ہے اور نفس ناطقہ کو ان لوگوں نے بھی مادی نہیں مانا بلکہ مجرد کہا ہے اور یہی صوفیہ کی بھی تحقیق ہے کہ روح مجرد ہے تب تو علوی بایمعنی ہے کہ فوق الاحیاز ہے اور یہی محمل ہوگا صوفیہ کے نزدیک روح کے فی السماء ہونیکا جیسا کہ یہی محمل ہے علماء ظاہر کے نزدیک بھی احادیث کون اللہ فی السماء کا۔ اور اگر مادی ہے جیسا کہ متکلمین کا قول ہے کہ انھوں نے اُسے جسم مانا ہے مگر جسم علوی لطیف تب وہ علوی بایمعنی ہے کہ اُس کا جز عالی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ روح کے علوی ہونے پر سب کا اتفاق ہے اور ہم کو سب سے کیا لینا کوئی بھی نہ مانے تو کیا جب کہ قران وحدیث سے ثابت ہے کہ روح کا مبدأ و معاد آسمان ہے معاد ہونا تو صراحۃً اور مبدأ ہونا قیاساً چنانچہ حدیث میں روح کی حالت وارد ہے "حتی تخرج ثم یعرج الی السماء فیفتح لہا الی قولہ حتی تنتہی الی السماء التی فیہا" الحدیث (مشکوۃ عن ابن ماجہ) یعنی جب آدمی مرتا ہے تو فرشتے اُس کی روح کو آسمان پر لیجاتے ہیں اس سے یہ تو ظاہر ہے کہ روح کا معاد آسمان ہے اور مبدأ ہونا اس طرح معلوم ہوا کہ موت کے بعد جسم کے لئے دفن کا حکم دیا گیا ہے جس میں حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس کو اصل کی طرف لوٹا دینا مقصود ہے جب جسم کا مبدأ زمین تھی اور اوس کو جسم کا معاد بنایا گیا اور روح کے لئے آسمان پر لیجانا بتلایا جس سے معلوم ہوا کہ آسمان معاد روح ہے اور یہ ابھی معلوم ہوچکا کہ معاد اسی کو بنایا ہے جو مبدأ تھا تو معلوم ہوا کہ آسمان ہی روح کا مبدأ بھی ہے پس جسم کا مبدأ و معاد تو زمین ہوئی اور روح کا مبدأ و معاد آسمان ہوا اور موت کے بعد روح کا آسمان کی طرف جانا جس طرح حدیث مذکور سے ثابت ہے اسی طرح قران سے بھی مفہوم ہوتا ہے چنانچہ کفار کے بارہ میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں "لا تفتح لہم ابواب السماء ولا یدخلون الجنۃ حتی یلج الجمل فی سم الخیاط" یعنی ارواح کفار کے لئے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے اس سے

معلوم ہوتا ہے کہ روحیں ان کی بھی آسمان پر جانا چاہتی ہیں مگر ان کو دھکے دیدئے جائیں گے پس یہ دعوی بھی ثابت ہو گیا کہ آسمان روح کا مبدا و معاد ہے اور آسمان و زمین دونوں اسوقت سامنے موجود ہیں تو ان کو اس نظر سے دیکھتے رہنا معاد مستقبل کے استحضار کو سہل کر دیتا ہے اور اب مناسبت مقام سے استطراداً ایک تو اسپر شیخ اکبر نے یہ تفریع کی ہے کہ عالم آخرت اسوقت موجود ہے تفصیل اس کی یہ ہے کہ عالم آخرت کے دو جزو ہیں ایک زمان آخرت جسمیں جزا سزا شروع ہو جاوے اور اعمال کا صلہ ملجاوے وہ تو بعد میں آئیگا اور ایک مکان آخرت وہ اس وقت بھی موجود ہے یعنی آسمان اور عالم بالا چنانچہ آسمان کا موجود ہونا تو مشاہد ہے اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت ساتویں آسمان پر ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ جنت موجود ہے تو معلوم ہوا کہ مکان آخرت اس وقت موجود ہے اس تحقیق سے بہت سے اشکالات سہولت کے ساتھ حل ہو گئے مثلاً ایک اشکال یہ ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شب معراج میں رویت حق کیونکر ہوئی جبکہ دنیا میں رویت حق محال عادی ہے۔ اس تحقیق کے بعد جواب آسان ہو گیا۔ کہ آپ کی رویت دنیا میں نہ تھی بلکہ عالم آخرت میں تھی کیونکہ مکان آخرت اب بھی موجود ہے اسپر شاید یہ اشکال ہو کہ گو آپ اسوقت مکان آخرت میں تھے مگر آپ کی حیات تو دنیوی تھی پھر حیات دنیویہ رویت کی کیسے متحمل ہوئی اس کا جواب یہ دیا جائیگا کہ جیسے زمان آخرت میں یہ خاصیت ہے کہ اس وقت متحمل رویت ہو جائیگا ایسے ہی مکان آخرت میں بھی یہ خاصیت ہے کہ جو وہاں پہنچ جائے اس میں متحمل رویت پیدا ہو جاتا ہے گو وہ حیات دنیویہ ہی سے متلبس ہو آخرت کے مکان و زمان دونوں کی خاصیت دنیا سے الگ ہے اور یہاں سے قادیانیوں کے بیہودہ تمسخر کا بھی جواب ہو گیا جو وہ اہل سنت کے اس عقیدہ پر کہ عیسے علیہ السلام آسمان پر زندہ موجود ہیں کیا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر وہ آسمان پر زندہ ہیں تو کھاتے کہاں سے ہیں اور بگڑے موتے کہاں ہیں اسی قسم کی بیہودہ باتیں بکتے رہتے ہیں جواب یہ ہے کہ عالم آخرت کی خاصیت سے دنیا کی خاصیت جدا ہے وہاں کھانا پانی ایسا ہضم ہو جاتا ہے کہ فضلہ بالکل نہیں رہتا جیسا کہ اہل جنت کے بارہ میں حدیث میں آیا ہے کہ وہ بگڑے موتنے سے پاک ہوں گے بس کھانا کھا کر ان کو مشک جیسا خوشبودار پسینہ آئے گا اور کچھ نہ ہوگا گویا فضلہ

اتنا کم ہوگا کہ پسینہ ہی کی راہ سے نکل جائیگا ایسے ہی عیسیٰ علیہ السلام کو صرف پسینہ آجاتا ہوگا اور کچھ ضرورت نہ ہوتی ہوگی رہا یہ کہ کھانے کہاں سے ہیں اسکا جواب ظاہر ہے کہ جنت آسمان ہی پر ہے ممکن ہے کہ وہاں سے فرشتہ کے ذریعہ سے ان کے لئے غذا پہونچتی ہو اور یہ بھی تو ممکن ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو بھوک پیاس ہی نہ لگتی ہو خدا تعالیٰ بدون غذا کے بھی تو زندہ رکھ سکتے ہیں کیونکہ جس نے غذا میں قوت ابقار کھی ہے وہ بدون غذا کے بھی اس قوت کو پیدا کرسکتا ہے اگر قوت ابقاء کے لئے غذا کا واسطہ ضروری ہے تو خود غذا میں جو قوت ابقاء ہے کیا اس کے لئے بھی غذا کا واسطہ ہے تو پھر غذا کے لئے غذا لازم آئے گی پھر اُس میں بھی ہم کلام کریں گے اسی طرح سلسلہ چلتا رہا کہ ہر غذا کے لئے دوسری غذا کا واسطہ بنایا گیا تو سلسل مستحیل لازم آئیگا پس لامحالہ کسی جگہ یہ کہنا پڑے گا کہ اس غذا میں قوت ابقاء بلا واسطہ پیدا ہوئی ہے معلوم ہوا کہ اس قوت کے لئے غذا کا واسطہ لازم نہیں حق تعالیٰ بلا واسطۂ غذا بھی اس قوت کو پیدا کرسکتے ہیں۔ پھر اگر عیسیٰ علیہ السلام میں اسی طرح یہ قوت پیدا کردی گئی ہو تو کیا استحالہ ہے پھر دنیا میں ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ بعض لوگوں کو بدون غذا کے ہفتوں اور مہینوں زندہ رکھتے ہیں چنانچہ مریض بعض دفعہ مہینہ بھر تک کچھ نہیں کھاتا۔ اور زندہ رہتا ہے اب یہاں تاویل کی جاتی ہے کہ اس مریض کے جسم میں رطوبات فضلیہ بہت پیدا ہوگئے ہیں معدہ ان کے تحلیل میں مشغول ہے اس لئے بھوک نہیں لگتی اور نہ حیات پر کچھ اثر پڑتا ہے۔ مگر یہ محض بات کا بنانا اور تاویل گڑھنا ہے میں کہتا ہوں کہ تندرست آدمی تو مریض سے زیادہ مرطوب ہوتا ہے۔ غریب بیمار جس کا چہرہ بھی زرد اور ہاتھ پیر بھی لاغر ہوجاتے ہیں جو قلت دوران خون کی علامت ہے کیا سٹے کٹے سرخ و سپید رنگ والے سے زیادہ مرطوب ہوسکتا ہے ہرگز نہیں پھر ذرا کوئی تندرست تو مہینہ بھر بھوکا رہے کہ غذا کا دانہ بھی اُس کے حلق میں نہ جانے پائے جس طرح بیماروں کو اس طرح کئی ہفتہ اور مہینہ بھر گذر جاتا ہے تندرست تو یقیناً ہلاک ہوجائے مگر بیماروں کو حق تعالیٰ اپنی قدرت سے بدون غذا کے زندہ رکھتے ہیں تو کیا جس نے مہینہ بھر بدون غذا کے زندہ رکھا وہ اس سے زیادہ مدت تک بغیر غذا کے زندہ رکھنے پر قادر نہیں ضرور قادر ہے اور اگر یہ بھی سمجھ میں نہ آئے تو یوں سمجھو

کہ غذا کی دو قسمیں ہیں ایک ظاہری ایک باطنی جس طرح غذا ظاہری سے قوت وحیات باقی رہتی ہے اسی طرح کبھی غذاے باطنی بھی اس کی قائم مقام ہو جاتی ہے چنانچہ دنیا میں صوفیہ کے واقعات بکثرت اس قسم کے منقول ہیں کہ وہ مہینوں محض ذکر اللہ پر اکتفا کرتے تھے! اور بہت بہت دنوں کے بعد کھانا کھاتے تھے۔ حضرت شیخ علی صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت متواتر اور مشہور ہے۔ کہ زندگی بھر میں اُن کے پیٹ کے اندر چند سیر سے زیادہ غذا نہیں پہونچی اور اس پر قوت کی یہ حالت کہ حضرات صوفیہ کی عمریں عام آدمیوں سے طویل ہوتی ہیں آخر یہ کس چیز کی طاقت تھی محض ذکر الٰہی کی کہ وہ ان کے لئے غذا کا قائم مقام بنگیا تھا اس لئے اُن کو غذا کی بہت کم ضرورت ہوتی تھی اور باوجود تقلیل غذا کے ان کی قوت میں کمی نہ آتی تھی تو ممکن ہے کہ حضرت عیسی علیہ السلام کے لئے یہی غذاے باطنی ظاہری غذا کے قائم مقام بنگئی ہو اور چونکہ عالم آخرت کی خاصیت دنیا کی خاصیت سے الگ ہے تو ممکن ہے کہ یہاں اگر غذاے باطنی مہینہ بھر یا چالیس دن تک غذاے باطنی کے قائم مقام ہوتی ہے تو وہاں برسوں اور مدت دراز تک اس کے قائم مقام ہو جاتی ہو۔ آخر اس میں استحالہ کیا ہے بہرحال شیخ کی اس تحقیق نفیس سے بہت سے اشکالات کا حل ہو گیا اور اس عالم آخرت کا تصور بالفعل بھی آسان ہو گیا کیونکہ عالم آخرت باعتبار مکان کے اسوقت بھی موجود ہے پس یہاں دو تصور ہوے ایک روح کے مبدأ و معاد یعنی آسمان کا کہ وہ آخرت ہے دوسرے جسم کے مبدأ و معاد کا کہ وہ زمین ہے اور یہ دونوں ہر وقت پیش نظر ہیں جس سے تصور میں کوئی تکلف ہی نہیں کرنا پڑتا بس اسی طرح تصور کیا کرو کہ روح کا مبدأ و معاد سر کے اوپر ہے ایک دن روح جسم سے الگ ہو کر اوپر چلی جائیگی۔ اور جسم کا مبدأ و معاد زمین ہے ایک دن یہ جسم سے الگ ہو کر مٹی میں مل جائیگا۔ اور زمین کا جسم کے لئے مبدأ و معاد ہونا قرآن کا جس طرح مدلول ہے اسی طرح مشاہد بھی ہے۔ چنانچہ معاد ہونا تو بہت ہی ظاہر ہے۔ رات دن اسکا مشاہدہ ہو رہا ہے۔ کہ بہت سے بدن مرنے کے بعد پیوند زمین ہو گئے ہیں۔ باقی مبدأ ہونا اس طرح ہے کہ جسم انسان کی ترکیب عناصر اربعہ سے ہے جسمیں غلبہ تراب کو ہے اور تراب کا جزو ارض ہونا ظاہر ہے معلوم ہوا کہ اصل مادہ جسم انسانی کا ارض ہی ہے اسی طرح سے

اس کا مبدأ زمین ہے دوسرے انسان کا جو مادہ ہے یعنی نطفہ وہ انہی غذاؤں سے پیدا ہوتا ہے چنانچہ باپ ماں قسم قسم کی غذائیں کھاتے ہیں جنسے ان کے بدن میں خون پیدا ہوتا ہے۔ اور اُس خون کے جوہر سے نطفہ بنتا ہے۔ پھر نطفہ سے اولاد ہوتی ہے بس یہ کہنا صحیح ہے کہ انسان کا مبدأ زمین ہے۔ کیونکہ یہ غذائیں سب زمین ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور یہاں سے معلوم ہوا کہ جس طرح زمین میں نباتات کا تخم موجود ہے اسی طرح حیوانات اور انسان کا تخم بھی زمین ہی کے اندر موجود ہے۔ دیکھئے زمین کے بعض اجزاء سے درختوں کے پتے بنتے ہیں اور اُسی کے بعض اجزاء سے لکڑی بنتی ہے اور بعض اجزاء لطیف سے انار کا دانہ اور انگور اور سیب اور مٹھائی کھٹائی اور تمام اقسام کے مزے بھی بنتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ان سب کی اصل زمین کے اندر ہے۔ جبھی تو ثمرات میں ان کا ظہور ہوتا ہے اسی طرح زمین کے اندر ایسا تخم بھی ہے جس سے نطفہ بنتا ہے جو انسان کی اصل ہے تو زمین کے اندر انسان کا بھی تخم موجود ہوا اسی طرح زمین میں چاندی سونے کی بھی اصل موجود ہے یا قوت اور عقیق وغیرہ کی اصل بھی موجود ہے۔ مگر چاندی پھلوں کی ایسی اصل کو نکالکر اور ان کو ترکیب دیکر پھل ظاہر کر دیتے ہیں۔ پس وہ زمین کے اجزاء میں سے انار کی اصل کو الگ نکال لیتے ہیں وہ انار ہی میں پہونچتی ہے۔ اور انگور وغیرہ کی اصل کو جدا نکالتے ہیں اس کا انگور بن جاتا ہے ایسے ہی وہ زمین کے اجزاء میں سے انسان کی اصل کو جدا نکال کر نطفہ بنا دیتے ہیں جس سے دوسرا انسان بن جاتا ہے غرض زمین ہی کے اندر تمام اشیاء کی اصل ہے جن کو حق تعالیٰ ترکیب خاص سے الگ الگ نکالتے رہتے ہیں۔ کہیں خوشبو کی اصل کو نکالکر چمیلی بیلا گلاب میں ظاہر کر دیتے ہیں کبھی مٹھاس کھٹاس کی اصل کو الگ کرکے گنے اور انگور سیب وغیرہ میں ظاہر کر دیتے ہیں۔ یہاں سے اُس حدیث کی حقیقت بھی معلوم ہو گئی ہوگی جسمیں وارد ہے کہ حق تعالیٰ مسلمانوں کو جنت میں جانے کے ساتھ ہی پہلے زمین کی روٹی کھلائیں گے۔ اس پر ملاحدہ نے اعتراض کیا ہے کہ زمین کی روٹی کیسی ہوگی کیا مسلمانوں کو ڈلے پتھر کھلائے جائیں گے۔ صاحب ڈلے پتھر تو ان کو ہی ملیں گے ہم کو تو جوہر ارضی ملیگا یعنی یہ تو معلوم ہو گیا کہ تمام لذائذ اور ہر قسم کے مزے زمین ہی کے اندر موجود ہیں سو جس طرح اس وقت حق تعالیٰ ہر مزے کو الگ الگ

پھلوں میں نکال کر دیتے ہیں اس وقت تمام مزے دار چیزوں کی اصل نکال کر اُس کا مغز بنایا جائیگا وہ جوہر ارض ہوگا اُسمیں گیہوں چنا انگور بادام انار سیب اور ہر قسم کی لذیذ چیزوں کا مزا موجود ہوگا اس کی روٹی بنا کر مسلمانوں کو کھلائی جائیگی میں کہتا ہوں کہ اس وقت آپ جو گیہوں کی روٹی کھاتے ہیں یہ کس چیز کی روٹی ہے صاحب یہ بھی تو زمین ہی کی روٹی ہے آٹا بھی تو زمین ہی کے اجزاء سے بنتا ہے۔ جس کو گیہوں میں الگ کر کے کھاتے ہو۔ اور گیہوں میں یہ کہاں سے آیا تھا اسی مٹی میں سے چنانچہ ایک دانہ زمین میں ڈالتے ہو وہ زمین کی مٹی اور پانی کے بہت سے اجزا کو کھینچکر پرورش پاتا ہے اور اُسی ایک دانہ کے ہزاروں دانہ ہو جاتے ہیں مگر چونکہ اس وقت وہ مٹی کی شکل میں نہیں ہے بلکہ صورت بدل گئی ہے اس لئے یہ نہیں کہا جاتا کہ مٹی کھا رہے ہیں مگر حقیقت میں دیکھا جائے تو آپ رات دن مٹی ہی کھاتے ہیں کیونکہ وہی رنگ بدل بدلکر ہر غلہ اور ترکاری اور پھل پھلواری میں ظاہر ہوتی ہے پس سمجھ لو کہ حق تعالیٰ قیامت میں زمین کے انہی عمدہ اجزاء کو جنھیں آج کل تم بہت شوق سے کھاتے ہو یکجا جمع کر کے مسلمانوں کو کھلائیں گے پھر اس کو ڈلے پتھر اور مٹی کہنا کیونکر صحیح ہے اور حقیقت کے اعتبار سے کہو تو آج کل جتنی بھی چیزیں تم کھاتے ہو وہ سب بھی مٹی ہی ہیں اور صورت کے اعتبار سے جیسے یہ مٹی نہیں اسی طرح وہ بھی مٹی نہ ہوگی بلکہ صورت اور مزے میں آجکل کی غذاؤں سے وہ بہت زیادہ خوشنما اور الذ ہوگی کیونکہ اسمیں تمام لذائذ کے مزے اور سب کے رنگ موجود ہوں گے۔ اب یہ سوال رہا کہ یہ تو معلوم ہو گیا کہ وہ روٹی ڈلے پتھروں اور مٹی کی نہ ہوگی بلکہ زمین کے ماکول اجزاء کا جوہر اور سست ہوگا لیکن مسلمانوں کو جوہر کھلایا جائیگا اس میں حکمت کیا ہے اور جنت کے اغذیا کے ہوتے ہوئے اجزاء ارضیہ جو اس سے بدرجہا کم درجہ ہے کھلانے کی مصلحت کیا ہے سو حکمت بھی سنیئے اس میں ایک حکمت تو یہ ہے کہ مرنیکے بعد چونکہ دنیا کی لذیذ چیزوں کے مزے کچھ تو طول مدت کی وجہ سے اور کچھ ہول محشر کی وجہ سے لوگوں کو یاد نہ رہے ہوں گے۔ تو اس وقت مسلمانوں کو تمام ماکول اجزاء کا جوہر کھلا کر جو کہ ہر ماکول کے الگ الگ کھانے سے زیادہ لذیذ ہوگا یہ بتلایا جائیگا کہ دیکھو دنیا کی لذائذ کا تو یہ منتہیٰ اور خلاصہ ہے جسمیں سب قسم کے مزے موجود ہیں

اگر بھول گئے ہو تو ان کو چکھ لو اور دنیا کی لذتوں کو یاد کر لو اس کے بعد جنتوں کی نعمتوں کے مزے چکھو کہ وہ کس درجہ لذیذ اور لذائذ دنیا سے کتنی بڑھی ہوئی ہیں۔ پس خلاصۂ لذائذ دنیا کھا کر اور سب کے مزے یاد کر کے جب وہ جنت کی چیزیں کھائیں گے اور ان میں اُن میں زمین آسمان کا فرق دیکھیں گے اسوقت ان کو نعماے جنّت کی پوری قدر ہوگی تو یہ حکمت ہوگی اِس جوہر کے کھلانے میں تاکہ نعماے جنت کی مسلمانوں کو پوری قدر ہو دوسرے یہ حکمت بھی ہوگی کہ دنیا میں بعض اللہ کے بندوں نے یا تو بوجہ غربت و افلاس کے یا بوجہ ترک لذات اور مجاہدات کے سب قسم کے مزے نہیں چکھے بعضوں نے عمر بھر بھی انگور و سیب نہیں کھایا ہوگا چنانچہ میرے ایک مخدوم نے مجھکو خربزہ کی ایک قاش دی اور خود بھی کھائی اور کہنے لگے آج سترہ برس کے بعد خربزہ کھا رہا ہوں یہ تو معمولی لذائذ کا حال ہے اور جو لذتیں بادشاہوں اور امیروں کو عجیب و غریب نصیب ہوتی ہیں۔ وہ تو ان بیچاروں کو کہاں نصیب۔ تو حق تعالیٰ ان مقبول بندوں کو اول زمین کا جوہر کھلائیں گے تاکہ جنت میں جانے سے ہر قسم کی لذائذ کا مزہ اُن کو معلوم ہو جاوے۔ پھر جنت کی نعمتوں کو چکھکر اندازہ کریں کہ یہ دنیا کی لذتیں اُن کے سامنے کیا ہیں کچھ بھی نہیں اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ جنت میں جاکر ان کو یہ وسوسہ نہ آسکے گا کہ دنیا کی لذات سے ہم محروم ہیں یا جن کے ہم تارک رہے تھے معلوم نہیں وہ کیسی ہوں گی تو پہلے سب چیزیں انھیں کھلادی جائیں گی تاکہ یہاں کی ہر لذت کا خوب ادراک ہو جائے تو پھر ان کے متعلق نعماے جنت کی مساوات کا وسوسہ نہ آسکے گا تو اصل دعوت تو ان خاص بندوں کی ہوگی مگر کریموں کی عادت ہے کہ مہمانوں کے طفیل میں نوکروں اور دربانوں کو بھی دعوت کے دن پلاؤ زردہ جو کچھ پکتا ہے دیدیتے ہیں اس طرح طفیل میں ہم کو بھی وہ جوہر کھلا دیا جائیگا خیر یہ تو درمیان میں ایک حدیث کے رفع اشکال کے طور پر گفتگو ہوگئی تھی اصل میں یہ مضمون بیان کر رہا تھا کہ زمین جسم انسانی کا مبدأ بھی ہے۔ جیسا کہ اس تقریر سے معلوم ہو گیا اور معاد تو ہے ہی۔ اور آسمان روح انسانی کا مبدأ و معاد ہے اور یہاں سے معلوم ہوا ہوگا کہ انسان بیچارہ کیسی کشاکشی میں ہے کہ اس کی ایک ٹانگ تو زمین میں ہے اور ایک آسمان پر ہے روح تو اس کی

سماوی ہے اور جسم ارضی ہے ایک جزو تو آسمان پر جانا چاہتا ہے اور ایک جزو زمین پر رہنا چاہتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اس کا ایک جزو اسی وقت آسمان پر اور دوسرا زمین پر۔ کیونکہ روح حقیقی اب بھی آسمان ہی پر ہے وہ بدن میں حلول کئے ہوئے نہیں ہے بلکہ اوپر ہی سے بدن کی تدبیر کر رہی ہے اور جو روح انسان کے اندر ہے وہ روح اصلی نہیں ہے بلکہ نسمہ ہے جو بدن انسانی میں حلول کئے ہوئے ہے صوفیہ نے اسکو نسمہ کہا ہے اور انھوں نے کشف سے معلوم کیا ہے کہ یہ روح حقیقی نہیں بلکہ ایک جسم لطیف ہے جو اس جسم کثیف میں حلول سریانی کئے ہوئے ہے جیسے جسم تعلیمی جسم طبعی میں حال ہوتا ہے گو جوہریت و عرضیت کا تفاوت ہے طلبہ اس کو سہولت سے سمجھ لیں گے اور یہ بھی کشف سے معلوم کیا ہے کہ وہ اسی جسم کی صورت پر ہے (غالباً مرنیکے بعد وہی آسمان کی طرف لیجائی جاتی ہے) اور روح حقیقی حال فی الجسم نہیں ہے بلکہ وہ جوہر مجرد عن المادہ ہے جس کو مادی سے حلول کا کچھ علاقہ نہیں۔ صرف تدبیر و تصرف کا علاقہ ہے وہ آسمان سے بھی فوق ہے۔ اور اس کو سماوی بمعنی علوی کہا جاویگا جیسا اوپر بھی مذکور ہوا ہے۔ اور اس فوق السماء ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ آسمان سے اوپر کسی مکان میں ہے کیونکہ مجرد کے لئے مکان نہیں ہو سکتا بلکہ صوفیہ کا اسے فوق السّمٰوات کہنا یہ اس کے لامکانی ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ فوق السمٰوات مکان نہیں ہے تو فوق السماء ہونا لامکانی ہونا ہے اسی لئے استواء علی العرش کی ایک تفسیر یہ بھی کی ہے کہ اس میں حق تعالےٰ کے لامکانی ہونے کی طرف اشارہ ہے کیونکہ عرش منتہائے امکنہ ہے تو حق تعالیٰ کا عرش فوق ہونا لامکانی ہوتا ہے۔ (پس اس تفسیر پر استوی علی العرش کے یہ معنی ہیں کہ خدا تعالیٰ مکان اور مکانیات کو پیدا کرکے ان میں مقید نہیں ہوا بلکہ لامکانی ہی رہا اور یہ مراد نہیں کہ پیدا کرنے کے وقت مکان یا مکانیات سے کچھ تلبس ہو گیا تھا پھر تنزہ عن المکان ہو گیا جیسا کہ لفظ "ثم استوی" میں ثم سے ظاہراً شبہہ ہوتا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ حق تعالےٰ جس طرح پہلے استوی علی العرش سے موصوف تھے اسی طرح بعد میں بھی رہے ثم کے یہ معنی ہیں یعنی پھر بھی وہ استواء ہی رہا۔ (واللہ اعلم ۱۲ جامع)۔ اور متکلمین نے روح حقیقی کو نہیں سمجھا وہ نسمہ ہی کو روح حقیقی کہتے ہیں۔ اور صوفیہ نے جو روح حقیقی کو

مجرد کہا ہے۔ اس پر بعض متکلمین نے ان کی تکفیر کی ہے حالانکہ اس میں کوئی بھی تکفیر کی بات نہیں صوفیہ کو ایک چیز منسمہ کے سوا کشف سے معلوم ہوئی وہ اس کے قائل ہو گئے متکلمین کی نظر وہاں تک نہیں پہونچی وہ قائل نہ ہوئے مگر اس کے کیا معنی کہ وہ صاحب مشاہدہ کو کافر کہیں گے متکلمین کے اس حکم کی بنا یہ ہے کہ انھوں نے تجرد کو حق تعالیٰ کی خاص صفت مانا ہے پس مجرد سوائے حق تعالیٰ کے کوئی نہیں ہو سکتا۔ اور صوفیہ ارواح کو بھی مجرد مانتے ہیں۔ لہذا وہ شریک باری کے قائل ہوئے اور یہ کفر ہے مگر یہ دلیل نہایت مخدوش ہے اس لئے کہ اس کی کوئی دلیل نہیں کہ تجرد اخص صفات واجب ہے بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ واجب کے اخص صفات کی تحقیق تو بہت دور ہے خود ممکنات کی صفات کے حقائق بھی جو کچھ کسی نے بیان کئے ہیں وہ قطعی نہیں ہیں حکماء اور منطقین خود اقرار کرتے ہیں کہ جنس کو عرض عام ہے اور فصل کو خاصہ سے بہت اشتباہ ہے پس ممکن ہے کہ جسکو ہم فصل سمجھا ہے وہ حقیقت میں خاصہ ہو اور جسکو ہم جنس کہتے ہیں واقع میں وہ عرض عام ہو جب ہمارے علم کی ممکنات کے بارہ میں یہ حالت ہے تو صفات واجب میں اس کا نقص ظاہر ہے پس کسی کو حق نہیں کہ واجب کے لئے کسی خاص صفت کو مابہ الامتیاز قرار دیکر دوسروں کی تکفیر کرنے لگے چنانچہ صوفیہ نے متکلمین کی اس رائے کو تسلیم نہیں کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ تجرد کا واجب کے لئے نقص صفات ہونا مسلم نہیں بلکہ اقرب یہ ہے کہ ممکن بالذات یہ اخص صفات واجب ہے پس غیر واجب کو مجرد ماننے سے شرک و کفر لازم نہیں آتا البتہ کفر اُس وقت لازم آتا ہے جبکہ روح کو مجرد مانکر اس وقت کو واجب و قدیم بھی مانا جاوے اور یہاں ایسا نہیں کیونکہ ہمارے نزدیک مجرد بھی حادث ہو سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک ارواح مجرد بھی ہیں۔ اور حادث بھی ہیں۔ واجب اور قدیم نہیں ہیں۔ بہرحال صوفیہ کے قول پر تو انسان کی ایک ٹانگ آسمان پر اور ایک زمین پر ہونا ظاہر ہے کیونکہ وہ تو روح حقیقی کو حال فی الجسم نہیں مانتے بلکہ فوق السمٰوات کہتے ہیں اور متکلمین کے قول پر بھی ظاہر ہے کیونکہ گو ان کے نزدیک روح بدن میں حلول کئے ہوئے ہے۔ مگر اُس کا علوی ہونا اور طالب سمٰوات ہونا ان کو بھی مسلم ہے کیونکہ وہ روح کو مثل ملائکہ کے جوہر کے مادی لطیف کہتے ہیں

جسکا مبدأ و معاد عالم ناسوت نہیں بلکہ عالم ملکوت ہے۔ پس انسان عجیب کشمکش میں ہے کبھی جسمیت کا غلبہ اس پر ظاہر ہوتا ہے کبھی روحانیت کا غلبہ جسمیت کے وقت اس سے اعمال سفلیہ صادر ہوتے ہیں۔ (معاصی وغیرہ) اور غلبۂ روحانیت کے وقت اعمال علویہ ظاہر ہوتے ہیں۔ (یعنی طاعات وغیرہ) اور یہاں سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ سالک کو کسی وقت مطمئن اور بے فکر ہو کر نہ بیٹھنا چاہئے کیونکہ جب تک جسم و روح کا تعلق باقی ہے اسوقت تک دونوں میں کشاکشی ضرور باقی ہے گو مجاہدہ کے بعد سخت کشاکشی تو نہیں رہتی مگر بالکل زوال بھی نہیں ہوتا اس لئے مجاہدہ کی ہر وقت ضرورت ہے گو مجاہدہ کاملہ کے بعد پہلی جیسی ضرورت تو نہیں رہتی مگر استغناء بھی نہیں ہو جاتا۔ کیونکہ جب تک ضدین کا اجتماع باقی ہے اور ہر ضد دوسرے پر غالب ہونا چاہتی ہے اسوقت تک مجاہدہ کی ضرورت ناگزیر ہے بس زندگی میں تو انسان کی یہ حالت ہے ؎

گر رشک بَرد فرشتہ بر پاکی ما — گہ خندہ زند دیو ز ناپاکی ما
ایماں چو سلامت بلبِ گور بریم — احسنت بریں چستی و چالاکی ما

واقعی ایمان پر خاتمہ ہو گیا تو اُس دن بے فکری ہو گی۔ اور اُس دن مجاہدہ کی کامیابی ظاہر ہو گی ورنہ زندگی میں تو یہی کشاکش لیل و نہار باقی ہے یہ بیچ میں چند لطیفے استطراداً میں نے بیان کر دئے ہیں۔ اب اصل مضمون کی طرف عود کرتا ہوں میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہمارے اندر دو چیزیں ہیں ایک جسم ایک روح۔ اور ہر ایک کا ایک مبدأ و معاد ہے جس کے استحضار سے غفلت کم ہو جاتی ہے اور غفلت ہی ہمارے امراض کی جڑ ہے تو حق تعالیٰ نے ہم کو اس جگہ بتلایا ہے کہ تمہارے اندر جو ایک جزو جسم کا ہے اُسکا مبدأ و معاد زمین ہے جسکا مشاہدہ آسان کے مشاہدہ سے اکثر و ایسر ہے تم اسی میں غور کر لو تو تمہارے دن بھلے ہو جائیں گے یہ بھی کتنی شفقت ہے کہ حق تعالیٰ نے ہم کو آسمان کا مراقبہ تعلیم نہیں کیا کیونکہ وہ ہم سے دور ہے پھر ہر وقت آسمان کی طرف نظر کرنا اور غور کرنا بھی دشوار ہے اور زمین ہر وقت ہم سے قریب ہے اور اس پر ہر دم نگاہ پڑتی ہے تو بتلا دیا کہ تم زمین پر چلتے پھرتے اُٹھتے بیٹھتے سوتے لیٹتے اس کا تصور کیا کرو کہ ہم زمین ہی سے پیدا ہوئے

ہیں تو ہماری اصل خاک ہے لہذا ہم کو خاک بنکر رہنا چاہیئے مٹی ہو کر تکبر کرنا نہایت ہی نازیبا ہے پھر آخر میں بھی ہم مٹی ہی میں ملنے والے ہیں۔ یہ جسم سب خاک خوردہ ہو جائیگا اور ایک دن ہم زمین کے اوپر سے اُس کے اندر پہونچ جائیں گے تو اس کے لئے ہم کو ایسے اعمال کرنا چاہئیں جو اس وقت کارآمد ہوں حقیقت میں اس مراقبہ کو اصلاح حال میں بہت ہی تاثیر ہے۔ اس جگہ بجائے مراقبہ سموات کے (جو کہ روح کا مبدأ و معاد ہے) مراقبہ زمین کی تعلیم فرمانیکا ایک نکتہ تو یہ تھا کہ زمین ہم سے بہ نسبت آسمان کے اقرب ہے اور ایک نکتہ اس میں اور ہے وہ یہ کہ اس جگہ اوپر سے موسے علیہ السلام کی گفتگو کا ذکر ہے جو فرعون کے ساتھ ہوئی تھی چنانچہ اوپر ارشاد ہے "قال فمن ربکما یا موسیٰ" یعنی فرعون نے کہا کہ ای موسیٰ تم دونوں کا یعنی موسے و ہارون علیہ السلام کا رب کون ہے اس کے جواب میں موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا "ربنا الذی اعطی کل شی خلقہ ثم ہدی" یہاں بھی ایک عجیب لطیفہ ہے وہ یہ کہ فمن ربکما کے بعد مقتضی ظاہر یہ تھا کہ یا موسیٰ و ہارون کہا جاتا جب فمن ربکما الخ میں دونوں کو خطاب کیا گیا ہے تو ندا میں بھی دونوں کو خطاب ہونا چاہیئے مگر حق تعالیٰ نے صرف "یا موسیٰ" فرمایا ہے اسکی کیا وجہ ہے یہ وہ باتیں ہیں کہ انکا کشف ہونے لگے تو آدمی قرآن کے لفظ پر ناچنے لگے لوگ ڈھولکی اور ستار پر کیا ناچتے ہیں واللہ قرآن کا لفظ لفظ نچا دینے والا ہے۔ اسمیں نکتہ یہ ہے کہ بتلا دیا گیا کہ فرعون کا اصل روے سخن حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کی طرف تھا انہی کی طرف متوجہ ہو کر بات کر رہا تھا ہارون علیہ السلام سے تبعًا خطاب تھا نہ کہ اصالتًا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کو تربیت کیا تھا جس کا عجیب قصہ ہے اور اُس سے خدا تعالیٰ کی قدرت کا ظہور ہوتا ہے واقعہ یہ ہے کہ فرعون سے نجومیوں نے بطور پیشین گوئی کے کہدیا تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہوگا جو تیری سلطنت کے زوال کا سبب ہوگا۔ فرعون نے اس کے بعد حکم کر دیا تھا کہ بنی اسرائیل میں جو لڑکا بھی پیدا ہو اس کو قتل کر دیا جائے اور لڑکیوں کو اس لئے چھوڑ دیا جائے کہ ان سے خطرہ نہ تھا دوسرے خدمتگاری کے واسطے ان کو ماما بنا کر رکھنے کی ضرورت تھی بہرحال بنی اسرائیل کے بچے قتل ہونے لگے اسی زمانہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام

پیدا ہوئے ان کی والدہ کو فکر ہوئی کہ اب یہ بھی قتل ہوں گے حق تعالیٰ نے انکو الہام کیا کہ ایک صندوق میں بند کر کے اُن کو دریا میں ڈالدو ہم ان کو بچالیں گے پھر ان کو تمہارے پاس ہی پہونچا دینگے۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ اور زیادت احتیاط کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی بہن سے فرمایا کہ تو کنارہ کنارہ صندوق کو دیکھتی ہوئی چلی جا اور معلوم کر کہ یہ کہاں پہونچتا ہے اور اسے کون اٹھاتا ہے وہ دور سے دیکھتی ہوئی چلتی رہی یہاں تک کہ صندوق فرعون کے محل سے نیچے کو گذرا کیونکہ وہ دریا اُس کے محل سے ہو کر گذرتا تھا اُس وقت فرعون معہ اپنی بی بی کے محل کے نیچے کنارۂ دریا پر بیٹھا ہوا تھا کہ سامنے سے صندوق بہتا ہوا آیا تو اُس نے اس کے نکالنے کا حکم دیا۔ جب صندوق اس کے سامنے لاکر رکھا گیا۔ اور اُس نے کھولا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نظر پڑی جو اپنا انگوٹھا چوس رہے تھے موسیٰ علیہ السلام کو خدا تعالیٰ نے ایسا حسین بنایا تھا کہ ہر شخص کو صورت دیکھنے سے ان پر محبت آتی تھی چنانچہ ارشاد بھی ہے "والقیت علیک محبۃ منی" اور تجلی طور کے بعد تو یہ کیفیت ہوئی کہ کسی کو نگاہ بھر کر آپ کا چہرہ دیکھنے کی تاب نہ تھی اور جو دیکھ لیتا اسکی بینائی زائل ہو جاتی غرض آپ اس درجہ حسین تھے کہ بس دیکھتے ہی فرعون کو بے اختیار محبّت آئی اور اُن کو نکال کر گود میں لے لیا اور چومنے لگا اس کے بعد پھر نجومیوں کی پیشین گوئی کا خیال آیا اور کھٹکا پیدا ہوا کہ یہ بچہ کہیں وہی نہ ہو اور قتل کا ارادہ کیا مگر اسکی بی بی حضرت آسیہ نے سفارش کی کہ اس سے کیا خطرہ اول تو یہی معلوم نہیں کہ یہ بنی اسرائیل سے ہے یا نہیں اور ہو بھی تو ہم اپنی حفاظت میں پرورش کریں گے ہاتھ تلے رہے گا تو کیا خوف ہے پھر ایسے خوبصورت بچہ کا قتل کرنا بھی دل کو گوارا نہیں فرعون کو خود بھی محبت آ ہی چکی تھی اس لئے ذرا سی سفارش پر اپنے خیال سے رک گیا اور موسیٰ علیہ السلام کو اپنا بیٹا بنا کر پالنا شروع کیا اب وہ شاہی فرزند کہلانے لگے اور دشمن کے ہاتھوں سے پلنے لگے خدا تعالیٰ نے کیسی اپنی قدرت ظاہر کی کہ لے کمبخت تو کہاں تک تدبیریں کریگا ہم تیرے ہی ہاتھ سے دشمن کو پلوائیں گے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

در بہ بست و دشمن اندر خانہ بود حیلۂ فرعون زیں افسانہ بود

واقعی فرعون کی تدبیر ایسی ہی تھی کہ باہر تو ناحق بچوں کو مروا رہا تھا اور گھر کی خبر نہ تھی کہ جس کے لئے یہ سامان کر رہا ہوں وہ میرے ہی ہاتھ سے پل رہا ہے غرض جب وہ شاہی بیٹے ہوگئے تو دودھ پلانے کے لئے اناؤں کو بلایا گیا اُس وقت موسیٰ علیہ السلام کی بہن بھی محل شاہی میں پہونچ گئیں حق تعالیٰ نے یہ تدبیر کی کہ جس عورت کا پستان حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مُنہ میں دیا جاتا وہ اس کو منہ ہی میں نہ لیتے اور ہرگز دودھ نہ پیتے اس پر فرعون کو بڑی پریشانی ہوئی کہ یہ کسی کا دودھ کیوں نہیں پیتا اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے کہا "ھل ادلکم علی اہل بیت یکفلونہ لکم وہم لہ ناصحون" کیا میں تمکو ایسی بی بی کا پتہ بتلاؤں جو تمھاری خاطر اس بچہ کو اچھی طرح پرورش کردیں اور وہ اس کی خیر خواہ بھی ہیں۔ اہل سیر نے لکھا ہے کہ ان کے اس قول پر "وہم لہ ناصحون" فرعون کھٹک گیا اور کہا کہ یقیناً تجکو معلوم ہے کہ یہ بچہ کس کا ہے جبھی تو یہ کہتی ہے کہ وہ اس کی خیر خواہ بھی ہیں ورنہ تجکو یہ کیا معلوم ہوتا کہ اس کا خیر خواہ کون ہے کون نہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کی بہن بڑی سمجھدار اور فہیم تھیں کیوں نہو آخر کس خاندان کی تھیں فوراً جواب دیا کہ لہ کی ضمیر اس بچہ کی طرف عائد نہیں بلکہ فرعون کی طرف عائد ہے اور مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ سرکاری خیر خواہ بھی ہیں (کانت فہیمۃ للدور ہا ۱۲) خیر اس جواب سے اطمینان سا ہوا تو فرعون نے کہا کہ اچھا اُن بی بی کو بلا کر لاؤ چنانچہ وہ اپنی والدہ کو بُلا لائیں ان کا پستان منہ میں جانا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اچھی طرح دودھ پینے لگے فرعون نے آپ کی والدہ سے کہا کہ یہ بچہ تمھارا ہی معلوم ہوتا ہے ورنہ اسکی کیا وجہ کہ تمھارے سوا اس نے کسی کا دودھ بھی نہ پیا۔ انھوں نے فرمایا حضور اتنے سے بچہ کو ماں باپ کی کیا سمجھ لائیے آپ جس عورت کا چاہئے بچہ لے آئیے وہ بھی ضرور میرا دودھ پی لے گا وجہ یہ ہے کہ بعض عورتوں کا دودھ خراب ہوتا ہے اس لئے بعضا بچہ ایسی عورتوں کا دودھ نہیں پیتا میرا دودھ نہایت عمدہ ہے اس لئے اس نے خوشی سے لیا اور ہر بچہ اسی طرح پی لیگا یہاں بھی وہ لاجواب ہوا اور آپ کی والدہ کو معقول تنخواہ پر اپنے محل میں رکھا کہ تم ہی اس بچہ کو دودھ پلاؤ چنانچہ خدا تعالیٰ نے اس طرح آپ کی ماں کو بھی انسے ملا دیا

اور پرورش ہوتی رہی حتی کہ بڑے ہوئے اور جوان ہوئے اور شاہی فرزند کہلانے کی وجہ سے سب کی نگاہ میں معظم و محترم رہے پھر ایک قبطی کا خون آپ کے ہاتھ سے ہوگیا تھا۔ اسکی وجہ سے روپوش ہوکر مدین پہونچ گئے۔ دس سال کے بعد وہاں سے واپس ہوئے اور راستہ میں نبوت سے مشرف ہوکر فرعون کو تبلیغ کرنے کے لئے مصر میں تشریف لائے اس وقت ہارون علیہ السلام آپ کے ساتھ تھے کیونکہ وہ بھی موسی علیہ السلام کی درخواست پر نبی بنا دئے گئے تھے۔ دونوں صاحبوں نے آکر اُس سے کہا "انا رسول ربک فارسل معنا بنی اسرائیل ولا تعذبہم قد جئناک بآیۃ من ربک والسلام علی من اتبع الھدی انا قد اوحی الینا ان العذاب علی من کذب وتولی" چونکہ فرعون موسیٰ علیہ السلام سے اچھی طرح واقف تھا اور ان پر ایک قسم کا ناز بھی تھا اس لئے اس نے انہی کیطرف روے سخن کیا ہارون علیہ السلام کی طرف اصل خطاب نہ تھا اسواسطے "فمن ربکما" کے بعد یا موسیٰ کہا گیا۔ یا ہارون و موسیٰ نہیں کہا گیا اس سوال کے جواب میں موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر شئے کو وجود عطا کیا پھر (اسباب بقا کی طرف ہر شئے کو) رہنمائی کی (چنانچہ ہر مخلوق اپنے بقا کا ذریعہ پیدا ہوتے ہی ڈھونڈھنے لگتا ہے مرغی کا بچہ زمین پر چونچ مارتا ہے اور انسان کا بچہ پستان کو ڈھونڈھنے لگتا ہے وغیرہ وغیرہ) اس کے بعد فرعون نے یہ سوال کیا "قال فما بال القرون الاولیٰ" کہ پہلے لوگوں کا کیا حال ہے (جو مرچکے ہیں) اس سوال کی وجہ یہ تھی کہ موسیٰ علیہ السلام کے کلام میں یہ حکم تھا "ان العذاب علی من کذب وتولی" جس سے مقصود تکذیب پر وعید سنانا تھا۔ اس پر یہ سوال کیا کہ الوہیت و رسالت کے مکذبین بہت گذرے ہیں ان کی حالت عذاب میں کیا ہوئی "قال علمھا عند ربی فی کتاب لا یضل ربی ولا ینسی" موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اس کا علم خدا ہی کے پاس ہے ایک کتاب میں (جسے اس نے سب محفوظ کر رکھا ہے محض علم پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اتمام حجت کے لئے سب کو لکھ بھی دیا ہے) میرے پروردگار کو غلطی اور بھول نہیں ہوتی (پس لکھنا اس غرض سے نہیں ہے کہ یاد رہے بلکہ اور حکمتوں کی بنا پر ہے) پس حالت تو

ان کی علم الٰہی میں منضبط ہے۔ اب صرف انتظار وقت موعود آنیکا ہے اس وقت عذاب اکبر کا ظہور ہو جاویگا آگے حق تعالیٰ کے کمال علم و حکمت کو چند واقعات مشاہدہ سے ثابت کیا ہے تاکہ اُن کا قادر ہونا بھی ثابت ہو جاوے اور ایقاع وعید کے لئے اسی علم و قدرت کی ضرورت ہے چنانچہ ارشاد ہے" الذی جعل لکم الارض مہدا وسلک لکم فیہا سبلا وانزل من السماء ماء اجس نے زمین کو تمہارے لئے بستر بنایا (جو نہ بہت سخت ہے لوہے کے مانند جسپر لیٹنے بیٹھنے سے جسم کو تکلیف ہو نہ بہت نرم ہے گارے کے مانند جسمیں پاؤں دھنسنے لگے اور یہ کمال حکمت ہے) اور اس میں تمہارے لئے راستے چلادئے (اگر زمین بہت سخت یا بہت نرم ہوتی تو اسپر راستوں کے نشانات یا تو قائم ہوتے یا باقی نہ رہتے تو چلنے والے کو پتہ نہ چلتا کہ اب راستہ کدھر کو ہے یہ بھی کمال حکمت ہے کہ زمین کو ایسا بنایا ہے جسپر مختلف راستے الگ الگ محفوظ رہتے ہیں)۔ اور آسمان سے پانی اتارا (یہ بھی کمال حکمت پر مبنی ہے) اس کے بعد ارشاد ہے" فاخرجنا بہ ازواجا من نبات شتی وکلوا وارعوا انعامکم ان فی ذلک لآیات لاولی النہی" پھر ہم نے پانی کے ذریعہ سے قسم قسم کی نباتات پیدا کیں ان میں سے خود بھی کھاؤ اور اپنے جانوروں کو بھی چراؤ اس میں عقل والوں کے لئے بڑی نشانیاں ہیں کمال قدرت الٰہیہ غیر متناہیہ پر) یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اوپر تو حق تعالیٰ کا ذکر غیبت کے صیغوں سے تھا یہاں تکلم کے ساتھ ہونے لگا۔ اہل ظاہر نے تو اس کا یہ جواب دیا ہے کہ" انزل من السماء ماء" تک موسیٰ علیہ السلام کا کلام تھا انھوں نے تو بارش کے نازل ہونے پر گفتگو کو ختم کر دیا تھا آگے حق تعالیٰ نے پیدائش نباتات کا ذکر تتمیم کلام کے لئے بڑھا دیا اور بتلا دیا کہ پانی سے نباتات کا پیدا ہونا نہایت عجیب حکمت پر مبنی ہے اور بعض مغلوبین اہل حال نے کہا ہے کہ نہیں یہ بھی موسیٰ علیہ السلام ہی کا کلام ہے اس وقت ان پر وحدت الوجود کا غلبہ ہو گیا تو غائبانہ ذکر چھوڑ کر تکلم کے ساتھ فرمانے لگے کہ پھر ہم نے پانی سے نباتات کو نکالا اور اس وقت موسیٰ علیہ السلام کا" فاخرجنا" فرمانا ایسا ہی تھا جیسا کہ شجرۂ طور نے کہا تھا" انی انا اللہ رب العلمین" یہ اہل حال بہت دور کی بات کہتے ہیں ان کو ہر شخص

نہیں سمجھ سکتا۔ طلبہ تو وہی جواب سمجھ لیں جو اہل ظاہر نے دیا ہے وہ اہل حال کی باتوں میں غور نہ کریں مگر اپنا انکار بھی نہ کریں (کیونکہ یہ ضرور نہیں کہ جو بات تمہارے سمجھ میں نہ آئے وہ غلط ہی ہو) بہرحال چاہے موسیٰ علیہ السلام کا کلام ہو یا حق تعالیٰ نے اُن کے کلام کو پورا کیا ہو یہ مضمون اسی گفتگو کے متعلق ہے جو فرعون سے ہو رہی تھی اس لئے یہاں حق تعالیٰ نے مراقبۂ ارض ہی کی تعلیم فرمائی کیونکہ فرعونی "مراقبۂ ارض" ہی کے قابل تھے "مراقبۂ سماء" کے قابل نہ تھے۔ یہ بھی اس مقام پر ایک نکتہ ہے جس میں ہم پر بھی یہ چھینٹا ہے کہ تم فرعون اور اُس کی قوم کی طرح غبی ہو اس لئے تم کو بھی مراقبۂ ارض کی تعلیم کی جاتی ہے (یہ تیسرا نکتہ ہے ۱۲) مگر حق تعالیٰ کے یہاں ایسے اغبیا کی بھی دوا موجود ہے وہ اذکیاء کو مراقبۂ سماء تعلیم فرماتے ہیں (جیسا کہ ایک مقام پر ارشاد ہے "ویتفکرون فی خلق السموات والارض (قدم فیہ السموات لان المقام مقام مدح اولی الالباب ۱۲ جامع) اور اغبیا کو مراقبہ ارض بتلاتے ہیں وہ زمین ہی کا مراقبہ کریں تو ان کے دن بھلے ہو جائیں اور اس کا سہل طریقہ یہ ہے کہ زمین پر چلتے ہوئے یہ سوچو کہ اس وقت ہم اوپر چل رہے ہیں۔ اور عنقریب زمین کے نیچے اوتریں گے۔ موت کا خیال بھی نہ ہو تو صرف اتنا ہی سوچ لینا بھی کافی ہے۔ پھر اس سے یہ سوچ پیدا ہو گی کہ جب ہم کو زیر زمین جانا ہے تو اس وقت کے لئے کیا کرنا چاہئے اس وقت اعمال ہی کام دیں گے اور کوئی چیز ساتھ نہ جائیگی۔ صاحبو! یہ بات تو ذرا سی ہے مگر اسپر عمل کرکے دیکھو چند دن میں حالت بدل جائیگی دوا کا نفع نام بتانے سے نہیں ہوا کرتا استعمال کرنے سے ہوتا ہے آپ اسپر عمل کیجئے نفع خود معلوم ہو جائے گا۔ پھر جب عمل کی فکر ہو گی تو آپ کو معلوم ہو گا کہ کام تین قسم کے ہیں ایک وہ جو زیر زمین نافع ہیں دوسرے وہ جو مضر ہیں تیسرے وہ جو نہ نافع ہیں نہ مضر ہیں جو مضر ہیں ان کو تو فوراً چھوڑ دو گے۔ رہی وہ جو نہ نافع ہیں نہ مضر ہیں وہ بھی قابل ترک ہیں۔ کیونکہ آدمی جب اپنے گھر میں آتا ہے تو ترکاری دال گوشت آٹا ناج وغیرہ لیکر داخل ہوتا ہے جو معاش کے لئے ضروری اور مفید ہیں سانپ بچھو

لیکر گھر میں کوئی نہیں گھستا جو کہ مضر ہیں۔ اور جیسے سانپ بچھو لیکر گھر میں نہیں آتے اسی طرح ڈلے پتھر لیکر بھی نہیں گھستے۔ آخر کیوں۔ محض اس واسطے کہ فضول ہیں۔ ان میں نفع کیا اور جو کوئی ڈلے پتھر لائے بھی تو بیوی سے بحث ہوگی وہ کہے گی کہ ان چیزوں کا گھر میں کیا کام تھا آپ کہیں گے کہ ضرر بھی تو کچھ نہیں اس پر وہ آپ کو بے وقوف بنائے گی کہ میاں پھر ساری بستی کا کوڑا گھر ہی میں لاکر جمع کردو کیونکہ اس میں فائدہ نہیں تو ضرر بھی کچھ نہیں غرض بیوی سے خوب بحث ہوگی۔ ان شاء اللہ وہی جیتے گی تو جب دنیا کے گھر میں تم فضولیات جمع نہیں کرتے گو مضر بھی نہ ہو تو آخرت میں فضول اعمال کیوں لیجاتے ہو۔ بس وہی کام کرو جو آخرت کے لئے ضروری اور مفید ہوں اور جو مضر یا فضول ہوں اُن سب کو چھوڑ دو۔ صاحبو! اس مراقبہ کا نافع ہونا تجربہ میں آگیا ہے اول یہ مضمون بے ساختہ میرے قلب میں آیا تھا۔ اُس وقت کسی آیت سے استنباط کرکے میں نے اس کو نہ سوچا تھا بلکہ ویسے ہی گھر جارہا تھا کہ دفعتہ چلتے ہوئے خیال آیا کہ اس وقت تو ہم زمین کے اوپر چل رہے ہیں اور ایک دن اس کے اندر ہوں گے اس خیال کے آتے ہی حالت بدل گئی اور قلب پر خاص اثر ہوا اور کئی دن تک اسکا غلبہ رہا پھر آیات قرآنیہ میں بھی اس کی تعلیم نظر آئی اور میری عادت ہے کہ جو مضمون مجھے نافع معلوم ہوتا ہے جی چاہا کرتا ہے کہ اپنے بھائیوں کو اس سے مطلع کردوں کیونکہ مثل مشہور ہے ع

کہ حلوا بہ تنہا نہ بایست خورد

اس لئے میں نے یہ مضمون بیان کیا اور اسی لئے اس آیت کو اختیار کیا "کیفما اتفق" اختیار نہیں کیا میں نے اپنے بعض دوستوں کو بھی یہ مراقبہ تعلیم کیا ہے بہت ہی نفع ہوا غرض اسکا نافع ہونا محقق ہوچکا ہے اس لئے میں سب کو ہدایت کرتا ہوں کہ چلتے پھرتے اس کا مراقبہ رکھا کرو کہ ایک دن ہم زیر زمین ہوں گے یہ مراقبہ سہل بھی بہت ہے۔ اسمیں کچھ وقت نہیں حق تعالیٰ نے ہم کو نزدیک کی چیزوں میں غور کرنے کی تعلیم فرمائی ہے تاکہ کچھ دشواری نہ ہو چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں "افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت و الی السماء کیف رفعت و الی الجبال کیف نصبت و الی الارض کیف سطحت" کیا اونٹ کو نہیں دیکھتے

کیونکر پیدا کیا گیا ہے اس میں سب سے پہلے اونٹ کا ذکر کیا گیا ہے۔ کیونکہ اہل عرب کثرت سے اسی پر سوار ہوتے ہیں اور راکب جمل کو زیادہ تلبس اونٹ ہی سے ہوتا ہے پھر اہل عرب کو اونٹ سے محبت بھی بہت ہے چنانچہ ایک شاعر اپنے محبوب کے خال رخسار کی تشبیہ میں کہتا ہے کہ رخسارہ پر تل ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بالو کے میدان میں اونٹ کی مینگنی پڑی ہو اس سے اونٹ کے ساتھ اس کا تعلق ظاہر ہے اور ایک شاعر کہتا ہے ؎

"احبہا وتحبنی ویحب ناقتہا بعیری"

میں محبوبہ سے محبت رکھتا ہوں اور وہ مجھ سے محبت کرتی ہے اور میرے اونٹ کو اسکی اونٹنی سے محبت ہے اس لئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کیا یہ لوگ ہمارے دلائل قدرت کو اونٹ میں نہیں دیکھتے کہ اس کو کیسا عجیب خلقت بنایا ہے اور کیسا جفاکش اور صابر و بردبار کر دیا ہے پھر اونٹ پر سوار ہوتے ہی آدمی اونچا ہو جاتا ہے تو سامنے آسمان نظر آتا ہے اس لئے اس کے بعد فرماتے ہیں "والی السماء کیف رفعت" اور آسمان کو نہیں دیکھتے کیونکر بلند کیا گیا ہے۔ پھر سفر شروع کرنے کے بعد دائیں بائیں پہاڑ نظر آتے ہیں تو آگے فرماتے ہیں "والی الجبال کیف نصبت" اور پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کس طرح زمین میں نصب کئے گئے ہیں پھر گاہے گاہے سواری کی حالت میں زمین پر بھی نظر پڑ جاتی ہے سامنے بڑے بڑے میدان آتے ہیں جن کو سوار طے کرتا جاتا ہے تو فرماتے ہیں "والی الارض کیف سطحت" اور زمین کو نہیں دیکھتے کس طرح بچھائی گئی جو شخص کبھی اونٹ پر سوار ہوا ہو یا اس نے راکب جمل کی حالت میں تامل کیا ہو وہ اس ترتیب کی خوبی اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کہ پہلے اونٹ کا ذکر کیا پھر آسمان کا پھر پہاڑوں کا پھر زمین کا کیونکہ رکوب کی حالت میں اکثر نظر اسی ترتیب سے واقع ہوتی ہے بہرحال جن چیزوں سے ہمکو زیادہ قرب اور زیادہ تلبس ہوتا ہے حق تعالیٰ نے انہی میں تامل کی تعلیم فرمائی ہے اور یہاں سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوگئی کہ حق تعالیٰ نے دلائل قدرت معلوم کرنے کے لئے اونٹ اور پہاڑ اور آسمان و زمین کا مراقبہ تو بتلایا ہے مگر انار و دسوان کی طرف کہیں متوجہ نہیں فرمایا کیونکہ ان میں توجہ کرنے سے دلائل قدرت پر نظر نہیں رہتی بلکہ خواہش نفس پر نظر رہجاتی ہے آگے نہیں بڑھتی

معلوم ہوا کہ دلائل قدرت کا مشاہدہ انہی چیزوں میں ہو سکتا ہے جہاں خواہش نفس کا موقع نہ ہو ورنہ دلائل قدرت تو نظر قلب سے غائب ہو جائیں گے اور محض خواہش ہی خواہش رہجائیگی۔ پس اب جو لوگ یہ دعوے کرتے ہیں کہ ہم امارد و نسوان کو قدرت خدا دیکھنے کے لئے گھورتے ہیں ان کا جھوٹا ہونا ظاہر ہو گیا اگر واقعی ان کو دلائل قدرت کا مطالعہ مقصود ہوتا تو وہ ان چیزوں میں نظر کرتے جنکا مراقبہ حق تعالیٰ نے تعلیم فرمایا ہے طالب کو تو انمیں بھی وہی قدرت نظر آتی ہے جو خوبصورت لڑکوں اور عورتوں میں نظر آتی ہے بلکہ ان سے زیادہ کیونکہ ان کے مطالعہ میں محض دلائل قدرت ہی پر نظر ہوتی ہے اور کسی بات کا خیال نہیں آتا۔ شیخ سعدی فرماتے ہیں ؎

محقق ہماں بیند اندر ابل کہ در خوبرویان چین و چگل

صاحبو! امارد و نسوان کو وہی گھورتا ہے جس کو خدا مطلوب نہیں بلکہ مخلوق ہی مطلوب ہے شیخ اس کے متعلق فرماتے ہیں ؎

نداد ند صاحبدلاں دل بہ پوست وگر ابلہے داد بے مغز اوست

یعنی عقلمند کبھی پوست اور کھال کو دل نہیں دیا کرتا اور اگر کوئی دے تو وہی بیوقوف ہے اس لئے ان چیزوں سے نظر کو بچانا چاہیئے ان سے اصلاح نہ ہوگی فساد بڑھے گا قدرت کے دلائل دیکھنے کے لئے زمین ہی کو دیکھ لو جو سب کی ماں ہے کہ تم کیوں کر گیہوں اور میووں اور شلجم مولی میں سے نکلکر نطفہ کی شکل میں آئے۔ پھر اس سے کس حکمت کے ساتھ اس خوبصورت جسم کی طرف منتقل کئے گئے اور کیونکر پیدا ہوئے پھر کیسے پلے پلائے جوان ہوئے پھر یہ بھی سوچ لو کہ ایک دن زمین کے نیچے بھی جانا ہے اور زمین میں جانے سے پہلے نزع کی حالت ہوگی بیماری ہی میں مال و دولت و جائداد وغیرہ سے آپ کا تعلق کم ہو جائے گا اس وقت اپنے لئے کچھ نہ کر سکو گے نہ کسی کو خیرات دے سکو گے نہ فوت شدہ نماز روزہ کی تلافی کر سکو گے بس ثلث مال میں جو چاہو کر لو اس سے زیادہ حق نہ ہوگا۔ پھر دفن کے بعد فرشتے آویں گے نہ معلوم سوال و جواب کیسے ہوں کیسے نہ ہوں اس کو سوچو تو پھر حالت کی اصلاح ہوگی اور فکر پیدا ہوگی۔

کہ وہ کون سے اعمال ہیں جن سے وہاں بیڑا پار ہو۔ اس کے لئے آپ کو دو چیزوں کی ضرورت ہو گی ایک بقدر ضرورت علم کی دوسرے عمل کی اور اگر کسی سے تحصیل علم نہ ہو سکے تو وہ اہل اللہ کی صحبت اور ان سے ملنا ملانا اختیار کرے اور ان سے پوچھ پوچھ کر عمل کرے اسکو لوگوں نے بالکل ہی ترک کر دیا حالانکہ یہ سب کی اصل ہے اور کم و بیش اس کی ضرورت سب کو ہے۔ بخدا اصلاح حال میں اس سے بڑھ کر کوئی چیز بھی فائدہ مند نہیں مولانا فرماتے ہیں ؎

گر تو سنگِ خارہ و مرمر شوی چوں بصاحبدل رسی گوہر شوی

صحبت اہل اللہ کا سب کو اہتمام کرنا چاہئے اور جن کو علم کا حاصل کرنا مطالعہ سے دشوار ہو وہ تو ضرور اس کا اہتمام کریں کہ اس کے ذریعہ سے علم و عمل دونوں سہولت سے حاصل ہو جائیں گے۔ اب میں ختم کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ ہماری اصلاح فرمائیں آمین۔ وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا و مولانا محمد و علی آلہ واصحابہ اجمعین والحمد للہ رب العالمین +

الاحیاء

کا

پانچواں وعظ مسمّٰی بہ

خیرالارشاد + لحقوق العباد

منجملہ ارشادات حکیم الامت مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب

تھانوی دام فیضہ

(عبدالواسع جعفری کے اہتمام سے)

مطبع انوار احمدی واقع الہ آباد سے شایع ہوا

قیمت سالانہ ۔ے ر علٰحدہ قیمت اس وعظ کی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الوعظ المسمّٰی بہ

خیرالارشاد لحقوق العباد

این	متی	کم	کیف	لِمَ	ماذا	کیف	متفرقات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنی دیر ہوا	کیسے کیا ہوا	کیوں ہوا	کیا مضمون تھا	کس طرح زبان یا قلم سے ادا ہوا	متعین کی تعیین تعوذ المستعون
جلال آباد مکان تحصیلدار صاحب ضلع مظفرنگر	۲۴ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۴ھ روز دوشنبہ بوقت چاشت	۳ گھنٹہ ۵۰ منٹ	تخت پر کرسی رکھوا کر کرسی پر بیٹھکر بیان فرمایا	تحصیلدار صاحب کی درخواست پر	حقوق العباد کے اہتمام کی تاکید اور حق العبد کے فوت ہونے میں تنگدستی فوت ہونے کا بیان اور کارکنان گورنمنٹ کا کارکنان گورنمنٹ کے ساتھ برتاؤ کے بارے میں	کس طرح بیان ہوا	الاشتات

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن

یضلله فلا هادی له ونشهد ان لا الٰه الا الله وحده لا شریك له ونشهد ان سیدنا ومولانا محمدا عبده ورسوله صلی الله تعالیٰ علیه وعلیٰ اله واصحابه وبارك وسلم **اما بعد** فاعوذ بالله من الشیطان الرجیم ط بسم الله الرحمن الرحیم ط انما السبیل علی الذین یظلمون الناس ویبغون فی الارض بغیر الحق اولئك لهم عذاب الیم ط

یہ ایک آیت ہے سورہ شوریٰ کی اس میں حق تعالیٰ نے حقوق العباد کے متعلق ایک ضروری مضمون ارشاد فرمایا ہے گو سباق اور سیاق کے لحاظ سے ایک خاص حق العباد کے متعلق وارد ہے۔ مگر عموم الفاظ سے مطلقاً حقوق العباد کے متعلق بھی ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ عبارۃ النص سے تو اس کی دلالت معنی مسوق لہ پر ہے جو کہ ایک خاص حق العبد ہے۔ اور اشارہ النص سے مطلقاً حقوق العباد پر دلالت ہے یعنی مطلق حقوق العباد پر اس کی دلالت اشارۃً ہے نہ کہ قصداً مگر دست خفی نہیں بلکہ صریح ہے اور اس کو میں نے اس لئے اختیار کیا ہے کہ جی یوں چاہا کرتا ہے۔ کہ ہر موقع پر خواہ موقع زمانی ہو یا مکانی مضمون ضرورت کے موافق بیان ہوا اور یوں تو شریعت کے سارے مضامین ہی ضروری ہیں مگر ان میں سے بھی جن کی شدید ضرورت ہو اس کا بیان کیا جائے اور یہ شدت ہماری غفلت اور بے التفاتی سے بڑھ جاتی ہے کہ ایک حکم ضروری العمل ہو اور اس سے غفلت اور بے التفاتی برتی جارہی ہو۔ چنانچہ اس وقت میرے خیال میں اس جگہ حقوق العباد کے متعلق بیان کی زیادہ ضرورت ہے بلکہ جب مجھ سے کئی ہفتہ پہلے بیان کے لئے کہا گیا تھا تو اسی وقت دل میں یہ بات آئی تھی کہ اس جگہ حقوق العباد کے متعلق بیان کی ضرورت ہے مگر اسوقت باحتمال بارش کے یہاں آنے کی ہمت نہ ہوئی اور میں نے کہدیا تھا کہ جس دن بادل نہ ہو اس دن چلوں گا چنانچہ اس جمعہ کو جو مجھ سے تاریخ پوچھی گئی تو میں نے پیر کا دن اسی شرط کے ساتھ معین کر دیا تھا گو آج بھی بادل گھرا ہوا تھا اور ہمت آنے کی نہ ہوتی تھی مگر جب سواری آگئی تو میں نے بار بار سواری کو واپس کرنا گوارا نہ کیا اور خدا کے نام پر چلا آیا (اور بحمداللہ بادل کے وقت گئے تھے

اور کھلے میں واپس آئے لوٹتے وقت باول نہ رہا تھا ۱۲ ط) تو اس مضمون کا خیال مجھے درخواست کے ساتھ ہی آگیا تھا چنانچہ آج اس کو بیان کرنے کا موقع ملا ہے تو بیان کرتا ہوں اور شروع ہی سے میں نے اطلاع بھی کردی کہ میں یہ بیان کرونگا میری عادت ہے کہ جس مضمون کو بیان کرنا مقصود ہوتا ہے میں اس کو پہلے ہی صاف صاف کہدیتا ہوں تاکہ روح بیان اور خلاصہ کے علم سے باقی مضمون سہولت سے سمجھ میں آجائے نیز اس میں چونکہ تفصیل بعد الاجمال ہوتی ہے اس لئے وہ اوقع فی النفس بھی ہوتی ہے بخلاف عام مقرروں کے کہ ان میں بعض دفعہ بیان کرنے والا مقصود کو توطیہ و تمہید کے بعد ادا کرتا ہے اور اس میں بھی ایک حکمت ہے وہ یہ کہ اس میں دیر تک سامعین کو مضمون مقصود کا اشتیاق رہتا ہے۔ اور اشتیاق کے بعد جو بات معلوم ہوتی ہے اس کی وقعت ہوتی ہے اور دوسرے یہ بھی حکمت ہے کہ اگر وہ مضمون ایسا ہو جس سے طبائع پر گرانی ہوتی ہو تو پہلے ہی سے اس مضمون کو سن کر لوگوں پر گرانی نہ ہو اور بعض سامعین اٹھ اٹھ کر نہ چلدیں جیسا کہ چندے کے متعلق بیان کرنے والے پہلے ہی سے یہ نہیں کہتے کہ آج چندہ کا بیان ہوگا بلکہ اول مذہب کے حقوق اور علم کے فضائل بیان کرتے ہیں پھر یہ کہتے ہیں کہ حفاظت اسلام کی بہتر صورت مدارس وغیرہ کا قیام ہے پھر کہتے ہیں کہ انکا قیام سب مسلمانوں کی توجہ و ہمت سے ہوسکتا ہے اب چندہ کی ترغیب دیتے ہیں مگر میں ایسا نہیں کرتا اول تو میں چندہ کے متعلق بیان ہی نہیں کرتا اور اگر کبھی کرتا ہوں تو اول ہی کہدیتا ہوں کہ آج چندہ کا بیان ہوگا جس کا جی چاہے بیٹھے اور جس کا جی نہ چاہے اٹھ کر چلا جائے میں چندہ کے مضمون کو توطیہ و تمہید کے بعد اس لئے نہیں کہتا کہ اس سے سننے والوں کو دھوکا ہوتا ہے کیونکہ وہ تو یہ سمجھ کر بیٹھتے ہیں کہ ہم سے کچھ مانگا نہ جائیگا اور جب اخیر میں انسے چندہ کو کہا گیا تو بعض کو ناگوار ہوتا ہے اور وہ اپنے دل میں کہتے ہیں کہ ہم کو پہلے سے یہ معلوم ہوتا کہ اخیر میں ہم سے چندہ مانگا جائیگا تو ہم اتنی دیر تک اپنا وقت نہ ضائع کرتے دوسرے اس طرز سے تمہیدی مضامین کی ساری وقعت سامعین کے دل سے نکل جاتی ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ بس یہ سارا زور و شور اس لئے تھا کہ ہمیں چندہ دو سو میں مسلمانوں کو دھوکہ دینا نہیں چاہتا

اور نہ احکام علوم شرعیہ کی وقعت کھونا چاہتا ہوں جس مضمون کے متعلق مجھکو یہ شبہہ ہوتا ہے کہ اس سے بعض سامعین پر گرانی ہوگی میں پہلے ہی اس کو ظاہر کر دیتا ہوں اس کے بعد جو کوئی بیٹھے گا مطمئن ہو کر بیٹھے گا اور مجھپر اس کے بیٹھے رہنے کا کچھ احسان نہ ہوگا اور نہ وہ میرے اجمال و ابہام کی وجہ سے بندھے گا ان وجوہ سے میں ابہام کو پسند نہیں کرتا اور اگر کسی کو توطیہ و تمہید سے صرف دفع وحشت عن المضمون مقصود ہو اور کوئی نیت نہ ہو تو تمہید کے بعد مقصود کے بیان کرنے کا بھی مضائقہ نہیں کیونکہ دفع وحشت سامع بھی مطلوب ہے۔ مگر جہاں تک میں دیکھتا ہوں اس پیشہ والوں کی نیت توطیہ و تمہید سے یہ نہیں ہوتی کہ سامعین کی وحشت مضمون سے دفع ہو بلکہ زیادہ تر اپنی مصلحت مدنظر رکھتے ہیں کہ کہیں لوگوں کو ہم سے وحشت نہ ہو جائے اس لئے وہ چندہ کے مضمون کو ایسی رنگ آمیزی اور تمہید کے بعد زبان پر لاتے ہیں کہ لوگوں کو ان حضرت واعظ سے وحشت نہ ہو مگر میں اس کو خیانت سمجھتا ہوں۔ کہ واعظ اپنے مصالح کا لحاظ کر کے وعظ کہے اس کو تو مخاطبین کی مصلحت کا لحاظ کرنا چاہیئے کہ اُن کی اصلاح کس طرز میں زیادہ ہے چاہے اپنی مصلحت رہے یا جائے مجھ کو تو اس سے غیرت آتی ہے کہ اپنی مصالح کا لحاظ کر کے بیان کروں ایک بار میں جودھپور گیا اور مجھ سے اہل شہر نے وعظ کی درخواست کی تو ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ وعظ میں امام ابوحنیفہ کے فضائل زیادہ بیان کیجئے گا۔ کیونکہ یہاں کے لوگ آپکو اور آپکی جماعت کو ضعیف فی الحنفیۃ سمجھتے ہیں (یعنی غیر مقلدی کی طرف مائل سمجھتے ہیں ۱۲) میں نے کہا کہ اب تو میں ہرگز یہ مضمون بیان نہیں کروں گا۔ اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ میں لوگوں کو اپنا معتقد بنانے کے لئے وعظ کہوں کہ بھائیو ہمیں حنفیت میں ضعیف نہ سمجھو کیونکہ دیکھو ہم امام صاحب کے ایسے معتقد ہیں تو یہ تو محض اپنی مصلحت ہوئی سامعین کی اسمیں کیا مصلحت ہوئی البتہ اگر سامعین میں کوئی امام صاحب سے غیر معتقد ہوتا تو اس صورت میں امام صاحب کے فضائل بیان کرنے میں بیشک مخاطبین کی مصلحت تھی کہ ایک امام کے ساتھ بدگمانی کرنے سے لوگوں کو رکاوٹ ہو جاتی مگر جب سامعین میں امام صاحب سے

غیر معتقد کوئی نہیں تو اب مضمون ان کی مصلحت سے نہ ہوا بلکہ اس میں محض اپنی مصلحت رہگئی اور مجھ کو اس سے غیرت آتی ہے کہ لوگوں کو اپنا معتقد بنانے کے لئے کوئی مضمون بیان کروں چنانچہ میں نے یہ مضمون (فضائل امام کا) نہیں بیان کیا بلکہ میرے نزدیک سامعین کی اصلاح کے لئے جس مضمون کی ضرورت تھی وہ بیان کیا اور شروع میں یہ بھی کہدیا کہ بعض خیر خواہوں کی یہ رائے تھی کہ آج فضائل امام ابوحنیفہ بیان کئے جائیں اور اس میں مصلحت یہ بتلائی گئی کہ مجھے یہاں پر کہ بعض لوگ ضعیف فی الحنفیۃ سمجھتے ہیں تو ان کے اس خیال کی اصلاح ہو جائیگی مگر میں اس کو گوارا نہیں کرتا کہ اپنی نصرت و مصلحت کے لئے مریضوں کی مصلحت کو فوت کروں فضائل امام کے بیان سے آپ لوگوں کو کچھ نفع نہ ہوگا کیونکہ آپ میں امام صاحب سے غیر معتقد کوئی نہیں ہاں بظاہر میرا ایک نفع تھا سو میں اپنے نفع کے واسطے بیان کرنا نہیں چاہتا وہ طبیب طبیب نہیں ہے جو نسخہ لکھتے ہوئے اپنی مصالح کی رعایت رکھے (مثلاً ایسی دوائیں لکھے جو اسی کے پاس ملتی ہوں ۱۲) اور مریض کی مصالح کو نظر انداز کردے اس لئے میں اس مضمون کو چھوڑ کر وہ مضمون اختیار کرتا ہوں جو آپ کے لئے نافع ہے اور جو کچھ بیان کروں گا قرآن و حدیث سے بیان کرونگا جس پر ہر مسلمان عمل کرنے کا طالب ہے اس لئے آپ مضمون پر نظر رکھیں اسکو نہ دیکھیں کہ بیان کرنے والا کیسا ہے۔ میرے اندر ہزاروں عیوب سہی لیکن انشاء اللہ آپ کو وہی راستہ بتلاؤں گا جو آپ کے واسطے نافع ہے اور اس کو نافع میرے ہی کہنے سے نہ سمجھو خالی الذہن ہو کر سن لو پھر خود غور کرو یا جس سے عقیدت ہو اس سے تحقیق کر لو اس کے بعد بھی اگر غلطی ہو گی معذور ہو اس کے بعد پھر جو بیان ہوا تو سامعین پر بہت بڑا اثر ہوا۔ تجربہ یہ ہے کہ جب مخاطب کی مصلحت کا لحاظ کر کے بیان کیا جائیگا تو اس کا اثر ضرور ہوگا۔ اس لئے میں ہمیشہ مخاطبین کی مصلحت و ضرورت کا لحاظ رکھتا ہوں اور خلاف ضرورت بیان نہیں کرتا۔ اسی لئے میں نے اس وقت یہ مضمون "حقوق العباد" کا اختیار کیا ہے کیونکہ میرے خیال میں اس مقام پر یہ سامعین کی مصلحت و ضرورت کا مضمون ہے شاید کسی کو یہ خیال ہوا ہوگا کہ یہ تو پھیکا مضمون ہوگا تو صاحب

بیان تو علاج ہے اور علاج و دوا میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ یہ دوا پھیکی ہے یا میٹھی بلکہ ضرورت اور نفع کو دیکھا جاتا ہے اگر کوئی دوا پھیکی ہی ہو یا اس سے بڑھکر یہ کہ کڑوی ہو مگر ہو ضرورت کے موافق کہ اس سے زیادہ نافع کوئی دوا نہ ہو تو بتلایئے اسوقت اس کو ترجیح ہوگی یا اس میٹھی دوا کو جو نہ ضرورت کے موافق ہے نہ زیادہ نافع ہے اس لئے اس کو مت دیکھو کہ یہ مضمون پھیکا ہے یا جوشیلا بلکہ اس کو دیکھئے کہ یہ آپ کی ضرورت کا بھی ہے یا نہیں سو ضرورت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ دیندار لوگ بھی عبادات میں تو فرائض و واجبات بلکہ مستحبات تک کا اہتمام کرتے ہیں یعنی جو لوگ کام کرنے والے ہیں اگرچہ بعض ایسے بھی ہیں کہ سب ہی اعمال میں کوتاہی کرتے ہیں مگر جو کام کرنے والے ہیں وہ عبادات میں تو فرائض و واجبات کے لئے بھی کوشش کرتے ہیں مستحبات کی بھی پابندی کرتے ہیں درود شریف اور تسبیحات حتی کہ دلائل الخیرات اور وظائف تک کا اہتمام کرتے ہیں اور گو یہ دلائل و حزب برکت کی چیزیں ہیں اور ان میں ثواب بھی ہے مگر دلائل الخیرات اور حزب البحر وغیرہ یہ جتنے وظائف آجکل معمول بہا ہیں حدیث کے اوراد کے برابر ہرگز نہیں ہیں غرض بعض لوگ ان زوائد کے پابند ہیں مگر حقوق العباد کا اُن کو بھی خیال نہیں بس آجکل لوگوں نے محض نوافل اور تسبیحات پڑھنے کو دینداری سمجھ لیا ہے حالانکہ اصل دینداری معاملات سے معلوم ہوتی ہے چنانچہ سلف کے نزدیک دینداری کا معیار زیادہ تر معاملات ہی تھے۔ صرف نماز و روزہ کرتے ہوئے دیکھ کر کسی کے دیندار ہونے کا حکم نہ لگاتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دربار میں ایک مقدمہ پیش ہوا جسمیں مدعی کے پاس دو گواہ تھے ایک گواہ کی عدالت تو حضرت عمر کو معلوم تھی دوسرے گواہ کی عدالت کا ان کو علم نہ تھا تو آپ نے حاضرین سے دریافت فرمایا کہ اس گواہ کی عدالت کے متعلق تم سے کوئی گواہی دیتا ہے ایک شخص کھڑا ہوا اور اس نے کہا کہ میں اس کے عادل ہونے پر گواہ ہوں حضرت عمر نے پوچھا کہ تجھ کو اسکا عادل ہونا کیسے معلوم ہوا "ھل جاورتہ ام صحبت معہ فی السفر الذی یسفر عن حقیقۃ المرء او عقدت معہ عقداً" کیا تو اس کے پڑوس میں کبھی رہا ہے یا سفر میں کبھی تیرا اور اسکا ساتھ ہوا ہے جس سے انسان کی مخفی حقیقت

ظاہر ہوتی ہے یا تو نے اس کے ساتھ کوئی معاملہ بیع و شرا کا کیا ہے اس نے کہا نہیں "قال فلعلک رأیتہ خارجا من المسجد بعد الصلوٰۃ" فرمایا تو شاید تم نے اس کو نماز پڑھکر مسجد سے نکلتا ہوا دیکھ لیا ہوگا اس نے کہا جی ہاں فرمایا "فانت لا تعرف" تم اس کو نہیں پہچانتے محض اتنی بات سے کسی کا دیندار اور عادل ہونا معلوم نہیں ہوسکتا تو دیکھئے حضرت عمر نے محض نماز اور تسبیحات کو دینداری کے لئے کافی نہیں سمجھا بلکہ اس کے ساتھ معاملات کی درستی کو بھی ضروری سمجھا مگر آجکل ہم لوگوں نے اس کو دین سے بالکل خارج سمجھ رکھا ہے حالانکہ یہ دین کا ایسا ضروری جزو ہے کہ اس کے بدون آدمی گواہی دینے کے قابل نہیں ہوتا اس سے آپ کو اس مضمون کی ضرورت معلوم ہوگئی ہوگی کیونکہ جس بات سے اتنی غفلت ہو کہ باوجود ضرورت کے لوگ اس کو ضروری نہ سمجھتے ہوں وہ بہت زیادہ اہتمام کے قابل ہوگا اس لئے غور سے اس مضمون کو سننا چاہئے گو اس میں لطف نہ آئے اور وہ مضمون یہ ہے کہ ہم لوگوں نے "حقوق العباد" کو بالکل ہی پس پشت ڈال رکھا ہے اور اس مرض کا ایک سبب ہے پہلے اس کو معلوم کرلینا چاہئے اور سبب کے علم سے ایک گونہ ان لوگوں کا عذر بھی معلوم ہوجائیگا۔ جن کی میں شکایت کر رہا ہوں اور عذر کے بعد ان کا جرم بھی ہلکا ہوجائیگا گو ان لوگوں کو اپنا عذر خود بھی معلوم نہیں مگر میں تبرعاً خود انکا عذر بتلائے دیتا ہوں کیونکہ عذر کا جواب دیدینے سے پھر حجت تمام ہوجاتی ہے اس لئے میں اتمام حجت کے لئے اُن کا عذر بیان کرکے اُن کا جواب دینا چاہتا ہوں۔ دوسرے سبب مرض کے نہ جاننے سے مرض کا ازالہ بھی سہل ہوجائیگا کیونکہ ع انما الاصلاح تبدیل المزاج

اصلاح کا طریقہ یہی ہے کہ مریض کے مزاج کو بدل دیا جائے جس کی حقیقت یہ ہے کہ جو سبب ہے اس کے مرض کا اس کو زائل کردیا جائے تو سنئے کہ تاکد حق کے دو سبب ہوتے ہیں کبھی تو عظمت حق کی وجہ سے حق کا تاکد ہوتا ہے اور کبھی حاجت کی وجہ سے عظمت حق کی وجہ سے حق کا موکد ہونا تو ایسا ہے جیسے باپ کسی کام کو کہے کہ یہ کرو اور پڑوسی کہے کہ مت کرو یہاں عقلاً اور شرعاً باپ کی اطاعت واجب ہے کیونکہ اس کی عظمت پڑوسی کی عظمت سے زیادہ ہے اس لئے پڑوسی کی بات پر عمل نہ کیا جائیگا بلکہ باپ کی بات پر عمل کیا جائیگا

خواہ اس کام میں باپ کا ذاتی نفع بھی نہ ہو لیکن عظمت کی وجہ سے اس کی اطاعت پڑوسی کی اطاعت پر مقدم ہوگی اور خواہ اس کا کچھ نفع ہو جیسے باپ کہے کہ میرا بدن دبا اور پڑوسی کہے کہ میرا بدن دبا تو بتلایئے اس صورت میں پڑوسی کا حق زیادہ ہوگا یا باپ کا سب عقلاء یہاں متفق ہیں کہ باپ کا حق زیادہ ہے اور حاجت کی وجہ سے تاکد کی مثال یہ ہے جیسے ایک سائل آکر آپ سے روپیہ مانگے کہ مجھے ایک روپیہ دیدو میں برف کی قلفیاں کھاؤں گا۔ (جیسا کہ بعض بھنگڑ رئیسوں سے ایسی فرمایش کیا کرتے ہیں اور وہ اُن کو مجذوب سمجھکر سب کچھ کھلاتے ہیں ۱۲) اور ایک سائل آکر یہ کہے کہ مجھے ایک روپیہ دیدو میرے یہاں آٹھ دن کا فاقہ ہے بچے بھوکے تڑپ رہے ہیں۔ تو بتلایئے اس صورت میں کس کا حق زیادہ ہے آیا اس شخص کا جو برف کی قلفیاں کھانے کو روپیہ مانگتا ہے یا اس غریب کا جس کے یہاں آٹھ دن کا فاقہ ہے یقیناً اس غریب فاقہ زدہ کا حق زیادہ ہے ایسے ہی ایک رئیس کے یہاں شادی ہو جس میں سو روپیہ نیوتہ میں دینے کے لئے آپ لے جارہے ہوں۔ حالانکہ اس کو آپ کے سو روپیہ کی کچھ بھی ضرورت نہیں اور اُسی وقت ایک غریب آدمی پر جو شریف خاندان کا ہے کوئی مقدمہ قائم ہوگیا جسمیں ضمانت نہ داخل کی گئی تو اس شریف آدمی کی آبرو جاتی رہے گی تو بتلایئے اس وقت نیوتہ میں امیر کو سو روپیہ دینا چاہیئے جس کو کچھ بھی اس کی پروا نہیں یا اُس غریب کی آبرو بچانی چاہیئے۔ تو جس کو حس ہوگا وہ سمجھے گا کہ اس صورت میں نیوتہ میں روپیہ دینے سے زیادہ ضروری اس غریب کی آبرو کا بچانا ہے یہاں بھی حاجت کی وجہ سے حق کا تاکد ہوگیا۔ غرض آپ دنیا کے معاملات میں غور کرلیں تو معلوم ہوگا کہ تاکد حق کا سبب کبھی عظمت ہے کبھی حاجت مگر دین کے بارے میں اس قاعدہ پر کوئی بھی خیال نہیں کرتا یہاں سب لوگوں نے تاکد حق کو صرف عظمت میں منحصر کرلیا ہے جس کی عظمت قلب میں ہے اسی کے حقوق ادا کرتے ہیں حاجت کو تاکد حق کا سبب نہیں سمجھتے اور اگر حاجت کی وجہ سے کسی کا حق ادا بھی کرتے ہیں تو وہ بھی جب کہ اپنے ملنے والوں میں سے کسی امیر کو حاجت پیش آجاوے باقی غریب کی حاجت تو کوئی چیز ہی نہیں کیونکہ آجکل غریب ہونا بھی ایک جرم ہے

خصوصاً اس چودھویں صدی میں چنانچہ ایک شخص کہتے تھے کہ آجکل غریبوں کی ایسی حقارت ہے کہ کسی امیر کی ریح صادر ہو جاوے تو تبارک سلامت ہوتی ہے کہ صحت ہوئی اور غریب کی ریح صادر ہو تو کہا جاتا ہے دماغ سڑا دیا اور اس سے بڑھکر یہ کہ غریبوں کی روح کی بھی وہ قیمت نہیں جو امیروں کی ریح کی ہے چنانچہ غریب کے مرنیکا لوگوں کو اتنا رنج نہیں ہوتا جتنا کسی امیر کی ریح بند ہو جانیکا ہوتا ہے کسی شہر میں ایک بیگم صاحبہ نے اپنے محلہ میں سے کسی کے رونے چلانے کی آواز سنی تو ماما سے کہا دیکھنا کیا بات ہے اس نے کہا کہ محلہ میں فلاں غریب آدمی مرگیا ہے اس کی بیوی بچے رو رہے ہیں تو بیگم صاحبہ کہتی ہیں اوئی میں تو یہ سمجھی تھی کوئی آدمی بیمار ہو گیا ہے (یعنی کوئی رئیس ۱۲) گویا انکے نزدیک وہ غریب تو آدمی ہی نہ تھا۔ غرباء تو اُن کے نزدیک گدھے ہی ہیں۔ بلکہ دیکھا جاتا ہے کہ امیروں کے بیمار ہونے سے بھی رنج ہوتا ہے اور غریبوں کے مرنے کی بھی پروا نہیں (یہی وجہ ہے کہ امیروں کو زکام بھی ہو جائے تو سنو آدمی اُن کی عیادت کو آتے ہیں اور کوئی غریب مر جاوے تو اُس کی بیوی بچوں کی تعزیت کو بھی کوئی نہیں جاتا الا قلیل ۱۲) اور بعض لوگ تھوڑے سے غریبوں کی بھی کچھ ہمدردی کرتے ہیں بشرطیکہ مسلمان ہو اور اگر مسلمان نہ ہو بلکہ ہندو ہو جیسے چمار بھنگی تو اُس کے حقوق تو سمجھتے ہی نہیں وہ تو گویا بہائم ہیں کہ جو چاہا اونھیں کہدیا اور جس طرح چاہا مار پیٹ لیا اور صاحبو! اس وقت کیا ہوگا جبکہ یہ ثابت ہو جائے کہ بہائم کے بھی حقوق ہیں۔ میرا ارادہ ہوا تھا کہ اس وقت حقوق العباد کے بجائے حقوق الخلق بیان کروں جس میں تمام مخلوق کے حقوق کا بیان ہو جاے کافروں کے بھی اور جانوروں کے بھی مگر سارا قاعدہ بغدادی آج ہی کیونکر ختم کرادوں اس لئے میں حقوق بہائم کی تفصیل کرنا نہیں چاہتا مگر اجمالاً کہے دیتا ہوں کہ شریعت میں جانوروں کے بھی حقوق ہیں تو ان انسانوں کے حقوق کیوں نہ ہوں گے جن کو آپ جانور سمجھتے ہیں۔ پس خوب سمجھ لو کہ غریب اگر کافر بھی ہو اُسکے بھی کچھ حقوق ہیں۔ ایسے ہی اگر کوئی مسلمان فاسق و فاجر ہو تو اس کے بھی حقوق ہیں گناہ کرنے سے یا کفر کرنے سے وہ وقف نہیں ہو گیا کہ آپ جو چاہیں اس کے ساتھ

معاملہ کریں ایک بزرگ نے کسی شخص کو حجاج بن یوسف کی غیبت کرتے ہوئے دیکھا تھا تو فرمایا کہ جس طرح حق تعالیٰ حجاج سے ان لوگوں کا بدلہ لیگا جنپر اُس نے ظلم کیا تھا ایسے ہی حجاج کا بدلہ اُن لوگوں سے لیگا جنھوں نے اس کی غیبت وغیرہ کی ہوگی حجاج خدا کی نافرمانی کرکے سب کے لئے وقف نہیں ہوگیا کہ جو بھی چاہے اسکو بُرا بھلا کہے سبحان اللہ ایسا کون قانون ہے جس میں باغیوں کے بھی حقوق ہوں یہ خدا ہی کا قانون ہے جسمیں باغیوں تک کے حقوق ہیں حتیٰ کہ کافروں کے بھی حقوق ہیں چنانچہ بیٹے کو جائز نہیں کہ وہ جہاد میں اپنے کافر باپ کو قتل کرے گو وہ خدا کا باغی ہے مگر خدا تعالےٰ نے بیٹے پر اسکا یہ حق رکھا ہے۔ غرض ہم لوگوں نے تاکہ حق کا سبب محض عظمت کو سمجھ لیا ہے اور یہ مرض دینداروں میں بھی ہے کہ وہ بھی اہل عظمت ہی کے حقوق کو زیادہ ادا کرتے ہیں میں نے ایک دفعہ دیوبند کے مدرسہ میں طلبہ سے کہا تھا کہ تم لوگ اساتذہ کی عظمت نہیں کرتے نہ اُن کے حقوق کی رعایت کرتے ہو۔ پھر میں نے کہا کہ شاید آپ اپنے دل میں کہتے ہوں گے کہ ہم تو حضرت مولانا محمود حسن صاحب کی بہت عظمت کرتے ہیں۔ اور اُن کی خدمت بھی کرتے ہیں۔ تو ذرا دل میں غور کرلو کہ مولانا کی یہ عظمت و خدمت محض استاد ہونیکی وجہ سے ہے یا اُن کی شہرت و عظمت کی وجہ سے ہے ظاہر ہے کہ محض حق استادی کی وجہ سے تم مولانا کی عظمت نہیں کرتے ورنہ اس کی کیا وجہ کہ اور استادوں کی عظمت و وقعت نہیں کی جاتی آخر وہ بھی تو استاد ہیں معلوم ہوا کہ مولانا کی عظمت بوجہ شہرت کے کرتے ہو کہ وہ سب سے زیادہ بزرگی وغیرہ میں مشہور ہیں۔ تو جب اہل علم میں بھی یہ مرض ہے کہ وہ مشاہیر اہل عظمت ہی کے حقوق ادا کرتے ہیں پھر دوسروں کا تو کیا کہنا غرض اس غلطی میں قریب قریب سب ہی مبتلا ہیں کہ لوگوں نے تاکہ حق کے مدار کو عظمت ہی میں منحصر سمجھ لیا ہے یہی وجہ ہے کہ حقوق اللہ کی تو کچھ رعایت کی بھی جاتی ہے۔ اور حقوق العباد کی رعایت بالکل نہیں کیجاتی۔ کیونکہ عظمت کے لحاظ سے بندہ خدا کے سامنے کچھ بھی نہیں حق تعالےٰ کی وہ عظمت ہے کہ اُس کے سامنے بندہ من حیث ہو بندہ کچھ عظمت نہیں رکھتا بندہ چاہے کیسا ہی عظیم ہو حق تعالیٰ کی عظمت کے سامنے اُس کی عظمت مٹ جاتی ہے جیسے آفتاب کے

سامنے چاند اور ستاروں کی روشنی مٹ جاتی ہے حالانکہ اسوقت آفتاب پر بادل بھی آرہا ہے مگر چاند ستاروں کے مٹانے کے لئے وہ اب بھی کافی ہے۔ ؎

چو سلطان عزت علم برکشد جہاں سر بجیب عدم درکشد

دیکھئے جگنو رات کو تو چمکتا ہے مگر دن کو نہیں چمکتا کسی نے اُس سے پوچھا کہ تو دن میں کہاں رہتا ہے جو نظر نہیں آتا کہا میں تو دن میں اسی جگہ رہتا ہوں جہاں رات کو سوتا ہوں مگر دن میں آفتاب کے سامنے میں چمک نہیں سکتا شیخ سعدی اسی کو فرماتے ہیں ؎

مگر دیدہ باشی کہ در باغ و راغ بتابد ہمی کرمکے چوں چراغ
کسے گفتش اے کرمک شب فروز چہ بودت کہ بیروں نیائی بروز
نہ بینی کہ آں کرمکِ پاک زاد جواب از سر روشنائی چہ داد
کہ من رود و شب جز بصحرا نیم ولے پیش خورشید پیدا نیم

اسی لئے حق تعالیٰ شانہ ارشاد فرماتے ہیں "فان العزۃ للہ جمیعا" کہ عزت و عظمت تمامہا حق تعالیٰ کے لئے ہے۔ اس کی عظمت کے سامنے کسی کی کچھ عظمت نہیں۔ اس پر شاید کسی کو یہ شبہہ ہو کہ دوسری جگہ تو حق تعالیٰ یوں فرماتے ہیں کہ "وللہ العزۃ ولرسولہ وللمومنین" کہ عزت اللہ کیلئے ہے اور اسکے رسول کے لئے اور مومنین کے لئے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کے لئے بھی عظمت ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ پہلی آیت میں عزت بالذات کا ذکر ہے اور دوسری جگہ عام ہے۔ بالذات اور بالواسطہ کو پس حاصل یہ ہوا کہ عزت بالذات تو تمامہا اللہ ہی کے لئے ہے اور عزت بواسطہ رسول اور مومنین کے لئے بھی ہے غرض بالذات اور بالعرض کا فرق ہے بالذات کے درجہ میں سوائے حق تعالےٰ کے کسی کے لئے بھی عظمت نہیں انسان چاہے کتنا ہی بڑا عظیم ہو اُس کی عظمت بالذات نہیں بلکہ بالعرض ہے جو کہ عظمت الٰہی کے سامنے سلب ہو جاتی ہے۔ یہی تو وہ بات ہے جس کو مولانا شہید رحمہ اللہ علیہ نے بیان فرمایا تھا جسپر آج اعتراض ہو رہے ہیں انھوں نے بھی وہی کہا ہے جو "فان العزۃ للہ جمیعا" سے مفہوم ہو رہا ہے اتنا فرق ہے کہ حق تعالیٰ نے "فان العزۃ للہ جمیعا" عربی میں فرمایا ہے اور مولانا شہید نے اسی

مضمون کو اردو میں کہدیا ہے باقی بات ایک ہی ہے زبان کے بدلنے سے حکم نہیں بدلجاتا زبان تو وہ چیز ہے کہ حق تعالیٰ کے یہاں اس کا کچھ بھی اعتبار نہیں ان کی نظر تو حقیقت پر رہتی ہے اور یہی حال اہل اللہ کا ہے ہمارے حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ کے پاس ایک رومی شیخ آئے تھے اُس وقت حاجی صاحب مثنوی کا درس دے رہے تھے اور حاجی صاحب کی عادت تھی کہ تقریر اردو میں فرمایا کرتے تھے گو حضرت کو فارسی پر بھی پوری قدرت تھی اور وہ شیخ فارسی سمجھ بھی لیتے مگر بے تکلف زبان اردو ہی تھی اس لئے اپنی ہی زبان میں تقریر فرما رہے تھے مگر باینہمہ وہ شیخ رومی درس سے محظوظ ہو رہے تھے حالانکہ وہ اردو بالکل نہ سمجھتے تھے۔ درس کے وقت کسی خادم نے حضرت سے عرض کیا کہ اگر یہ اردو سمجھتے تو انھیں کتنا لطف آتا جو بغیر سمجھے بھی اسقدر محظوظ ہو رہے تھے۔ حاجی صاحب نے فرمایا میاں ان مضامین کے لئے اس زبان کی قید نہیں وہاں تو کوئی دوسری ہی زبان ہے پھر مولانا کے یہ شعر پڑھے ؎

پارسی گو گرچہ تازی خوشتر است　　عشق را خود صد زبانِ دیگر است
بوے آں دیر چو پراں می شود　　ایں زبانہا جملہ حیراں می شود

بلکہ بعض اوقات بے زبانی میں وہ اثر ہوتا ہے جو زبان دانی میں نہیں ہوتا میں نے ابھی (وعظ سے پہلے) مجمع احباب میں کہا تھا کہ ریل کے سفر میں ایک ڈپٹی صاحب مجھ سے ملے اور بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں میں اخلاق کے ساتھ کھلکر ان سے باتیں کر رہا تھا کہ اتنے میں مغرب کی نماز کا وقت آگیا تو میں اور خواجہ صاحب اور چند رفقاء نماز کے اہتمام میں مشغول ہوگئے وہ ڈپٹی صاحب نماز نہ پڑھتے تھے ویسے ہی اپنی جگہ بیٹھے رہے خواجہ صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ ان ڈپٹی صاحب کو نماز کے لئے کہنا چاہئے کیونکہ یہ آپ سے محبت ظاہر کرتے ہیں آپ کا کہنا ان کو ناگوار بھی نہ ہوگا اور امید ہے کہ اثر بھی زیادہ ہوگا اور باوجود قدرت کے امر بالمعروف کو ترک کرنا شاید نامناسب ہو۔ میں نے کہا کہ امر بالمعروف اس موقعہ میں واجب نہیں کیونکہ ان کو نماز کا فرض ہونا معلوم ہے اور یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ چند آدمی نماز کو اُٹھے ہیں اب بھی اگر ان کو توفیق نہ ہو تو یہ ان کی کوتاہی ہے

باقی میں تو زبان سے کچھ نہ کہوں گا کیونکہ میرے کہنے سے اگر انھوں نے نماز پڑھ بھی لی تو پڑھینگے اپنے واسطے اور احسان ہوگا میری گردن پر سو مجھے تو اس سے غیرت آتی ہے کہ دین کے کام میں ان کا احسان اپنے سر لوں اگر آپ کو امر بالمعروف کا ایسا ہی جوش ہے تو آپ خود کیوں نہیں کہتے ؟ باقی میں اتنا کہے دیتا ہوں کہ اسوقت نماز کے لئے کہنے کا ان پر وہ اثر نہ ہوگا جو نہ کہنے کا اثر ہوگا خیر خواجہ صاحب نے بھی ان سے کچھ نہ کہا اور میں نماز پڑھکر پھر اُن کے پاس آبیٹھا اور جس بشاشت سے پہلے باتیں کر رہا تھا اسی بشاشت سے اب بھی کرنے لگا میں نے ظاہری برتاؤ سے یہ بات بالکل اُن پر ظاہر نہیں ہونے دی کہ مجھے آپ کے نماز نہ پڑھنے سے انقباض ہوا یا آپ کی حقارت میرے دل میں ہے ہرگز نہیں اس کے بعد دوسری نماز کا وقت آیا اور ہم اسی طرح نماز کو اُٹھے اور بعد نماز کے میں پھر انھیں ڈپٹی صاحب کے پاس آبیٹھا اور اسی نشاط سے پھر باتیں کرنے لگا اس کا ان کے دل پر بے حد اثر ہوا اور وہ نماز کے سخت پابند ہوگئے ۔ اور ایک صاحب سے کہتے تھے کہ صاحب ریل کے سفر میں جب مولانا نماز کو اُٹھے اور میں نہیں اُٹھا تو مجھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا میرے سر پر جوتیاں پڑ رہی ہیں اور غضب یہ کہ مولانا نے مجھ سے ایک دفعہ بھی زبان سے یہ نہ فرمایا کہ آؤ تم بھی نماز پڑھ لو (اگر یہ فرما دیتے تو میں کچھ عذر ہی کر دیتا جس سے شرمندگی کم ہو جاتی ۱۲) اور اس وقت میں یہ خیال کرتا تھا کہ شاید اب نماز پڑھ کر جو مولانا آئیں گے تو نہ میرے پاس بیٹھیں گے نہ مجھ سے بات کریں گے مگر جب وہ نماز سے فارغ ہو کر بدستور میرے پاس آبیٹھے اور اسی بشاشت سے گفتگو کرنے لگے جیسے پہلے کر رہے تھے ۔ تو واللہ اس ادا نے تو مجھے ذبح ہی کر ڈالا ۔ بھائی اُس روز سے میں نماز کا پورا پابند ہوگیا ہوں راوی نے جب انکا یہ قول مجھ سے نقل کیا تو میں نے لوگوں سے کہا بتلاؤ اس وقت امر بالمعروف کا زیادہ اثر ہوتا یا خاموش رہنے کا زیادہ اثر ہوا ۔ امر بالمعروف سے اتنا ہو جاتا کہ وہ صرف اس وقت نماز پڑھ لیتے مگر یہ جو اثر ہوا کہ وہ شرمندگی سے ذبح ہو ہوگئے اور عمر بھر کے لئے نمازی بنگئے یہ بے زبانی ہی کا اثر تھا تو دیکھئے اس وقت ان کو کچھ نہ کہنے کا وہ اثر ہوا جو کہنے سے نہ ہوتا ۔ یہاں بے زبانی سے زیادہ اثر ہوا اور واقعی گو میں نے ان کو

زبان سے نماز کے لئے نہ کہا تھا۔ مگر دل میں یہی نیت تھی کہ انشاء اللہ میرے سکوت سے ان پر زیادہ اثر ہوگا (چنانچہ ایسا ہی ہوا) فی الحکیم ہر کام کا موقعہ خوب سمجھتا ہے سیاست اسی کا نام ہے کہ ہر شخص کی تربیت اس کے مناسب طریق سے کیجائے اور یہ بات حضرت اقدس میں بالکمل وجوہ بحمد اللہ نمایاں ہے (للہ در من حکیم ۱۲ جامع) غرض کبھی بے زبانی بھی زبان سے زیادہ کام دیتی ہے اس سے معلوم ہوا کہ زبان پر اثر کا مدار نہیں پس محض زبان کے بدلنے سے دوسرا اثر لے لینا عجیب بات ہے جو لوگوں کی کم فہمی پر دال ہے ہمارے ملنے والوں میں ایک بزرگ تھے امیر شاہ خاں صاحب وہ پرانے بزرگوں کے دیکھنے والے تھے تحریکات حاضرہ میں اُن کی رائے وہی تھی جو میری رائے ہے الکا قیام مینڈھو میں رہتا تھا جہاں کچھ دنوں سے مولوی حبیب احمد صاحب کیرانوی بھی مدرس ہو کر پہونچ گئے ہیں۔ اُن کی رائے بھی تحریکات حاضرہ میں میرے موافق ہے (بلکہ وہ مجھ سے بھی زیادہ پختہ ہیں ۱۲ جامع) مگر لوگوں کی یہ حالت تھی کہ مولوی حبیب احمد صاحب کی باتوں پر تو اعتراض کرتے تھے اور امیر شاہ خاں صاحب سے خوش تھے۔ ایک مرتبہ امیر شاہ خاں صاحب نے مجھے لکھا کہ میرا مسلک بھی وہی ہے جو مولوی حبیب احمد صاحب کا ہے جو وہ کہتے ہیں وہی میں کہتا ہوں مگر اتنا فرق ہے کہ وہ اردو میں کہتے ہیں اور میں فارسی میں کہتا ہوں اس لئے لوگ میری باتوں سے متوحش نہیں ہوتے اور ان پر اعتراض وطعن کرتے اور بُرا بھلا کہتے ہیں تو حقیقت میں یہ عوام کی کم فہمی ہے ورنہ خدا تعالیٰ کے یہاں زبان کی کچھ قید نہیں اس لئے زبان کے بدلنے سے شرعاً حکم نہیں بدل جاتا چنانچہ مولانا شہید بھی حقیقت میں وہی کہتے تھے جو حق تعالیٰ نے "فان العزۃ للہ جمیعا" میں فرمایا ہے۔ مگر انھوں نے اس کو اردو میں کہدیا اس سے لوگ متوحش ہونے لگے اور بیچاروں پر فتوی لگانے لگے بہرحال چونکہ حق تعالیٰ کی عظمت کے سامنے بندہ کی عظمت کچھ بھی نہیں اس لئے لوگوں کو حقوق العباد کا اہتمام نہیں کہ وہ صاحب عظمت نہیں مگر میں نے بتلا دیا ہے کہ تاکد حق کا سبب صرف عظمت میں منحصر نہیں بلکہ حاجت بھی تاکد حق کا ایک سبب ہے پس حقوق اللہ کا تاکد تو عظمت کی وجہ سے ہے

اور حقوق العبد کا تاکد حاجت کی وجہ سے ہے فقہاء نے اس کو سمجھا ہے اور واقعی فقہاء حکماء امت ہیں اسی طرح صوفیہ بھی اور فقہ کی تعریف تصوف کو بھی شامل ہے سلف میں فقہ فقط احکام ظاہرہ کے علم کا نام نہ تھا بلکہ مجموعہ احکام ظاہرہ و باطنہ کے علم کو فقہ کہتے تھے چنانچہ امام صاحب نے فقہ کی تعریف یوں فرمائی ہے "معرفۃ النفس مالہا و ما علیہا" جس میں تصوف بھی داخل ہے تو فقہاء جابجا فرماتے ہیں "حق العبد مقدم علی حق اللہ" کہ بندہ کا حق اللہ تعالیٰ کے حق پر مقدم ہے ان کا یہ مطلب نہیں کہ نعوذ باللہ عظمت کی وجہ سے ایسا ہے بلکہ احتیاج کی وجہ سے حق العبد کو حق اللہ پر مقدم کہا گیا ہے کیونکہ بندہ محتاج ہے اور حق تعالیٰ احتیاج سے بری ہیں مگر فقہاء کا یہ جملہ ظاہر میں ایسا وحشت ناک ہے کہ اگر کوئی صوفی ایسا کہدیتا تو کفر کے فتوے لگ جاتے مگر فقہاء بے دھڑک فرماتے ہیں کہ حق العبد حق اللہ پر مقدم ہے کیونکہ وہ منتظم ہیں اُن کو حقوق کا انتظام کرنا ہے اور واقعی حقوق العباد کا اہتمام بدون اس طرح صاف صاف کہے نہیں ہو سکتا تھا مگر اُن پر کوئی فتوی نہیں لگتا تا لوگ ان کو قانونی سمجھتے ہیں اس لئے اُن سے ڈرتے ہیں جانتے ہیں کہ اگر ان پر اعتراض کیا گیا تو جھاڑ کی طرح پیچھے لگ جائیں گے اور ایک مسئلہ کے ثابت کرنے کو رسالے کے رسالے تصنیف کر دیں گے اور صوفیہ بیچارے غریب ہیں کسی سے بحث مباحثہ نہیں کرتے اس لئے اُن کو سب دبا تے ہیں۔ اور اُن کی بات بات پر فتوے لگائے جاتے ہیں وہ تو ایسے غریب ہیں کہ کوئی ان کو غریب کہہ بھی دے تب بھی بُرا نہیں مانتے اور ذرا اہل ظاہر کو تو غریب کہدو دیکھو کیسے چڑتے ہیں۔ اسپر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک نواب نے کسی مصلحت سے ایک گنوار کو مجسٹریٹ بنا دیا تھا وہ مقدمات کا فیصلہ کرنے لگا ایک دفعہ کسی نے عرضی پیش کی تو اسمیں لکھا تھا کہ غریب پرور سلامت تو آپ بہت برہم ہوئے اور کہا نواب صاحب تو ہم کو مسفق (بسین معملہ) مہربان لکھتے ہیں اور یہ نالائق ہم کو غریب (یعنی غریب ۱۲) لکھتا ہے اچھا پانچ روپیہ جرمانہ اس الو کی سمجھ میں غریب ہی آیا پرور کو وہ سمجھا ہی نہیں اور شاید یہ خیال کیا ہو کہ پرور بھی کوئی تحقیر کا لفظ ہو گا جبھی تو غریب کے ساتھ ملایا گیا ہے غرض آج کل غریب کہنے سے بھی لوگ چڑتے ہیں

مگر صوفیہ اس سے بھی بُرا نہیں مانتے بلکہ اگر کوئی انہیں جاہل بھی کہدے جب بھی بُرا نہیں مانتے کیمیا گر کو اگر کوئی یوں کہدے کہ اسے کیمیا نہیں آتی ویسے ہی جھوٹ موٹ کیمیا گر بنا ہوا ہے تو وہ کبھی ناخوش نہ ہوگا بلکہ خوش ہوگا کہ اچھا ہے لوگ یوں ہی سمجھتے رہیں تاکہ میں پولیس کی دست برد سے بچا رہوں اسی طرح کسی صوفی کو کوئی جاہل کہدے تو وہ خوش ہوتے ہیں کہ اچھا ہوا میں رجوع خلائق سے بچا اور نہ لوگ ہجوم کر کے خلوت مع المحبوب سے روک دیتے اور اگر کبھی ان کو جواب کا جوش بھی ہوتا ہے تو اندر سے کوئی یوں کہدیتا ہے ؎

با مدعی مگوئید اسرار عشق و مستی بگذار تا بمیرد در رنج و خود پرستی

غرض صوفیہ حق العبد کو حق اللہ پر مقدم کہدیتے تو ان پر فتوی کفر جاتا مگر فقہاء کو کوئی کچھ نہیں کہتا وہ صاف کہتے ہیں کہ حق العبد مقدم علی حق اللہ اور منشا اس کا صرف یہی ہے کہ بندہ محتاج ہے مگر اسکا یہ مطلب نہیں کہ آج سے حقوق اللہ کو ترک کر کے حقوق العباد ہی کو لیلو بلکہ مطلب یہ ہے کہ جہاں دونوں میں تعارض ہو وہاں حق العبد مقدم ہے اور یہ بھی شریعت کا حکم اور حق اللہ ہی ہے اور جہاں تعارض نہ ہو وہاں ہر ایک کو اپنے اپنے موقعہ پر ادا کرنا چاہیئے۔ دیکھو اگر باپ بیٹے سے یوں کہے کہ کھانا کھالے اور ماں کہے کہ پانی پی لے تو اس وقت ان دونوں باتوں پر عمل کیا جائیگا کیونکہ دونوں میں تعارض کچھ نہیں دونوں کا جمع ممکن ہے اور اگر باپ کہے کہ پہلے نمکین کھاؤ اور ماں کہے کہ پہلے میٹھا کھاؤ تو یہاں البتہ سوال ہوگا کہ دونوں میں سے کس کا حق ادا کیا جائے۔ غرض مقدم و موخر کو وہیں دیکھا جاتا ہے جہاں تعارض ہو اور عدم تعارض کے وقت دونوں کو اختیار کیا جاتا ہے۔ بس اب بتلاؤ کہ نماز پڑھنے اور قرض ادا کرنے میں کیا تعارض ہے کچھ بھی نہیں پس دونوں کو بجالاؤ نماز بھی پڑھو اور قرض بھی دو تعارض کی صورت یہی ہے کہ مثلاً ایک شخص کے پاس سو روپئے ہیں جن پر سال بھی گذر گیا ہے تو قاعدہ سے اس میں سے زکوۃ کے واجب ہونے چاہئیں مگر اس شخص پر کسی کا دین بھی ہے تو اس وقت حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر تم پر کسی کا دین ہے تو پہلے بندہ کا حق ادا کرو زکوۃ ساقط ہے یہاں فقہاء فرماتے ہیں کہ حق العبد حق اللہ پر مقدم ہے

اور یہ بھی حقیقت میں حق اللہ ہی ہے کیونکہ بندوں کے حقوق کا ادا کرنا حق تعالیٰ ہی کے حکم کی وجہ سے تو لازم ہے حق تعالیٰ نے خود حکم دیا ہے کہ بندوں کے حقوق ادا کرو اس بنا پر یوں کہنا چاہئے کہ اسوقت ایک حق اللہ دوسرے حق اللہ پر مقدم ہو گیا اس لئے حق اللہ و حق العبد میں تعارض بھی نہیں مگر چونکہ ظاہر میں وہ حق العبد معلوم ہوتا ہے اس لئے یہ کہا جاتا ہے کہ حق العبد حق اللہ پر مقدم ہے مگر یہ محض ظاہری تقدیم ہے اور ایک حقیقت کی بناء پر یہ ظاہری تقدیم بھی رفع ہو جاتی ہے اور وہ حقیقت حق تعالیٰ نے میرے قلب پر وارد فرمائی ہیں میں نے منقول کہیں نہیں دیکھا وہ یہ کہ حق اللہ سے مراد حق النفس ہے کیونکہ جن امور کو حق اللہ کہا جاتا ہے وہ طاعات و عبادات ہیں اور ظاہر ہے کہ بندہ کے افعال سے حق تعالیٰ کا نہ کوئی نفع ہے نہ ضرر ہے بلکہ نفع یا ضرر جو کچھ ہے بندہ ہی کا ہے۔ تو یقیناً حق اللہ میں جو اضافت ہے یہ اضافت نفع یا ضرر کی نہیں ہو سکتی جیسا کہ حق العبد میں اضافت نفع یا ضرر کے لئے ہے کہ وہ ایسا حق ہے جسکا ادا کرنا بندہ کو نافع اور تلف کرنا بندہ کو مضر ہے۔ اس طرح یہاں نہیں کہہ سکتے کہ یہ طاعات و عبادات ایسا حق اللہ ہیں کہ ان کا ادا کرنا خدا کو نافع اور تلف کرنا ان کو مضر ہے (نعوذ باللہ) پس میرے نزدیک حق اللہ سے مراد حق النفس ہے اور حق العبد سے مراد حق الغیر ہے اس تفسیر پر دونوں جگہ اضافت یکساں ہوگی یعنی ہر جگہ اضافت نفع و ضرر ہے پس حق اللہ یعنی حق النفس تو وہ ہے جس کا ادا کرنا اپنے آپ کو نافع اور ضائع کرنا اپنے آپ کو مضر ہے اور حق العبد یعنی حق الغیر وہ ہے جس کا ادا کرنا دوسروں کو نافع اور تلف کرنا دوسروں کو مضر ہے۔

پس اس تفسیر پر حق اللہ و حق العبد میں کہیں تعارض نہیں ہوا اور جو اشکال حق العبد کو حق اللہ پر مقدم کرنے میں ہوتا تھا وہ بھی نہ رہا کیونکہ اس تفسیر پر جس کو حق اللہ کہا جاتا ہے وہ حقیقت میں حق النفس ہے پس جہاں حق اللہ پر حق العبد کو مقدم کیا جاتا ہے وہاں درحقیقت حق الغیر کو حق النفس پر مقدم کیا گیا ہے اور اس میں کچھ بھی اشکال نہیں بلکہ یہ تو ایثار ہے جسکا ذکر اس آیت میں ہے "ویؤثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ" اسمیں حق تعالیٰ نے بعض صحابہ کی (یعنی حضرت ابوطلحہ کی) مدح فرمائی ہے کہ اپنے نفسوں پر

دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود بھوکے رہیں۔ انکا قصہ یہ ہوا تھا کہ ایک بار یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مہمانوں کو اپنے گھر لے آئے تھے اور انھوں نے اپنی بیوی سے کہا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مہمان ہیں ان سے کوئی چیز بچانا نہیں انھوں نے کہا کہ ہمارے گھر تو آج اتنا ہی کھانا ہے جو صرف بچوں کو کافی ہو سکتا ہے۔ تو حضرت ابوطلحہ نے فرمایا کہ پھر تم بچوں کو تو بھلا پھسلا کر سلا دینا اور ہم دونوں بھی کھائیں گے نہیں جو کچھ کھانا تیار ہے سب مہمانوں کے سامنے رکھدینا مگر وہ مہمان ایسے ہیں کہ بدون ہمارے کھائے کچھ کھائیں گے نہیں تو تم یہ کام کرنا کہ جس وقت مہمان گھر میں آئیں اسی وقت چراغ گل کر دینا پھر میں کہدوں گا کہ چراغ گل ہو گیا ہے اور روشن کرنے کا سامان اُسوقت دشوار ہے (کیونکہ اس زمانہ میں دیا سلائی کہاں تھی چقماق وغیرہ سے کام کرتے تھے ۱۲) اس لئے اندھیرے ہی میں کھانا کھا لیجئے ہم بھی اُن کے دکھلانے کو ساتھ بیٹھ جائیں گے۔ اور منہ چلاتے رہیں گے تاکہ وہ سمجھیں کہ یہ بھی کھا رہے ہیں چنانچہ ایسا ہی کیا کہ دونوں میاں بی بی خود بھوکے رہے اور مہمانوں کو کھلا دیا یہ ایثار ہے جسپر حق تعالیٰ نے ان کی مدح فرمائی ہے صوفیہ کو اس کا بہت اہتمام رہتا ہے وہ ہمیشہ اسکا خیال رکھتے ہیں کہ اپنے نفس پر دوسروں کو مقدم کریں اور اپنے متعلقین کو بھی وہ اس کی تعلیم دیتے ہیں مگر اس واقعہ مذکورہ پر ایک اشکال ہے۔ میں اس کو بھی رفع کئے دیتا ہوں ان علماء و طلباء کی بڑی مشکل ہے ان کو ہر جگہ شبے پڑتے ہیں اور ہمیں صوفیہ کی بھی رعایت کرنی پڑتی ہے کیونکہ ہم ان کو بھی مجتہد و فقیہ سمجھتے ہیں اس لئے اس کا بھی خیال رہتا ہے کہ انکا فعل خلاف شرع نہ ہو چنانچہ ایثار کرنا صوفیہ کا طرز ہے۔ اور اس کے لئے وہ اس آیت سے استدلال کرتے تھے۔ اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ ان صحابی نے جنکا واقعہ شان نزول میں مذکور ہوا ہے) مہمانوں کو اپنے نفس پر اور بچوں پر جو مقدم کیا تو یہ جائز کہاں تھا کیونکہ اپنے نفس کے بھی تو کچھ حقوق ہیں "ان لنفسک علیک حقا" اس کا جواب علماء اہل ظاہر ہی نے بہت اچھا دیا ہے کہ ان کو اس درجہ کی بھوک نہ تھی جیسی مہمانوں کو تھی۔ (یعنی انھوں نے اپنے نفس کے حق کو ضائع نہیں کیا بلکہ یوں کہو کہ اپنے کو

زیادہ راحت نہیں دی کہ اسمیں کچھ اشکال نہیں کہ دوسرے کی تکلیف رفع کرنے کو اپنی راحت میں کچھ کمی کردی جائے ۱۲ اب یہ شبہہ رہا کہ پھر بچوں پر مہمانوں کو کیسے مقدم کیا۔ اس کی تو اجازت بھی معتبر نہ تھی اسکا جواب دیا گیا ہے کہ بچوں کو بھوک نہ تھی وہ تمہارے بچوں کی طرح نہ تھے جن کا پیٹ بھرتا ہی نہیں اور اس بات کو ماں باپ خوب سمجھ سکتے ہیں کہ اس وقت بچہ کو بھوک ہے یا محض کھانا دیکھ کر حرص کرنے لگے گا تو حضرت ابو طلحہ کو قرائن سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ بچوں کو بھوک نہیں ہے وقت پر اچھی طرح کھا چکے ہیں اور رات کو نہ کھانے سے انھیں کلفت نہ ہوگی اس لئے بہلا پھسلا کر سلوا دیا اب اگر یہ سوال ہو کہ اس پر کیا دلیل ہے کہ حضرت طلحہ کے نزدیک بچے بھوکے نہ تھے محض حرص ہی کا درجہ باقی تھا اسکا جواب یہ ہے کہ معقول پڑھ کر آؤ تو معلوم ہوگا دلیل مستدل کے ذمہ ہے یا مانع کے ظاہر ہے کہ مانع کے ذمہ دلیل نہیں بلکہ منع کے لئے ابداء احتمال کافی ہے اب مستدل کا فرض یہ ہے کہ اگر اس کو یہ احتمال تسلیم نہ ہو تو دلیل سے اس کو باطل کرے غرض فقہاء نے جو یہ فرمایا ہے کہ "حق العبد مقدم علی حق اللہ" اور حقیقت اسی میں ایثار کی تعلیم ہے اور مطلب یہ ہے کہ اپنے نفس کے حقوق پر غیروں کے حقوق کو مقدم کرنا چاہئے فقہاء اسکو اس عنوان سے تعبیر فرماتے ہیں اور صوفیہ اسکو ایثار سے تعبیر کرتے ہیں حاصل دونوں کا ایک ہی ہے اتنا فرق ہے کہ فقہاء نے صرف معاملات میں اسکا اہتمام کیا ہے اور صوفیہ نے ہر امر میں اس کی سعی کی ہے حتی کہ عبادات میں بھی فرائض و واجبات کے اندر تو نہیں مگر مستحبات و فضائل میں وہ ایثار کرتے ہیں چنانچہ اگر کبھی کوئی صوفی صف اول میں کھڑا ہو جائے اس کے بعد کوئی بزرگ آجائیں استاد یا شیخ تو وہ پیچھے ہٹ کر اپنے بزرگ کو صف اول میں جگہ دیدیتے ہیں اسی طرح یہ حضرات خاص حالات میں صف اول میں دائیں جانب کھڑا ہونے کا زیادہ اہتمام نہیں کرتے بلکہ بائیں جانب کا زیادہ اہتمام کرتے ہیں۔ اور عام عادت یہ ہے کہ لوگ صف اول میں دائیں طرف کا بہت اہتمام کرتے ہیں حتی کہ بائیں طرف بہت ہی کم لوگ ہوتے ہیں اور اس کو افضل سمجھتے ہیں حالانکہ یہ غلط ہے دائیں طرف کو بائیں طرف سے مطلقاً فضیلت نہیں بلکہ مدار قرب امام پر ہے پس سب سے افضل

تو وہ شخص ہے جو امام کے پیچھے ہے اس کے بعد وہ افضل ہے جو اس کے دائیں طرف ہو پھر وہ جو اس کے بائیں طرف ہو اسی طرح جب اس کے بعد ایک آدمی دائیں طرف سے اور آجاوے تو اب دوسرے کو بائیں طرف کھڑا ہونا چاہئے اس وقت اس کا بائیں طرف ہونا دائیں طرف کھڑے ہونے سے افضل ہے کیونکہ اس صورت میں بائیں طرف ہو کر یہ امام سے زیادہ قریب ہوگا اور دائیں طرف کھڑا ہونے سے بعد ہو جائیگا غرض بائیں طرف کھڑا ہونے سے اگر امام کے اور اس کے درمیان میں چار آدمی کا واسطہ ہو اور بائیں طرف ہونے سے پانچ کا واسطہ ہو تو اس وقت بائیں جانب کھڑا ہونا افضل ہوگا وعلیٰ ہذا القیاس پس صف کو اس طرح بھرنا چاہئے کہ ایک آدمی امام کے بالکل پیچھے ہو پھر ایک اس کے دائیں اور ایک بائیں کھڑا ہوتا چلا جاوے مگر عوام یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے دائیں جانب کو بھرنا چاہئے جب اس طرف جگہ نہ رہے پھر بائیں طرف آنا چاہئے یہ غلط ہے بلکہ دونوں طرف برابر آدمی ہونے چاہئیں۔ مگر صوفیہ کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ خاص حالات میں زیادہ کوشش بائیں طرف

عہ قلت قال العلامۃ الشعرانی فی العہود المحمدیۃ اخذ علینا العہد العام من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا رأینا میسرۃ المسجد قد عطلت من صلوٰۃ الناس فیہا ان نذکرہا بالصلوٰۃ فیہا جبرا لہا قال وقد روی ابن ماجۃ وغیرہ عن ابن عمر قال قیل للنبی صلی اللہ علیہ وسلم ان میسرۃ المسجد قد تعطلت فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من عمر میسرۃ المسجد کتب اللہ لہ کفلین من الاجر وفی روایۃ للطبرانی مرفوعا من عمر جانب المسجد الایسر لقلۃ اہلہ فلہ اجران اھ (ص ۳۵) قلت وہذا ہو السر فی اہتمام الصوفیہ بالجانب الایسر ای لقلۃ رغبۃ الناس فیہ وامام اہتمامہم بالصف المؤخر مع کونہ خلافا للحدیث خیر صفوف الرجال اولہا وشرہا آخرہا فالسر فیہ ما قالہ الشعرانی ایضا اخذ علینا العہد العام من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا صفت سرائرنا من جمیع ما یسخط اللہ عزوجل بحیث لم یبق فی سرائرنا وظواہرنا الا ما یرضی ربنا ان نواظب علی الصلاۃ فی الصف الاول عملا بقولہ صلی اللہ علیہ وسلم لیلینی منکم اولوا الاحلام والنہی ای العقل ولا یکون العہد عاقلا الا اذا کان لہذا الوصف الذی ذکرناہ فمن کان فی ظاہرہ او باطنہ صفۃ یکرہہا اللہ تعالیٰ فلیس بعاقل کامل (ای ولیس اہلا للقرب من الامام ایضا بدلالۃ الحدیث ۱۲) ولا یتقدم للصف الاوّل بین یدی اللہ فی المواکب الالٰہیۃ الا الانبیاء والملائکۃ ومن کان علی اخلاقہم واما من تخلف عن اخلاقہم فیقف فی اخریات الناس خیرلہ رھ (ص ۳۵) (باقی صفحہ آئندہ)

کھڑا ہونے کی کرتے ہیں اور دائیں طرف کے لئے دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں اسی طرح صف اول پر بھی مزاحمت نہیں کرتے بلکہ خاص حالات میں دوسروں کو صف اول میں جگہ دیدیتے ہیں۔ اور خود صف ثانی یا ثالث میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور جنازہ کی نماز میں بھی وہ ایسا ہی کرتے ہیں کہ اکثر پچھلی صف میں کھڑے ہوتے ہیں اس کی ایک وجہ تو منقول ہے وہ یہ کہ صف مؤخر میں کھڑا ہونے والا مکمل صفوف زوائد ہے اور حدیث میں ہے کہ جس میت پر مسلمانوں کی تین صفیں نماز کی ہو جائیں اُس کی مغفرت ہو جاتی ہے تو صف ثالث میں کھڑا ہونے والا علت تامہ کا جزو اخیر ہے جو کہ سبب مغفرت ہے اور ایک وجہ میرے قلب میں آئی ہے وہ یہ کہ صف اول والے بلا واسطہ میت کے لئے دعا کرتے ہیں اور صف اخیر والا اگلی صف کے مسلمانوں کو بھی واسطہ بناتا ہے وہ بھی واسطے سے دعا کرتا ہے اس لئے صوفیہ پیچھے کھڑے ہوتے ہیں تاکہ اگلوں کو واسطہ بنا کر دعا کریں خیر جماعت جنازہ کا ذکر تو تبعاً تھا میں یہ کہہ رہا تھا کہ صوفیہ جماعت صلوٰۃ مفروضہ میں بھی صف اول میں ایثار کرتے ہیں۔ اگر کوئی انکا بزرگ آجائے تو وہ اس کو مقدم کر دیتے ہیں اس پر فقہا خشک اعتراض کرتے ہیں کہ تم نے صف اول کے ثواب کو چھوڑ دیا۔ جس میں استغناء عن الثواب ہے صوفیہ کہتے ہیں۔ کہ ایک ثواب تو صف اول میں کھڑے ہونے کا ہے اور دوسرا ثواب تعظیم اہل اللہ کا ہے جو اس سے بھی بڑھا ہوا ہے تو ہم ظاہر میں گو ایک ثواب کے تارک

(بقیہ نوٹ صفحہ گذشتہ) قال واما حدیث خیر صفوف الرجال ولہا فالمراد بالرجال الکمل اھ (ص۳۶) ای الکاملون فی الاحلام والنہی کیلا تتضاد الآثار فان حدیث لیلینی منکم اولوا الاحلام والنہی کما یفید طلب لدنو من ہو لاء یفید طلب التاخر عمن لیس علی منزلتہم ایضا اھ ویقال خیر صفوف الرجال اولہا خبر بمعنی الانشاء ای لیجعل الامام خیر الرجال فی اول الصف واللہ اعلم فاذا رأی احدہ خیرا منہ فضل منہ فتاخر لہ من الصف الاول وقد مہ فقد عمل مقبولا صلی اللہ علیہ وسلم لیلینی منکم اولوا الاحلام والنہی فای یوم علیہ اذا قدم من کان احق بالصف الاول منہ فافہم ولا تعجل بالانکار علی القوم فتندم ۱۲ جامع

عہ قلت وقد علمت مما ذکرناہ سابقا ان فی ذلک عملا بقولہ صلی اللہ علیہ وسلم لیلینی منکم اولوا الاحلام والنہی رواہ مسلم فی صحیحہ وقال فی ردالمحتار وفی حاشیۃ الاشباہ للحموی عن المصفرات (باقی نوٹ صفحہ آئندہ پر)

ہوئے مگر باطن میں دوسرے بڑے ثواب کے جامع ہوئے تو استغناء عن الثواب کہاں ہوا اس میں بھی تو طلب ثواب ہی ہے پھر شرعی قاعدہ ہے الدال علی الخیر کفاعلہ اس بناء پر جس کو ہم نے صفِ اول میں کھڑا کیا ہے اس کو جو صف اول کی فضیلت ہماری وجہ سے حاصل ہوگی اس کا ثواب بھی ہم کو ملیگا تو ہم ثواب صف اول سے بھی محروم نہ ہوئے اور اس کے ساتھ دوسرے ثواب کے جامع ہوگئے۔ ہمیں اس صورت میں دوہرا ثواب ملا۔

غرض ایثار حضرات صوفیہ کا بہت بڑا معمول ہے بھلا بزرگوں کے ساتھ تو وہ کیونکر ایثار نہ کرتے ان کا تو مذاق یہ ہے کہ وہ جانوروں کے ساتھ بھی ایثار کرتے

(بقیہ نوٹ صفحہ گذشتہ) عن النصاب وان سبق احدا لی الصف الاول فدخل رجل اکبر منہ سنا او اہل علم فینبغی ان یتاخر ویقدمہ تعظیما لہ اھ فہذا یفید جواز الایثار بالقرب بلا کراہۃ خلافا للشافعیۃ وقال فی الاشباہ لم ارہ لاصحابنا ونقل العلامۃ البیری فروعا تدل علی عدم الکراہۃ ویدل علیہ قولہ تعالی یؤثرون علی انفسہم ولو کان بہم خصاصۃ ط وما فی صحیح مسلم من انہ علیہ الصلوٰۃ والسلام اتی بشراب فشرب منہ وعن یمینہ اصغر القوم وہو ابن عباس وعن یسارہ اشیاخ فقال صلی اللہ علیہ وسلم للغلام اتاذن لی فی ان اعطی ہولاء فقال الغلام لا واللہ فاعطاہ الغلام۔ اذ لا ریب ان مقتضاہ طلب الاذن مشروعیۃ ذلک بلا کراہۃ وان کان غیرہ افضل اھ (ای لو کان آثر الغلام غیرہ بحقہ کان ذلک جائزا لہ) اقول وینبغی تقیید المسئلۃ (ای مسئلۃ جواز الایثار) بما اذا عارض تلک القربۃ ما ہو افضل منہا کاحترام اہل العلم والاشیاخ کما افادہ الفرع السابق والحدیث فانہما یدلان علی انہ افضل من القیام فی الصف الاول ومن اعطاء الاناء لمن لالحق فیکون الایثار بالقربۃ استقلالا من قربۃ اے ما ہو افضل منہا وہو الاحترام المذکور اما لو آثر علی مکانہ فی الصف مثلا من لیس کذلک یکون اعراضا عن القربۃ بلا داع وہو خلاف المطلوب شرعا اھ (ص ۲۹۴ ج ۱) قلت وکون الرجل لیس کذلک یختلف باختلاف الذوق فمن ذاق کونہ احسن الخلق کان ایثار کل مسلم افضل منہ فلہ تقدیم کل مسلم علی نفسہ ویکون فی ذلک عاملا بقولہ علیہ السلام لیلیني منکم الخ بتقدیم الافضل منہ غندہ فافہم واللہ تعالی اعلم ۱۲ رجامع۔

ہیں حضرت شاہ عبد الرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے والد ہیں یہ بڑے بزرگ صاحب باطن ہیں اور اس کے ساتھ ہی بڑے عالم اور محدث بھی ہیں ہندوستان میں علم حدیث یہی لائے ہیں گو شہرت شاہ ولی اللہ صاحب کی زیادہ ہے مگر اصل حدیث کے لانے والے یہاں پر یہی ہیں یہ علامہ ابو طاہر محدث مدنی کے شاگرد ہیں ان کی ایک حکایت ایثار کے متعلق ہے مگر اس سے پہلے میں ان کا ایک دوسرا واقعہ بیان کردوں (کیونکہ دونوں میں ارتباط ہے ۱۲) سو ایک واقعہ تو اُن کا یہ ہے کہ ایک دفعہ وہ بہت قیمتی اور عمدہ لباس پہنے ہوئے دربار شاہی میں جا رہے تھے صوفیہ ناقصین تو ہر حالت میں تقشف سے رہتے ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ ہم تو ظاہر میں جیسے اپنے گھر رہا کرتے ہیں ویسے ہی بادشاہوں کے سامنے رہیں گے ہم سلاطین کی عظمت کے لئے لباس کیوں تغیر کریں اور ایسے صوفیوں کی عوام کی نظر میں زیادہ وقعت ہوتی ہے مگر کامل کی یہ حالت ہوتی ہے ؎

من چو کلکم در میانِ اصبعیں نیستم در صف طاعت بیں ببیں

وہ اپنے لئے کوئی خاص وضع اور ہیئت تجویز نہیں کرتا وہ ہر حالت میں حکم کا تابع ہوتا ہے اسی لئے کبھی خستہ حال رہتا ہے کبھی بنا ٹھنا رہتا ہے یہ لوگ سلاطین کی ملاقات کے لئے قیمتی لباس بھی پہن لیتے ہیں کیونکہ اسمیں مزورلہ کا اکرام ہے اور اکرام مزورلہ مطلوب ہے اس لئے وہ ان کی خاطر اپنی وضع کو چھوڑ کر اس وقت شاہی وضع اختیار کر لیتے ہیں عوام ان کی اس حالت پر طعنہ کرتے ہیں کہ یہ بادشاہوں کی ملاقات کے لئے کیسے بنے ٹھنے جا رہے ہیں۔ مگر ان کو کیا خبر وہ کس حال میں ہیں اسی لئے کامل کا پہچاننا دشوار ہے کیونکہ وہ کسی حالت و وضع کا پابند نہیں ہوتا تو عوام کو اسمیں ظاہر اور سروں سے وہ خاص امتیاز نظر نہیں آتا ؎

در نیابد حال پختہ ہیچ خام پس سخن کوتاہ باید والسلام

ایک بزرگ بی بی کا قصہ ہے کہ وہ ہر رات کو بعد عشاء کے خوب زینت کرتیں عمدہ لباس پہنتیں زیور سے آراستہ ہو کر کنگھی سرمہ لگاتیں اور اس حالت سے شوہر کے پاس

آکر ان سے دریافت کرتیں کہ تم کو میری حاجت ہے اگر وہ کہتے ہاں تو ان کے پاس کچھ دیر لیٹ جاتیں اور اگر وہ کہتے کہ مجھے حاجت نہیں تو پھر کہتیں کہ اچھا اب مجھے اجازت دو کہ میں اپنے خدا کے ساتھ مشغول ہوں چنانچہ شوہر کی اجازت کے بعد وہ اپنا لباس اور زیور وغیرہ اتار کر رکھدیتیں اور کمبل اور اور ٹاٹ کا لباس پہنکر تمام رات عبادت کرتیں تو دیکھئے یہ بزرگ بی بی ایک وقت میں کیسی زینت کرتیں اور دوسرے وقت کمبل اور ٹاٹ میں رہتیں اب اگر کوئی زینت کے وقت اُن کو دیکھتا تو یہی کہتا کہ یہ کیسی بزرگ ہیں جو اس قدر زیب و زینت کا اہتمام کرتی ہیں مگر کسی کو کیا خبر کہ وہ کس لئے زینت کرتی تھیں وہ نفس کی خواہش کے لئے ایسا نہ کرتی تھیں بلکہ حکم شریعت کی وجہ سے زینت کرتی تھیں کیونکہ شریعت کا حکم ہے کہ عورت کو شوہر کے لئے خوب زیب و زینت کرنا چاہئے اس صورت میں اس کو زینت کرنے سے ثواب ملتا ہے مگر آجکل عورتوں کی یہ حالت ہے کہ شوہر کے سامنے تو بھکمنوں کی طرح رہتی ہیں اور جب کہیں برادری میں جاتی ہیں تو سر سے پیر تک آراستہ ہوتی ہیں اور اگر کوئی بیچاری شوہر کی خاطر زینت کرے تو سکو نکو بناتی ہیں کہ ہائے اسے حیا و شرم ذرا نہیں یہ اپنے میاں کے واسطے کیسے کیسے چوچلے کرتی ہے افسوس جس جگہ زینت کا حکم تھا وہاں تو سپر طعن ہوتا ہے اور جہاں ممانعت ہے وہاں اہتمام کیا جاتا ہے۔ تو وہ بزرگ بی بی ایسی نہ تھیں وہ تو حکم کے تابع تھیں جہاں شریعت کا حکم تھا وہاں خوب زینت کرتیں کیونکہ جب شوہر زینت کو کہے تو عورت کو خراب وخستہ رہنے کا کیا حق ہے مگر جب شوہر کو کچھ غرض نہ ہوتی تو وہ اپنے نفس کے لئے زینت کا اہتمام نہ کرتی تھیں۔ بلکہ وہی کمبل اور ٹاٹ پہن لیتی تھیں اسی طرح کا ملین زینت اور ترک زینت میں حکم کے تابع ہوتے ہیں۔ وہ اپنے نفس کے لئے کچھ نہیں کرتے چنانچہ شاہ عبدالرحیم صاحب دربار میں جانے کے لئے عمدہ بیش قیمت لباس پہن کر جارہے تھے۔ اس حالت سے تو ظاہر بینوں کو کچھ کچھ شبہات ہوئے ہوں گے اب دوسری حالت دیکھئے کہ راستہ میں آپ نے ایک کتے کے بچہ کو دیکھا جو نالی میں سردیئے ہوئے [illegible]

فرمایا کہ اس کو نالی سے نکال لو اس نے کچھ ناک منہ چڑھایا تو آپ نے آستین چڑھا کر اُسے خود نکالا اور ایک حمام قریب تھا وہاں لیجا کر گرم پانی سے اُس کو غسل دیا پھر آگ میں تاپا یہاں تک کہ اس کی سردی کم ہوگئی اور اچھی طرح چلنے پھرنے لگا پھر آپ نے اہل محلہ سے فرمایا کہ اگر تم اس کی راحت کا انتظام کرسکو اور نگہداشت کا وعدہ کرو تو میں اس کو یہیں چھوڑ دوں ورنہ اس کو اپنے ساتھ لیجاؤں اور میں خود اس کا انتظام کرونگا اہل محلہ نے وعدہ کیا تو آپ نے اس کو چھوڑ دیا اور پھر دربار میں تشریف لے گئے (بھلا جو شخص فخر و تکبر کے لئے زینت کرتا ہو کیا اس سے یہ ہوسکتا ہے کہ ایک کتے کے بچہ کو اپنے ہاتھ سے اسطرح دھوئے اور یوں اس کو راحت پہونچائے ہرگز نہیں۔ مگر حضرت شاہ صاحب نے بے تکلف اس کی خدمت کی خادم نے بھی ناک منہ چڑھا لیا مگر آپ کو ذرا بھی اس سے انقباض نہ ہوا یہ اس بات کی دلیل تھی کہ وہ اپنے نفس کے لئے زیب و زینت نہ کرتے تھے ۱۲) یہ قصہ تمہید ہے دوسرے قصہ کی اور وہ دوسرا قصہ جو مقصود ہے یہ ہے کہ ایک بار آپ بٹیا پر جارہے تھے ایک موقع ایسا آیا کہ بٹیا کے دونوں طرف پانی اور کیچڑ تھا صرف بٹیا ہی کا راستہ سوکھا ہوا تھا سامنے سے ایک کتا بھی اسی بٹیا پر آگیا اب وہاں اسکی ضرورت تھی کہ دونوں میں سے ایک کیچڑ میں اترے تو دوسرا بٹیا کے راستہ سے نکلے کیونکہ بٹیا پتلی تھی اس میں اتنی وسعت نہ تھی کہ دونوں برابر کو نکل جائیں چنانچہ شاہ صاحب کھڑے ہوگئے اور وہ کتا بھی سامنے کھڑا ہوگیا پھر اشارات میں گفتگو شروع ہوئی (بعض اہل اللہ جمادات و حیوانات سب کی گفتگو سمجھ لیتے ہیں ۱۲) چنانچہ شاہ صاحب نے کتے سے کہا کہ بھائی تم پانی میں اترو اس نے کہا کیوں مجھ میں اور آپ میں کیا فرق ہے آپ کیوں نہیں اُترتے اور یہ کہا کہ افسوس پہلے بزرگوں کا مذہب ایثار تھا اور اسوقت کے بزرگوں کا مذہب اختیار ہے فرمایا نہیں تو نے بدگمانی کی بلکہ میں تجھ سے اترنے کو اس لئے کہتا ہوں کہ تو مکلف نہیں ہے اور میں مکلف ہوں اگر تو اس پانی اور کیچڑ سے ناپاک بھی ہوجائیگا تو تھوڑی دیر میں خشک ہوکر پھر پاک ہوجائیگا پھر تیرے ذمہ نہ وضو ہے نہ نماز ہے۔ اور میں اتروں گا تو مجھے اپنے سارے کپڑے اور بدن کا دھونا اور پاک کرنا لازم ہوگا جس میں بہت دیر لگے گی ممکن ہے کہ نماز میں دیر ہوجائے

اس نے جواب دیا کہ بہت اچھا میرا تو کچھ حرج نہیں میں پانی میں اترتا ہوں مگر یہ یاد رکھو کہ تمہارے کپڑے ناپاک ہو جائیں تو ایک دو لوٹے پانی سے پاک ہو سکتے ہیں لیکن اگر میں اس وقت پانی میں اترا اور تمہارے دل میں یہ خیال آیا کہ میں اس کتے سے افضل ہوں تو اس سے تمہارا قلب ایسا ناپاک ہوگا جس کی ناپاکی ہفت قلزم سے بھی نہ دھل سکیگی یہ سُن کر شاہ صاحب پر ایک حالت طاری ہو گئی اور فوراً پانی میں اُتر کر راستہ سے ہٹ گئے اور کتا بٹیا پر سے چلا گیا اور آپ اس کے بڑے احسانمند ہوئے کہ اُسکے ذریعہ سے ایک علم عظیم عطا ہوا۔ اب شاہ صاحب پر غیب سے الہام ہوا کہ عبد الرحیم خبر بھی ہے کہ ہمنے تم کو یہ علم عظیم کتے کے ذریعہ سے کیوں دیا یاد کرو تم نے ایک دن ایک کتے کے بچہ پر احسان کیا تھا کہ اس کو پانی میں سے نکال کر گرم پانی سے دھویا اور آگ سے تاپا تھا تو ہم نے اُس احسان کا آج بدلہ کر دیا کہ اسی کی ابن النوع کے ذریعہ سے تم کو یہ علم عظیم عطا کیا تاکہ اس کتے کے بچہ پر اپنا احسان نہ سمجھیں اور ان علوم کی قدر صوفیہ ہی سمجھتے ہیں ان کو ان میں ایسا مزا آتا ہے کہ واللہ جب کوئی علم جدید عطا ہوتا ہے تو اس سے ایسا حظ آتا ہے کہ ہفت اقلیم کی سلطنت بھی اس کے سامنے گرد ہوتی ہے غرض صوفیہ نے ایثار سے یہاں تک کام لیا ہے کہ جانوروں کے ساتھ بھی ایثار کیا صوفیہ نے ہر مقام پر اسکی رعایت کی ہے اور بعض مواقع پر شریعت نے بھی اس کو واجب کیا ہے چنانچہ حقوق نفس پر حقوق غیر کو مقدم کیا گیا ہے بشرطیکہ اپنی ہلاکت اور اپنے اہل بیت کی پریشانی کا اندیشہ نہ ہو پس جہاں ایثار واجب ہے صوفیہ وہاں تو کیوں نہ کرتے وہ تو جہاں واجب بھی نہیں وہاں بھی اس کا بہت لحاظ رکھتے ہیں اور اس سے اُن کو علوم حاصل ہوتے ہیں اور ان کو تو بڑا مزا ان علوم ہی میں آتا ہے مگر اب لوگ چاہتے ہیں اُن سے دنیوی ترقی کرانا بھلا یہ اس کام کے کہاں ؎

تا بدانی ہر کرا یزداں بخواند از ہمہ کارِ جہاں بے کار ماند

صاحبو! جس کو ان علوم کا مزا حاصل ہو گیا ہے وہ واقعی دنیا کے کام کا نہیں رہتا ہاں جو ایسے باہمت ہوں کہ دونوں کو جمع کر سکیں جیسے حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما وہ

البتہ دونوں میں مشغول ہوتے ہیں اور اُن کو دنیا کے مشاغل ان علوم سے مانع نہیں ہوتے بلکہ دنیا بھی ان کے ہاتھ میں دین بنجاتی ہے مگر ایسے بہت کم ہیں زیادہ تو ایسے باہمت نہیں ہوتے۔ انکا تو وہی حال ہوتا ہے ؎

تا بدانی ہر کرا یزداں بخواند ازہمہ کارِ جہاں بیکار ماند

بہر حال لوگوں نے حقوق العباد سے بہت ہی غفلت کر رکھی ہے۔ حالانکہ حق العبد کا تقدم معلوم ہو گیا اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ حق اللہ پر حق العبد کا تقدم بوجہ عظمت کے نہیں ہے بلکہ محتاج وحقیر کے حق کو کریم غنی نے اپنے حق پر مقدم کر دیا ہے کہ جب دونوں میں تعارض ہوتا ہے تو وہ فرما دیتے ہیں کہ یہاں ہمارے حق کو چھوڑ دو ہمیں کچھ ضرورت نہیں اور بندہ کے حق کو ادا کرو وہ محتاج ہے اگر اسکا حق ادا نہ ہوگا تو پیٹ پھاڑ کر مرے گا یہ وجہ ہے تقدم کی پس لوگوں کا تاکد حق کے سبب کو صرف عظمت میں منحصر کر دینا صحیح نہیں بلکہ حاجت بھی تاکد حق کا ایک سبب ہے جب سبب مرض کا میں نے ازالہ کر دیا تو اب مرض کا علاج سہل ہو گیا پس بندہ کے حقوق کو اس کے حاجت کی وجہ سے ادا کرو اور جب میں آپ کے عذر کا جواب دے چکا تو حجت تام ہو گئی۔ اب کسی کے پاس حقوق العباد سے غفلت کرنے کا کوئی عذر نہیں رہا۔ یہ تو ان لوگوں کی غفلت کا علاج تھا جو حقوق العباد کا بالکل ہی اہتمام نہیں کرتے۔ اب دوسری غلطی بعض لوگوں میں یہ ہے کہ وہ حق العبد کو صرف مال میں منحصر کرتے ہیں کہ چوری کرنا غصب کرنا قرض لیکر انکار کر دینا کسی کی امانت رکھ کر مکر جانا بس یہی جرم ہے ان کے علاوہ حق العباد میں اور کوئی جرم نہیں حالانکہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حق العبد مال ہی میں منحصر نہیں بلکہ اور بھی حقوق ہیں اور وہ بھی حقوق مالیہ کے برابر بلکہ اسسے بھی معظم تھیں چنانچہ حجۃ الوداع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے دریافت فرمایا کہ یہ کونسا دن ہے صحابہ نے ادب کی وجہ سے عرض کیا اللہ ورسولہ اعلم فرمایا الیس یوم عرفۃ کیا یہ عرفہ کا دن نہیں ہے صحابہ نے عرض کیا بلے بیشک یہ عرفہ کا دن ہے پھر پوچھا یہ کونسا مہینہ ہے صحابہ نے ادب سے وہی جواب دیا اللہ ورسولہ اعلم آپ نے فرمایا

الیس ذی الحجۃ کیا یہ حج کا مہینہ نہیں ہے صحابہ نے عرض کیا بیشک یہ حج کا مہینہ ہے پھر دریافت فرمایا کہ یہ کونسا شہر ہے اس پر بھی صحابہ نے ادب سے "اللہ و رسولہ اعلم" ہی کہا آپ نے فرمایا الیس بالبلد الحرام، کیا یہ بلد حرام نہیں ہے۔ صحابہ نے عرض کیا بیشک یہ بلد حرام ہے۔ اس تمہید کے بعد آپنے فرمایا "الا ان اموالکم و دمائکم و اعراضکم علیکم حرام کحرمۃ یومکم ہذا فی شہرکم ہذا فی بلدکم ہذا من یومکم الی یوم القیامۃ (او کما قال) اس لو تمہارے اموال اور جانیں اور آبروئیں آج سے قیامت تک ویسی ہی حرام ہیں جیسے اس یوم معظم شہر معظم اور بلد معظم میں حرام ہیں۔ ہمیشہ کے لئے اُن کی حرمت ویسی ہی ہے جیسی آج ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حقوق العباد کی تین قسمیں ہیں ایک حقوق نفس دوسرے حقوق مال تیسرے حقوق عرض جب شریعت سے تین حقوق معلوم ہوتے ہیں تو آپ کو صرف مال میں حق العبد کو منحصر کرنیکا کیا حق ہے۔ صاحبو! جان کا بھی حق ہے آبرو کا بھی حق ہے مال کا بھی حق ہے۔ جان کا حق تو یہ ہے کہ کسی کو ناحق قتل نہ کرو خیر قتل تو یہاں اس بادشاہت میں بکثرت کون کرسکتا ہے اس کی طاقت تو یہاں کسی کو نہیں ہے گو شاذ و نادر کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے مگر وہ چھپ نہیں سکتا۔ فوراً مقدمہ قائم ہو کر پھانسی ہو جاتی ہے اس لئے اس سے سب ڈرتے ہیں ہاں یہ حق البتہ باقی ہے کہ کسی غریب کے دو چار ڈنڈے لگا دئے گو ہمارے قصبہ میں یہ حق بھی باقی نہیں رہا وہاں کسی کی مجال نہیں جو کسی بھنگی کو بھی مار سکے یا بیگار میں کام لے سکے ہمارے بھائی کے ایک کارندہ ہیں حاجی جی اب تو انھوں نے کارندگی سے استعفاء دیدیا ہے مگر جس زمانہ میں وہ کارندہ تھے اُس زمانہ کا قصہ بیان کرتے تھے۔ ایک دن میں نے سڑک صاف کرنے والے بھنگی سے کہا کہ جب تو سڑک پر جھاڑو دیا کرے تو ذرا ہمارے دروازہ میں بھی جھاڑو دیدیا کر تو وہ کیا کہتا ہے کہ حاجی جی کنونؔ تو ہے نہیں خیر تمہاری خاطر سے دیدیا کرونگا۔ تو وہاں کے بھنگی بھی قانونی کانون ہیں ہر شخص بجائے خود رئیس ہے اور اس کا حاصل یہ ہے کہ وہاں کوئی رئیس نہیں۔ (ہر شخص رئیس وہیں ہوتا ہے جہاں کوئی رئیس نہ ہو ۱۲) میں تو اس حالت سے بڑا خوش ہوں گو اپنی قوم کی حالت تنزل سے افسوس بھی ہوتا ہے کہ اُن کی وقعت بھنگیوں کے دلوں

میں بھی نہیں رہی مگر اس سے خوش ہوں کہ ان کے ہاتھ سے اب ظلم نہیں ہو سکتا ریاست تو وہی اچھی ہے جسمیں ظلم نہ ہو اور جس ریاست کا یہ نتیجہ ہو کہ غریبوں پر ظلم کیا جاوے اُس کے ہونے سے نہ ہونا اچھا چنانچہ اب ہمارے قصبہ میں زوال ریاست سے یہ بات تو ہو گئی کہ کوئی کسی پر ظلم نہیں کر سکتا اور جو کوئی کسی کو کچھ کہتا ہے تو جواب میں دس باتیں وہ ان کو سنا لیتا ہے پس ظالمانہ ریاست سے اُن کی یہی حالت اچھی ہے اُن کو اگر تھوڑی سی بھی ریاست ملتی ہے تو چوگنا ظلم کرتے ہیں کانپور کے ضلع میں ایک قصبہ ہے بارہ وہ پٹھانوں کی بستی ہے وہاں کے پٹھان بہت شریف ہیں مگر آخر تو رئیس ہیں کبھی کسی غریب کو کچھ کہہ بھی لیتے ہیں تو وہاں کے ایک پٹھان نے کسی جلاہے سے تمسخراً پوچھا کہ میاں کس حال میں ہو کہا خدا کی نعمتوں کا شکر ادا کرتا ہوں کہ خدا نے مجھکو جولاہا بنا دیا جس سے مجھ کو کوئی کچھ کہہ لیتا ہے کوئی دو چار ڈنڈے لگا دیتا ہے تو قیامت میں مجھے کسی کی نماز ملے گی کسی کے روزے ملیں گے پٹھان نہیں بنایا۔ اگر پٹھان ہوتا تو قیامت میں دوسرے لوگ میرے سب اعمال لیجاتے اور میں مفلس بنکر کھڑا رہتا تو میں اس بات پر خداء تعالیٰ کا بہت شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے پٹھان نہ بنایا یہ جواب سن کر کوئی دوسرا ہوتا تو نہ معلوم اس جُلاہے کی کیا گت بناتا مگر وہاں کے پٹھان شریف ہیں انھوں نے کچھ نہیں کہا نہ بُرا مانا اُن لوگوں کی شرافت کا ایک اور اس سے بھی زیادہ عجیب قصہ ہے وہ یہ کہ میں کئی سال ہوئے ایک دفعہ کان پور گیا تھا تو مجھے معلوم ہوا کہ نواح کان پور میں بعض دیہات کے نومسلم راجپوت مرتد ہونے والے ہیں آریہ اُن کو بہکا رہے ہیں تو میں نے اپنے احباب میں سے کچھ علماء اور رؤسا کو ساتھ لیا اور موضع گجنیر میں قیام کیا جو سب دیہات میں بڑا گانوں تھا پھر وہاں سے دو دو تین تین عالموں کو متفرق دیہات میں تبلیغ کے لئے بھیجا گیا اور ان کے چودھریوں کو بلایا اور کہا کہ بھائی ہم نے یہ سنا ہے کہ تم آریہ ہونے والے ہو۔ اگر کوئی شبہہ اسلام میں ہو رفع کر لو ایک نے جواب دیا کہ ہم آریہ کیوں ہوتے اُن کے یہاں تو نیوگ کا بڑا فحش طریقہ ہے جس کو کوئی شریف ہرگز گوارا نہیں کر سکتا۔ پھر ہم نے کہا کہ ہاں بھائی بس تم مسلمان ہی رہنا وہ کہنے لگے کہ ہم مسلمان

بھی نہیں ہوتے ہم تو نومسلم ہی رہیں گے۔ میں نے کہا اچھا تم نومسلم ہی رہو پھر باتوں باتوں میں ان سے پوچھا گیا تم ہماری طرح مسلمان کیوں نہیں ہوتے تو کہنے لگے کہ اصلی بات یہ ہے کہ ہم تمہاری طرح مسلمان ہو جائیں تو ڈر یہ ہے ہمیں تم میں سے کوئی اپنی لڑکی نہ دیگا نہ ہماری لڑکی لیگا اس لئے ہم تمہارے ساتھ بھی نہیں مل سکتے اور نہ آریوں کے ساتھ ملیں گے اس جواب پر میں ذرا خاموش ہوا تھا کیونکہ اس کا وعدہ میرے اختیار سے باہر تھا خدا بھلا کرے قصبہ بارہ کے پٹھانوں کا کہ وہ بھی خبر سن کر آ گئے تھے انمیں سے ایک رئیس کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ صاحبو! تم بے فکر رہو تم کو ہم اپنی بیٹیاں دیں گے اور تمہاری لڑکیاں لیں گے گو اس سے برادری میں ہماری ذلت ہو گی مگر اسلام کی وقعت و خدمت کے لئے ہماری جان و آبرو سب فدا ہیں میں اس جواب سے بڑا خوش ہوا اور ان کو بہت دعا دی کہ شاباش ع ایں کار از تو آمد و مرداں چنیں کنند۔ مگر یہاں آکر چودھری لاجواب تو ہو گیا۔ لیکن اپنی حالت کے بدلنے پر آمادہ نہ ہوا۔ معلوم ہو گیا کہ یہ بات اس نے محض شرارت کی راہ سے کہی تھی۔ جس سے صرف ہم کو لاجواب کرنا مقصود تھا۔ اور حقیقت میں ان لوگوں کو اپنی حالت کا بدلنا منظور نہیں وہ اپنے اسی طرز میں خوش ہیں۔ دراصل وہ مسلمان بھی برائے نام ہی ہیں حالت انکی یہ ہے کہ اُن کے نام ہندوؤں جیسے ہیں چنانچہ ایک چودھری کا نام نونسنگھ تھا اور دوسرے چودھری کا نام ادھار سنگھ تھا یہ بہ نسبت پہلے کے ذرا سمجھدار تھا بڑے چودھری سے کہا گیا کہ تجھے کلمہ بھی آتا ہے کہنے لگا ہاں آتا ہے کہا گیا سناؤ تو کہنے لگا کہ بس سنوت گانوں کے لوگ مجھے یوں کہیں گے کہ بڈھا سٹھیا گیا جو کلمہ پڑھت ہے ان کو کلمہ پڑھنے سے بھی رکاوٹ تھی وہ ایسے مسلمان تھے بس چند باتیں ان میں اسلام کی موجود تھیں ایک تو وہ ختنہ کراتے تھے دوسرے مردوں کو دفن کرتے تھے تیسرے نکاح قاضی سے پڑھواتے تھے مگر ساتھ ہی ہندوؤں کی طرح پھیرے بھی کرتے تھے اور ایک یہ بات ان میں اسلام کی تھی کہ محرم میں تعزیہ بناتے تھے اور اس کو اتنا بڑا شعار سمجھتے تھے کہ ادھار سنگھ نے یوں کہا تھا کہ ہم آریہ کیسے بنت ہمارے یہاں تو تاجیہ (تعزیہ) بنت ہے

میں نے یہ سن کر کہا کہ دیکھو تعزیہ مت چھوڑنا کہنے لگے اجی بھلا اسے ہم کب چھوڑنے لگے بعض علماء کو میری اس بات پر خیال ہوا کہ اس نے ایک بدعت کی مسلمانوں کو اجازت دی میں نے کہا بس چپکے بیٹھے رہو یہ کانپور اور لکھنؤ میں ہی شرک و بدعت ہے مگر یہاں فرض ہے کیونکہ اس جگہ تعزیہ ہی ان لوگوں کے دین کا وقایہ ہے ابھی تو ان لوگوں کا تعزیہ بناتے رہنا ہی ان کے اسلام کا محافظ ہے پھر جب رفتہ رفتہ یہ پکے مسلمان ہو جائیں گے اُس وقت بدعت و سنت کی تعلیم دیدینا ہمارے ایک دوست نے عجیب بات کہی میں نے اُسے کہا کہ کالج علیگڈھ میں مولود شریف ہوا کرتا ہے جو کہ بدعت ہے وہ دوست فرمانے لگے کہ یہ مولود شریف (بہیئۃ معروفہ) اور جگہ تو بدعت ہے مگر کالج میں جائز بلکہ واجب ہے کیونکہ اس بہانہ سے وہ کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر شریف اور آپ کے فضائل و معجزات تو سن لیتے ہیں تو اچھا ہے اسی طرح حضور کی عظمت و محبت ان کے دلوں میں قایم رہے ورنہ وہ تو سال بھر ایسی خرافات میں مبتلا رہتے ہیں کہ بھول کر بھی خدا و رسول کا نام انکی زبان پر نہیں آتا مجھے ان کی یہ بات پسند آئی کیونکہ واقعی اگر کسی جگہ بدعت ہی لوگوں کے دین کی حفاظت کا ذریعہ ہو جاوے تو وہاں اس بدعت کو غنیمت سمجھنا چاہئے جبتک کہ ان کی پوری اصلاح نہ ہو۔ غرض بارہ کے پٹھان بڑے شریف ہیں اور یہ اُن کی شرافت ہی ہے کہ اس جملہ کا جواب ناگوار نہ ہوا اور نہ کوئی دوسرا ہونا تو خوب حجت کرتا مگر واقعی بڈھے نے بات سچی کہی کہ اللہ کا شکر ہے جو میں جولاہا ہو گیا پٹھان نہ ہوا ورنہ پھر میں ظلم کرتا اور لوگ میرے نیک اعمال چھین لیتے سو ہمارے قصبہ میں تو یہ ریاست اب نہیں رہی کہ کوئی کسی کے ڈنڈے لگا سکے گو تھوڑا سا کہیں ہو بھی جاتا ہے مگر پھر کم ہے جس سے میں خوش ہوں لیکن اور قصبات میں جہاں تھوڑی بہت ریاست ہے وہاں اس قسم کا ظلم زیادہ ہوتا ہے اور افسوس یہ ہے کہ اس سے غربا بھی بچے ہوئے نہیں ان میں بھی تکبر بہت ہوتا ہے گو امیروں کی برابر قدرت نہ ہو مگر اینٹھ مروڑ انہیں بھی ہے چنانچہ خود اقرار کرتے ہیں کہ کوئی مال مست ہے کوئی کھال مست ہے اور یہ بہت سخت بات ہے کیونکہ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تین شخصوں سے بہت زیادہ بغض و نفرت ہے

ایک ملک کذاب بادشاہ جھوٹ بولنے والا کیونکہ آدمی اس لئے جھوٹ بولا کرتا ہے کہ اُسکے ذریعہ سے اپنا کام نکالے اور اس کی ضرورت وہاں ہوتی ہے جہاں کوئی اپنے سے زیادہ زبردست ہو جس کے سامنے سچ بولنے سے کچھ اندیشہ ہوتا ہے تو بادشاہ سے اوپر تو کوئی نہیں ہوتا اس کو جھوٹ بولنے کی کیا مار آئی دوسرے "شیخ زانی" یعنی بڈھا زنا کار کیوں کہ جوان میں تو ایک داعی زنا کا موجود ہے جس کا روکنا ہمت کی بات ہے مگر بڈھے میں تو وہ داعی بھی موجود نہیں یہ تو زبردستی اپنے نفس کو سوچ سوچ کر آمادہ کرے گا تو اس کا زنا کرنا محض حرص اور خباثت و شرارت ہی ہے تیسری حائل متکبر یعنی غریب تکبر کرنے والا کیونکہ امیر کے پاس تو تکبر کا کچھ سامان بھی ہے اور یہ خواہ مخواہ فرعون بے سامان بنا ہوا ہے غرض جس شخص میں جس گناہ کا سبب اور داعی موجود ہو اسکا جرم اس شخص سے کم درجہ کا ہے جسمیں کوئی سبب اور داعی موجود نہیں اس لئے غریبوں کا تکبر امیروں کے تکبر سے اشد ہے مگر حالت یہ ہے کہ غریب بھی اپنی کھال میں ایسے مست ہیں کہ جہاں اُن کا بس چلتا ہے وہاں یہ بھی دوسروں کی ایذا رسانی سے نہیں چوکتے ہمارے قصبہ میں ایک رئیس کے یہاں تقریب ہوئی تھی جس میں بہت کچھ سامان کیا گیا تو برادری کے ایک غریب شریف زادہ نے اوسکی آبروہی بہانا چاہی اور سوچتے رہے کہ کسی بات پر موقع ملے تو اس کی خوشی میں کھنڈت ڈالوں مگر وہاں ایسا عمدہ انتظام تھا کہ کسی بات میں اُن کو بولنے کا موقع نہ ملا اتفاق سے سقہ پانی کی مشک لئے ہوئے ان کے پاس سے گذرا اور مشک کی ایک باریک دھار سے کچھ چھینٹے ان کے کپڑوں پر پڑ گئے بس یہ کہاں تھے فوراً جھلا کر کھڑے ہو گئے اور رئیس کو بُرا بھلا کہنا شروع کیا کہ نوآموز نودولت ہے انتظام کا سلیقہ نہیں ہے برادری کے بھائیوں کے سامنے سے سقوں کو نکالا جاتا ہے جس سے سب کے کپڑوں پر چھینٹے پڑتے ہیں اور اُن کو ذلیل کیا جاتا ہے ہم ایسے اوچھے کی تقریب میں شریک نہیں ہو سکتے یہ کہکر چلتے ہو گئے پھر اس رئیس بیچارہ نے اُن کی خوشامد کی لوٹی پیروں میں ڈالی جب آپ تشریف لائے کیونکہ مقصود یہی تھا کہ ذرا اس کو ذلیل کر دیں اور اپنے پیروں میں اسکی ٹوپی ڈلوالیں مگر یہ اینٹھ مروڑ بھی اسی کی بدولت تھا کہ جانتے تھے وہ ہماری خوشامد کرے گا

آگے ہاتھ جوڑے گا اس لئے اس پر ناز تھا اور اس رئیس کی یہ تواضع بھی ریاست ہی کی بدولت تھی کیونکہ رؤساء جانتے ہیں کہ ہماری شان اتنی بڑی ہے جو ایسی باتوں سے نہیں گھٹتی پس غرباء میں بھی تکبر اور ایذاء رسانی کا مرض موجود ہے اس لئے اب میں اہل دولت کا لفظ چھوڑ کر "اہل قدرت" کہونگا تو جس کو جتنی بھی قدرت حاصل ہے اسمیں وہ دوسرے کی جان پر دست اندازی کرنے سے باک نہیں کرتا گو زیادہ دست اندازی رؤساء ہی کے ہاتھ سے ہوتی ہے۔ کیونکہ ان کو قدرت زیادہ ہے غریب آدمی کسی پر زیادتی کرتا ہے تو دوسرا اس کا بدلہ لے سکتا ہے۔ اور اگر خود نہ لے سکے تو نالش کر کے انتقام لے سکتا ہے اور امراء کی اول تو غرباء نالش نہیں کر سکتے کیونکہ اُس کے لئے روپیہ کی ضرورت ہے اور غریبوں کے پاس اتنا روپیہ کہاں۔ اور اگر نالش کریں بھی تو کامیابی دشوار ہے کیونکہ حکام بھی امراء کی رعایت کرتے ہیں۔ (بس وہی حال ہو جاتا ہے ؎

ہم نے سوچا تھا کہ حاکم سے کریں گے فریاد وہ بھی کم بخت ترا چاہنے والا نکلا (۱۲ جامع)

خصوصاً حکومت غیر عادلہ میں تو امراء کی بہت ہی رعایت ہوتی ہے۔ ہاں حکومت عادلہ ہو تو وہاں کسی کی پروا نہ ہوگی چاہے کوئی کتنا ہی امیر اور مالدار ہو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جبلۃ بن الایہم شاہ غسان اسلام لایا تھا حضرت عمرؓ کو اس کے اسلام سے خوشی ہوئی تھی کیونکہ بادشاہ کے مسلمان ہونے سے اس کی رعیت کے بہت سے لوگ اسلام میں داخل ہو جاتے ہیں۔ دوسرے اس سے مخالفین پر بھی رعب پڑتا ہے مگر اس خوشی کا یہ اثر نہ تھا کہ جبلہ کی ایسی رعایت کی جاتی کہ وہ جو چاہے ظلم کرنے لگے اور کچھ باز پرس نہ ہو چنانچہ ایک مرتبہ جبلہ لنگی باندھے ہوئے خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا لنگی باندھنا اہل عرب کا عام شعار تھا بادشاہ اور غریب سب لنگی ہی باندھتے تھے تو اسوقت اتفاق سے کسی غریب کے پیر سے جبلہ کی لنگی کا کونہ دب گیا جبلہ نے جو قدم آگے بڑھایا دفعۃً لنگی کھل گئی غصہ سے سرخ ہو گیا اور اس غریب مسلمان کے بڑی زور سے طمانچہ مارا اس کا دانت ٹوٹ گیا اس نے جبلہ کو تو کچھ نہ کہا سیدھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجلاس میں جا کر دعوی دائر کر دیا حضرت عمر نے جبلہ کو بلایا اور پوچھا کہ تو نے اس مسلمان کو طمانچہ

مارا ہے اس نے اقرار کیا آپ نے مدعی سے فرمایا کہ تم جبلہ سے قصاص لے سکتے ہو جبلہ نے کہا اے امیر المومنین اس بازاری کو مجھ جیسے بادشاہ کی برابر کس چیز نے کر دیا جو اس کو مجھ سے قصاص لینے کا حق حاصل ہو گیا آپ نے فرمایا اسلام نے تم دونوں کو برابر کر دیا جبلہ نے کہا اچھا مجھے کل تک کی مہلت دیجاوے میں کل قصاص دیدونگا حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں مہلت نہیں دے سکتا یہ مدعی کا حق ہے۔ اگر وہ چاہے مہلت دے یا نہ دے بیچارہ غریب آدمی ذرا سی بات پر پسیج جاتا ہے مدعی نے کہا کہ مجھے کل تک کی مہلت دینا منظور ہے پہر رات کو وہ کمبخت چپکے سے نکل کر بھاگ گیا اور مرتد ہو کر نصرانیوں میں جاملا مگر حضرت عمرؓ کو اس کی ذرا بھی پروا نہ ہوئی (اور نہ اسلام کو جبلہ کے ارتداد سے کچھ نقصان پہونچا بلکہ اگر حضرت عمر اُس کی رعایت کرتے تو اُس سے بیشک اسلام کو ضرر پہونچتا کیونکہ عقلاء کو یہ کہنے کا موقع ملتا کہ اسلام میں ضعیف کا حق قوی سے نہیں دلایا جاتا بلکہ زبردستوں کی رعایت کی جاتی ہے اور یہ خلاف عدل ہے اور اب تو گو ظاہر میں ایک جبلہ اسلام سے نکل گیا مگر عدل اسلامی کی نظیر تمام دنیا کے سامنے قائم ہو گئی۔ اور سب کو معلوم ہو گیا کہ قانون اسلام میں کوئی زبردست کسی کمزور کا حق نہیں دبا سکتا جس سے ہزاروں لاکھوں آدمی عدل اسلامی کے شیدا بن گئے ۱۲ جامع) اور تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں جبلہ بھی اپنے ارتداد پر بہت پچھتاتا تھا۔ اور باوجودیکہ نصرانیوں میں اسکی بڑی عزت اور آؤ بھگت ہوتی تھی۔ اور ہر قسم کے سامان عیش اُس کے لئے مہیا تھے مگر بعض دفعہ وہ رو کر یہ کہتا تھا کہ اے کاش میں اُس دن قصاص کو گوارا کر لیتا تو وہ میرے لئے اس عزت سے ہزار درجہ بہتر ہوتا اسلام واقعی ایسی چیز ہے کہ اس کو چھوڑ کر کبھی چین نہیں مل سکتا۔

تو جہاں حکومت مسلمہ عمریہ ہو وہاں البتہ کسی رئیس یا بادشاہ کی کسی غریب کے مقابلہ میں کچھ رعایت نہ ہوگی اور میں مسلمانوں کو وصیت کرتا ہوں کہ اگر کوئی بڑا ہندو یا عیسائی مسلمان ہو جایا کرے تو اُس کو نچاتے نہ پھرا کرو۔ ہاں اسکی خدمت اور خاطر کر و باقی ایسی دھوم دھام نہ کیا کرو جس سے کسی کو عجیب بات معلوم ہو

کیونکہ کوئی رئیس ہو یا بادشاہ جو کوئی بھی اسلام لاتا ہے اپنی نجات اور اپنی فلاح کے لئے لاتا ہے مسلمانوں پر کیا احسان کرتا ہے یہ تو جملہ معترضہ تھا میں کہہ رہا تھا کہ حضرت عمرؓ جیسی حکومت ہو تو خیر ورنہ غیر عادل حکومتوں کی یہی حالت ہے کہ ان میں رؤساء اور امراء کی غریبوں کے مقابلہ میں بہت رعایت کی جاتی ہے تو غرباء نالش کرکے بھی مالداروں سے انتقام نہیں لے سکتے اس لئے مالداروں کے ہاتھ سے مخلوق کی جان پر زیادہ ظلم ہوتا ہے اور ایک ظلم حکام کے ہاتھ سے ہوتا ہے کہ کسی کے دو چار بیدیں بلا وجہ لگوادیں اُن کی تو کون نالش کرتا ہے اور بعضے اس طرح ظلم نہیں کرتے تو یوں کرتے ہیں کہ مقدمہ میں ایک فریق سے رشوت لیکر کسی کا حق ضایع کردیا ایک ڈپٹی صاحب کی یہ حالت تھی کہ وہ دونوں فریق سے رشوت لے لیا کرتے تھے مگر اُن سے سب خوش تھے بلکہ ایماندار مشہور تھے کیونکہ جس فریق کے خلاف وہ فیصلہ کرتے تھے اُس کی رشوت واپس کردیا کرتے تھے اور بعضے یہ کرتے ہیں کہ جس نے زیادہ رشوت دیدی اُس کے موافق فیصلہ کردیا اور دوسرے کی رقم بھی ہضم کرلی مقدمہ تو حاکم کے ہاتھ میں ہوتا ہے جسکے چاہے موافق کردے حاکم کو مقدمہ کا بدلنا کیا مشکل ہے۔ ہیر پھیر کر وہ جس طرح چاہے بنادے۔ اسی وسعت اختیار پر نظر کرکے میں مسلمانوں سے کہا کرتا ہوں کہ تم حکام وقت کو ناراض نہ کرو یہ طریقہ بہت مضر ہے اسپر بعض نوجوان کہا کرتے ہیں کہ ہم تو جو کچھ کرتے ہیں قانون کے اندر کرتے ہیں خلاف قانون کچھ نہیں کرتے پھر حکام کیا کرسکتے ہیں میں نے کہا کہ حکام کو تمہاری نیت تو معلوم ہے جب وہ یہ جانیں گے کہ یہ لوگ ہم کو ناراض اور تنگ کرنے کے لئے یہ حرکت کررہے ہیں تو قانون اُن کے ہاتھ میں ہے جس بات کو تم خلاف قانون نہیں سمجھتے ہو وہ اس کو بھی کسی ترکیب سے خلاف قانون کردیں گے اور شریعت کا امر ہے "لاتلقوا بایدیکم الی التہلکۃ" کہ اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو تو ایسا کام نہ کرنا چاہیئے جس میں حاکم کی ناراضی ہو کیونکہ اس کا انجام قریب بہ ہلاکت ہے اور مدت دراز تک مسلمانوں کو اسکا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے اور ایسے خطرات سے حفاظت نفس شرعاً مطلوب ہے مگر اتنا فرق ہے کہ عوام تو اپنی جان سمجھکر اپنے نفس کی حفاظت کرتے ہیں اور اہل اللہ خدا کی

امانت سمجھکر حفاظت کرتے ہیں۔ کہ اس کو خلاف منشاء حق صرف نکیا جاوے (اس لئے عارف ایسے موقع میں جہاں شریعت نے حفاظت نفس کا حکم دیا ہو اپنی جان کی بہت حفاظت کرتا ہے گو عوام اس کو بزدل و ڈرپوک کہیں اور جہاں شریعت نے بذل نفس کا حکم دیا ہو وہاں اہل اللہ سے زیادہ جانبازی کرنے والا کوئی نہیں ہوتا ۱۲ جامع) تو دو طبقے تو یہ ہیں جو ظلم میں زیادہ بدنام ہیں یعنی رؤساء اور حکام اور ایک طبقہ اور ہے میانجیوں کا یہ بچوں کے ساتھ بہت ظلم کرتے اُن کو جب کسی بچہ پر غصہ آتا ہے تو قہر عام کی طرح سب پر برستا ہے کہ ایک طرف سے سب کی خبر لیتے چلے جاتے ہیں اس سے میانجی بہت کم بچے ہوئے ہیں ہاں اگر کوئی ایسا ہو جیسے حافظ علی حسن صاحب کیرانوی مقیم گنگوہ تھے تو بے شک وہ اس ظلم سے بچ سکتا ہے مگر ان میں افراط نہ تھا تو یہ تفریط تھی کہ بچوں کو مار کر ان سے کہتے تھے کہ تم مجھ سے بدلہ لیلو اور بعضے لڑکے ایسے شریر تھے کہ بدلہ بھی لے لیتے اور حافظ جی کو تھپی سے سٹراسٹر مارتے تھے اور وہ ایسے سیدھے تھے کہ بچوں کے ہاتھ سے مار کھا لیتے تھے ان کے سیدھے پن کی یہ حالت تھی کہ ایک دفعہ سقے کہیں بارات میں چلے گئے اور کئی روز تک محلہ والوں کو پانی کی تکلیف رہی تو آپ اپنے لڑکے سے فرماتے ہیں کہ ارے سعید تو ہی ایک مشک بنالے اور گھروں میں پانی بھر دیا کر حافظ جی تو پرانے زمانہ کے آدمی تھے اُن کو تو باوجود سید زادے اور شریف ہونے کے ایسے کاموں سے عار نہ تھا مگر انکے صاحبزادہ بڑے خفا ہوئے کہ ابا جان ہمیں سقا بنانا چاہتے ہیں غرض وہ بڑے سیدھے تھے اور نیک بھی بہت ہی تھے نماز تو ایسی اچھی پڑھتے تھے کہ سبحان اللہ! بڑی لمبی نماز پڑھتے تھے اور ہر رکن کو اعتدال و اطمینان سے ادا کرتے تھے مگر عدم علم کی وجہ سے وہ جماعت میں بھی ایسی ہی تطویل کرتے تھے جس سے نمازیوں کو تکلیف ہوتی تھی بہرحال وہ تو ایک میانجی ہم نے ایسے دیکھے ہیں جو بچوں پر ظلم نہ کرتے تھے اور جو کبھی ذرا سی زیادتی ہوگئی تو اس کی تلافی اس طرز سے کرتے تھے گو یہ طریقہ اچھا نہیں اس سے لڑکوں کی شرارت اور بددماغی اور بدخلقی بڑھ جاتی ہے اور معلم کو اس کی رعایت بھی ضروری

ہے کہ بچوں کے اخلاق خراب نہ ہوں تو اب اگر کوئی اپنی زیادتی کی تلافی کرنا چاہے تو اسکی تدبیر یہ ہے کہ سزا کے بعد بچوں کے ساتھ شفقت کرو اور جسپر زیادتی کی ہے اُس کے ساتھ احسان کر دیہاں تک کہ وہ خوش ہو جاوے جیسے میرٹھ کے ایک رئیس نے ایک غریب نوکر کے طمانچہ مار دیا تھا پھر اس کو اپنی غلطی پر تنبہ ہوا تو اس کو ایک روپیہ دیا پھر دوسرے نوکر سے کہا کہ اس سے پوچھنا اب کیا حال ہے کہنے لگا میں تو دعا کر رہا ہوں کہ ایسا طمانچہ روز لگ جایا کرے بس یہ طریقہ تلافی کا بہت اچھا ہے اس سے بچوں کے اخلاق پر بھی برا اثر نہ ہوگا اور ظلم کا دفعیہ بھی ہو جائیگا اور جب میانجی کا ایک دو دفعہ کرنے میں کچھ خرچ ہوگا تو آئندہ کو وہ خود بھی ذرا سنبھلکر مارا کریں گے نیز سزا کے بعد بچوں کو خوش کرنے کی اس لئے بھی ضرورت ہے کہ اُن کے دل میں معلم سے بغض و عداوت نہ پیدا ہو جاوے جو علم سے محرومی کا سبب ہے اس راز کو ایک رئیس نے سمجھا تھا قصہ اُنکا یہ ہے کہ جب میں کانپور میں تھا تو ہمارے مدرسہ میں اُن رئیس کا بھانجا پڑھتا تھا جو بہت ہی شریر تھا اُس کی حالت یہ تھی کہ پاخانہ کی دیواروں پر اساتذہ مدرسہ کے نام لکھتا تھا لوگوں کو فکر ہوئی کہ کون نالائق ہے آخر لوگوں نے خفیہ طور پر تفتیش کی اور پہلا لکھا ہوا سب مٹا کر یہ انتظام کیا کہ جو شخص پاخانہ سے نکلتا اُس کے نکلنے کے بعد فوراً دیکھا جاتا کہ کچھ لکھا ہوا تو نہیں ہے۔ آخر وہ لڑکا جو ایک دفعہ نکلا تو دیوار پر نام لکھے ہوئے پائے گئے اور اس کو پکڑ کر مدرسین کے پاس لایا تو ایک مدرس نے اس کو سخت سزا دی حتی کہ مارتے مارتے بیہوش کر دیا اور اسکی جان کا خطرہ ہو گیا بعض لوگوں نے اس کے ماموں کو اطلاع دی وہ فوراً کانپور آئے تو واقعی لڑکے کی حالت نازک تھی مگر علاج معالجہ سے افاقہ ہوا اور بچنے کی امید ہو گئی شہر کے لوگوں نے ان کو بہت بھکایا کہ پولیس میں رپٹ لکھوا دو مگر وہ سمجھدار آدمی تھے انھوں نے گوارا نہ کیا کہ ایک دینی مدرسہ کی شکایت غیروں کے پاس لیجاؤں بالآخر وہ میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ صاحب میری عدالت تو آپ ہیں۔ میں آپ کے یہاں استغاثہ کرتا ہوں۔ میں نے چپکے سے ان مدرس صاحب کے پاس رقعہ لکھا کہ تم اسی وقت اپنا استعفاء داخل کر دو چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا پھر میں نے رئیس سے صاحب سے کہا کہ میرے پاس اُن صاحب کا استعفاء ملازمت سے

آگیا ہے اور وہ آپ کے سامنے ہے اب ہم کو اُن پر کوئی حق مواخذہ کا نہیں رہا کیونکہ وہ مدرسہ کے ملازم ہی نہ ہے اس لئے میں کچھ نہیں کرسکتا آپکا جہاں جی چاہے استغاثہ دائر کرکے انتقام لے لیجئے وہ کہنے لگے کہ کیا آپ نے اُنکا استعفاء منظور کر لیا ہے میں نے کہا اور رد کرنیکا ہم کو کیا اختیار ہے وہ بیچارے بہت بڑے اہل آدمی تھے کہنے لگے یہ تو میری بڑی نحوست ہوئی کہ میری وجہ سے ایک عالم مدرسہ سے الگ ہوتے ہیں اور انکا فیض مدرسہ سے بند ہوتا ہے میں اپنا استغاثہ واپس لیتا ہوں اور آپکو یقین دلاتا ہوں کہ میں کہیں استغاثہ نہ کرونگا میں نے اپنا حق معاف کیا آپ انکا استعفاء واپس کردیں اُن کی اُس اہلیت سے میں بڑا خوش ہوا کہ شاباش مسلمان کو دین سے ایسی ہی محبت ہونا چاہئے اس کے بعد اُن کی عجیب خوش فہمی یہ تھی کہ مجھ سے کہنے لگے کہ میرا خیال یہ تھا کہ اس لڑکے کو اپنے ہمراہ لیجاؤں اور گھر پر اس کی تعلیم کا انتظام کروں مگر اب میں یہ چاہتا ہوں کہ اس کو کچھ دنوں مدرسہ ہی میں رکھوں کیونکہ ابھی اگر میں اسے گھر لیگیا تو یہ اس حالت میں جائیگا کہ اس کے دل میں ایک عالم سے کینہ اور بغض ہوگا۔ اور یہ اسکی آخرت کو مضر ہوگا اس لئے چند روز اس کو مدرسہ ہی میں رکھا جاوے اور انھیں حضرت کے سپرد کیا جائے جنھوں نے اس کو مارا تھا اور ان سے کہدیا جائے کہ اب اس کے ساتھ شفقت و ملاطفت کا ایسا برتاؤ کریں جس سے اس کے دل کا خار نکل جائے اور اُن سے اِس کو محبت ہوجائے پھر میں اس کو گھر بلالوں گا واقعی اس شخص کی سلامت فطرت پر میں حیران رہ گیا اور بے ساختہ میرے دل سے انکے لئے دعا نکلی اور اسوقت ہی سے میری سمجھ میں یہ تدبیر آئی ہے کہ بچوں پر زیادتی ہوجائے تو اسکی تلافی اس طرح کرنا چاہئے (دیکھئے بعضے دنیادار بھی کیسی سمجھ کے ہوتے ہیں ۱۲) بعضے میانجی بچوں پر مار کا تو ظلم نہیں کرتے مگر اور طرح ظلم کرتے ہیں وہ یہ کہ اُن سے اپنے گھر کی خدمت لیتے ہیں کہیں پانی بھرواتے ہیں کبھی آٹا پسواتے ہیں کبھی مٹی ڈھواتے ہیں۔ یاد رکھو والدین کی اجازت کے بغیر نابالغ بچوں سے ایسی خدمت لینا جائز نہیں بعضے میانجی یہ کرتے ہیں کہ گرمیوں کی دوپہر میں خود تو سو رہتے ہیں اور بچوں سے پنکھا جھلواتے ہیں یہ کتنا بڑا ظلم ہے آخر جس طرح تمکو نیند آتی ہے اُن کو بھی تو آتی ہے مگر بعضے لڑکے ان کے بھی چچا ہوتے ہیں

لوہاری میں ایک میانجی تھے ان کے پاس جہاں سے کچھ مٹھائی آتی اور وہ حفاظت کے ساتھ رکھتے لڑکے سب کھا جاتے اور کوئی ثبوت ہوتا نہ تھا ایک مرتبہ کہیں سے بتاشے آئے تو انھوں نے بتاشوں کو لوٹے میں رکھکر اوپر سے آٹا لگا کر منھ بند کر دیا جو سوکھنے کے بعد بچوں سے وقت کے ساتھ کھلتا اور راز ظاہر ہو جاتا اب لڑکے آئے اور سوچنے لگے کہ آج تو میانجی نے بڑا انتظام کیا ہے۔ اگر منھ کھولتے ہیں تو پتہ چلجائیگا ایک لڑکے نے کہا میں اس کی ترکیب بتاتا ہوں اس کی ٹونٹی میں پانی ڈالو اس سے بتاشے گھلجائیں گے پھر شربت کو سب پی جاؤ چنانچہ ایسے ہی کیا اور لوٹا بند کا بند رہا اب جو میانجی نے کسی دن خوش خوش اُس کے مُنھ کو کھولا تو وہاں کچھ بھی نہ تھا تو بعض لڑکے ان میانجیوں کی بھی خوب گت بنا دیتے ہیں۔ مگر اکثر یہی زیادتی کرتے ہیں۔ بعضے میانجی دوسروں کا کام بھی بچوں سے لیتے ہیں مثلاً کوئی مر گیا تو اسکا تیجا بچوں سے پڑھواتے ہیں۔ اور بعضے میت کے گھروں پر بھی بھیجدیتے ہیں کانپور میں بھی یہ رواج تھا کہ بچوں کو تیجے کے لئے لیجاتے تھے میں نے روکدیا اور کہدیا کہ بچے مدرسہ میں تیجے کے واسطے نہیں آتے بلکہ تیجہ کے واسطے آتے ہیں یہاں سے اس کام کے لئے کوئی نہ جائیگا۔ تب یہ سلسلہ بند ہوا غرض بچوں سے ایسی خدمت لینا جائز نہیں جسمیں والدین کی رضا نہ ہو اور اگر رضا بھی ہو تو جو خدمت بچوں کی طاقت سے باہر ہو یا خدمت خلاف سنت ہو (جیسے تیجہ کے دانے پڑھوانا) وہ بھی جائز نہیں میانجیوں کو اس کا خیال رکھنا چاہیئے۔

ایک طبقہ اور ہے جو بچوں کی جان و مال پر ظلم کرتا ہے وہ رسمی مشائخ کا طبقہ ہے یہ تو مریدوں کو اپنی ملک سمجھتے ہیں۔ اور اُن سے آئے دن فرمائشیں کرتے ہیں کبھی پانوں دبواتے ہیں کبھی پنکھا جھلواتے ہیں کبھی کہتے ہیں اب کے آؤ تو انگور لانا بعضے گھوڑے کے لئے گھاس منگواتے ہیں، اور ایسی خدمتیں لیتے ہیں جو اکثر اُن پر بار ہوتی ہیں یاد رکھو یہ بھی جائز نہیں چاہے کیسا ہی مخلص مرید ہو از خود اس سے کوئی فرمائش نہ کرنا چاہیئے ورنہ تمھاری وہ حالت ہوگی جیسے ایک مرید نے کہا تھا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ آپ کی انگلیاں تو شہد میں بھری ہوئی ہیں اور میری انگلیاں پاخانہ میں وہ بڑے خوش ہوئے کہنے لگے کیوں نہ ہو بحمد اللہ ہم

پاک صاف ہیں اور تم دنیا دار گندگیوں کے اندر بھرے ہوئے ہو کہنے لگا حضور یہ تو سچ ہے مگر ابھی خواب پورا نہیں ہوا پھر میں نے یہ دیکھا کہ آپ کی انگلیاں میں چاٹ رہا ہوں اور میری انگلیاں آپ چاٹ رہے ہیں اب تو وہ بڑے جھلائے کہ نالائق ہے مردود ہے کہنے لگا حضور میں نے تو خواب بیان کیا ہے جو دیکھا تھا۔ وہ عرض کر دیا واقعی اگر یہ خواب تھا تو اس کی تعبیر ظاہر ہے کہ مرید تو شیخ سے دین حاصل کرتا تھا اور شیخ مرید سے دنیا وصول کرتا تھا اور اگر اس نے گڑھا تھا تو بہت ہی موقع سے مناسب گڑھا۔ اس لئے مشائخ کو اس کا خیال رکھنا چاہئے کہ مریدوں کی دنیا پر نظر نہ کریں اور از خود کسی سے کچھ فرمائش نہ کریں ہاں کسی سے بہت ہی بے تکلفی ہو جہاں بار ہونے کا اطلاق احتمال نہ ہو اس سے کوئی بہت ہی ہلکی فرمائش کا مضائقہ نہیں مگر ایسے مخلص ہزار میں ایک ہی دو ہوتے ہیں عام حالت یہی ہے کہ لوگوں کو فرمائش سے گرانی ہوتی ہے بلکہ خود ہدایا میں بھی جن کی خود فرمائش بھی نہیں کی جاتی خلوص و محبت کی رعایت سخت ضروری ہے ہر وقت ہدیہ قبول کرنے کو تیار نہ بیٹھے رہا کریں کیونکہ بعض لوگ محض اس خیال سے ہدیہ دیتے ہیں کہ اگر نہ دینگے تو شیخ کو یہ خیال ہوگا کہ اس کو ہم سے محبت نہیں یا دوسرے یہ سمجھیں گے کہ اس کو تعلق نہیں اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں خلوص کہاں۔ (خلوص و محبت کے تو معنی یہ ہیں کہ ہدیہ دینے والے کو دنیا کی غرض تو کیا آخرت کی بھی غرض مقصود نہ ہو یعنی ثواب کا بھی قصد نہ ہو کیونکہ ثواب کے لئے کچھ دینا صدقہ ہے ہدیہ نہیں ہے ہدیہ وہ ہے جو محض تطییب قلب مُہدی لہٗ کے لئے دیا جائے گو تطییب قلب مسلم بھی ثواب کا موجب ہے اور اس سے ثواب کی نیت مذموم نہیں مگر ثواب اعطاء کا قصد نہ ہونا چاہئے کذا قالہ الشیخ رح) اور فکر کے بعد خلوص و محبت کی پہچان ہو جاتی ہے پھر دھوکہ کم ہوتا ہے۔ چنانچہ بحمد اللہ مجھے اسکی پہچان میں ملکہ ہو گیا ہے بہت کم دھوکہ ہوتا ہے۔ کیونکہ ہمیشہ سے اسکی فکر ہے گو کبھی دھوکہ ہو بھی جاتا ہے کیونکہ آخر بشر ہوں اور وہ بھی بار بار جارہ کے ساتھ نہ کہ فاعل کے ساتھ مگر ایسا شاذ و نادر ہوتا ہے میرے پاس آجکل ہی میں تین خط آئے اور تینوں ساتھ ہی آئے اور ایک ہی جگہ سے چلے ہوئے تھے غالباً بہار کی طرف سے آئے تھے اور تینوں کا

طرز خط بھی یکساں تھا ایک خط میں لکھا تھا کہ میں ڈیڑھ سو روپیہ ہدیۃً بھیجنا چاہتا ہوں جس کے لئے اجازت کا طالب ہوں۔ دوسرے میں ایک سو اٹھارہ روپئے لکھے تھے اور تیسرے میں شاید صرف اٹھارہ تھے مجھے ایک ہی دن میں تین خطوں کے آنے سے شبہہ ہوا پھر مضمون اور رسم الخط یکساں دیکھ کر یہ شبہہ قوی ہو گیا کہ شاید ان سب میں باہم کچھ مشورہ ہوا ہے یا ایک ہی شخص نے نام بدلکر تین خط بھیجے ہیں اب میں بڑا پریشان ہوا کہ کیا جواب دوں اگر منظور کر لوں کہ ہاں بھیجدو تو اس کے ساتھ یہ شبہہ لگا ہوا تھا کہ شاید یہ محض باہمی مشورہ ہو اور ان لوگوں کو امتحان مقصود ہو تو اس جواب سے دین کی سبکی ہو گی اور اگر انکار کروں تو شبہہ تھا کہ شاید ان لوگوں نے خلوص سے لکھا ہو سو محض اپنے گمان پر میں مخلصین کی دلشکنی کیسے کروں پھر گمان بھی اتنا ہی ہوا تھا کہ شاید باہم مشورہ ہوا ہے سو مشورہ میں بھی خلوص ہو سکتا ہے ممکن ہے یہاں کسی طالب علم کو یہ شبہہ پیدا ہوا ہو کہ جب عدم خلوص کا علم نہ تھا تو قبول کرنا حلال تھا ہاں بیشک یہ صحیح ہے مگر جب تھوڑی سی کوشش سے علم ہو سکے تو پھر سستی کیونکر جائز ہو گی بات یہ ہے کہ باہم مشورہ میں گو خلوص ہو سکتا ہے مگر بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک کی رائے ہوتی ہے ایک کی نہیں ہوتی وہ محض شرما شرمی سے شریک ہو جاتا ہے اور یہی اغلب و اکثر ہے مشورہ میں سب کا خلوص نادر ہے تو اس احتمال قوی کے ہوتے ہوئے ان ہدایا کا مطلقاً قبول کر لینا کیونکر جائز ہوتا اور ترجیح کے لئے کسی مرجح کی ضرورت تھی یہاں مرجح کوئی تھا نہیں کیونکہ میں ان کا تبین میں سے کسی سے بھی واقف نہ تھا۔ اس لئے میں نے اس شبہہ کے زائل کرنے کی تدبیر سوچی اور جو شخص اللہ و رسول کی اتباع کرنا چاہتا ہے حق تعالیٰ اس کی امداد فرماتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے میری امداد فرمائی اور یہ دل میں آیا کہ ابھی نہ اقرار کرنا چاہئے نہ انکار بلکہ ان لوگوں سے استفسار کرنا چاہئے کہ مجھ کو یہ شبہہ ہوا ہے۔ آیا یہ صحیح ہے یا نہیں اس کے بعد جو کچھ جواب آئیگا اس سے اصل حقیقت معلوم ہو جائیگی۔ چنانچہ میں نے ہر شخص کو یہی لکھدیا کہ آپ کا خط آیا اور تعجب ہے کہ اس کے ساتھ اسی دن کی ڈاک میں دو خط اسی مضمون کے اور آئے جنکا رسم الخط بھی اسی خط سے ملتا ہوا تھا اس اتفاقی

اجتماع سے مجھے یہ شبہہ ہوتا ہے کہ شاید باہم کچھ مشورہ ہوا ہے آیا میرا یہ خیال صحیح ہے یا غلط اس جواب کو لکھے ہوئے تقریباً دس بارہ دن ہو گئے مگر آج تک بھی اُن کا خط نہیں آیا بس سب خاموش ہو کر بیٹھ رہے میں نے خدا تعالیٰ کا بہت شکر ادا کیا کہ اس نے دنیا داروں کی چالاکی و تحقیر سے بچا لیا اور صاحب ہماری عزت تو کیا چیز ہے مگر اہل علم کی حرص وغیرہ سے لوگ دین اور علم کو ذلیل سمجھنے لگتے ہیں پس مشایخ کو اسمیں بہت احتیاط کرنا چاہیئے اور بدوں سوچے سمجھے ہر ایک کا ہدیہ قبول نہ کیا کریں نیز اپنے مریدوں کو اسکا عادی کرنا چاہیئے کہ وہ بالالتزام ہدیہ لیکر نہ آیا کریں کیونکہ التزام میں خلوص نہیں رہتا اور یہ جو مشہور ہے کہ خالی جاوے خالی آوے اس کا مطلب یہ ہے کہ جو خلوص سے خالی جاوے وہ فیوض سے خالی آوے یہ مطلب نہیں کہ جو فلوس سے خالی جاوے وہ بھی محروم ہی آتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ اور اگر کسی کو ایسا ہی التزام کا شوق ہے تو اسکی صورت یہ ہے کہ اسکا اہتمام نہ کرے کہ ہر دفعہ بڑھیا چیز ہی لیجاوے بلکہ کبھی کبھی معمولی چیزیں بھی لیجایا کرے (مثلاً مسواک لے گئے یا ایک دو پیسہ کی روشنائی ہی لے گئے یا ایک دو قلم لے گئے۔ کبھی دو چار خوشبودار پھول لے آئے وغیرہ وغیرہ ۱۲) بزرگان سلف ایسا ہی کرتے تھے کہ جب ہدیہ کا شوق ہوا تو جو چیز بھی ملی خواہ کیسی ہی معمولی ہو وہی لے گئے اس کے لئے اہتمام اور تکلف نہ کرتے تھے۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ایک بزرگ دوسرے بزرگ سے ملنے گئے راستہ میں خیال ہوا کہ کچھ ہدیہ لے چلنا چاہیئے کوئی دوسرا ہوتا تو گھر واپس آتا مگر انھوں نے یہ کیا کہ جنگل میں سے کچھ سوکھی ہوئی لکڑیاں اُٹھالیں اور لاکر ان بزرگ کے سامنے رکھدیا کہ یہ لکڑیاں حضرت کے لئے پانی گرم کرنے کو لایا ہوں وہ بزرگ اس ہدیہ سے بڑے خوش ہوئے اور اسکی ایسی قدر کی کہ فوراً اپنے خادم کو بلایا اور کہا کہ لکڑیاں بہت حفاظت سے رکھو جب ہم مرجائیں تو ہمارے غسل کے لئے اس سے پانی گرم کیا جاوے امید ہے کہ حق تعالیٰ اس ہدیہ حلال و خالص کی برکت سے میری مغفرت فرمادیں گے سبحان اللہ کیسے قدرداں لوگ تھے لہٰذا اس طرح اگر التزام بھی کرو تو کچھ مضائقہ نہیں۔ اگر گھاس پھوس نہ ملے تو کم از کم

دو چار مٹی کے ڈھیلے ہی استنجا کے لئے لیجاؤ اور اگر یہ خیال ہو کہ ایسے حقیر ہدیہ سے شیخ ناخوش ہوں گے اور اس کی قدر نہ کریں گے تو یاد رکھو ایسا شخص شیخ بنانے کے قابل نہیں جسکو مخلوص کی قدر نہ ہو فلوس ہی کی قدر ہو۔ صاحب تم کرکے تو دیکھو محبت کی قدر ضرور ہوتی ہے چاہے ہدیہ ظاہر میں قلیل ہی ہو اور دنیا میں قدر نہ ہو تو خدا کے یہاں تو ضرور قدر ہو گی حضرت سلطان نظام الدین رحمہ اللہ علیہ نے حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ آبائنا وامہاتنا وارواحنا وما یدینا ۱۲) کی روح پرفتوح کو ثواب پہنچانے کے لئے کھانا پکوایا تھا ماشاء اللہ سلطان جی کے یہاں شاہانہ انتظام تھا بڑے عمدہ عمدہ کھانے پکوائے تھے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہدیہ ثواب سے زیادہ اور کس چیز میں وہ خرچ کرتے ۱۲) کھانا تیار ہو گیا تو خدام نے اجازت چاہی کہ اس کو اٹھا کر تقسیم کر دیا جائے سلطان جی نے فرمایا کہ ابھی ذرا ٹھہرو پھر کچھ دیر کے بعد پوچھا تو فرمایا کہ ابھی ٹھہرو کچھ دیر کے بعد فرمایا کہ اب تقسیم کرو کسی خادم نے وجہ پوچھی کہ آپ کو کسکا انتظار تھا پہلے بار بار انکار کیوں تھا اور اب اجازت کیسے دیدی فرمایا اس وقت میرے بھائی علی احمد صابر نے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پرفتوح کو ثواب کے لئے بھونے ہوئے چنے تقسیم کئے تھے۔ تو میں نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمہ تن ادھر متوجہ ہیں تو ایسی حالت میں میں نے اپنا کھانا تقسیم کرنا نہیں چاہا بلکہ میں نے یہ چاہا کہ ذرا حضور ادھر متوجہ ہوں تو پھر کھانا اٹھاؤں تو دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت صابرؒ کے چنے اس قدر محبوب تھے کہ آپ ہمہ تن اس طرف متوجہ تھے حالانکہ حضرت سلطان جی کے کھانے ظاہر میں ان سے بہت بڑھے ہوئے مگر چونکہ حضرت صابر رحمۃ اللہ علیہ کے پاس زیادہ سامان نہ تھا انھوں نے ساری عمر گولر اور درخت کے پتے کھا کر ہی گذار دی حتی کہ چند سیر سے زیادہ اناج عمر بھر میں بھی ان کے پیٹ میں نہیں پہنچا واقعی بڑے صابر تھے تو حضور کو انکا قلیل ہدیہ ہی دوسروں کے ساز و سامان سے زیادہ عزیز تھا۔ مگر آجکل لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جیسا ہدیہ ہوگا ویسا ہی ثواب ہوگا۔ اگر ہدیہ قلیل ہو تو ثواب بھی قلیل ہوگا۔ صاحبو! یہ صحیح نہیں بلکہ وہاں تو خلوص کو دیکھا جاتا ہے اگر ہدیہ قلیل ہو مگر خلوص زیادہ ہو تو ثواب زیادہ ملیگا اور ہدیہ زیادہ ہو اور خلوص

کم ہو تو ثواب کم ہوگا۔ (البتہ اگر دونوں زیادہ ہوں خلوص بھی اور ہدیہ بھی تو بیشک یہ تو نورٌ علی نور ہوگا۔ ہاں اس کے بعد پھر اس کو بھی دیکھا جاتا ہے کہ جس نے زیادہ دیا ہے وہ صاحب وسعت ہے اور جس نے کم دیا ہے وہ صاحب وسعت نہیں تو باوجود خلوص میں برابر ہونے کے بھی کم وسعت والے کا ہدیہ صاحب وسعت کے ہدیہ سے بڑھ جائیگا بعض لوگوں میں ایک غلطی اعتقادی یہ بھی ہے کہ ثواب کو نوعیت میں بھی کھانے کے موافق سمجھتے ہیں چنانچہ شیر خوار بچوں کے لئے ایصال ثواب میں دودھ دیتے ہیں گوشت نہیں دیتے یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے دانت کہاں ہیں جو گوشت کھائیں اسی طرح شہداء کو سبیل میں شربت کا ثواب پہنچاتے ہیں کیونکہ وہ پیاسے شہید ہوئے تھے۔ اس میں علاوہ اس اعتقادی غلطی کے دوسری غلطی یہ بھی ہے کہ گویا ان کے نزدیک شہداء ابتک پیاسے ہی ہیں نعوذ باللہ اے صاحب انھوں نے تو مرتے ہی جنت کا ایسا شربت پیا ہوگا جس سے عمر بھر بھی پیاس نہ لگے اس کے متعلق خیر آباد کے ایک بزرگ کا قصہ مشہور ہے کہ ان کے کسی مرید نے زندگی ہی میں ان کی فاتحہ کی تھی جب وہ فاتحہ دلا کر اُن سے ملنے آیا تو فرمانے لگے کہ بھائی ذرا فاتحہ دیتے ہوئے گرم ٹھنڈے کا تو خیال کر لیا کرو تم نے فاتحہ میں فیرینی ایسی جلتی ہوئی دی کہ ابتک میری زبان میں چھالے پڑے ہوئے ہیں حالانکہ مرید نے اپنے گھر پر فاتحہ دی تھی مگر وہ جلتی جلتی ہی فقیروں کے مُنہ میں سے پیر صاحب کے مُنہ میں پہونچگئی۔ ہمیں یہ قصہ گڑھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ واہیات بھلا ایصال ثواب سے دوسرے کو ثواب پہونچتا ہے یا وہی کھانا پہونچتا ہے یقیناً ثواب پہونچتا ہے اور ثواب گرم ٹھنڈا ہوتا نہیں بلکہ وہ نیکیاں ہیں جو مہدی لہ کے نامہ اعمال میں لکھی جاتی ہیں جسکا صلہ جنت کے درجات ہوتے ہیں بہرحال یہ قصہ محض لغو ہے۔ ثواب کے لئے تو نص قطعی ہے "لن ینال اللہ لحومہا ولا دماءہا ولکن ینالہ التقوی منکم" کہ خدا کے یہاں قربانی کے جانوروں کا نہ گوشت پہنچتا ہے نہ خون بلکہ وہاں تو تقوی (اور خلوص) پہونچتا ہے اس نص سے عوام کی غلطی ظاہر ہوگئی جو ثواب کو کھانے کے موافق سمجھتے ہیں اور اسی نص کے موافق اہل اللہ کے یہاں بھی خلوص کی قدر ہوتی ہے۔ گو ظاہر میں ہدیہ قلیل ہو

چنانچہ اُن بزرگ نے لکڑیوں کے گٹھر کی یہ قدر کی کہ اس کو اپنے جنازہ کے غسل کے لئے احتیاط سے رکھوایا۔ بعض دفعہ اہل اللہ تو کسی کے ہدیہ کی تحقیر نہیں کرتے مگر ان کے خدام تحقیر کرتے ہیں۔ تو خدام کی رعایت نہ کرنا چاہئے۔ اور مشایخ کو چاہئے کہ کسی کو اپنا خادم خاص نہ بنائیں جسکو ان کے کاموں میں زیادہ دخل ہو بعض دفعہ یہ حواشی غضب کرتے ہیں کہ مریدوں کے ہدایا کی تحقیر کرتے اور بعض مریدوں کی شکایتیں شیخ سے کرتے رہتے ہیں جس کو چاہتے ہیں بڑھا دیتے ہیں اور جسکو چاہتے ہیں گرا دیتے ہیں پھر شیخ بھی آخر بشر ہے سنتے سنتے کچھ اثر اس کے قلب پر بھی ہو ہی جاتا ہے اس لئے میں تو بجائے حواشی کے اُن کو مواشی کہتا ہوں۔ غرض ظلم سے بہت کم لوگ بچے ہوئے ہیں۔ مشایخ تو مریدوں کی جان میں تصرف کرتے ہیں اور میاں جی بچوں کی جان میں اور رؤسا غریبوں کی جان میں بعض جگہ عوام رؤسا میں یہ دستور ہے کہ چوپال میں بیٹھے ہوئے ہیں اور سامنے سے کوئی غریب مزدور سر پر بوجھ رکھے ہوئے گذرا تو اس کو بلا کر کہدیا کہ بوجھ تو یہاں رکھدے اور فلاں جگہ جا کر یہ کام کر آ۔ یہ صریح ظلم ہے۔ کیونکہ اس سے لوگوں پر عموماً ناگواری ہوتی ہے وہ غریب بیچارہ رئیس کے ڈر سے کچھ نہیں کہتا مگر اسکا دل ہی جانتا ہے کہ اس کا وقت کیسا کھوٹا ہوا۔ اگر کام ہی لینا ہے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس سے یہ کہو کہ ہم کو فلاں جگہ ایک آدمی بھیجنے کی ضرورت ہے۔ اور اتنی مزدوری دیں گے اگر تجھے مزدوری لینا ہو تو بوجھ رکھ کر یہ کام کرلے غرض غریب کا دل خوش کر کے پھر کام لو اور غریب کا خوش کر دینا ہی کیا مشکل ہے دو چار آنے کے پیسوں میں بیچارہ خوش ہو جاتا ہے۔ مگر تراضی طرفین سے ہو۔ بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ ٹمٹم اور گاڑی کا کرایہ طے نہیں کرتے نہ قلی کی مزدوری چکاتے ہیں بس بے کہے سنے سوار ہو گئے یا مزدور کے سر پر بوجھ لاد دیا اور بعد میں سرکاری نرخ کے موافق کرایہ دیتے ہیں تو یاد رکھو یہ جائز نہیں بلکہ کرایہ اول چکانا چاہئے اس پر بعض لوگوں کو شبہ ہوگا کہ لیجئے حکومت نے تو ٹمٹم والوں اور قلیوں کی زیادتی سے مسافروں کو محفوظ کرنے کے لئے ایک نرخ مقرر کیا تھا شریعت نے اس کو بھی تا جائز کر دیا۔ جسکا مطلب یہ ہے کہ بس جتنا بھی کوئی مانگے ڈھی دو چاہے لٹ ہی جاؤ اسکا جواب یہ ہے کہ شریعت نے

ظلم کو روکنا چاہا۔ نیز اس سے بھی بچانا چاہا۔ کہ بعد میں نزاع نہ ہو سو ظاہر ہے کہ مزدور سے بلا رضامندی کام لینے کا کسی کو کیا حق ہے اسی طرح کسی کی گاڑی میں بدون اسکی خوشی کے سوار ہونے کا کسی کو کیا حق ہے باقی حکومت نے جن مصلحت سے نرخ نامے مقرر کئے ہیں۔ شریعت اس کو فضول نہیں کہتی مگر اس کی صورت شریعت کے موافق یہ ہے کہ ٹمٹم والے سے یا قلی سے کام لینے کے پہلے صاف کہدو کہ ہم سرکاری نرخ نامے کے موافق تم کو کرایہ یا مزدوری دینگے اس سے زیادہ نہ دینگے اگر خوشی ہو قبول کر لو اگر وہ اس پر بھی آپکو بٹھالے یا سامان اٹھالے تو پھر سرکاری نرخ کے موافق کرایہ دینا جائز ہے کیونکہ اب آپ نے معاملہ صاف کر لیا اور دوسرے نے بخوشی اس کو منظور کر لیا ہے پس تم سرکاری نرخ نامے کے موافق ہی دو مگر پہلے کہکر دو یہ نہیں کہ اول تو خاموش سوار ہو جاؤ اور بعد میں سرکاری نرخ کے حساب سے دو۔ کیونکہ ممکن ہے کہ ٹمٹم والے نے اس مزدوری کے خیال سے آپکو نہ بٹھایا ہو بلکہ ٹمٹم والوں کے عام رواج کے موافق مزدوری لینا چاہتا ہو پھر بعد میں نزاع ہوگا چنانچہ ہم نے اکثر لوگوں سے جھگڑا ہوتے ہوئے دیکھا ہے (اگر انسان میں تھوڑی سی بھی شرافت ہو تو وہ بعد کے نزاع کو ہرگز گوارا نہ کرے گا۔ یہی شریعت کی تعلیم ہے کہ مزدوری اور کرایہ اول طے کر لو چاہے سرکاری نرخ ہی کے موافق طے کر لو۔ بدون صفائی کے کسی چیز سے منتفع نہ ہو ۱۲) اسی طرح بعض حکام یہ ظلم کرتے ہیں کہ دورہ کے وقت کہیں سے بلا قیمت دودھ منگاتے ہیں کہیں سے پھل منگاتے ہیں اور بعض جگہ قصبات کے رؤساء ان کے لئے یہ چیزیں بھیجتے ہیں پہلی صورت تو صریح ظلم ہے اور دوسری صورت رشوت میں داخل ہے اور اسمیں بھی اکثر ظلم ہی ہوتا ہے کیونکہ زمیندار اور رئیس اپنے گھر سے یہ سامان نہیں بھیجتے بلکہ بستی کے دوکانداروں پر ظلم کرکے انسے لیتے ہیں اور حکام کے ڈیرہ پر پہنچاتے ہیں۔ جب حکومت کی طرف سے دورہ کرنے والوں کو ماہوار تنخواہ ملتی ہے اور دورہ کا بھتہ بھی ملتا ہے پھر اُن کو بستی والوں سے یہ چیزیں لینے کا کیا حق ہے مسلمانوں کو اس طریقہ سے بچنا چاہئے بعض دفعہ یہ ہوتا ہے کہ حاکم خود تو منتظم ہوتا ہے کسی سے رشوت نہیں لیتا نہ کسی پر ظلم کرتا ہے۔ مگر اُن کے متعلقین چپراسی وغیرہ ظلم کرتے ہیں۔ اس لئے حاکم

تنہا اپنی احتیاط سے نجات نہیں پا سکتا بلکہ اس کا انتظام بھی اس کے ذمہ ہے کہ متعلقین بھی ظلم نہ کرنے پائیں جسکی صورت یہ ہے کہ عام طور سے اشتہار دیدے کہ میرے یہاں رشوت کا بالکل کام نہیں اس لئے اگر میرے عملہ میں سے کوئی شخص کسی سے رشوت مانگے تو ہرگز کوئی نہ دے بلکہ ہمسے اس کی اطلاع کرے پھر اطلاع کے بعد جس نے ایسی حرکت کی ہو اس سے رقم واپس کرائے اور کافی سزا دے نیز جو شخص حاکم سے ملنے آئے اس کو خود جاکر دروازہ سے باہر تک پہنچائے تاکہ نکلتے ہوئے کوئی چپراسی وغیرہ اس کو تنگ نہ کرے۔ قرآن میں نص ہے: "وان احد من المشرکین استجارک فاجرہ حتی یسمع کلام اللہ ثم ابلغہ مامنہ" علت سے اس کے عموم میں یہ صورت بھی قیاساً داخل ہے نیز حکام کو یہ بھی چاہئے کہ لوگوں کے متعلقات براہ راست اپنے سے رکھیں کسی شخص کو واسطہ نہ بنائیں کیونکہ یہ واسطے بہت ستم ڈھاتے ہیں اگر یہ کہو کہ صاحب یہ تو بڑا مشکل ہے تو میں کہونگا ہاں بیشک مشکل ہے مگر حکومت کرنا آسان نہیں یہ منہ کا نوالہ نہیں حاکم ہر وقت جہنم کے کنارہ پر ہے اگر جہنم کے عذاب سے بچنا چاہتے ہو تو اس کی صورت یہی ہے اور تمنے تو یہ بلا خود اپنے سر لی ہے تم نے کوششیں کرکے سفارشیں کرا کے حکومت حاصل کی ہے پھر اس کے حقوق ادا کرنے سے کیوں جان چراتے ہو جو بلا خود تم نے اپنے سر لی ہے اس کا مزہ چکھو! صاحبو! حکومت وہ چیز ہے کہ حضرات سلف تو اس سے بھاگتے تھے۔ ماریں کھاتے تھے اور قبول نہ کرتے تھے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ۔ جن کے آپ مقلد کہلاتے ہیں۔ اسی پر شہید کئے گئے خلیفہ وقت نے کئی دفعہ اُن کو عہدۂ قضا پر مجبور کیا مگر انکار کر دیا کیونکہ ان کو یہ حدیث یاد تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "من جعل قاضیاً فقد ذبح بغیر سکین" یعنی جو شخص قاضی بنا دیا گیا۔ وہ بدون چھری کے ذبح کر دیا گیا۔ اس لئے امام صاحب عذر کرتے تھے آخر اسی بات پر امام صاحب قید کئے گئے۔ اور قید خانہ ہی میں زہر دیکر شہید کئے گئے یہ سب کچھ گوارا تھا۔ مگر حکومت منظور نہ تھی۔ صاحبو! سلف کی یہ حالت تھی کہ جب خلفاء کسی عالم کو قاضی بنانا چاہتے اور وہ قضا کی مذمت اور وعید میں اُن کو احادیث سناتے تو سلاطین ان کی خوشامد کرتے تھے کہ اچھا ہم تم کو چھوڑے دیتے ہیں مگر للہ یہ باتیں

دوسروں سے نہ کہنا ورنہ سب لوگ قضا کو چھوڑ دیں گے لیکن یہ وعیدیں اسی حاکم کے لئے ہیں جو حکومت کے حقوق ادا نہ کرے اور جو عدل و انصاف کا اہتمام کر کے اُسکے حقوق ادا کرے تو اُس کے لئے قیامت میں عرش کا سایہ بھی ہے مگر اب دیکھئے کہ جن لوگوں نے اسکے حقوق ادا کئے ہیں ان کی کیا حالت تھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب شام کا دورہ کیا ہے تو آپ کے ساتھ کل یہ سامان تھا کہ ایک غلام تھا اور ایک اونٹ اسی پر آقا اور غلام دونوں باری باری سوار ہوتے تھے اور کھانے کے لئے ستو کا ایک تھیلا تھا اور ایک کھجوروں کا بس سارے راستہ اسی کو گھول کر پی لیا۔ اور دو چار کھجوریں کھالیں نہ ساتھ میں خیمہ تھا نہ گھوڑے تھے۔ نہ بہت لاؤ لشکر تھا پھر راستہ میں جہاں ٹھہرتے تھے وہاں استقبال کرنے کی ممانعت تھی نہ کسی کا ہدیہ لیتے تھے نہ کسی گانوں سے دودھ اور جنس منگاتے تھے یہ تو خلیفہ کی حالت تھی اب سردار لشکر کی حالت سنئے جو وقت حضرت عمر ملک شام میں پہنچے اور حضرت امیر عبیدہؓ امیر العساکر اسلامیہ کے خیمہ میں داخل ہوئے تو دیکھا نہ وہاں فرش و فروش ہیں نہ کچھ زیب و زینت ہے بس چمڑہ کا بستر تھا اور خیمہ کی چوب میں ایک تھیلا لٹکا ہوا تھا حضرت عمر نے پوچھا اے ابو عبیدہ اس تھیلہ میں کیا ہے فرمایا اسمیں روٹی کے سوکھے ہوئے ٹکڑے ہیں افطار کے وقت اُن کو بھگو کر کھالیتا ہوں فرمایا اے ابو عبیدہؓ تم اس وقت ملک شام میں ہو جہاں قسم قسم کی نعمتیں ہیں ہر چیز ارزاں ہے تم یہ سوکھے ٹکڑے کس لئے کھاتے ہو اپنے کو راحت کیوں نہیں دیتے کہا اے امیر المومنین کیا آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیشت یاد نہیں کہ حضور نے کس طرح زندگی بسر کی ہے بس میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ حضور کی طرح زندگی گذار دوں اے امیر المومنین زندگی ایک دن ختم ہونے والی ہے۔ چاہے اس کو راحت سے گذارو یا مشقت سے اس وقت متنعم اور غیر متنعم سب یکساں ہوں گے۔ یہ باتیں سن کر حضرت عمر بھی رونے لگے اور وہ بھی روتے رہے اس مضمون میں ایک بزرگ کا قطعہ عجیب ہے جو انھوں نے ایک رئیس کے جواب میں لکھا ہے غالباً رئیس نے ان کی تکلیف کا حال سنکر لکھا تھا کہ آپ میرے پاس آجائیں تو یہاں آپ کو خوب راحت ملیگی وہ جواب میں لکھتے ہیں ؎

خوردنِ تو مرغ مسمی و می خوردنِ ما نانِ جوین ما
پوششِ تو اطلس و دیبا حریر پنجہ زدہ خرقۂ پشمین ما

اسی طرح سب چیزوں کا موازنہ کرکے فرماتے ہیں ؎

نیک ہمین است کہ می بگذرد راحتِ تو محنتِ دوشین ما

فرماتے ہیں کہ ہاں بیشک اس وقت تیرا کھانا ہمارے کھانے سے اچھا اور لباس ہمارے لباس سے اچھا ہے مگر یہی حالت اچھی ہے جو گذر رہی ہے ؎

باش کہ تا طبل قیامت زنند آن تو نیک آمد و یا این ما

قیامت آنے دو اُس وقت معلوم ہو جائیگا کہ کس کی حالت اچھی ہے (اہل اللہ کو خدا پر بھروسا ہوتا ہے اس لئے یہ فرمادیا فخر کی نیت نہ تھی کیونکہ وہ آپ سے زیادہ ترساں ولرزاں رہتے ہیں اُن کو فخر کی کہاں مہلت ہے کبھی تحدث بالنعمہ کے طور پر کچھ کہدیتے ہیں۔ جو صورت دعوے میں ہوتا ہے مگر واقع میں دعوٰی نہیں ہوتا ۱۲)۔

سرمد اسی مضمون کو اس طرح فرماتے ہیں ؎

منعم کہ کباب می خورد می گذرد در بادۂ ناب میخورد می گذرد

یعنی کباب و شراب کھانے والے بھی مریں گے اور فاقہ کرنے والے بھی مریں گے جسکا آگے ذکر ہے ؎

سرمد کہ بکاسۂ گدائی ناں را تر کردہ بآب میخورد می گذرد

غرض سلف کے پیش نظر یہ باتیں تھیں اُن کو حکومت میں مزا کہاں تھا عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

مراد منزلِ جاناں چہ امن و عیش چو ہر دم جرس فریاد می دارد کہ بربندید محملہا

واقعی جس کو یہ فکر ہو کہ یہاں سے ایک دن جانا ہے وہ کس طرح چین سے بیٹھ سکتا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ دوپہر کو سخت گرمی میں سر پر چادر ڈالے ہوئے ایک اونٹ کی تلاش میں جارہے تھے۔ اُس وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے بالاخانہ پر بیٹھے تھے۔ دور سے دیکھ کر خیال ہوا کہ شاید امیر المومنین جارہے ہیں جب

قریب آئے تو پکارا اے امیرالمومنین آپ اس دھوپ اور لُو میں کہاں جا رہے ہیں فرمایا بیت المال کا ایک اونٹ گم ہو گیا ہے اس کی تلاش میں جا رہا ہوں عرض کیا کہ تھوڑی دیر کے بعد بھی تلاش ممکن تھی اس دھوپ میں کیوں تکلیف کی فرمایا جہنم کی آگ اس سے بھی سخت ہے حضرت عثمان نے عرض کیا کہ اچھا میں اپنے غلام کو بھیجے دیتا ہوں آپ یہاں آرام کیجئے فرمایا کہ قیامت میں تم سے یا تمہارے غلام سے بازپرس نہ ہو گی۔ بیت المال کے متعلق بازپرس تو مجھی سے ہو گی اس لئے میں اپنی رہائی کی فکر خود ہی کرنا چاہتا ہوں یہ فرما کر تشریف لے گئے اور دوپہر کی دھوپ ہی میں اس کو تلاش کیا۔ عرب کی گرمی اور دھوپ مشہور ہے اندازہ کر لیجئے کیسی سخت دھوپ ہو گی مگر امیرالمومنین اس وقت خود تلاش کے واسطے نکلے دوسروں پر بھی بھروسہ نہ کیا تو حضرت جن کو حکومت میں جہنم سے بچنے کا خیال ہے وہ ایسی ایسی تکالیف برداشت کر کے حکومت کرتے ہیں آپ نے اس کو منحوس کا نوالہ سمجھ لیا ہے اور باوجود یکہ حضرت عمر کے عدل و انصاف و جفاکشی کی یہ حالت تھی کہ دنیا میں اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ اور خود حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو فخر تھا کہ میں نے ایسے شخص کو اپنا خلیفہ بنایا ہے جس کی کوئی نظیر نہیں ہے۔ چنانچہ جب حضرت صدیق نے اُن کو خلیفہ بنایا ہے تو ایک شخص نے کہا کہ اے ابوبکرؓ تم نے مسلمانوں پر ایک سخت مزاج شخص کو خلیفہ بنا دیا خدا کو اس کا کیا جواب دو گے تو حضرت صدیق نے فخر کے ساتھ فرمایا کہ تو مجھے کیا ڈراتا ہے اگر مجھ سے سوال ہوا تو میں حق تعالیٰ سے عرض کر دوں گا کہ میں نے ایسے شخص کو خلیفہ بنایا تھا کہ روئے زمین پر اس سے بہتر کوئی نہ تھا۔ صاحبو! خدا کے یہاں ایسی ویسی بات نہیں چل سکتی۔ خدائے تعالیٰ کے سامنے پکی ہی بات کوئی کہہ سکتا ہے۔ پس حضرت صدیق کو کوئی وثوق تھا جو وہ حضرت عمر کے متعلق حق تعالیٰ کے سامنے شہادت دینے کو تیار تھے مگر اس پر بھی کسی صحابی نے حضرت عمر کو وصال سے دس یا پندرہ سال بعد خواب میں دیکھا کہ پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے آ رہے ہیں پوچھا اے امیرالمومنین آپ کا کیا حال ہے فرمایا عمر قریب ہلاکت ہو گیا تھا مرنے کے بعد سے جو حساب شروع ہوا ہے

تو آج حساب سے فراغت ہوئی ہے۔ الحمد للہ کہ خدا تعالیٰ نے مجھے بخشدیا تو حضرت حکومت کوئی مزہ کی چیز نہیں ہے جسکو جتنی بھی حکومت حاصل ہے اسی قدر اُس کے ذمہ حقوق ہیں جن کا ادا کرنا اُس کے ذمہ لازم ہے پس حکام پر لازم ہے کہ جو شخص اُن سے ملنے آئے اُس کو جائے امن تک خود پہونچائیں تاکہ عملہ والے اُس کو پریشان نکریں۔ یہ تو جان و مال کے حقوق تھے۔ ایک حق آبرو کا ہے یہ بھی حق العباد کی ایک فرد ہے جس کے ضائع کرنے میں ہم لوگ بہت مبتلا ہیں۔ خصوصًا علماء و مشائخ کیونکہ عوام تو عوام ہی کی آبروریزی اور غیبت کرتے ہیں اور یہ لوگ اولیاء اللہ اور مشائخ کی غیبت اور آبروریزی کرتے ہیں تاکہ لوگ اُدھر سے ہٹکر اُن کی طرف آویں یاد رکھو یہ خلوص کے بالکل خلاف ہے خلوص کی پہچان تو یہ ہے جو شیخ علی خواص رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمائی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی بستی میں دین کا ایک کام کر رہا ہو پھر اُس سے اچھا کام کرنے والا آجاوے تو اُس کام کو چھوڑ کر اُس دوسرے ہی شخص کے سپرد کردے اور اپنے متعلقین کو خود اُس کے یہاں بھیجدے اور آپ کسی دوسرے کام میں لگے اور اس سے خوش ہو کہ الحمدللہ دین کا کام کرنے والا اس بستی میں دوسرا آگیا جس سے میرا بوجھ ہلکا ہو گیا اب مجھے خلوت و ذکر کا خوب موقع ملیگا ہائے عارفین اہل اللہ تو ہر وقت اس کو ترستے ہیں کہ کوئی وقت فراغت اور خلوت کا ملے جس میں یہ محبوب حقیقی کے ساتھ مشغول ہوں۔ اُن کا تو مذاق یہ ہے کہ ؎

دلآرامے کہ داری دل در و بند دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

اسی کو عارف جامی فرماتے ہیں ؎

چہ خوش وقتے و خرم روزگارے کہ یارے برخوردار از وصل یارے

حضرت گو شغل علمی بھی دین ہے اور ثواب کا کام ہے مگر پھر بھی عارفین خلوت کے لئے تڑپتے رہتے ہیں۔ کیونکہ ان مشاغل میں کوئی نہ کوئی بات دین کے خلاف سرزد ہو ہی جاتی ہے تو ان سے قلب کی پوری اصلاح نہیں ہوتی اصلاح قلب کے لئے ایک وقت خلوت کا ضرور ہونا چاہئے اس لئے عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

از قیل و قال مدرسہ حالے دلم گرفت یک چند نیز خدمتِ معشوق میکنم

بھلا اور عارفین تو کس شمار میں ہیں جب سید العارفین سید نا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حق تعالیٰ خلوت کا امر فرما رہے ہیں "فاذا فرغت فانصب والی ربک فارغب" جن لوگوں کو خلوت کا لطف حاصل ہو چکا ہے۔ ان کے دل سے اس کی قدر پوچھو حضرت نواب شیفتہ کا ایک شعر اس کے متعلق مجھے بہت ہی پسند آیا ؎

چہ خوش ست با تو بزمے بنہفتہ ساز کردن در خانہ بند کردن سر شیشہ باز کردن

اس میں بنہفتہ ساز کردن عجیب تعبیر ہے (ایسے ہی سر شیشہ باز کردن میں حضور قلب کی کیفیت کا فوٹو کھینچ دیا ہے ۱۲) غرض مخلص کی شان یہ ہے کہ وہ محض ضرورت دینی کی وجہ سے کسی منصب کو ادا کرتا ہے خواہ وہ درس و تدریس ہو یا تعلیم و تربیت باطن ہو یا وعظ و امامت ہو اپنے نفس کی بڑائی کے لئے کسی منصب پر پیشقدمی نہیں کرتا اور اسکی علامت یہ ہے کہ جب کوئی دوسرا اس کام کا کرنے والا آجاتا ہے اور یہ دیکھ لیتا ہے کہ دینی ضرورت اس سے پوری ہو گئی تو اب وہ اپنے کو اس منصب سے علٰحدہ کر لیتا ہے اور خود خلوت و ذکر میں مشغول ہو جاتا یا دین کا کوئی دوسرا کام لے لیتا ہے جس کا کرنے والا اس بستی میں کوئی دوسرا نہیں ہے مگر اب تو یہ حالت ہے کہ جو شخص کسی جگہ پڑھاتا ہے وہاں دوسرا پڑھانے والا آجائے تو یہ اُس سے جلتا ہے کوئی واعظ ہے اور اُسکی بستی میں کوئی دوسرا واعظ آجائے تو یہ اُس سے حسد کرتا ہے کسی جگہ ایک مدرسہ ہے وہاں دوسرا مدرسہ ہو جائے تو پہلے مدرسہ والے اُس کے مٹانے کی کوشش کرتے ہیں کوئی شیخ ایک مقام میں تربیت باطن کر رہا ہے وہاں دوسرا شیخ آجاوے تو اس کو گراں گذرتا ہے پھر ایک دوسرے کی آبروریزی اور غیبت میں مشغول ہوتے ہیں وہ چاہتا ہے کہ یہ نہ رہے یہ چاہتا ہے کہ وہ نہ رہے۔ صاحبو! کیا اسی کا نام دین ہے۔ کیا اسی کو خلوص کہتے ہیں پھر تماشا ہے کہ باوجود اس بد دینی کے ہر اک بجائے خود نازاں ہے اور سمجھتا ہے کہ میں دنیا سے الگ ہوں اور دین کا کام کر رہا ہوں حالانکہ اُس کے دل میں سراسر دنیا بھری ہوئی ہے اور اس کا مصداق بنا ہوا ہے "الذین ضل سعیھم فی الحیوٰۃ الدنیا وھم یحسبون انھم یحسنون

ضعفا نے عرض کیا خاص کیا عوام سبھی نے آبرو کے حق سے غفلت کر رکھی ہے اور غیبت و شکایت کو کچھ گناہ ہی نہیں سمجھتے اس تقریر سے صاف واضح ہو گیا ہوگا کہ حقوق العباد صرف اموال ہی میں منحصر نہیں ہیں بلکہ مال کا بھی حق ہے۔ جان کا بھی حق ہے آبرو کا بھی حق ہے پس باہم ایک دوسرے کی اتلاف جان اتلاف مال اتلاف آبرو سے بچو۔ اور ایک چوتھی چیز اور ہے جو ان تینوں سے بھی اہم ہے مگر لوگ اس کو بہت کمتر اور معمولی بات سمجھتے ہیں وہ کیا ہے "اتلاف دین" ہر مسلمان کا دوسرے مسلمان پر یہ بھی حق ہے کہ اس کی دین کا ضرر نہ کرے یعنی اپنی وجہ سے کسی کا دین ضائع نہ کرے یہ سب سے مقدم ہے اس کے بعد آبرو کا درجہ ہے پھر جان کا پھر مال کا کیونکہ شریف آدمی جان کو مال سے مقدم سمجھتا ہے اور جان بچانے کے لئے مال کو خرچ کر دیتا ہے مگر آبرو کو جان سے بھی مقدم سمجھتا ہے چنانچہ شریف آدمی آبرو کے لئے جان پر کھیل جاتا ہے اور جو شریف دیندار ہوگا اور مسلمان سبھی دیندار ہیں وہ آبرو اور جان سے زیادہ دین کو سمجھتا ہے۔ چنانچہ دیندار آدمی حفاظت دین کے لئے آبرو کی پروا نہیں کیا کرتا۔ حضرت مولانا عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت (مجدد زمان) سید احمد صاحب بریلوی قدس سرہ کے خلفاء میں سے ہیں ایک مرتبہ لشکر کے ساتھ جا رہے تھے اور خود امیر عسکر تھے کہ راستہ میں نماز کا وقت آگیا تو آپ نے اپنی بی بی صاحبہ کو برقعہ اڑھا کر نماز کے لئے سب کے سامنے بھلی سے اتارا اور بلند آواز سے فرمایا کہ صاحبو! دیکھ لو یہ عبدالحی کی بیوی ہے جو نماز کے واسطے سب کے سامنے کھڑی ہوئی ہے حضرت دیندار کی تو یہی حالت ہو گی کہ وہ عرفی آبرو کو دین کے لئے فدا کر دے گا مگر اب لوگ یہ کرتے ہیں کہ آبرو کو دین سے زیادہ سمجھتے ہیں اسی واسطے تقریبات میں محض اپنی آبرو کے لئے دین کے خلاف بہت سے کام کرتے ہیں حالانکہ آبرو سے دین مقدم ہے اور آبرو جان و مال پر مقدم ہے مگر بعضے ایسے بھی ہیں جو مال کو آبرو سے مقدم کرتے ہیں جیسے بعضے رذیل بھیک مانگ کر مال جمع کرتے ہیں اور آبرو کی پروا نہیں کرتے بعضوں نے مسجد اور مدرسہ کے چندہ کی آڑ پکڑ لی ہے کیونکہ ویسے بھیک مانگنے میں تو کون دیتا ہے مسجد اور مدرسہ کے نام سے کچھ مل ہی جاتا ہے پھر جو کچھ ملتا ہے وہ اسی مانگنے والے کے پیٹ کو لگ جاتا ہے نہ مسجد کو

لگتا ہے نہ مدرسہ کو کسی مقام میں ایک صاحب تھے وہ مسجد کے لئے چندہ کیا کرتے تھے اور چند روز کے بعد پھر آدھمکتے اور قسمیں کھا جاتے کہ میں سارا چندہ مسجد ہی کو لگا آیا ہوں ایک شخص اُس کے حال سے واقف تھا اس نے کہا کم بخت جھوٹی قسم تو نہ کھایا کر تو مسجد کو کہاں لگاتا ہے سارا خود ہی کھا لیتا ہے کہنے لگا کہ واللہ میں سب مسجد کو لگا دیتا ہوں۔ آؤ تم کو دکھا دوں چنانچہ روپیوں کی تھیلی کو مسجد کی دیوار سے رگڑ کر دکھا دیا کہ میں اسطرح لگایا کرتا ہوں اس لئے میری قسم جھوٹ نہیں ہوتی یہ ویسی ہی تاویل ہے جیسی ایک دودھ والے نے کی تھی وہ بھی قسم کھایا کرتا تھا کہ واللہ میں دودھ میں پانی نہیں ملاتا ایک شخص نے کہا کمبخت تو نے میرے سامنے پانی ملایا ہے تو آپ کہتے ہیں کہ میں نے دودھ میں پانی نہیں ملایا پانی میں دودھ ملایا تھا وہ یہ کرتا تھا کہ ایک برتن میں پانی پہلے سے بھر لیا اور اُسمیں دودھ ڈالدیا تو اس صورت میں پانی میں دودھ ملایا گیا نہ کہ دودھ میں پانی اس لئے اپنے نزدیک وہ اس قسم میں سچا تھا کہ میں دودھ میں پانی نہیں ملاتا آجکل لوگ ایسی ایسی استادیاں کرتے ہیں اور چندہ والے اس میں زیادہ مبتلا ہیں مگر اُن کو تو مال سے غرض ہے چاہے دین اور آبرو ضائع ہو یا رہے۔ ایک محصل چندہ سفر کان پور میں مجھ سے ملے اور شکایت کرنے لگے کہ فلاں رئیس نے مدرسہ کے لئے چندہ مانگنے پر مجھے بہت مارا اب میں کیا کروں میں نے کہا تم اس نوکری پر لعنت بھیجو کوئی اور کام کرو۔ کہنے لگے یہ تو دین کا کام ہے اسے کیونکر چھوڑ دوں۔ میں نے کہا پھر جاؤ ایسی تیسی میں اگر یہ دین کا کام ہے تو شکایت کیوں کرتے ہو ماریں کھاتے رہو اور صبر کرو۔ کوئی قسم لیکر ان سے پوچھے کہ وہ دین ہی کے لئے تو محصل چندہ بنے ہوئے تھے۔ یہ بھی محض ایک بہانہ ہے ورنہ اصل مقصود تنخواہ ہے اگر پچاس ساٹھ روپئے ان کو گھر بیٹھے ملجایا کریں تو پھر ہم دیکھیں کہ وہ پھر بھی دینی خدمت کے لئے یہ ذلت گوارا کرتے ہیں مگر اب کیا کریں پیٹ کو بھی کسی طرح دین اس واسطے یہ ساری ذلت گوارا ہے۔ دین کی حالت تو یہ تھی کہ وہی محصل چندہ اُس رئیس کے یہاں بھی آئے تھے۔ جہاں میں مقیم تھا اُن سے چندہ مانگا تو اُنھوں نے دس روپئے دیدئے تو محصل صاحب کہتے ہیں کہ جناب آپ تو ہر سال بیس روپئے

دیا کرتے تھے اب کے دس کیوں دئے۔ یہ طریقہ تھا اُن کے چندہ کا جس میں سبکے سامنے وہ دینے والے کو ذلیل کرتے تھے۔ بس کسی رئیس کے ساتھ یہی حرکت کی ہوگی اُس نے مارا پیٹا ہوگا۔ ورنہ محض مانگنے پر کون مارتا ہے ہاں ان کے مارنے کے بعد اگر دوسرا عذر کردے یا تھوڑا سا دیدے اور اس پر اُس کو ذلیل کیا جاوے تو بیشک کوئی دل چلا مار بھی دیتا ہے چندہ کا یہ طریقہ بالکل خلاف شریعت ہے اور حرام ہے اور آجکل زیادہ تر چندہ کے طریقے حرام ہی ہیں مگر محصلین چندہ اس کو دین سمجھتے ہیں کچھ نہیں اس کا نام تو بے حسی ہے کہ مال کے واسطے نہ آبرو کی پرواہے نہ دین کی۔ ہاں چندہ کا ایک طریقہ جائز بھی ہے کہ مسلمانوں کو اطلاع کردو کہ فلاں جگہ مدرسہ ہے اور فلاں شخص کے پاس اُس کے لئے چندہ جمع ہورہا ہے جس کا جی چاہے وہاں اپنی رقم جمع کردے پھر دیکھیں کتنے آدمی دینے آتے ہیں غرض بعضے ایسے بے حس بھی ہیں جو آبرو کو مال کے واسطے ضائع کر دیتے ہیں اور بعضے ایسے بھی ہیں جو مال کے واسطے جان بھی دیدیتے ہیں۔ تھانہ بھون کا قصہ ہے کہ ایک میانجی کے پاس دو سو روپیہ جمع ہوگئے تھے جن کو ایک لوٹے میں رکھکر زمین کے اندر گاڑ رکھا تھا مگر محبت مال کی حالت یہ تھی کہ روز اُن کو گنا کرتا تھا کسی دن لڑکوں نے بھانپ لیا وہ موقع کے منتظر رہے آخر ایک دن ملاجی کہیں دعوت میں گئے ہوئے تھے پیچھے لڑکوں نے وہ روپئے نکال لئے اور خوب عمدہ عمدہ کھانے پکوائے اور ملاجی کے حال پر انتہا رحم کیا کہ اُن کی بھی دعوت کردی ملاجی خالی الذہن تھے خوشی خوشی دعوت کر چلے گئے اُنھیں ایسے عمدہ کھانے کب ملے تھے بڑے خوش ہوئے کھاتے جاتے اور پوچھتے جاتے کہ بھائی آج کیا تقریب تھی جو ایسے کھانے پکوائے گئے لڑکوں نے کہا حضور یہ سب آپ ہی کی جوتیوں کا طفیل ہے تھوڑی دیر کے بعد ملاجی نے پھر کہا کہ آج کیا بات ہے کون مہمان آگیا ہے جسکے لئے یہ اہتمام ہوا ہے پھر بھی لڑکوں نے وہی جواب دیا کہ سب حضور ہی کا طفیل ہے اس پر ایک لڑکے کو ہنسی آگئی تو ملاجی کھٹک گئے کہ شاید میرے روپیوں میں ہاتھ پڑ گیا ہے جبھی یہ بار بار اسکو میرا طفیل بتلاتے ہیں بس ابتو کھانا پینا سب بھول گئے اندھے باؤلوں کی طرح سیدھے حجرہ میں آئے اور کھودا تو روپئے ندارد بس فوراً ہی

جان نکل گئی لوگ دوڑے کہ یہ قصہ کیا ہے معلوم ہوا کہ روپیہ گم ہونے کا اتنا صدمہ ہوا یہ قصہ بستی میں مشہور ہوا تو اُسوقت تھانہ بھون میں ایک عالم مولانا سعد الدین علی صاحب موجود تھے اُنھوں نے فرمایا کہ یہ روپیہ منحوس ہے جس نے ایک مسلمان کی جان لیلی اس کو کوئی ہاتھ نہ لگائے بلکہ جنازہ کے ساتھ ہی قبر میں دفن کر دیا جائے۔ چنانچہ اہل محلہ نے اس کی تعمیل کی اور کسی نے ان روپیوں کو ہاتھ نہیں لگایا بلکہ سب کو ایک تھیلی میں باندھکر قبر میں میانجی کے ساتھ دفن کر دیا۔ کفن چوروں کو خبر لگ گئی۔ انھوں نے کہا مولوی کی تو عقل جاتی رہی کہ خواہ مخواہ اتنا روپیہ زمین میں گاڑ دیا چلو اسکو نکالنا چاہئے چنانچہ رات کو ایک شخص نے قبر کھودی تو دیکھا کہ سب روپئے کفن سے باہر سینے کے اوپر ترتیب وار رکھے ہوئے ہیں اور خوب چمک رہے ہیں۔ یہ خوش ہوا کہ اب تو اور آسانی ہو گئی اوپر ہی سے سب سمیٹ لوں گا پس انگلی ہی روپیوں سے لگی تھی کہ چیخ مارتا ہوا بھاگا وہ روپئے عالم برزخ کی آگ سے دہک رہے تھے جنسے میت کو عذاب دیا جا رہا تھا پھر اس کفن چور کی عمر بھر یہ حالت رہی کہ ہر وقت ایک آبخورہ ہاتھ میں لئے پھرتا تھا جس میں وہ انگلی ہر وقت ڈوبی رہتی تھی اس طرح کچھ تسکین رہتی اور جہاں پانی بدلنے کو انگلی آبخورہ سے نکالی فوراً چیخیں مارتا تھا کہ ہائے میں جلا ہائے مرا تو بعض ایسے بھی ہیں جو مال کے واسطے جان دیدیتے ہیں۔ مگر ایسے کم ہیں زیادہ حالت تو یہی ہے کہ مال سے جان کو زیادہ سمجھتے ہیں اور جان سے زیادہ آبرو کو سمجھتے ہیں مگر دین کو سب سے کمتر کر رکھا ہے۔ اسی لئے کسی کے اضرار دین سے کچھ باک نہیں کسی کو خوشامد میں آکر غلط فتوی دیدیا جیسا ہمارے یہاں ایک جاہل نے دنیوی خوشامد میں مطلقۃ الثلاث کو حلال کر دیا دنیا دار مولوی اس مرض میں بہت مبتلا ہیں اور اُن کے غلط فتوئی سے عوام کے لئے حرام چیز حلال نہیں ہو جاتی کیونکہ فتوے کی غلطی چھپی نہیں رہا کرتی ایک اضرار دین یہ ہے کہ کسی کو دین کا راستہ معلوم نہیں تربیت کا طریقہ جانتا نہیں اور خواہ مخواہ شیخ و مرشد بنکر بیٹھ گیا ہے اور لوگوں کی راہ مارتا ہے۔ ایک اضرار دین یہ ہے جس میں اہل مدارس مبتلا ہیں کہ کسی طالب علم نے کسی سے مشورہ لیا کہ میں کون سے

مدرسہ میں پڑھوں تو ہر مدرسہ والا اپنے ہی مدرسہ کا مشورہ دیتا ہے گو جانتے ہیں کہ اس کا نفع دوسرے مدرسہ میں زیادہ ہے۔ افسوس آج کل اہل علم بھی غلط مشورہ دینے لگے ہیں اور پہلے زمانہ میں کفار بھی غلط مشورہ نہ دیتے تھے۔ چنانچہ ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ اُن کے ایک لڑکی تھی جس کے شادی کے پیام جابجا سے آرہے تھے، تو انھوں نے اپنے ایک پڑوسی سے جو کہ یہودی تھا مشورہ کیا کہ میری لڑکی کے فلاں فلاں جگہ سے پیام آرہے ہیں تمھارے نزدیک کون سی جگہ اچھی ہے اس نے اول تو عذر کیا کہ آپ کو مجھ سے مشورہ نہ کرنا چاہئے کیونکہ میں دین میں آپ کا مخالف ہوں مخالف کے مشورہ کا کیا اعتبار تو بزرگ نے فرمایا کہ شریف آدمی ہو گو مسلم نہیں ہو اس لئے غلط مشورہ نہیں دوگے اس لئے تم بے تکلف مشورہ دو تو وہ یہودی کہنے لگا میں نے سنا ہے کہ آپ کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "تنکح المرأۃ لاربع لمالہا وجمالہا وحسبہا ودینہا فاظفر بذات الدین تربت یداک" عورت سے نکاح کرنے میں چار باتوں کو دیکھا جاتا ہے مال کو اور جمال کو اور حسب کو اور دین کو۔ پھر آپ نے فرمایا کہ تم دیندار سے نکاح کرنے کی کوشش کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ کے مذہب اسلام میں سب سے زیادہ دیکھنے کی چیز دین ہے تو میرے خیال میں جتنے لوگوں نے بھی پیام بھیجا ہے دین پورا پورا کسی میں بھی نہیں ہے۔ میرے نزدیک تو ایک طالب علم جو آپ کی مسجد میں رہتا ہے وہ بڑا دیندار ہے، ہر وقت خدا کے کام میں لگا رہتا ہے۔ پس آپ اپنی بیٹی کو اس سے بیاہ دیں انشاء اللہ تعالیٰ بہت برکت ہوگی چنانچہ ان بزرگ نے ایسا ہی کیا اور عمر بھر اُن کی لڑکی راحت سے رہی۔ حدیث میں آتا ہے "المستشار مؤتمن" جس سے مشورہ لیا جاتا ہے اسکو امانت دار سمجھا جاتا ہے۔ پس مشورہ غلط دینا خیانت ہے اس سے بہت احتراز کرنا چاہئے۔ ہماری بستی میں ایک صاحب اپنا گھر فروخت کرنا چاہتے تھے پہلے مجھے بھی اُسکے خریدنے کا خیال تھا۔ مگر بعد میں اُن کی رائے بدل گئی پھر کچھ ایسے واقعات بستی میں اُن کے ساتھ پیش آئے جن سے گھبرا کر اُنھوں نے باہر ملازمت کر لی اور گھر بیچنے کا پھر ارادہ کر لیا۔ اُس وقت بھی میرا خیال تھا کہ اگر یہ فروخت کرینگے تو میں ضرور لیلونگا

کیونکہ اس مکان کے نہ لینے سے مجھے گو نہ تکلیف ہے لیکن اس دفعہ انھوں نے مجھسے مشورہ کیا کہ میں گھر بیچنا چاہتا ہوں اس میں آپ کی کیا رائے ہے۔ اس وقت اگر میں اپنی غرض کا لحاظ کرکے اُن کو یہ مشورہ دیدیتا کہ ہاں فروخت کردو تو وہ فوراً بیچدیتے کیونکہ ان کی زیادہ رائے اسی طرف مائل تھی مگر جب مجھ سے مشورہ کیا تو میں نے اپنی مصلحت پر نظر کرنا اور اُن کی مصلحت کو نظر انداز کردینا خیانت سمجھا اور وہی رائے دی جو اُن کے لئے مناسب تھی میں نے کہا کہ آپ گھر کو ہرگز فروخت نہ کریں کیونکہ دوسری جگہ چاہے کیسی ہی راحت ہو مگر کسی وقت پھر وطن یاد آتا ہے اور جب باہر جاکر ٹھوکریں لگتی ہیں تو اس وقت اپنے وطن سے زیادہ کوئی جگہ نہیں ہوتی چنانچہ اس رائے کی وجہ سے انھوں نے اپنا ارادہ ملتوی کردیا اس پر بعض لوگوں نے مجھے بیوقوف بھی بنایا کہ تم نے یہ رائے دیکر ساری عمر کی مصیبت پھر اپنے سر لی میں نے کہا کچھ بھی ہو یہ تو مجھسے کبھی نہ ہوگا کہ ایک شخص امین سمجھکر مجھ سے مشورہ کرے اور میں اُس کی مصلحت کے خلاف مشورہ دوں مجھے دین سب سے مقدم ہے اب چاہے مجھے راحت ہو یا کلفت ہو (اور انشاء اللہ اس نیت کی برکت سے راحت ہی ہوگی ۱۲ جامع) مگر عموماً آجکل مشیروں کی یہ حالت ہے کہ جان جان کر غلط مشورہ دیتے ہیں جسمیں اُن کے نزدیک صراحۃً دوسرے کا نقصان ہوتا ہے، بگہرہ میں ایک شخص ملازمت سے گھر آیا اور ساتھ میں بہت کچھ نقد اور سامان وغیرہ بھی لایا، پھر اس کی لڑکی کا بیاہ ہونے لگا تو بستی کے بھائیوں نے اُس کے پاس اُٹھنا بیٹھنا شروع کیا اور یہ رائے دی کہ ذرا شادی میں خوب دھوم دھام کرو تاکہ لوگوں کی نگاہ میں تمھاری عزت ہو اور خاندان کا نام ہو چنانچہ اس نے ایسی دھوم دھام کی کہ جو کچھ باہر سے کماکر ساتھ لایا تھا سب غارت کردیا۔ بعد میں ان مشیروں میں سے ایک نے فخراً کہا کہ یہ بہت بڑھ گیا تھا یہ رائے دیکر ہم نے اُس کو اپنے برابر کرلیا آج کل برادری کے بھائیوں کی عام حالت یہی ہے کہ کسی کو اپنے سے بڑھا ہوا دیکھ نہیں سکتے بس جہاں کوئی بڑھا اور انھوں نے اسکو ایسی پٹیاں پڑھانی شروع کیں جس سے چار دن میں وہ ان کے برابر بلکہ کم ہوجائے اور برابر دو غرض سے کرتے ہیں، کبھی حسد سے اور کبھی اسلئے

کہ وہ ہم کو گھٹانے کی فکر نکرے کیونکہ آج کل جہاں کوئی ذرا بڑھتا ہے وہ دوسروں کو گھٹانا شروع کر دیتا ہے اس لئے اپنی جان بچانے کو وہ اس کوشش میں رہتے ہیں کہ کسی طرح یہ ہم سے بڑھا ہوا نہ رہے جیسے ایک گانوں کا آدمی باہر جاکر چار پانچسو روپیہ کا ملازم ہوگیا تھا اُس کے گھر پر ایک میانجی بچّوں کو پڑھانے کو نوکر تھے وہی سارے گانوں میں خط پڑھنا جانتے تھے اس شخص کا خط آیا کہ میں اتنے کا ملازم ہوگیا ہوں تو گھر والوں نے میانجی کے پاس خط بھیجدیا کہ ذرا اسکو پڑھ دو کیا لکھا ہے میانجی خط کو دیکھ کر رونے لگے تو خط لانے والا گھبرا گیا کہا میانجی خیر تو ہے کیا لکھا ہے کہا ایسی ہی بات لکھی ہے جسپر مجھے رونا چاہیئے اُس نے دوڑکر گھر میں خبر کی تو اُس کی بیوی نے دروازہ پر بلاکر پوچھا کہ کیا بات ہے خیر تو ہے میانجی نے کہا بتلاؤں گا مگر تو بھی رو وہ بھی رونے لگی اتنے میں محلہ والے آگئے کہ یہ کیا معاملہ ہے میانجی نے کہا کہ تم بھی رو وہ بھی رونے لگے پھر پوچھا کہ میاں آخر بتاؤ تو سہی کیا لکھا ہے کوئی مرگیا ہے یا بیمار ہوگیا ہے کہا نہیں اسمیں یہ لکھا ہے کہ میں پانچسو روپئے کا نوکر ہوگیا ہوں لوگوں نے کہا لاحول ولا قوۃ پھر یہ رونے کی بات ہے یا خوشی کی میانجی نے کہا یہ رونے ہی کی بات ہے مجھے تو اس لئے رونا چاہیئے کہ اب یہ مجھے اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے کیوں نوکر رکھے گا کسی انگریزی جاننے والے ماسٹر کو بلاوے گا اور بیوی کو اس واسطے رونا چاہیئے کہ اب وہ اس گانوں کی عورت کو کیوں اپنے نکاح میں رکھے گا بس اسے طلاق دیکر کوئی شہر کی تعلیمیافتہ عورت لائیگا، اور گانوں والوں کو اس لئے رونا چاہیئے کہ اب وہ سال بھر کے بعد آتے ہی اپنا گھر بہت عالیشان بنائیگا جس میں غریبوں کے مکانات جبراً معمولی داموں میں خرید خرید کر ملائے جائیں گے پھر زمین جائداد بہت سی خریدے گا جس میں غریبوں کے حصے دبائے جائیں گے واقعی باتیں تو میانجی نے سب معقول کہیں آجکل زیادہ مال و دولت حاصل کرکے لوگ یہی حرکتیں کرتے ہیں اسواسطے بھی دوسروں کو فکر ہوتی ہے کہ کسی طرح یہ ہم سے بڑھا ہوا نہ رہے خیر یہ تو وہ ظلم ہے جو انسان اپنی غرض کیواسطے دوسروں پر کیا کرتا ہے اور بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ اپنی غرض سے بھی نہیں محض دوسروں کے آرام کے واسطے مخلوق کا گلا دبایا کرتے ہیں

جیسے بعض زمیندار حکام کو خوش کرنے کے واسطے گانوں والوں سے چندہ جبراً وصول کرتے ہیں اور خوشامد کے لئے چندہ کی رقم سے ان کے سامنے ڈالی پیش کرتے ہیں اور اسی طرح بہت سے قصے کئے جاتے ہیں میں فروع کو کہاں تک بیان کروں میں نے بطور قاعدہ کلی کے یہ حقوق بیان کردئے ہیں فروع انہی سے سمجھ میں آسکتی ہیں اب یہ سمجھئے کہ جو کچھ حقوق میں نے ابتک بیان کئے ہیں یہ تو حقوق عامہ ہیں ان کے بعد کچھ حقوق خاصہ ہیں جب کسی صاحب حق میں کوئی خاص خصوصیت ہوتی ہے تو اس کے کچھ خاص حقوق ان حقوق عامہ پر بڑھ جاتے ہیں یہ حقوق مذکورہ تو ہر انسان کے دوسرے انسان پر بحیثیت عبد ہونے کے ہیں اب اگر کوئی شخص مسلمان بھی ہے تو اسلام کی وجہ سے اس کا حق اور بڑھ جائیگا مثلاً مسلمان کا دوسرے مسلمان پر یہ حق ہے کہ بیمار ہو تو عیادت کرو جب ملے تو سلام کرو، اس کو چھینک آوے اور الحمد للہ کہے تو یرحمک اللہ کہو مرجاوے تو جنازہ کی نماز پڑھو دفن کفن میں شریک ہو وغیرہ وغیرہ ایک خصوصیت یہ ہے کہ کوئی شخص ہمارا پڑوسی ہے جوار کی وجہ سے اسکا حق بڑھ جائیگا ایک خصوصیت یہ ہے کہ کوئی ہمارا محسن بھی ہے جیسے استاد یا پیر یا کوئی دوست وغیرہ سو احسان کی وجہ سے اُن کے حقوق عام مسلمانوں کے حقوق سے زیادہ ہوں گے محسن ہونے میں باپ ماں کا درجہ سب سے بڑھا ہوا ہے ان کے حقوق سب سے زیادہ ہیں اسی طرح بعض اور رشتے بھی بواسطہ احسان میں داخل ہیں مثلاً سسرالی رشتہ جیسے بیوی کی ماں اس کا باپ وغیرہ کہ وہ بیوی کے محسن ہیں۔ اور بیوی سے دوستی کا رشتہ ہے تو دوست کے محسن گویا اپنے ہی محسن ہیں ان کے حقوق بھی عام لوگوں سے زیادہ ہیں غرض کہ خصوصیات کی وجہ سے حقوق عامہ پر حقوق خاصہ کا اضافہ ہو جاتا ہے اس وقت نہ میں اسکی تفصیل کرسکتا ہوں نہ اتنا وقت ہے علماء کی کتابیں موجود ہیں جن میں سب کے حقوق لکھے ہوئے ہیں اہل قرابت و اہل خصوصیت کے حقوق تو سب جانتے ہی ہیں احکام کی کتابوں میں رعایا اور حکام کے حقوق بھی لکھے ہوئے ہیں غرض اسلام میں سب انسانوں کے لئے کچھ نہ کچھ حقوق ہیں میری ایک کتاب مختصر اس بارہ میں طبع ہو چکی ہے جس کا نام حقوق الاسلام

ہے اس کو دیکھو اس میں مختصراً سب کے حقوق لکھے ہوئے ہیں ایک مسلمان ڈپٹی نے وہ کتاب ایک انگریز کو دکھلائی تھی اُس نے جو دیکھا تو اس میں رعایا اور حکام کے بھی حقوق تھے کہ رعایا کو حکام کے ساتھ اس طرح رہنا چاہئے اور حکام کو رعایا کے ساتھ یوں برتاؤ کرنا چاہئے ایک حق تو حاکم مسلم کا ہے وہ الگ ہے اسلام میں مطلق حاکم کا بھی بوجہ معاہدہ کے نیز بوجہ احسان انتظام راحت کے ایک حق ہے چاہے مسلم ہو یا غیر مسلم تو وہ انگریز بڑا متعجب ہوا کہ اسلام میں حکام کے بھی حقوق ہیں اس کو اسی پر تعجب ہوا اُسے یہ خبر ہوئی کہ اسلام میں بہائم کے بھی حقوق ہیں تو اور زیادہ تعجب ہوتا صاحبو یہ قانون خداوندی ہی کی خصوصیت ہے جسمیں باغیوں کے بھی حقوق ہیں۔ کفار حالانکہ خدا تعالےٰ کے باغی ہیں اور ان کے بارہ میں ارشاد ہے "ان ہم الا کالانعام بل ہم اضل" مگر اس کے ساتھ ان کے کچھ حقوق بھی رکھے ہیں۔ بہرحال خصوصیت محل وغیرہ سے یہ حقوق بڑھ جاتے ہیں اور مخصوص اُن انسانوں کے حقوق بہت زیادہ ہیں جو کسی سے کچھ نہ کہہ سکیں وہ کون ہیں وہ بیویاں ہیں یہ بیچاری عموماً ایسی بے کس اور بے بس ہوتی ہیں کہ کسی سے کچھ شکایت کر ہی نہیں سکتیں اور اگر کسی کے باپ ماں زندہ بھی ہوں جب بھی شریف عورتیں اپنے خاوند کی شکایت کسی سے نہیں کرتیں پھر مردوں کی یہ حالت ہے کہ اپنی بیوی کے سوا اور جگہ بھی ان کی نظر اُٹھ جاتی ہے اور بعضے ایسی ایسی جگہ پھنس بھی جاتے ہیں مگر ہندوستان کی عورتیں عموماً اپنے شوہروں کی عاشق ہوتی ہیں گو شوہر کیسا ہی ہو ہم نے دیکھا ہے کہ بعض مرد بدصورت بھی ہوتے ہیں مگر ان کی بیویاں بجز شوہر کے کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتیں واقعی ہندوستان کی عورتیں تو اس صفت میں حوریں ہیں حق تعالےٰ نے حوروں کی تعریف میں جہاں حسن و جمال کو بیان فرمایا ہے وہاں قاصرات الطرف بھی فرمایا ہے کہ وہ اپنی نگاہوں کو شوہر ہی پر منحصر کرنے والی ہوں گی کسی غیر پر نظر نہ ڈالیں گی واقعی ہندوستان کی عورتیں اس صفت میں تمام ممالک کی عورتوں سے ممتاز ہیں یہ تو نکاح کر کے شوہر کے ساتھ ایسی وابستہ ہو جاتی ہیں کہ اپنے باپ ماں کو بھی بعض دفعہ چھوڑ دیتی ہیں چنانچہ اگر اس کے باپ ماں یا اور کسی عزیز کے ساتھ کبھی شوہر کی

ع و قربان ربی کی قوت مالک ظاہر ہوتی تھی ۱۲

اُن بَن ہو جائے تو عورت عموماً شوہر کا ساتھ دیتی ہے باپ ماں کا ساتھ نہیں دیتی مگر اسپر بھی بعضے مرد ان پر بہت زیادتی کرتے ہیں باوجودیکہ وہ اُن پر ایسی فدا ہیں مگر بعض لوگ ان کے ساتھ جوتے ہی سے بات کرتے ہیں باندی اور غلام سے بھی ان کی اوقات بدتر رکھتے ہیں بعضے ایسے بیروت ہیں کہ ان کی آمدنی ہزاروں کی ہے مگر بیوی کو دس ہی روپیہ کا روزینہ دیتے ہیں اور بعضے تو کھانے کپڑے کی بھی خبر نہیں لیتے۔ نہ ہوا عرب یا بعض ہندوستانی ریاستیں کہ وہاں عورت فوراً قاضی کے یہاں جاکر نالش کر دیتی ہے۔ اب یا تو قاضی کی تجویز کے موافق نان ونفقہ دینا پڑتا ہے ورنہ جبراً طلاق دلوائی جاتی ہے جس کے بعد فوراً عورت کی طرف سے مہر کی نالش ہو جاتی ہے اور بعض ممالک میں مہر نکاح کے وقت ہی پیشگی دھروا لیتے ہیں یہ بیچاری ہندوستان ہی کی عورتیں ہیں جو مہر بھی معاف کر دیتی ہیں اور عمر بھر نان ونفقہ کی تکلیف بھی سہتی ہیں خیر کسی کے پاس ہو ہی نہیں تو اُس کی شکایت نہیں اس صورت میں تو عورتیں خود محنت مزدوری کرکے شوہر کو بھی کھلاتی ہیں لیکن جس کو خدا تعالیٰ نے سب کچھ دیا ہو وہ بیوی کو تنگ رکھے یہ نہایت بے عزتی اور بے حمیتی ہے سعدی فرماتے ہیں ؎

به بیں آں بے حمیت را کہ ہرگز نخواہد دید روے نیک بختی
تن آسانی گزیند خویشتن را زن و فرزند بگذارد بہ سختی

حالانکہ عورتوں کا ایک حق تو اسواسطے ہے کہ وہ بے کس بے بس ہیں۔ دوسرے اسواسطے بھی حق ہے کہ وہ تمہاری دوست ہیں اور اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ دوستی کی وجہ سے حق بڑھ جاتا ہے پھر وہ تمہاری دین کی محافظ بھی ہیں اسی لئے صوفیہ نے تقلیل وقاع کو مجاہدہ میں داخل نہیں کیا باوجودیکہ وہ تمام لذات میں الذ ہے مگر صوفیہ نے اسکی تقلیل کو مجاہدہ میں شمار نہیں کیا۔ اور نہ کثرت وقاع سے منع کیا ہے گو اور وجہ سے منع کیا ہے مگر مجاہدہ کی حیثیت سے منع نہیں کیا اس سے معلوم ہوا کہ صوفیہ محض ترک لذات نہیں کراتے بلکہ اصلاح قوت بہیمہ کراتے ہیں اگر اُن کا مقصود ترک لذات ہوتا تو کثرت وقاع سے پہلے منع کرتے غرض بیوی اس لحاظ سے بھی قابل قدر ہے کہ اُس سے دین

کی حفاظت اور خیالات فاسدہ کی روک ہوتی ہے۔ اس درجہ میں وہ بڑی محسن ہے جو لوگ دیندار ہیں وہ اس احسان کی قدر کرتے ہیں۔ مولانا محمد مظہر صاحب رحمۃ اللہ علیہ مدرس مظاہر العلوم کی یہ حالت تھی کہ ان کی بیوی بوڑھی ہوگئی تھیں مگر مولانا کو اُن سے ایسا تعلق تھا کہ جب وہ ذرا بیمار ہوتیں تو مولانا فوراً مدرسہ سے رخصت لیکر خود اپنے ہاتھ سے اُن کی خدمت کرتے تھے آج کل تو بعض لوگ بوڑھی بیوی سے نفرت کرنے لگتے ہیں، حالانکہ تم نے ہی تو اس کو بوڑھی کیا ہے مگر مولانا کی یہ حالت تھی کہ نوکروں اور ماماؤں پر اپنی بیوی کی خدمت کو نہ ڈالتے تھے بلکہ مدرسہ سے رخصت لیکر خود خدمت کرتے تھے۔ اسی لئے تو علماء کو لوگ بیوی کا مرید کہتے ہیں۔ مگر جی ہاں اُن کا مرید ہونا تمہاری طرح پیر ہونے سے اچھا ہے تم بیویوں کے پیر ہو مگر ڈاکو پیر ہو اور اصل یہ ہے کہ مولوی بیویوں کے مرید نہیں ہیں بلکہ ان کے دل میں خدا کا خوف ہے وہ حقوق العباد کو ادا کرنے کا اہتمام کرتے ہیں بیوی کے حقوق نصوص میں ان کی نظر سے گذرے ہوئے ہیں حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرت کا حال انھوں نے پڑھا ہے اس لئے وہ بیویوں کے ساتھ نرمی اور ملاطفت کرتے ہیں اُن کو راحت پہونچاتے ہیں بلکہ جتنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا ہے اُتنا تو کوئی مولوی کر بھی نہیں سکتا اور اگر کوئی ویسا کرنے لگے تو نہ معلوم لوگ اسکو زن مرید سے بڑھکر اور کیا خطاب دینے لگیں گے حدیث میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ایک بار دوڑے تو اسوقت وہ ہلکی پھلکی تھیں آپ سے وہ آگے نکل گئیں اس کے بعد کچھ عرصہ میں دوبارہ پھر آپ ان کے ساتھ دوڑے اُس وقت حضرت عائشہ بھاری پڑگئی تھیں تو اب حضور آگے نکل گئے تو آپ نے فرمایا "تلک بتلک" یہ پہلی بار کا بدلہ ہے میں نے ایک مولوی سے جو بڑے وقار و تمکنت سے رہتے تھے کہا تھا کہ تم نے جس چیز کا نام وقار رکھا ہے یہ تکبر ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہاری طرح کے وقار سے نہ رہتے تھے بتلاؤ کیا تم بھی کبھی اپنی بیوی کے ساتھ دوڑے ہو۔ بس چپ ہوگئے اس کا کچھ جواب نہ تھا میں نے کہا بس رہو وقار وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرت کے موافق ہو

اور جو اُس کے خلاف ہو وہ وقار نہیں بلکہ تکبر ہے غرض مولوی اس واسطے اپنی بیویوں کی خاطر زیادہ کرتے ہیں کہ اُن کی نگاہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرت ہے پھر بیوی کی خاطر کرنے میں دنیا کی بھی تو بڑی مصلحت ہے اول بات تو یہ ہے کہ اس سے زندگی لطف سے گذرتی ہے۔ ایک دوسرے کی راحت و رنج کا شریک ہوتا ہے اور اگر میاں بی بی میں موافقت اور بے تکلفی اور انشراح ہو تو پھر زندگی کا کیا لطف ہے جہاں ہر وقت جوتی پیزار ہو وہاں کوئی خوشی نہیں ؎

در خرمی بر سرائے بہ بند ۔۔۔ کہ بانگ زن ازوے برآید بلند

لطف تو اسی میں ہے کہ آدمی دن بھر کا تھکا ماندہ گھر میں جائے تو گھر والوں کی باتوں سے جی خوش کرے وہ اُس کو راحت دیں یہ ان کی راحت کا خیال کرے اور یہ کیا زندگی ہے کہ دن بھر تو کام میں تھکے اب شام کو گھر جاکر بھی رنج و غم ہی کی باتیں کی جائیں مگر آج کل لوگوں کے مذاق بگڑ گئے ہیں بے حسی چھا گئی ہیں وہ اسی حالت میں رہنا پسند کرتے ہیں مگر جنکو ذرا بھی حس ہے وہ تو اس کو دنیا ہی میں دوزخ سمجھتے ہیں اور جنکی معاشرت گھر والوں کے ساتھ عمدہ ہے واقعی ان کو دنیا ہی میں جنت نصیب ہے ؎

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد ۔۔۔ کسے را با کسے کارے نباشد

(یعنی کار ایذا نباشد ۱۲) اور سعدی فرماتے ہیں ؎

زنِ خوب فرماں بروپارسا ۔۔۔ کند مرد درویش را پادشا

ہمہ روز اگر غم خوری غم مدار ۔۔۔ چو شب غمگسارت بود در کنار

صاحبو! یہ راز ہے اہل اللہ کی دلجوئی میں وہ اس لئے اپنے گھر والوں کو راحت پہونچاتے ہیں تاکہ زندگی لطف کے ساتھ گذرے اور واقعی خدا تعالیٰ نے یہ تعلق ہی ایسا بنایا ہے کہ بیوی سے زیادہ کوئی بھی انسان کو راحت نہیں دے سکتا بیماری میں بعض دفعہ سارے عزیز الگ ہو کر ناک منھ چڑھانے لگتے ہیں خصوصاً اگر کسی کو دستوں کی بیماری ہو جائے مگر بیوی سے یہ کہیں نہیں ہو سکتا کہ وہ شوہر کو اس حال میں بھی چھوڑ دے وہ بیماری میں سب سے زیادہ راحت پہونچاتی ہے شاہجہاں پور میں ایک رئیس نے بڑھاپے میں

شادی کی تھی ان کے لڑکوں نے اعتراض کیا کہ تم کو اس عمر میں شادی کی کیا ضرورت تھی خدمت کے لئے تو آپ کی اولاد بہت تھی کہا تم نہیں جانتے بیوی کے برابر مجھے کوئی راحت نہیں دیسکتا اتفاق سے ایکبار وہ بیمار ہوئے اور دست لگ گئے تو سارے لڑکے اور بہو بیٹیاں چھوڑ کر الگ ہو گئے اور بدبو کی وجہ سے کوئی بھی پاس نہ آتا تھا مگر بیوی اس وقت بھی خدمت گذار تھی وہ بیچاری ہر وقت سہارا لگا کر ٹھیلانی کپڑوں کو دھوتی صاف کرتی تھی پھر وہ بیماری سے شفایاب ہوئے تو لڑکوں کو بلایا اور کہا تم نے اپنی خدمت کا حال دیکھ لیا اسی کے بھروسہ پر مجھے کہتے تھے کہ تمھیں شادی کی کیا ضرورت ہے اب تم نے ضرورت دیکھ لی اگر اس وقت میری بیوی نہ ہوتی تو تم تو چھوڑ کر الگ ہو گئے تھے میں اکیلا پڑا سڑتا رہتا حقیقت میں بیماری کے اندر بہو بیٹیاں ہرگز وہ کام نہیں دیسکتیں جو بیوی دے سکتی ہے خدا تعالیٰ نے یہ راحت اسی تعلق میں رکھی ہے اسی لئے حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب نے پہلی بیوی کے انتقال پر اخیر عمر میں پھر شادی کی تھی حالانکہ اُسوقت مولانا کی عمر سو برس سے اوپر تھی یہ تو بیوی سے دنیا کی راحت پہونچتی ہے اور دین کی راحت یہ ہے کہ گھر کے انتظام سے بے فکری ہو جاتی ہے جس سے قلب کو فراغ و اطمینان حاصل ہوتا ہے تجربہ ہے کہ بدون بیوی کے گھر کا انتظام درست نہیں ہو سکتا بس مرد کا کام تو اتنا ہے کہ یہ مادہ جمع کر دیتا ہے پھر ہیئت عورت ہی سے بنتی ہے، میں نے بعض رؤسا کو دیکھا ہے کہ مال و دولت اُن کے پاس بہت کچھ تھا مگر بیوی نہ تھی تو ان کے گھر کا کچھ بھی ڈھنگ نہ تھا لاکھ باورچی رکھو نوکر رکھو وہ راحت کہاں جو بیوی سے ہوتی ہے باورچی تو تنخواہ کا ملازم ہے ذرا ایک دن تم نے کوئی سخت بات اُس سے کہدی اور وہ ہاتھ جھاڑ کر الگ ہوا پھر مصیبت کا سامنا ہے پکاؤ روٹی اپنے ہاتھ سے اور چولھا جھونکو برتن دھوؤ اور بیوی سے یہ کب ہو سکتا ہے کہ مرد کو اپنے ہاتھ سے پکانے دے پھر تجربہ ہے کہ اگر بیوی کے سامنے بھی نوکروں سے کام لیا جائے اور بغیر بیوی کے بھی انسے کام لیا جائے تو دونوں صورتوں میں آسمان زمین کا فرق ہوگا گھر کی مالک کے سامنے مامائیں اور نوکر زیادہ چوری نہیں

کر سکتی اور اس کے بغیر تو گھر کا پٹرا ہو جاتا ہے البتہ اگر کوئی مرد گھر کا کام خود بھی جانتا ہو تو اس سے تو ایسے نوکر ڈرا دبتے ہیں گو عورت جیسا انتظام تو پھر بھی نہیں ہوتا مگر پھر بھی زیادہ سرکشی نہیں کر سکتے۔ اس پر مجھے اپنے والد صاحب کا قصہ یاد آگیا کہ جب میرٹھ میں والد صاحب ملازم تھے تو ایک بار سفر میں باورچی کو کھانا پکانے کے لئے ساتھ لے گئے ایک دفعہ والد صاحب اُس پر کچھ خفا ہوئے اور کھانا پکانے والے کو جا بدیدیا وہ بھی بیچ میں کھانا چھوڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا کہ لیجئے میں جاتا ہوں اپنے نزدیک تو اسنے یہ سوچا تھا کہ اب منشی جی میری خوشامد کریں گے اور کم از کم اس وقت کے لئے کھانا پکا دینے کو تو ضرور کہیں گے مگر والد صاحب نے اُسی وقت اُس کا حساب کر دیا اور کہا جاؤ رخصت وہ باورچی تھوڑی دیر کھڑا رہا کہ دیکھوں یہ کھانا پکانے کا اسوقت کیا انتظام کرتے ہیں والد صاحب نے اسی وقت آستین چڑھائی اور ہاتھ دھو چولھے پر جا بیٹھے اور روٹیاں پکانی شروع کیں تو بہت عمدہ پکائیں نہ معلوم کہاں سیکھ لیا تھا۔ بس یہ دیکھ کر تو باورچی قدموں میں گر پڑا کہ میری خطا معاف ہو والد صاحب نے فرمایا کہ نالائق تو نے یہ سمجھا ہوگا کہ اب میں تیری خوشامد کروں گا خدا کا شکر ہے مجھے سارے کام آتے ہیں میں صرف آسانی کے لئے دوسروں سے کام لیتا ہوں نہ اس لئے کہ مجھے کچھ آتا نہیں۔ والد صاحب کو بقدر ضرورت سینا پرونا بھی آتا تھا اور اپنے سب کام خود کر لیا کرتے تھے کسی بات سے عار نہ تھا ایک بار والد صاحب تھانہ بھون میں تشریف لائے تو برسات کی وجہ سے گھر کے چھتوں پر گھاس بہت کھڑا تھا والد صاحب نے کھرپا اپنے ہاتھ میں لیا اور کوٹھے پر تشریف لے گئے اور مجھ سے بھی کہا کہ آؤ میاں اشرف علی ہم خود گھاس اکھاڑیں گے غرض تھوڑی دیر میں سب چھتیں صاف کر دیں تو کوئی شخص ایسا صاحب ہمت ہو جو سب کام کر سکتا ہو وہ تو شاید بیوی بغیر پریشان نہ ہو مگر ایسے بہت کم ہیں زیادہ وہی ہیں جو نوکروں کے جواب دینے پر پریشان ہو جاتے ہیں اس لئے بیوی کی قدر کرنا چاہئے کہ وہ دنیا اور دین دونوں کی معین ہے اور اُس کے حقوق کی رعایت بہت زیادہ ضروری ہے کیونکہ اُسمیں چند در چند خصوصیات ہیں جن میں سے ہر ایک کے بہت سے

حقوق ہیں چونکہ آج کل لوگ عورتوں پر بہت ظلم کرتے ہیں اس لئے میں نے اس پر تنبیہ کرنا ضروری سمجھا اب میں آیت کا ترجمہ کرتا ہوں حق تعالیٰ فرماتے ہیں "انما السبیل علی الذین یظلمون الناس ویبغون فی الارض بغیر الحق"۔

بس الزام تو اُن ہی لوگوں پر ہے جو آدمیوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں۔ عبارۃ النص اور مسوق لہ الکلام تو اس آیت میں انتقام کے وقت ظلم کی وعید کا بیان کرنا ہے مگر اشارۃً ابتداء ظلم کو بھی شامل ہے خواہ انتقام میں ہو یا نہ ہو کیونکہ الفاظ آیت میں عموم ہے اور اسی لئے میں نے اپنی تفسیر میں تعمیم پر تنبیہ کر دی ہے بلکہ اشارہ کے ساتھ دلالۃً بھی تحریم ظلم پر دال ہے اور یہ بات بہت ہی ظاہر ہے کیونکہ انتقاماً ظلم کا حرام ہونا ابتداء ظلم کی حرمت کو بدرجۂ اولیٰ مستلزم ہے کیونکہ انتقام کے وقت انسان کو جوش غضب ہوتا ہے اس لئے کہ پہلے دوسرے کی طرف سے ظلم ہو چکا ہے اور جوش میں حد سے بڑھ جانا مستبعد نہیں بلکہ حد پر قائم رہنا بڑی ہمت کا کام ہے تو جب مقام عذر میں بھی ظلم کی اجازت نہیں تو جہاں کوئی سبب اور عذر بھی نہ ہو وہاں تو ظلم کی اجازت کیونکر ہو سکتی ہے لہٰذا دلالۃ النص سے بھی یہ آیت ابتداء ظلم کو شامل ہے اسکے بعد فرماتے ہیں "ویبغون فی الارض" اور سرکشی و تکبر کرتے ہیں زمین میں یہ اس لئے بڑھایا کہ بتلا دیا کہ ظلم کا منشا اور سبب تکبر ہے چنانچہ میں نے کہا تھا کہ حقوق العباد کے عدم اہتمام کا ایک سبب ہے وہ یہ کہ لوگوں نے تاکہ حق کا سبب صرف عظمت میں منحصر کر لیا ہے جسکی عظمت دل میں ہے اُس کے حقوق تو ادا کرتے ہیں اور جس کی عظمت قلب میں نہیں اُسکے حقوق کو ادا نہیں کرتے اور کسی کی عظمت نہ ہونے کا مطلب یہی ہے کہ اُس کو اپنے سے حقیر سمجھا جاتا ہے اور یہی حاصل ہے تکبر کا اسی کو حق تعالیٰ نے یبغون میں بیان فرمایا ہے اور چونکہ تکبر کا مذموم ہونا عقلاً و نقلاً سب کو مسلم ہے لہٰذا اسکا علاج بھی ضروری ہوا آگے حق تعالیٰ نے فی الارض میں اسکا علاج بتلایا ہے حق تعالیٰ کی بھی عجیب تعلیم ہے کہ بیماری کے ساتھ ساتھ دوا بھی بتلاتے جاتے ہیں۔ تمام قرآن کو غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جہاں کسی مرض کو بیان فرمایا ہے وہاں ساتھ ساتھ علاج بھی بتلا دیا ہے بس وہ

شان ہے کہ ؎

دروم از یار است و درماں نیز ہم دل فدائے او شد و جاں نیز ہم

حق تعالیٰ نے کائنات میں بھی یہی طرز رکھا ہے کہ جو چیز کسی بات کو مضر ہے اس کے پاس ہی مصلح بھی موجود ہے، ایک سیاح کہتے تھے کہ ایک گھاس سخت زہریلی ہے جسکا نام بچھو ہے اگر کسی کو لگ جائے تو بچھو کے کاٹے کی سی لہر دوڑ جاتی ہے۔ مگر اسکے پاس ایک دوسری گھاس بھی پیدا ہوتی ہے وہ اسکا تریاق ہے کہ جہاں اسکو ملا فوراً تکلیف زائل ہوگئی اسی طرح یہاں فی الارض میں علاج کبر پر تنبیہ کی گئی ہے کہ حیرت کی بات ہے کہ زمین پر پھر کر اور مٹی سے پیدا ہو کر تکبر کرتے ہو ذرا سوچو تو کہ تمہاری اصل کیا ہے یہی زمین تمہاری اصل ہے جسپر آدمی اور جانور چلتے پھرتے بگتے موتتے ہیں یہ تمہاری ماں ہے پس تم کو تو خاک بنکر رہنا چاہئے ایک دوسرے مقام پر بھی حق تعالیٰ نے اس بات پر تنبیہ کی ہے "منہا خلقناکم و فیہا نعیدکم و منہا نخرجکم تارۃ اخرے" اس میں بھی مراقبہ ارض کی تعلیم ہے کہ ہم نے تم کو زمین ہی سے پیدا کیا اور اسی میں لوٹا دیں گے کہ مر کر سب خاک ہو جاؤ گے سارا بدن گل سڑ جائیگا پھر کس بات پر تکبر کرتے ہو واقعی تکبر کا یہ عجیب علاج ہے پس ہم کو اس سے کام لینا چاہئے اور زمین کی حالت میں تفکر کرنا چاہئے اسی کو سعدی نے لیا ہے ؎

ز خاک آفریدت خداوند پاک پس اے بندہ افتادگی کن چو خاک

افسوس ہماری ماں کی تو یہ حالت ہے کہ وہ سب کے پاؤں کے تلے ہے اور ہماری یہ حالت کہ آسمان پر چڑھے جاتے ہیں، صاحب یہ سارا ناز آٹیوقت تک ہے جبتک خدا کی نعمتیں ہمارے پاس ہیں اگر ایک نعمت بھی چھن جائے تو سارا ناز خاک میں ملجائے آخر مجنوں میں کس بات کی کمی ہو جاتی ہے جو اسکو جانور سے بدتر سمجھنے لگتے ہو بس دماغ میں کمی ہو جاتی ہے مگر دیکھ لیجئے پھر کیا حشر ہوتا ہے۔ ہمارے ایک دوست کو فالج ہو گیا تھا حالانکہ وہ بہت بڑے عالم تھے مگر دماغ پر فالج پڑنے سے سارا علم نقر یود ہو گیا ایکدم تک بھول گئے تھے افاقہ کے بعد بچوں کی طرح انکو الحمد یاد کرائی گئی تو ان کے بھائی کو بڑی خوشی ہوئی اور مٹھائی بانٹی گئی جیسے بچوں کی

بسم اللہ میں مٹھائی بانٹی جاتی ہے پھر انسان کاہے پر تکبر کرتا ہے یہ سب چیزیں خاک میں ملنے والی ہیں فی الارض میں اسی پر متنبہ کیا گیا ہے کہ ہیں زمین میں رہکر تکبر کرتے ہو تمکو شرم نہیں آتی اس کے بعد بغیر الحق دونوں کے لئے واقعی قید ہے۔ ظلم کے لئے بھی اور بغی کے لئے بھی کیونکہ ظلم اور تکبر دونوں بغیر الحق اور ناحق ہی ہوتے ہیں۔ اس میں تصریحاً یہ بات بتلادی کہ تم کو تکبر اور ظلم کا کچھ حق نہیں ہے پھر ناحق کیوں ظلم کرتے ہو اور گو اس کے بیان کی ضرورت نہ تھی مگر اس کی تصریح اس لئے کردی کہ بعض لوگ اپنی جہالت کی وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ ہم کو تکبر کا حق ہے کیونکہ خدا نے ہم کو بڑا بنایا ہے اسلئے تصریحاً بتلادیا کہ خدا نے تو تم کو زمین سے پیدا کیا اور زمین میں رہنے کا حکم دیا ہے تم کو آسمان پر چڑھنے کا کیا حق ہے آگے اُس سبیل کی تعیین فرماتے ہیں کہ ظلم کرنے والوں پر جو الزام ہے اُس کی صورت کیا ہوگی فرماتے ہیں "اولئک لہم عذابٌ الیمٌ" ان لوگوں کے لئے دردناک عذاب ہے۔ صاحبو! یہ ظلم کا معاملہ ایسا سخت ہے کہ جب تک بندہ اپنا حق نہ معاف کردے اُس وقت تک خدا بھی نہ معاف کرے گا۔ خدا تعالیٰ اپنے حقوق تو معاف کردیتے ہیں مگر بندہ کے حقوق جب تک وہ معاف نہ کرے معاف نہیں کرتے یہ بہت سخت بات ہے سلطان محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ بڑے عادل اور غازی بادشاہ تھے ایک دفعہ انھوں نے خواب میں ایک بڑا عالیشان خوبصورت جنت کا محل دیکھا فرشتوں سے پوچھا کہ یہ محل کس کے واسطے ہے کہا محمود غزنوی کے لئے ہے۔ انھوں نے کہا پھر مجھے اندر جانے دو میں اپنے محل کو دیکھوں فرشتوں نے کہا ابھی آپ کو اندر جانے کی اجازت نہیں آپ کے ذمہ ایک مقدمہ ہے اسکا فیصلہ ہوجائے تو پھر اجازت ہوگی پوچھا کیا مواخذہ ہے تو انھوں نے ایک چابک دکھلایا جو دیوار میں لٹکا ہوا تھا کہ تم نے اس کوڑے سے ناحق ایک ملازم کو مارا ہے جب تک اسکا حق ادا نہ ہوجائے آپ جنت میں نہیں جاسکتے بس یہ سُن کر محمود رحمۃ اللہ علیہ کانپ ہی تو گئے اور گھبراہٹ سے آنکھ کھُل گئی صبح تک بیتابی کے ساتھ کروٹیں بدلتے رہے جب صبح ہوئی تو اُس ملازم کو بلایا اور چابک اُس کے سامنے ڈالدیا کہ تیرا جتنا جی چاہے مجھے اس سے

مارلے اور آگے ہاتھ جوڑے کہ للہ تو اپنا بدلہ لیلے ورنہ میں جنت سے محروم ہو جاؤں گا اُس نے کہا حضور مجھپر ایک تو وہ ظلم ہوا تھا اُس سے بڑھکر آپ دوسرا ظلم یہ کرتے ہیں کہ مجھ سے انتقام کو فرماتے ہیں وہ قدموں میں گر پڑا اور کہا کہ میں نے جہان پناہ کو معاف کیا آپ بالکل بے فکر رہیں مگر محمود کی اس سے تسلی نہ ہوئی اُس کو بہت سا انعام واکرام دیا جس سے وہ خوش ہوا تب چین پڑا تو صاحب یہ ظلم ہلکی چیز نہیں ساری عبادتیں اُسوقت تک ناکافی ہیں جب تک ظلم سے برأت نہ ہوگی درمختار میں ہے کہ ایک دانگ کے بدلے میں جو درہم کا چھٹا حصہ ہے جسکو تین پیسے سمجھ لیجئے سات سو مقبول نمازیں حقدار کو دلائی جائیں گی مجھے اس روایت کی صحت وضعف کی تحقیق نہیں ممکن ہے فقہاء کو تحقیق ہوئی ہو۔ پھر دوسرے نصوص بھی تو اس بارہ میں موجود ہیں غرض ہر حال میں کتنی سخت مصیبت ہوگی اول تو ہماری نمازیں مقبول ہی کتنی ہیں پھر تین تین پیسہ کے بدلے میں وہ بھی جاتی رہیں تو بتلایئے قیامت میں کیسی حسرت ہوگی حدیث مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا "من المفلس فیکم" تم مفلس کسکو سمجھتے ہو۔ صحابہ نے عرض کیا کہ ہمارے نزدیک مفلس وہ ہے جس کے پاس درہم ودینار نہ ہو حضور نے فرمایا کہ اس سے بڑھکر مفلس وہ ہے جس نے نمازیں بھی بہت پڑھی تھیں روزے بھی بہت رکھے تھے حج بھی کیا تھا زکوٰۃ بھی دی اور صدقات بھی کئے تھے "ولکن قذف ہذا وضرب ہذا واخذ مال ہذا فجاء رجل فذہب بصلوتہ وجاء آخر فذہب بصیامہ الحدیث" مگر اس کے ساتھ اس نے کسی کو گالی دی تھی کسی کو مارا پیٹا تھا کسی کا مال لے لیا تھا۔ اب قیامت میں ایک آیا وہ اس کی نمازیں لیگیا دوسرا آیا وہ روزے لیگیا تیسرا آیا وہ حج لے گیا چوتھا آیا وہ زکوٰۃ وصدقات لے گیا پھر بھی کچھ حقدار بچ گئے اور ان کے دینے کو نیکیاں نہ بچیں تو ان کے گناہ اُس کے اوپر ڈالدئے گئے اور یہ طاعات سے خالی ہو کر گناہوں میں لاکر جہنم میں داخل ہوا یہ ہے سب سے بڑا مفلس۔ پہلی روایت میں اگر کچھ کلام ہو تو یہ حدیث تو بالکل صحیح ہے تو کیا یہ بات تھوڑی ہے کہ ذرا ذرا سے حقوق العباد کے بدلہ میں ساری کی کرائی محنت دوسروں کو

ملجائے گی اب تو آپ کو معلوم ہوا کہ حقوق العباد من وجہ نماز روزہ سے بھی مقدم ہیں ان کا بہت اہتمام کرنا چاہیئے مگر افسوس آجکل لوگوں کو ان کا بالکل ہی اہتمام نہیں اب یہاں ایک سوال ہے وہ یہ کہ ایک شخص نے کسی پر ظلم کیا ہو اور کسی سے رشوت لی ہو کسی کی غیبت کی ہو اور اب وہ مرچکے ہیں یا لاپتہ ہیں تو ان کے حقوق کیونکر ادا کئے جائیں۔ اسکا جواب یہ ہے کہ شریعت میں کوئی صورت لاعلاج نہیں ہے کرنے والا ہونا چاہیئے اسکی تدبیر یہ ہے کہ اول تو پوری کوشش کرے ان لوگوں کے پتہ لگانے میں۔ اگر ان کا پتہ لگجائے تب تو اُن کو حق پہونچائے۔ اگر معلوم ہوا کہ وہ مرگئے ہیں تو مالی حقوق ان کے ورثہ کو پہونچاؤ اگر ورثا کا بھی پتہ نہ لگے تو جتنی رقم تم نے ظلم و رشوت سے لی ہے اتنی رقم خیرات کرو اور نیت کر لو کہ یہ ہم ان کی طرف سے دے رہے ہیں یہ تو حقوق مالیہ کا حکم ہے اور غیبت شکایت اور جانی ظلم کی تلافی کا طریقہ یہ ہے کہ اگر مظلوم مرگیا ہو یا لاپتہ ہوگیا ہو تو اسکے حق میں دعا کرو نماز اور قرآن پڑھکر اُس کو ثواب بخشو اور عمر بھر اُسکے لئے دعاء کرتے رہو انشاء اللہ حق تعالیٰ ان کو تم سے راضی کر دینگے جسکی صورت قاضی ثناء اللہ صاحب نے یہ لکھی ہے کہ قیامت میں مسلمانوں کو بڑے بڑے خوبصورت عالیشان محل دکھلائے جائیں گے اور حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ ان محلات کا خریدار کوئی ہے اور ارشاد ہوگا کہ ان کی قیمت یہ ہے کہ جس کا جو حق کسی کے ذمہ ہو اُسکے معاف کر دے اُس وقت کثرت سے اہل حقوق اپنے حق معاف کر دیں گے۔ پھر سرکار کی طرف سے مثل داخل دفتر ہو جائیگی۔ قاضی صاحب اپنے زمانہ کے محدث اور محقق تھے انھوں نے تحقیق کرکے یہ روایت کہیں سے لکھی ہوگی ہم کو اُن پر اعتماد ہے غرض معذرت کرنے والوں کی وہاں بڑی قدر ہے۔ اُن کے حقوق اللہ تعالیٰ خود ادا کر دیں گے وہاں تو اینٹھ مروڑ پر گرفت ہوتی ہے کہ باوجود ظلم و تعدی کے پھر بھی فکر نہ ہوا اور ادائے حقوق کا اہتمام نہ ہوا اب ایک سوال اور رہ گیا وہ یہ کہ کسی نے مثلاً دس روپئے سود یا رشوت میں لئے ہیں اور یہ بھی معلوم ہے کہ کس کس سے لئے ہیں اب وہ چاہتا ہے کہ اس کا حق ادا کرے تو کیونکر کرے اس لئے کہ اس وقت اُس کے پاس دس ہزار روپئے نہیں ہیں ساری عمر میں جمع

حرام مال کھایا تھا آج ایک دن میں سب کیسے ادا کردے اس کا جواب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے یہاں کام کا شروع کردینا اور ادا کا عزم کرلینا بھی مقبول ہے تم اول تو صاحب حق سے معافی کی درخواست کرو۔ اگر وہ خوشی سے معاف کردے تب تو جلدی ہلکے ہوگئے اور اگر معاف نکرے یا خوشی سے معاف نکرے تو اب تھوڑا تھوڑا جتنا ہوسکے اس کا حق ادا کرتے رہو مگر یہ ضروری ہے کہ اپنے فضول اخراجات کو موقوف کردو بس ضروری خرچوں میں اپنی آمدنی خرچ کرو اور اس سے جتنا بھی بچے وہ حقداروں کو ادا کرو اور اگر وہ مرگئے ہوں تو ان کے ورثا کو دو اور اگر ورثا بھی نہ معلوم ہوں تو ان کی نیت سے خیرات کرتے رہو انشاء اللہ اول تو امید ہے کہ دنیا ہی میں سارا حق ادا ہوجائیگا اور اگر کچھ ادا ہوا اور کچھ رہ گیا تو اس کو حق تعالیٰ ادا کردیں گے حق تعالیٰ کے یہاں نیت کو زیادہ دیکھا جاتا ہے جس کی نیت پختہ ہو کہ میں حق ادا کروں گا پھر اس پر عمل بھی شروع کردے حق تعالیٰ اس کو بالکل بری کردیتے ہیں اور صاف نیت وہ چیز ہے کہ جنت میں جو آپ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہیں گے معلوم بھی ہے یہ کس چیز کی برکت ہے یہ نیت ہی کی تو برکت ہے کیونکہ عمل تو انسان زندگی بھر کرتا ہے اس کا صلہ بہت سے بہت یہ تھا کہ ہزار دو ہزار سال تک بہشت میں رہنا ہوجاتا عمل محدود کی جزا عقلاً محدود ہوتی ہے مگر یہ غیر محدود جزا آپ کی نیت ہی کی وجہ سے ہے کہ مسلمان گو عمل کرتا ہے محدود زمانہ میں مگر اس کی نیت یہ ہوتی ہے کہ اگر میں ابدالآباد تک بھی زندہ رہوں تو ہمیشہ اسلام و اعمال صالحہ پر جما رہوں گا اس لئے اُن کی جزا بھی دائمی ہے اور یہی راز ہے کفار کے عذاب دائمی کا کیونکہ وہ بھی گو زمانہ محدود تک کفر کرتے ہیں مگر نیت ان کی یہی ہوتی ہے کہ ابدالآباد تک بھی زندہ رہیں گے تو اسی طریقہ پر جمے رہیں گے پس نیت کو آپ حقیر نہ سمجھیں۔ تو اب ابدی کے مستحق آپ اسی کی وجہ سے ہیں۔ لہٰذا اُسی وقت سے ادا حقوق کا اہتمام شروع کردو اور نیت پختہ کرلو کہ ادا کرکے رہیں گے۔ اور تھوڑا تھوڑا ادا کرتے رہو۔ انشاء اللہ تعالیٰ پھر آپ اس بوجھ سے ہلکے ہوجائینگے اور نہ یاد رکھئے کہ حقدار قیامت میں آپ کی بوٹیاں کھالیں گے اور ساری نیکیاں چھین

لینگے نیز حدیث میں آتا ہے "الظلم ظلمات یوم القیمۃ" کہ ظلم کے لئے قیامت میں بہت ظلمتیں ہیں خدا اس سے محفوظ رکھے اب میں ختم کرتا ہوں بحمداللہ اس وقت حقوق العباد کی تفصیل اور توضیح کافی ہو چکی ہے اور اشکالات کا حل بھی ہو گیا ہے اب کسی کے پاس کوئی عذر نہیں رہا۔ ع "جو اس پر بھی نہ وہ سمجھے تو اُس بُت کو خدا سمجھے" حدیث میں ہے کہ حقوق کو دنیا ہی میں ادا کر دو یا معاف کرا لو پہلے اُس دن کے جسمیں روپیہ پیسہ کچھ نہ ہوگا اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو توفیق دیں اور فہم سلیم عطا فرمائیں۔ وصلی اللہ علی سیدنا ومولانا محمد وعلی آلہ واصحابہ وسلم۔ تم بحمداللہ وبنعمتہ وجلالہ تم الصالحات وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

الاحیاء

کا

پانچواں وعظ مسمّٰی بہ

الدنیا والاخرہ

منجملہ ارشادات حکیم الامت مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب

تھانوی دام فیضہ

(عبدالواسع جعفری کے اہتمام سے)

مطبع انوار احمدی واقع الہ آباد سے شائع ہوا

قیمت سالانہ ۔ے ر

علحدہ قیمت اس وعظ کی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الوعظ المسمّٰی بہ

الدنیا والاخرہ

کم	این	متی	ماذا	کیف	المستمعون	من ضبط
کتنی دیر ہوا	کہاں ہوا	کب ہوا	کیا مضمون تھا	کس ہیئت پر ہوا	سامعین کی تعداد تخمینی	کس نے ضبط کیا
گھنٹہ منٹ ۵ ۲ ۳	مسجد شاہ گنج متصل باغ پورہ دہلی	۱۸ شعبان ۱۳۲۲ھ	اثبات معاد	منبر پر بیٹھ کر	تقریباً ۱۰۰۰ اور مستورات کا مجمع بھی تھا	احقر اور لیں غفرلہ میرٹھی متخلص بالعلم و دیوبند

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یہدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشہد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشہد ان محمدا عبدہ ورسولہ

امابعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ وما ھذہ الحیوۃ الدنیا الا لھو ولعب وان الدار الاخرۃ لھی الحیوان لو کانوا یعلمون۔ اس آیت سے قبل مسئلہ معاد مذکور ہے اور اس سے قبل مسئلہ نبوت اور اس سے قبل مسئلہ توحید ہے غرض یہ تینوں مضمون قریب قریب بترتیب مذکور ہیں اور یہ ہر سہ مسائل جمیع مسائل قرآنیہ میں امہات المسائل شمار کئے جاتے ہیں باقی جمیع مسائل ان کے لئے متمم ہیں یا توطیہ وتمہید ہیں اور یہ اصل اصول مگر باوجود اس کے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ دیگر مسائل قرآنیہ غیر مہتم بالشان اور غیر ضروری ہیں بلکہ قرآن حکیم کا ہر ہر مسئلہ ضروری اور مہتم بالشان ہے۔ لیکن چونکہ یہ ہر سہ مسائل مرجع وماٰل

جمیع مسائل ہیں لہذا جزوی فضیلت و اہتمام شان بنسبت جمیع مسائل کے ان کے واسطے زیادہ ثابت کی گئی۔ پرسوں دہلی مدرسہ عبدالرب کے وعظ میں مسئلہ توحید پر بیان ہوا تھا بفضلہ اس پر بقدر ضرورت وضاحت کے ساتھ بیان ہو چکا ہے اور کل پانی پت میں مسئلہ نبوت کا بھی کافی بیان ہو چکا ہے لہذا آج اس وعظ میں مسئلہ معاد کو بیان کرنا زیادہ اولی و انسب معلوم ہوتا ہے تاکہ جس طرح خداوند تعالی نے ہر سہ مسائل کو ایک سلسلہ میں مترتبا بیان کیا ہے۔ اسی طرح اس سفر میں ان تینوں مسئلوں پر بترتیب قرآنی بیان ہو جائے۔ اور یہ آیت درحقیقت تمام مضمون معاد مذکور الصدر کا خلاصہ ہے تو اول تو یہ تینوں مضامین جمیع مسائل قرآنیہ میں اہم ہیں۔ لہذا اہمیت مسئلہ معاد کے لئے ویسے ہی ثابت تھی علاوہ ازیں یہ آیت خلاصہ ہے مسئلہ معاد کا اور خلاصہ کسی مضمون کا چونکہ اصل اور نچوڑ ہوتا ہے لہذا بہت ضروری شمار کیا جاتا ہے اسی وجہ سے خلاصہ کو روح سے تعبیر کیا جاتا ہے تو اول تو خود مضمون معاد مثل اپنے دو قریبی کے روح جمیع مسائل اور ضروری اور پھر اس کا خلاصہ وہ تو اور بھی زیادہ ضروری اور روح الروح ہوگا۔ لہذا اہمیت اس آیت کی کافی طور سے واضح ہو گئی سامعین کو چاہئے کہ وہ اس اہمیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے نہایت غور و یکسوئی کے ساتھ اس مضمون کو سنیں اور اس پر کاربند ہوں۔ یہ مضمون اگرچہ بالکل بدیہی اور واضح ہے کسی قسم کی دقت و نظریت اسمیں نہیں لہذا محتاج بیان بھی نہ تھا۔ لیکن چونکہ آج کل اس مضمون سے لوگ بالکل غافل ہو گئے ہیں اور اس کو بھلا بیٹھے ہیں اس وجہ سے متنبہ کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے جیسا کہ عام طور سے قاعدہ ہے کہ بدیہی امر محتاج دلیل تو کبھی بھی نہیں ہوتا ہاں تغافل کے وقت تنبیہ کی ضرورت پیش آجایا کرتی ہے جیسے کوئی شخص بینا ہو مگر روز روشن میں کام اندھوں کے سے کرے تو اس سے کہتے ہیں کہ میاں دن نکل رہا ہے یا سورج نکل رہا ہے حالانکہ وہ مخاطب بھی اور تمام اہل دنیا یہ جانتے ہیں کہ سورج نکل رہا ہے اور روز روشن ہے تو چاہئے تھا کہ اسکا یہ کہنا عبث و لغو ہوتا حالانکہ کوئی اس کو لغو نہیں کہتا اسوجہ سے کہ اس تخاطب سے مقصود طلوع کی خبر دینا نہیں اس وجہ سے کہ

ع آفتاب آمد دلیل آفتاب ۔ بلکہ مقصود یہ ہے کہ تمکو جو کام طلوع آفتاب کی حالت میں کرنا چاہیے تھا تم وہ نہیں کرتے جس سے شبہہ ہوتا ہے کہ تمہارے نزدیک بوجہ عدم استفادہ کے طلوع شمس نہیں ہوا لہذا میں تم کو تنبیہ کرتا ہوں کہ ہوش میں آکر کام کرو یا جیسے کوئی شخص کسی ایسے شخص سے کہے جو کہ اپنے باپ کے ساتھ گستاخی و بے ادبی سے پیش آتا ہے کہ میاں یہ تیرا باپ ہے تو کیا اس سے مقصود ابوۃ کی خبر دینا ہے ہرگز نہیں اس وجہ سے کہ ابوۃ کا علم مخاطب کو قائل سے زائد ہے قائل کو تو ابوۃ کا علم ابھی دو چار برس سے ہوا ہوگا اور مخاطب نے تو جب سے ہوش سنبھالا ہے ابا ابا کہکر پیارا ہوگا ہے تو اگر یہ مقصود ہوتا اہل دنیا اس کو بے وقوف کے نام سے یاد کرتے حالانکہ کوئی بھی اس کو بیوقوف نہیں کہتا معلوم ہوا کہ مقصود یہ ہے ہی نہیں بلکہ اسکی غرض محض تنبیہ ہے اس امر پر کہ یہ تیرا باپ ہے تجکو چاہیے کہ حقوق ابوۃ کا لحاظ رکھے اور عظمت پدری کو مدنظر رکھے یہ تیرا موجودہ رویہ شان ابوۃ کے خلاف ہے بلکہ اس طرز عمل سے ایہام ہوتا ہے کہ شاید تیرے نزدیک یہ تیرا باپ ہی نہیں ہے ۔ کیونکہ یہ طرز عمل تو اغیار کے ساتھ برتا جاتا ہے اس اعتبار سے اسکا یہ قول نہایت ضروری بلکہ اس قسم کی تنبیہ کو قابل تحسین سمجھا جاتا ہے تو دیکھئے اگرچہ ابوۃ اس کی بالکل بدیہی بلکہ حسی اور ظاہر و باہر تھی محتاج بیان ہرگز نہ تھی لیکن پھر اس بیان کو تنبیہ پر محمول کرکے قابل تحسین سمجھا جاتا ہے اسی طرح یہ مضمون بھی گو اجلی بدیہیات سے ہے اسکی بداہت میں کوئی شک و شبہہ نہیں مگر محض تغافل کی وجہ سے ضرورت بیان کی پیش آئی اب میں مضمون بیان کرتا ہوں اور یہ مضمون مرکب ہے دو جزؤں سے اول تو فناء دنیا دوسرا اثبات آخرت تو اگرچہ جزو اول تو بوجہ مشاہد ہونے کے اتنا صاف اور واضح ہے کہ اصلا محتاج بیان نہیں لیکن دوسرا حصہ مضمون کا کہ بہ نسبت اس کے غامض و دقیق ہے وہ محتاج بیان ہے اور بہ نسبت اس کے اس لئے کہا ہے کہ وہ بھی زیادہ دقیق نہیں چنانچہ اگر بنظر غور و تامل دیکھا جاوے تو چونکہ مضمون ثانی مثل لازم مضمون اول کے ہے لہذا جب ملزوم بدیہی ہوا اور وہ کافی طور سے واضح ہوگیا تو لازم خود بخود سمجھ میں آجاویگا اور اس کا

ماننا ضروری ہوگا درحقیقت مضمون اول ہی اضطراراً و فطرۃً علم کرا دیتا ہے مضمون ثانی کا اس وجہ سے کہ وہ محسوس ہے اور لازم محسوس محسوس ہوتا ہے اور محسوس محتاج بیان و وضاحت نہیں باقی رہا یہ کہ جزو اول مسلم و محسوس کیوں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام عقلاء کا اتفاق ہو چکا ہے فناء دنیا پر لہذا یہ مسئلہ متفقہ و مسلمہ ہو گیا باقی رہا استلزام اس کی وجہ یہ ہے کہ جب انسان کا اعتقاد فناء دنیا کے متعلق راسخ ہو جائیگا اور اس امر کا یقین کامل ہو جائیگا کہ اس سرائے فانی سے ایک دن کوچ کرنا ہے عنقریب طبل بازگشت بجنے والا ہے تو اس یقین کا لازمی اثر یہ ہے کہ اسکو دنیا و لواحقات دنیا سے نفرت پیدا ہو جائیگی ہر ہر شے پر نظر واپسیں ہوگی متاع دنیویہ سے رغبت منقطع ہوگی اس وجہ سے کہ انسانی فطرۃ کا خاصہ ہے کہ اس کو اشیاء فانیہ سے تنفر و انقباض پیدا ہو جاتا ہے طبیعت برداشتہ خاطر ہو جاتی ہے یکسوئی و یکجہتی کی طالب ہوتی ہے روز و شب ہم اسکا مشاہدہ کرتے ہیں چنانچہ ایک مسافر شام کے وقت سرائے کے کمرے میں جا کر قیام کرتا ہے تو قبل اس کے کہ وہ اپنا اسباب اسمیں رکھے قیام کا انتظام کرے اسکو یقین کامل ہوتا ہے کہ میں اس کوٹھری میں صرف رات رات کا مہمان ہوں صبح ہوتے ہی مجکو یقیناً کوچ کرنا اور اس کمرے کو چھوڑنا ہے اس سے میری ملاقات صرف چند گھنٹوں کی ہے پھر میں کہاں اور یہ کہاں پھر اگر یہ کوٹھری کہیں سے ٹوٹی ہوتی ہے تو اس کی اصلاح کا مطلق خیال نہیں ہوتا اگر کوئی کڑی نکلی ہوئی ہوتی ہے تو اسکو یہ خیال بھی ہرگز نہیں ہوتا کہ اس میں دوسری کڑی ڈلوانی چاہیئے یا کہیں سامان زینت میں کمی ہو تو اسکو پورا کرنے کا بھی اہتمام بالکل نہیں ہوتا حالانکہ اسکو یہاں ایک رات تو ضرور بسر کرنی ہے اور یہیں آرام کرنا ہے اور فطرت انسانی کا مقتضا ہے کہ وہ اپنے آرام کے ذرائع کو مہیا کرنا چاہتی ہے لہذا موافق اس اقتضاء کے اسکو اصلاح کرانی چاہیئے تھی لیکن نہیں کراتا محض اس یقین کامل کی وجہ سے جو اس کے قلب میں راسخ ہے کہ صبح کو یہاں سے کوچ کرنا ہے میرا قیام صرف چند ساعت کا ہے یہ کوٹھری عنقریب پھٹنے والی ہے اسی طرح جب انسان کا یہ عقیدہ ثابت و راسخ ہو جائیگا کہ یہ دنیا فنا ہونے والی ہے اس سے مفارقت و مہاجرت

لازمی ہے تو ضرور اسکو دنیا سے تنفر و انقباض پیدا ہوگا جیسا کہ سرائے کی کوٹھری سے ہوتا ہے لیکن یہ معاملہ اپنے مکان کی کوٹھری کے ساتھ نہیں اگرچہ سرائے کی کوٹھری اور مکان کا کمرہ اس حیثیت سے دونوں برابر ہیں کہ ان دونوں سے ہم کو جدا ہونے کا یقین ہے لیکن باوجود اس کے پھر جو ہم تھوڑا سا فرق دیکھتے ہیں کہ جو معاملہ آپ کا سرائے کی کوٹھری کے ساتھ ہے وہ مکان کی کوٹھری کے ساتھ نہیں مکان کے کمرے کی اگر کڑی نکل جاتی ہے تو آپ فوراً اس فکر میں مبتلا ہوتے ہیں کہ جلد اسمیں کڑی ڈلوائی جائے اگر قلعی کم ہو جاتی ہے تو فوراً سفیدی کرانے کا انتظام کرتے ہیں اسباب زینت کی کمی کے وقت آپ اس کے اہتمام میں مشغول ہو جاتے ہیں تو یہ فرق کیوں ہے اس وجہ سے نہیں کہ خدانخواستہ آپ کو دنیا اور اس کے مکانات کے فنا ہونے کا یقین نہیں بلکہ یہ فرق اسوجہ سے ہے کہ آپ سرائے کی کوٹھری میں داخل ہونے کے قبل اس بات کا یقین کامل رکھتے ہیں کہ صبح کو اس سے ضرور کوچ کرنا ہے اور جتنے زمانہ آپ وہاں پر مقیم رہتے ہیں برابر یہی خیال اور یہی صورت مفارقت پیش نظر رہتی ہے بخلاف مکان کے کہ اُس کے کمرہ میں نہ داخل ہوتے وقت آپ کو اُس سے نکلنے اور جدا ہونے کا خیال مستحضر رہتا ہے اور نہ قیام کے زمانہ میں قوۃ متخیلہ آپ کے سامنے کبھی صورت مفارقت پیش کرتی ہے بلکہ کبھی بھولے سے بھی یہ خیال نہیں آتا حالانکہ اس کا یقین کامل و اعتقاد راسخ ہے لیکن صرف استحضار نہیں بخلاف سرائے کے کمرے کے کہ وہاں پر یقین و اعتقاد کے ساتھ استحضار بھی ہے یہی وجہ ہے کہ سرائے کا کمرہ تو موحش و ہیبت ناک معلوم ہوتا ہے اُس سے دلچسپی نام کو نہیں ہوتی بخلاف مکان کے کہ وہ مجسم ذریعہ دلچسپی ہوتا ہے اس سے طبیعت بہلتی ہے اس کی چیزیں اچھی معلوم ہوتی ہیں اس میں آکر وحشت دور ہوتی ہے اُس کی تزئین کی اُمنگیں طبیعت میں لہریں مارتی ہیں حالانکہ سبب وحشت یعنی اعتقاد مفارقت و یقین مہاجرت دونوں میں مشترک ہے مابہ الفرق صرف یہ ہے کہ وہاں پر اعتقاد کے ساتھ استحضار بھی ہے اور یہاں پر اعتقاد محض ہے استحضار نہیں نیز ایک مابہ الفرق اور بھی ہے وہ یہ کہ فنا و مفارقت دنیا کا خیال اگر ہوتا بھی ہے تو موجودہ حالت یا حالت قریبہ میں نہیں بلکہ زمانہ مستقبل بعید میں ہے

بچے گمان کرتے ہیں کہ میاں ابھی تو بچے ہیں اب جوان ہوں گے زندگی کے مزے اڑائینگے پھر کبھی بوڑھے ہوں گے پھر کبھی موت آئیگی ایسے ہی جوان خیال کرتے ہیں کہ میاں ابھی تو بوڑھا ہونا باقی ہے ابھی کیا ہے ابھی تو ایک منزل ہم میں اور فنا میں حد فاصل ہے ایسے ہی بوڑھے خیال کرتے ہیں کہ ابھی تو بڑھاپا ہی آیا ہے ابتداء پیری ہے اسکی انتہا بھی ہوگی جب کبھی موت آئیگی غرض ہر شخص فنا کو اپنے لئے زمانہ مستقبل بعید میں سمجھتا ہے چنانچہ حج کو جارہا تھا تو ایک میرے بزرگ نے کہا کہ میاں ابھی تو تم بچے ہو ابھی کیا جلدی ہے کر لینا حج جب ہماری عمر پر آؤ گے اور ایسے ہی جلدی ہے تو آئندہ سال ہم بھی چلیں گے جب ہمارے ساتھ حج کرنے چلنا میں نے اُن کو جواب دیا کہ حضرت آپ کی تو اتنی عمر گذر چکی اگر آپ مجکو بھی عمر کا پٹہ لکھدیں کہ تیری عمر بھی ہماری برابر ضرور ہوگی تو میں بیشک اس وقت کا جانا موقوف کروں اور آپ کے ساتھ ہی چلوں تو واقعی بات یہ ہے کہ انکی عمر تو اتنی ہوگئی نہ معلوم ہماری عمر اتنی ہو یا نہ ہو ہمارے پاس کونسا امر موجب یقین ہے کہ ہم ان کی عمر تک ضرور زندہ رہیں گے جو ہم اُن کے کہنے کو قبول کرلیں میرے سامنے ایک واقعہ ہوا کہ ایک جوان شخص کی ملاقات ایک بوڑھے شخص سے ہوئی جو کہ اپنی عمر طبعی کو پہنچ چکے تھے جب رخصت ہونے کا وقت آیا تو بوڑھے بولے کہ دیکھئے نہ معلوم اب آپ سے ملاقات نصیب ہو یا نہ ہو ہم تو عمر طبعی کو پہنچ چکے ہیں چراغ سحری ہیں ہر وقت منتظر موت ہیں۔ تو اُس جوان شخص نے کہا کہ آپ تو چراغ سحری ہیں کچھ تو عمر پائی ہے لیکن ہم چراغ شام ہی ہیں ابھی روشن ہوئے ہیں بلکہ اچھی طرح ابھی روشن بھی نہیں ہونے پائے اگر ابھی ایک ہلکا سا بھی ہوا کا جھونکا لگ گیا تو گل بخلاف آپ کے کہ آپ چراغ سحری ہیں آپ پر رات تو سلامتی کے ساتھ گذر گئی ہے اب صبح ہی کو احتمال گل ہونیکا ہے اور ہمیں تو رات کے بھی صحیح وسالم گذر جانے میں شک ہے لہذا ہماری حالت آپ سے زائد قابل یاس ہے اور یاس ملاقات میں ہم آپ سے اول نمبر ہیں۔ لہذا اس حسرت ملاقات کی آپ سے کوئی خصوصیت نہیں بلکہ ہم اور آپ دونوں اس میں شریک ہیں ماشاء اللہ کتنا لطیف جواب دیا ہے اور واقعی بالکل صحیح بلا مبالغہ کہا کہ ہم تو چراغ شام ہیں ایک

خفیف جھوکا ہوا کا ہمارے نیست و نابود کرنے کے واسطے کافی ہے۔ یہ بالکل نیا محاورہ ہے اور قابل داد جواب ہے۔ جسکا حاصل یہ ہے کہ بوڑھے اور جوان سب کے سب چراغ ہی کے مثل ہیں مگر کوئی چراغ شام ہے اور کوئی چراغ سحر خطرہ سے کوئی بھی خالی نہیں غرض لوگ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ ابھی تو بچے ہیں پھر جوان ہوں گے پھر بوڑھے ہوں گے پھر بہت بوڑھے ہوں گے تو حضرت یہ تو بتلایئے کہ آپ کے پاس وہ کونسا اللہ میاں کے یہاں کا سارٹیفکٹ ہے کہ جس سے آپ کو اپنے جوان اور بوڑھے ہونیکا یقین ہو گیا یا کوئی وحی آپ کے پاس نازل ہوئی کہ جس نے آپ کو اس تحدی سے دعوی کرنے پر مجبور کیا کیا خبر ہے کہ شاید یہ ساعت وہی ساعت ہو جسکو دنیا کی آخری ساعت سے تعبیر کیا جاتا ہے، شاید ہمیں نفس نفس واپسیں بود، اور شاید ابھی آب و ہوا دنیا کی منقطع ہونے والی ہو حیات دنیوی اجل مقدر پر پہونچ چکی ہو غرض یہ کہ اس قسم کے خیالات کا پیدا ہونا روشن دلیل ہے عدم استحضار فناء دنیا کی گو ہم کو فنا ہونے کا عقیدہ تو ہے لیکن اسوقت اسکا استحضار نہیں اور اگر ہے بھی تو زمانہ مستقبل بعید میں ہے لیکن اعتقاد و یقین سب کو ہے حالانکہ مقصود شریعت کا جیسا کہ آیت بھی بدلالۃ واضحہ بتلا رہی ہے یہی استحضار ہے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی استحضار کی تحصیل کا علاج بتلایا ہے کہ "کن فی الدنیا کانک غریب" یعنی دنیا میں اس طرح رہو جیسا کہ ایک مسافر اور اس حیات دنیوی کو ایسا سمجھو جیسا کہ ایک مسافر کی حالت سفر میں ہوتی ہے۔ جس طرح کہ ایک مسافر اپنے سفر کی حالت میں پڑاؤ پر یا سرائے کی کوٹھری میں ہر وقت رخت برد و ش بسر اوقات کرتا ہے اسی طرح تم بھی دنیا میں رہکر بسر اوقات کرو دنیا کو سفر آخرت کی سرائے اور پڑاؤ سمجھو کہ جیسا اس کا قیام مطلوب نہیں ہوتا ایسے دنیا کا قیام بھی مقصود نہ ہونا چاہئے اور آپ کے اس کلام رحمت انضمام میں تو بوجہ اس کے کہ ہمکو خطاب فرمایا ہے پھر کسی قدر ہمارے مذاق کی رعایت ہے اس وجہ سے کہ اس میں لفظ غریب سے پھر بھی ایک قسم کا قیام فی الدنیا مفہوم ہوتا ہے اگرچہ ایسا ہی ہو جیسا کہ ایک مسافر کا قیام منزل پر لیکن جو ارشاد آپ نے اپنی نسبت فرمایا ہے اسمیں تو اتنے قیام کا بھی پیام نہیں

وہ ارشاد یہ ہے کہ میرا دنیا سے کیا علاقہ میری تو دنیا کے ساتھ ایسی مثال ہے جیسے کوئی سوار چلا جارہا ہو اور چلتے چلتے کسی درخت کے سایہ میں کھڑا ہو جاوے اور درحقیقت یہ بھی تفسیر اوسی ارشاد کی ہے تاکہ اس تفسیر سے ہر قسم کے شبہات زائل ہو جاویں اور خلاف مقصود کا ایہام بھی نہ رہے یعنی یہ نہ سمجھنا کہ ہم شب کو مقیم ہیں صبح ہم کو جانا ہے جیسے کہ مسافر خیال کرتا ہے کہ صبح کو جانا ہے بلکہ یہ سمجھو کہ ہم چل رہے ہیں۔ ہر دم مسافرت میں ہیں ہر وقت مسافت سفر کو قطع کر رہے ہیں۔ اب اگر کسی ظاہر بین کو یہ شبہ ہو کہ ہم تو کہیں بھی کسی کو ہر وقت چلتا ہوا نہیں دیکھتے۔ بلکہ بعض اوقات تو ہم حرکت تک بھی نہیں پاتے چہ جائیکہ قطع مسافت بلکہ حرکت کی ضد سکون موجود ہوتا ہے تو ایسے موقع پر قطع مسافت متحقق ہونا محال عقلی ہے اسوجہ سے کہ اجتماع ضدین محال ہے سکون اور حرکت کا اجتماع ناممکن ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ بیشک قطع مسافت کے واسطے حرکت لازمی ہے لیکن جناب آپ نے یہ کیسے سمجھا کہ حرکت نہیں آپ کو معلوم بھی ہے کہ حرکت کی دو قسمیں ہیں ایک حرکت مکانی اور ایک حرکت زمانی تو یہاں پر حرکت مکانی اور انتقال اینی تو بیشک نہیں ہے کیونکہ ظاہراہم دیکھتے ہیں کہ آخرت میں پہونچنے کے واسطے اللہ پاک نے کوئی زینہ نہیں بنایا جسپر چڑھکر ہم آخرت میں چلے جاویں نہ کوئی سیڑھی ہے جسکو لگا کر آسمان پر پہونچ جاویں نہ کوئی میل دو میل کی مسافت ہے جسکو پیادہ یا سواری میں طے کر کے اللہ میاں کے ہاں پہونچ جائیں جیسے ہم ریل یا یکہ میں بیٹھ کر ایک شہر سے دوسرے شہر میں پہونچ جاتے ہیں۔ لیکن اس حرکت مکانی کے نہ ہونے سے یہ کیسے لازم آیا کہ حرکت زمانی بھی نہیں بلکہ یہاں پر حرکت زمانی متحقق ہے۔ یعنی اگرچہ ہم ساکن محض ہیں لیکن زمانہ حرکت کر رہا ہے وہ حرکت کرتے کرتے ایک ایسی آخری ساعت پر پہونچ جائیگا کہ جسکے بعد ہم آخرت میں ہوں گے نہ کسی سیڑھی کے ذریعہ سے نہ کسی زینہ کے واسطہ سے بلکہ حرکت زمانی کے ذریعہ سے جو کہ ہمارے اختیار سے باہر ہے کیونکہ ہم حرکت زمانہ کے بڑھانے اور گھٹانے پر قادر نہیں چہ جائیکہ روکنے پر اگر آپ یہ چاہیں کہ ہم آٹھ ہی کے گھنٹے میں رہیں اور ۹ کے گھنٹے میں داخل نہ ہوں تو چاہے سر سے پانوں تک زور کیوں نہ لگائیں ناممکن ہے کہ آپ ۹ کے گھنٹے میں داخل نہ ہوں

بلکہ آپ ضرور داخل ہوں گے اور اضطراراً داخل ہوں گے حرکت زمانہ آپ کو مجبور کرتی ہے ورنہ اگر کوئی سیڑھی آخرت میں پہونچنے کی ہوتی تو ممکن تھا کہ ہم نہ چڑھتے مگر وہ تو اللہ میاں نے سیڑھی ہی ایسی عجیب بنائی ہے جو کہ اختیار سے بالکل باہر اور غیر محسوس ہے لہذا حرکت زمانی ضرور متحقق ہے اور انتفاع احد الحرکتین مستلزم انتفاء ثانی کو نہیں تو جو لازم قطع مسافت تھا یعنی حرکت مطلقہ وہ موجود ہے اور جو منتفی ہے یعنی حرکت مکانی وہ لازم نہیں اس وجہ سے کہ حرکت مطلقہ کا تحقق کسی ایک فرد سے ہو سکتا ہے جو یہاں فرد ثانی یعنی حرکت زمانی کے ضمن میں ہے لہذا حضور کا یہ فرمانا کہ ہماری مثال ایسی ہے جیسے ایک مسافر سفر کو قطع کر رہا ہو بالکل صحیح ہو گیا یقیناً ہماری مثال ایک رہرو مسافر کی سی ہے جو اپنے سفر کو قطع کر رہا ہے یہی حرکت زمانی ہے جو بوجہ خارج از اختیار و کسب ہونے کے سبب تغافل بنتی ہے کہ ہمیں اپنی حالت کی طرف التفات نہیں ہوتا ہم نہیں سمجھتے کہ اس ساعت سے قبل ہماری کیا حالت تھی اور اب کیا ہے اور اس ساعت کے گذر جانے سے کس قدر حصہ ہمارے اس دنیوی حیوٰۃ کا ختم ہو گیا اسی وجہ سے محققین نے کہا ہے کہ بچہ جس وقت پیدا ہو کر ایک ماہ کا ہوتا ہے تو اس کی ماں کہتی ہے کہ آج میرا بچہ ایک مہینہ کا ہو گیا لیکن درحقیقت وہ سمجھتی نہیں کہ اسکی عمر سے ایک مہینہ کم ہو گیا۔ جس ساعت سے اس نے دنیا میں قدم رکھا اسی وقت سے اس کی عمر میں ہر ہر ساعت محسوب ہونے لگتی ہے۔ اور اسی قدر حصہ عمر گھٹنے لگتا ہے جیسے برف ہوتی ہے کہ اسکو جسقدر رکھا جائے اسی قدر وہ برابر گھٹتی رہتی ہے حتی کہ آخر ایک ساعت ایسی آئے گی کہ برف گل کر بالکل ختم ہو جائیگی اس موقع پر ایک حکایت یاد آئی کہ ایک شخص کسی گانوں کے رہنے والے ملازمت کی غرض سے وطن سے باہر گئے اور کسی جگہ جا کر ملازمت کی چند ماہ بعد ملازمت سے رخصت لے کر جب گھر کو جانے لگے تو جہاں اور فرمائشیں اور عمدہ عمدہ چیزیں گھر لے جانے کے واسطے انھوں نے خریدیں اُن میں دو چار سیر برف بھی تھی چونکہ سامان بہت تھا لیجانے میں دقت کے واقع ہونے کا احتمال تھا تخفیف سامان کی غرض سے دو چار شخص انھی کے گانوں کے جو اُن سے ایک دن پہلے جانے والے تھے ان کو وہ برف کا پلندہ دیدیا کہ بھئی یہ برف ہمارے گھر پہنچا دینا تمھاری

مہربانی ہوگی ہمارے بوجھ میں کچھ تخفیف ہو جائیگی کل انشاء اللہ ہم بھی آجائیں گے۔ انھوں نے وہ برف لے جاکر ان کے گھر پہونچا دیا وہ بیچارے دیہاتی گانوں کے رہنے والے برف کے خواص کیا جانیں اتنا جانتے تھے کہ ٹھنڈی چیز ہے اور قاعدہ ہے کہ اس قسم کے موقع پر اہل خانہ جس شے کو مرغوب سمجھتے ہیں اس کو آنے والے شخص پر اُتھار رکھا کرتے ہیں کہ جب وہ آئے گا اُسی وقت اس کو کھائیں پئیں گے۔ اس عادت کے موافق ان بیچاروں نے برف کو ویسے ہی معمولی کپڑے میں لپٹا ہوا اٹھا کر رکھدیا کہ کل کو انہی کے سامنے جب وہ آئیں گے استعمال کرینگے اگلے دن جب وہ صاحب گھر پہونچے مکان پر قیام کرنے کے بعد منجملہ دیگر تحائف کے برف کا بھی ذکر چھیڑا انھوں نے کہا کہ ہم نے کل ایک شخص کے ہمراہ برف بھی بھیجا تھا وہ پہنچا یا نہیں گھر والوں نے نہایت خوشی سے کہا کہ ہاں وہ برف پہونچ گیا اور ابتک تمہارے انتظار میں ویسے ہی رکھا ہے کسی نے چھوا بھی نہیں اس نے کہا کہ "ہائیں" کیا وہ برف ابتک رکھا ہے ارے تمہارا بھلا ہو جو تم نے برف کو ہی کھو دیا۔ دیکھوں تو سہی وہ ابتک کیسے رکھا ہے۔ وہ خوشی خوشی اُٹھا لے گئے کپڑا جو کھول کر دیکھا تو برف کا پتہ بھی نہیں صرف قدرے گیلے کپڑے میں باقی ہے اتنا بڑا برف کا ڈلا ندارد۔ "کفن موجود مردہ غائب" دیکھئے یہ بیچارے برف کی خاصیت سے واقف نہ ہونے کی وجہ سے کہ یہ ایسی شے ہے کہ اس کو جس قدر دیر تک رکھا جائے اتنی ہی گھٹتی چلی جاتی ہے۔ بخلاف دیگر اشیاء کے کہ وہ رکھنے سے محفوظ و مصون ہوتی ہیں یہ غلطی کی اور اسی بھولے پن اور لاعلمی کے عالم میں رہکر انھوں نے اپنے ہاتھوں سے برف کھو دیا۔ ایسی ہی برف کی طرح ہماری عمریں ہیں کہ ان میں برابر انحطاط کا عالم ہے ہر ساعت ہر لحظہ میں ہماری عمر کا ایک بیش بہا قیمتی حصہ برف کی طرح پگھلتا ہے اور ہم ان دیہاتیوں کی طرح غافل ہیں اور نہیں سمجھتے آخر کار ہمارا انجام بھی وہی ہونے والا ہے جو ان کا ہوا تھا جس طرح انھوں نے برف کو اپنے ہاتھوں سے کھو دیا تھا اسی طرح ہم بھی اپنی عمر کو کھو رہے ہیں کسی دن ہاتھ جھاڑ کے الگ ہو جائیں گے اور یہ گراں قیمت عمر تمام ہو جائے گی اسوقت بجز کف افسوس ملنے کے اور کوئی چارہ کار نہ ہوگا یہی غفلت و لاپروائی بنا ہے تمام دنیا کی لذات و اہل دنیا کی دلچسپیوں کی اور یہی ہے وہ مار آستین جو نیچے نیچے ہماری جڑ کھوکھلی

کر رہا ہے اور اس عزیز سفر کی منزل کو کھوٹا کر رہا ہے کاش ہم لوگوں کی آنکھوں سے یہ غفلت کے پردے اٹھیں اور ہم ہوش میں آکر اس تپ دق کی چارہ جوئی کریں اور اس لاعلاج مرض کی دوا کی فکر کریں وہ ہی دوا جس کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم جیسے مریضوں کے واسطے اس کا علاج تجویز کیا ہے وہ یہی ہر وقت اپنے کو ایک رہرو مسافر تصور کریں۔ اور دنیا کو اپنی منزل مقصود کی شاہ راہ خیال کریں اس وظیفہ کا ہر وقت ہر ساعت استحضار رکھیں اٹھتے بیٹھتے ہر وقت اس مراقبہ میں رہیں اپنی حیوٰۃ دنیویہ کو ایک مسافر کی حالت سفری سے زائد خیال کریں جس طرح ایک مسافر اپنے سفر میں وہ ہی کام کرتا ہے جو اس کے سفر کے معین ہوتے ہیں منزل مقصود پر جلد سے جلد پہونچانے والے ہوتے ہیں۔ اور جو چیزیں اُس کے سفر کو کھوٹا بنانے والی اور مخل مقصود ہوتی ہیں ان کو ہرگز نہیں اختیار کرتا آپ نے کہیں نہ دیکھا ہوگا کہ ایک مسافر جو اپنے منزل مقصود پر جلد سے جلد پہونچنے کا قصد رکھتا ہے۔ وہ راستہ میں کہیں کھیل تماشہ میں مصروف ہو یا کسی دلچسپ چیز سے دل بہلانے کا خیال کرے بلکہ جو موانع اتفاقیہ پیش آکر مخل مقصود بنتے ہیں اور نقصان منزل کا باعث ہوتے ہیں۔ ان کی وجہ سے بھی طبیعت کو سخت کوفت ہوتی ہے اگر کہیں مرکب خراب ہو جاتا ہے تو نئی سواری کی کوشش کرتا ہے اگر کہیں گاڑی لیٹ ہو جاتی ہے تو بے حد غمگین ہوتا ہے اور اگر کہیں گارڈ گاڑی کی رفتار تیز کر کے اس نقصان کو پورا کر دیتا ہے تو اس سے بہت مسرت انتہا درجہ کی حاصل ہوتی ہے غرض اگر کہیں اتفاقیہ نقصانات پیش آجاتے ہیں تو ان کے جبر نقصان کے درپے اور تلافی مافات میں کوشاں رہتا ہے یہ شان ہمارے اسفار دنیویہ کی ہے ہم کو چاہیئے کہ کم از کم یہ ہی شان اور یہی اہتمام اپنے سفر آخرت میں بھی پیدا کریں کہ جس طرح اسفار دنیویہ میں موانع سفر سے کوسوں دور بھاگتے ہیں۔ اتفاقیہ نقصان پر طبیعتوں میں آثار غم پاتے ہیں اور جو امور معین ہوتے ہیں ان کی طرف رغبت کرتے ہیں اسی طرح اس وقت ہم کو چاہیئے کہ اپنی ہر ہر نقل و حرکت کو تنقیدی نظر سے دیکھیں کہ آیا یہ ہمارے سفر آخرت کے واسطے حائل ہے یا معین اگر کوئی حالت یا کوئی فعل

ہمارا مانع سفر ہے تو اس سے احتراز کریں اور اسکو اپنے حق میں رہزن منزل شمار کریں جس طرح کہ ایک مسافر اپنی حالت سفر میں جان و مال کی چور ڈاکوؤں سے حفاظت کرتا ہے اسی طرح ہم بھی ان امور کو اپنے حق میں رہزن و غارتگر شمار کریں اور جو امور ہمیں اس سفر میں مدد دینے والے ہیں منزل مقصود تک جلد سے جلد پہونچانے والے ہیں۔ ان کی طرف دوڑیں انھیں رغبت کے ساتھ بطیب خاطر اختیار کریں غرض ہر وقت اپنی حالت پر محاسبانہ نظر رکھیں اور یہ خیال رکھیں کہ کہیں کوئی غار راہ ہمارے اس شاہ راہ پر رونما نہ ہو یا کسی ظلمت کا اثر اس روشن راستہ پر نہ پڑے جس کی ظلمت میں ہم ہاتھ پیر مارتے ہوئے پھٹکتے پھریں اور صراط مستقیم سے دور جا پڑیں مختصر یہ ہے کہ ہر حالت کو معین سمجھ کر اختیار کریں اور مانع سمجھ کر اس سے احتراز کریں۔

مگر افسوس کہ ہماری غفلت حد سے بڑھ گئی لاپروائی کی کچھ انتہا نہیں مادہ عقل بفضلہ تعالیٰ ہمارے اندر بہت کچھ موجود ہے۔ کاش ہم کو ہوش آئے اور ہم [illegible] کریں اور تامل کی نظر سے دیکھیں تو سمجھ سکتے ہیں کہ یہ امور ہمارے حق میں مضرت رساں اور نقصان دہ ہیں نتیجہ ہمارے ان افعال کا بجز اضاعۃ وزیان کے اور کچھ نہیں۔ مگر وائے برما و بر حال ما کہ ہماری اسقدر ردی حالت ہوگئی ہے کہ اگر کسی وقت اپنے ان ناسزا افعال پر توبہ کا خیال بھی ہوتا ہے تو نفس حیلہ باز فوراً کہتا ہے کہ میاں ابھی کیا ہے۔ ایک مرتبہ پیٹ بھر کر گناہ کرلیں تو پھر ایک دفعہ ہی توبہ کرلیں گے کہیں ایسا نہ ہو کہ آج توبہ کریں اور کل پھر کسی دلچسپ گناہ کی طرف میلان خاطر ہو اور ارتکاب معصیت میں مبتلا ہوں تو فضول توبہ ٹوٹے گی محنت عنائع ہوگی اللہ میاں کے سامنے جھوٹے بنیں گے منہ دکھانے کو جگہ نہ رہے گی اس سے بہتر یہ ہے کہ اول ایک طرف سے فارغ البالی حاصل کرلیں تب دوسری طرف مائل ہوں گے گناہ کے ایک دفعہ پیٹ بھر لیں پھر توبہ کی فکر کریں گے افسوس ہماری مثال بالکل اس مسافر کی سی ہے جو ایک دور دراز سفر کا عازم ہے سفر سخت منزل دشوار ہے وہ راستہ میں اپنے گھوڑے کی ایک ٹانگ توڑ دے اور کہے کہ دوسرا گھوڑا عمدہ نیا لیکر سفر کریں گے پھر دوسرے گھوڑے کا بھی یہی حشر کرے غرض اسی طرح سے وہ اپنے مرکب کا جانی دشمن بن جاوے تو آپ ہی بتلائیے کہ کیا یہ

مسافر اس منزل سے ایک قدم بھی آگے بڑھ سکتا ہے یا کوئی عاقل اس کی نسبت خیال کر سکتا ہے کہ یہ کسی صورت سے کسی زمانہ میں منزل مقصود تک پہونچ جائیگا ہرگز نہیں اسی طرح تو یہ یہاں سے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھ سکتا یہی کیفیت ہماری ہے کہ رات دن معاصی میں مبتلا رہتے ہیں اور اپنے مرکب عمر کے ہر ہر قدم کو توڑ کر دوسرے مرکب کی ہوس میں ہیں پھر کسی وقت جو کچھ ٹوٹی پھوٹی توفیق طاعات کے بجالانے کی میسر آتی ہے اور کچھ نماز روزہ ادا کرتے ہیں تو اس سے دوچند معاصی کا بوجھ اپنی گردن پر لاد لیتے ہیں تو بھلا کیا ہم اس مسافر کی طرح کوئی قدم بھی سفر آخرت کی طرف بڑھا سکتے ہیں یا انچ دو انچ مسافت قطع کر سکتے ہیں ہرگز نہیں۔ بلکہ جس طرح وہ مسافر بیچ میں پڑا ہوا ہے کہ آگے نہیں بڑھ سکتا اسی طرح ہم ہیں کہ شاہ راہ آخرۃ پر ایک قدم نہیں بڑھا سکتے یہی نہیں بلکہ ہم تو اتنے بدنصیب ہیں کہ اس مسافر کی طرح ایک حالت پر بھی قائم نہیں رہتے بلکہ جس قدر ہم آگے بڑھتے ہیں اس سے دوچند پیچھے ہٹ جاتے ہیں اس وقت ایک حکایت حسب حال یاد آئی کہ ایک عزیز کسی ملازمت پر مامور تھے رخصت لیکر مکان پر آئے رخصت ختم ہونے پر آئی احتیاطاً ذرا پہلے چلنا چاہا شام کا وقت تھا گھر والوں نے بہت روکا مگر وہ بھی ضد کے پورے کہا نا صاحب میں تو ابھی جاؤں گا ورنہ میرا بہت حرج ہوگا چاہے کچھ بھی ہو چنانچہ وہ اپنی ہٹ کے مطابق گھر سے چل کھڑے ہوئے چلتے وقت کچھ جھٹ پٹا سا ہو چلا تھا گھر سے تھوڑی دور ہی گئے ہوں گے کہ رات ہوگئی اتفاق سے زمانہ مہینہ کی آخر تاریخوں کا تھا رات اندھیری تھی اور اتفاق سے اس وقت سخت گہری گھٹا اور اس کے ساتھ کچھ ترشح بھی ہو رہا تھا اندھیرے کی وجہ سے راستہ بھول گئے اور اتفاق کی بات کچھ ایسا راستہ سے بچھڑے کہ ساری رات چکر لگایا مگر راستہ ہی ہاتھ نہ آیا بلکہ کچھ ایسے چکر میں پڑے کہ آدھی رات کو اپنے ہی گانوں کی طرف ہو لئے جب صبح ہوئی تو سامنے اپنا گانوں دکھائی دیا جب بستی میں پہونچے تو کہیں ان کے گھر کے سامنے ایک جامع مسجد تھی اور اس میں ایک برگد کا درخت تھا تو آپ اس مسجد کو دیکھتے ہی فرماتے ہیں کہ بھئی یہ تو بالکل ہمارے ہی یہاں کی سی جامع مسجد ہے اور کسی نے برگد بھی تو ہمارے مسجد ہی کا اکھاڑ کر یہاں لگا دیا ہے

مگر کتنی زبردست مشابہت ہے کہ بالکل وہی معلوم ہوتی ہے ذرا بھی تو فرق نہیں آگے جو بڑھے تو سامنے ہی سے اپنے مکان کا دروازہ دکھلائی دیا دیکھ کر فرمایا کہ افوہ یہ گھر تو بالکل ہمارے ہی گھر کی طرح ہے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بالکل ہمارا ہی گھر ہے یعنی سارا دروازہ چبوترہ چوکیاں بالکل ویسے ہی ہیں مگر اس ماجرے کو دیکھکر اب ذرا ان کی طبیعت میں وحشت سی ہونے لگی چلتے چلتے اپنے مکان کے دروازہ کے سامنے پہونچے اب تو سخت حیران کہ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے کہیں سچ مچ یہ ہمارا گھر تو نہیں کبھی خیال آتا کہ ہو نہ ہو یہ تو ہمارا ہی گھر ہے کبھی دل میں سوچتے کہ کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا پھر کہتے مگر نہیں یہ تو بیداری ہے۔ یہ دیکھو میرے ہاتھ پیر حرکت کر رہے ہیں میں چل رہا ہوں غرض اسی شش و پنج میں تھے کہ اتنے میں آپ کے بھتیجے نماز فجر کے لئے مکان سے نمودار ہوئے چچا کو دیکھ کر سلام کیا اور پوچھا کیا ہوا بھتیجے میں کوئی شک نہ تھا فرمانے لگے لاحول ولا قوۃ لعنت ہے ہم پر اور ہماری عقل پر ساری رات تو جنگل میں ٹھوکریں کھاتے پھرے بارش میں بھیگے میلوں کی مسافت طے کی مگر جہاں سے چلے تھے وہیں کے وہیں موجود ایک فرلانگ بھی آگے نہیں بڑھے جیسے تیلی کا بیل اپنے ایک ہی مرکز پر دن بھر چلتا رہتا ہے اور اپنے دل میں سمجھتا ہے کہ میں نے ایک طویل مسافت میلوں کی قطع کرلی مگر درحقیقت وہ جس جگہ سے چلا تھا وہیں موجود ہے جس مرکز پر اول پھیرے میں گھومتا ہوا نظر آتا تھا اسی مرکز پر اس وقت تک سرگرداں ہے ایسے ہی ایک صاحب تھے کہ ان کا گھوڑا اڑیل ہی ٹٹو تھا اور پرلے سرے کا شریر تھا منجملہ دیگر شرارتوں کے اس میں ایک شرارت یا مرض یہ بھی تھا کہ جب لید کرتا تھا تو جب تک لوٹ کر اس کو سونگھ نہ لیتا کبھی آگے نہ بڑھتا وہ بیچارہ راکب بھی اس کی شرارت سے عاجز آگیا تھا مگر مجبور تھا کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا تھا اس مصیبت میں اس بے چارہ کو ایک سفر کرنے کی ضرورت پیش آئی مجبوراً اس ہی ٹٹو پر سوار ہوکر چلا اس نے اپنی وہی ہٹ شروع کی اور جہاں لید کی پیچھے پڑکر سونگھا اور آگے چلدیا اتفاق سے راستہ میں ایک اور شخص بھی سفر کر رہا تھا اس نے گھوڑے کا یہ ڈھنگ دیکھا اور سخت متعجب ہوا پوچھا میاں یہ گھوڑا عجیب نرالی صفت کا ہے ایسا

تو نہ کہیں دیکھا نہ سنا اس نے کہا میاں کیا بتلاؤں اس کمبخت گھوڑے نے مجکو مصیبت میں ڈال رکھا ہے اس میں ایک یہ مرض ہے جس سے میں عاجز آگیا ہوں مگر یہ کمبخت باز نہیں آتا پھر اُس کو مفصل کیفیت سُنا ئی اس نے کہا دیکھو اس کا علاج میں کیا اچھا کرتا ہوں یہ کہکر اُس نے اپنا گھوڑا اُس کے پیچھے کر لیا اور جب وہ لید کرکے سونگھنے کا قصد کرتا تو یہ پیچھے سے ایک چابک رسید کرتا اور اُس کو مُنھ تک نہ موڑنے دیتا بارے خدا خدا کرکے ایک بہت سا حصہ راستہ کا پُرامن عجلت کے ساتھ گذر گیا آگے چلکے اس دوسرے مسافر کو کسی دوسرے راستہ پر جانا تھا وہ ایک موقع پر اس سے جدا ہوا اور کہا کہ لو بھائی جس قدر میرے امکان میں تھا میں نے تم کو اس مصیبت سے بچایا اب تم جانو اور تمہارا گھوڑا میں تو اب رخصت ہوتا ہوں اس بیچارے نے بہت کچھ شکریہ ادا کرنے کے بعد اس کو رخصت کیا ان کے جاتے ہی گھوڑے نے گردن موڑ کر دیکھا جب خوب اطمینان کر لیا کہ اب وہ سوار میرے پیچھے نہیں ہے اور چلا گیا ہے اب کسی قسم کا خطرہ نہیں رہا تو وہیں سے رُک کر لوٹا اور جہاں جہاں لید کی تھی اور سونگھا نہ تھا سب کو لوٹ کر باری باری سونگھا سوار نے بہتیرے ہاتھ پیر مارے مگر کمبخت نہ باز آیا اور اس کی ساری منزل کو کھوٹا کیا یہ سب اس دوسرے رفیق سفر کی عنایت کا نتیجہ تھا اگر اس کی یہ عنایت نہ ہوتی تو سفر تو کھوٹا نہ ہوتا جتنا راستہ کٹتا جس طرح بھی اور جس زمانہ میں بھی کٹتا کچھ وصول تو ہوتا مگر یہ تو اتنی دیر کی محنت و مشقت سب بیکار گئی اور جہاں تھے پھر وہیں کے وہیں آپہونچے ۔ ہنوز روز اول کا مضمون ہوگیا حالانکہ اس رفیق سفر نے اپنے خیال کے مطابق بہت بڑا احسان کیا تھا لیکن بعض وقت کا احسان بھی بدسلوکی سے بدتر ہوتا ہے ۔ چنانچہ اسی واقعہ سے مشاہدہ ہوگیا تو واقعی بالکل اسی حکایت کے مطابق ہماری حالت ہے ۔ یہ دیکھئے ہماری نفس پروری کہ ان واقعات کو سُن کر تو کس قدر تعجب کرتے ہیں ۔ اور صاحب واقعہ کو افسوسناک حالت میں خیال کرتے ہیں مگر اپنے گریبان میں منہ ڈالکر نہیں دیکھتے کہ ہم خود اس مرض کے بیمار ہیں اس مسافر سے زائد افسوسناک حالت ہماری ہے بہت

سے خدا ترس بندے ہم میں ایسے ہیں جو پچھلی رات کو اُٹھتے ہیں نوافل ادا کرتے ہیں عاجزی کے ساتھ دعائیں مانگتے ہیں توبہ استغفار کرتے ہیں فریضہ پنجگانہ کے پابند روزے رکھنے کے عادی ہیں مگر افسوس کہ اس صلوٰۃ لیل اور نوافل و تسبیح عبادات و ریاضات پر پانی پھیرنے کے واسطے وہ ایک دو غیبتیں جو صبح اُٹھتے ہی اُن کے مُنہ سے اپنے بھائیوں کے حق میں نکلتی ہیں کافی ہو جاتی ہیں اور تمام عبادات و ریاضات کا حاصل و انجام یہ دو غیبتیں ہی ہو جاتی ہیں جو کہ عذاب اخروی کا ذریعہ بننے کے واسطے کافی ہیں تمام کیا کرایا خاک میں ملجاتا ہے اور جس حالت میں تھے اور جس جگہ تھے پھر وہیں لوٹ آتے ہیں جس طرح اس مسافر کو اس شریر گھوڑے نے سرِ راہ منزل پر لا ڈالا تھا اسی طرح یہ دو برائیاں جو کہ محض شرارت نفس کا نتیجہ ہیں پھر ہمکو ایسے غار مذلت میں لا ڈالتے ہیں اتنی بڑی غفلت غضب خدا کا اس کی علت محض یہی ہے کہ وہی استحضار فنا دنیا نہیں جسکا رونا تھا اور وہی احساس قطع مسافرت و مسافت نہیں ہے جس کی ضرورت تھی یہ نہیں سمجھتے کہ ہم مسافر ہیں سفر کر رہے ہیں۔ دور و دراز منزل ہمارے سامنے ہے بلکہ اپنے آپ کو مقیم سمجھتے ہیں حالانکہ ہم ہر حالت میں باعتبار حرکت زمانی کے مسافر ہیں پس جس طرح ہم بوجہ حرکت مکانی کے اپنے کو مسافر سمجھتے ہیں اسی طرح بوجہ حرکت زمانی کے بھی مسافر سمجھنا چاہیئے فرق دونوں مسافرتوں میں صرف یہی ہے کہ یہ سفر اول باعتبار حرکت مکانی کے سفر نہیں ہے اور یہی فرق ہے جس پر احکام و عبادات کا تغیر و تبدل ہوتا ہے قصر و اتمام صلوٰۃ رخصت و عزیمت کا دار و مدار اسی سفر ثانی پر ہے یعنی مسافرت بحسب المکان ہی کو اصطلاح فقہاء میں سفر کہا جاتا ہے جس کو تم بھی اپنے روز و شب کی اصطلاح میں سفر سے تعبیر کرتے ہو۔ چنانچہ جس وقت یہ انتقال مکانی ہوتا ہے اسوقت قصر کا حکم دیا جاتا ہے۔ اور انسان مسافر سے تعبیر کیا جاتا ہے ورنہ مقیم کہا جاتا ہے اور جس سفر کا فرمان نبوی میں ذکر ہے جس کے اعتبار سے تم ہر وقت مسافر ہو یہ منشا اور دار و مدار تغیر احکام کا نہیں اس سفر پر قصر ثابت نہیں اس کو خوب غور سے سُن لو کبھی نفس و شیطان کے مغالطہ میں پھنس جاؤ کہ جب ہم بروئے حدیث مسافر ٹھیرے تو مسافر کے واسطے تو قصر کا حکم ثابت ہے رباعی نماز اُس کے حق میں ثنائی ہوتی ہے لہذا ہم پھر کیوں پڑھائے

دو کے چار پیسے اللہ دے اور بندہ لے چلو دور کمتوں سے تو فرصت ملی جس طرح ایک جاہل کی حکایت ہے کہ وہ ہمیشہ قصر کیا کرتے تھے خواہ وطن اصلی ہی میں ہوں ایک شخص نے سوال کیا کہ آپ ہر حالت میں قصر کرتے ہیں خواہ سفر میں ہوں یا حضر میں یہ تو صریح مخالفت ہے احکام فقہیہ شرعیہ کی تو انھوں نے جواب دیا کہ ہمارا یہ فعل اگر فقہ کے خلاف ہے تو ہو حدیث کے تو موافق ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عابر سبیل اور مسافر کے الفاظ فرمائے ہیں اور ہماری حالت قیام فی الدنیا کو سفر سے تعبیر کیا ہے لہذا ہم اگر قصر کرتے ہیں تو کونسا بُرا کام کرتے ہیں اسی طرح ایک اور صاحب تھے اگر اُن کو ایک میل جانے کی بھی ضرورت پیش آتی تو وہ قصر کر لیا کرتے تھے۔ اُن سے کسی شخص نے کہا کہ آپکا یہ طرز عمل عجیب نرالا نا ہے۔ جو تمام روایات فقہیہ کے خلاف ہے کسی امام کے مذہب پر بھی ایک میل کی مسافت میں قصر نہیں آج تک کسی نے اس کو مدت سفر نہیں قرار دیا جواب دیا کہ ہمیں کسی امام کے مذہب سے کیا لینا جب نص صریح کلام اللہ میں موجود ہے "اذا ضربتم فی الارض" اس سے بڑھکر اور کونسی نص ہو سکتی ہے کیونکہ ضرب فی الارض ایک میل کی مسافت پر بھی صادق آتا ہے لہذا ہم بموجب اس آیت کے قصر کرتے ہیں تو اس شخص نے جواب دیا کہ اگر قصر کا ثبوت محض ضرب فی الارض سے ہے تو اس کے معنی لغوی تو زمین پر قدم مارنے اور چلنے کے ہیں لہذا اگر آپ مکان سے مسجد میں آکر نماز پڑھا کریں تب بھی قصر کیا کریں اس وجہ سے کہ اطلاق لغوی موجود ہے۔ اتنی دور چلنے سے بھی آپ کے قول پر زمین پر پیر مارنے کا اطلاق آسکتا ہے اس میں کسی مقدار کی تعیین تو ہے ہی نہیں۔ تاکہ اس کا لحاظ کیا جاوے۔ ایسے ہی ایک صاحب تھے چلتے چلتے مغرب کا وقت ایسی جگہ جہاں سے ایک طرف مسجد تھی بیچ میں سڑک اور ایک طرف خالی میدان مغرب کی اذان ہو گئی انھوں نے میدان کی طرف ہو کر تیمم کیا اور نماز پڑھنا شروع کر دی نماز کے بعد کسی نے اُن سے کہا کہ پانی تو سامنے مسجد میں موجود تھا آپ نے تیمم کیوں کیا انھوں نے جواب دیا کہ میاں میرے پاس تو پانی نہیں مسجد میں اگر ہے تو میں کیا کروں اور قرآن شریف میں فرمایا گیا ہے "فلم تجدوا ماء فتیمموا صعیداً طیباً" بتلاؤ کہ میرے پاس

پائی گا وجود کہاں ہے لہٰذا رخصت شرعی میرے حق میں ثابت ہے غرض ان حکایات کے بیان کرنے سے یہ ہے کہ ہم لوگوں کا مذاق بگڑ گیا ہے کہ جہانتک ہوتا ہے نفس کی سہولتیں تلاش کرتے ہیں کہ کسی طرح نفس پر بار نہ پڑے اور ویسے ہی جان چھوٹ جائے لہٰذا بموجب اس مذاق کے کہیں آپ یہ نہ سمجھ جائیں کہ جب ہم اس حدیث کے موافق مسافر بن گئے تو آج سے بس قصر کرنا شروع کر دیں چلو دو رکعت سے تو جان چھٹی اب کے ایسی ترکیب کریں گے کہ ان دو سے بھی جان چھوٹ جائے خواہ وہ غرض جس کے اعتبار سے منطوق حدیث مسافرت کو ثابت کرتا ہے حاصل ہو یا نہ ہو اس کا کوئی ثمرہ مرتب ہو یا نہ ہو دنیا اور اس کے متعلقات سے نفرت پیدا ہو یا نہ ہو بس نفس کو کسی طرح سے آرام مل جائے اُس کے آسائش کی صورتیں پیدا ہو جائیں چنانچہ ہم نے ایسی بزرگ ہستیاں بھی سنی ہیں جو خوب دھڑلے سے سود لیتے ہیں جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ سود لینا تو حرام ہے تو کیوں لیتے ہو تو نہایت بے باکی سے جواب دیتے ہیں کہ ہندوستان دارالحرب ہے اور دارالحرب میں سود لینا بعض علماء کے مذہب پر جائز و حلال ہے۔ ہم ان ہی لوگوں کے مذہب پر عمل کرتے ہیں بتلاؤ اسمیں کیا حرج ہے لیکن جب زکوٰۃ دینے کا وقت آتا ہے اور اُن سے زکوٰۃ نہ دینے کا سوال ہوتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ بھائی ہمارا تو سارا مال حرام ہے سودی ہے اور غیر کا حق ہے حق غیر میں زکوٰۃ کہاں اسوجہ سے ہم زکوٰۃ ادا کرنے سے مجبور ہیں۔ تم ہی بتلاؤ کہ ہم کیونکر زکوٰۃ ادا کریں اگر ہمارا مال سودی نہ ہوتا تو ہم بھی بطیب خاطر زکوٰۃ ادا کرتے۔ دیکھئے نفس کی کتنی زبردست چال ہے کیسا عجیب بہانہ چھانٹتا ہے کہ لینے کے وقت تو جو کچھ بھی آجائے حلال ہے اور اگر نہ بھی حلال ہو تب بھی حلال ہے۔ اور دینے کے وقت حرام اعلیٰ درجہ کا حرام بلکہ تمام دنیا کے حرام مالوں سے بڑھ کر حرام کیونکہ اسوقت دینا بھی پڑتا ہے غرض ہر وقت نفس اس قسم کے بہانے تراشتا رہتا ہے اور سہولت کی صورتیں چھانٹتا رہتا ہے حضرت شیخ فرید عطار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

چوں شتر مرغے شناس ایں نفس را ۔۔۔ نے برد باز و نہ پرد بر ہوا

گر بہ پرگویش گوید اشترم ورنہی بارش بگوید طائرم

یعنی نفس کی مثال شتر مرغ کی سی ہے کہ جب اس سے اُڑنے کو کہا جاتا ہے تو کہتا ہے میاں تم بھی عجیب آدمی ہو اُڑنے کو مجھ سے کہتے ہو کہیں اونٹ بھی دُنیا میں اُڑا ہے میں تو اونٹ ہوں اونٹ تم میرا نقشہ اور صورت نہیں دیکھتے بتلاؤ میں اونٹ سے کس بات میں کم ہوں اور جب کہا جاتا ہے کہ اچھا اگر تم اُڑنے سے اس لئے معذور ہو کہ تم اونٹ ہو تو پھر اونٹ ہی کے سے کام کرو بوجھ لادو اور آگے آگے چلو تو جواب دیتا ہے کہ میاں تم بھی بالکل آنکھوں سے اندھے عقل سے خارج معلوم ہوتے ہو تم کو میرے یہ دو بڑے بڑے بازو اور لمبے لمبے پر نہیں نظر آتے کہیں پرندوں نے بھی بوجھ لادا ہے وہ تو اس واسطے وضع کئے گئے ہیں کہ اُڑتے پھریں غرض جس صورت میں عافیت نظر آتی ہے اسی کو اختیار کرتا ہے۔ اگر اونٹ بننے میں بوجھ لانا پڑتا ہے تو پرند بن جاتا ہے اور پرند بننے میں جب اُڑنے کی مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے تو اونٹ بن جاتا ہے۔ اسی طرح نفس ہے کہ جب عیش و عشرت کے سامان ہوتے ہیں اور دلچسپیوں کا انتظام ہوتا ہے تو قوی ہو جاتا ہے خوب ہاتھ مارتا ہے دل کھول کر گناہ کرتا ہے اور جب کبھی نماز روزہ کا ذکر ہوتا ہے تو ضعیف بن جاتا ہے۔ بہانہ تراشتا ہے۔ اگر کوئی بے چارہ خدا سے بہت کچھ خوف کر کرا کے پچھلی رات کو اٹھنے کا قصد کرتا ہے تو اسے تھپک کر یہ اطمینان دلا کر سلاتا ہے کہ ابھی بہت رات باقی ہے ابھی اٹھکر پڑھ لیں گے۔ اسی طرح تھپک تھپک کر سلاتا رہتا ہے اور اطمینان دلاتا جاتا ہے حتیٰ کہ صبح ہو جاتی ہے اسی طرح اگر کسی خدا کے بندے پر بہت کچھ خوف و خشیۃ غالب ہوتا ہے ہیبت خداوندی طاری ہوتی ہے گناہوں کی بھیانک صورتیں اُس کے سامنے عذاب کو کھینچ کھینچ کر لاتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں تو توبہ کا قصد کرتا ہے مگر نفس فوراً سدِّ راہ بنکر عائق ہوتا ہے کہ واقعی ضرور توبہ کرنا چاہئے مگر ذرا ایسا تو ہو کہ اللہ میاں کے ہاں عہد شکن اور بد عہد تو نہ کہلائیں یہ ایک گناہ اور کر لیں تو پھر واقعی ضرور توبہ کریں گے للہ در القائل ما احسن ما قال ؎

ہر شبے گویم کہ فردا ترک ایں سودا کنم بازچوں فردا شود امروز را فردا کنم

روز کہتا ہے کہ کل ضرور توبہ کروں گا آج تک جو کچھ گناہ ہونے تھے ہو گئے اگر ایک آدھا اور کوئی باقی رہیگا تو ہو جائیگا پھر خوب مضبوط توبہ ہوگی پھر جب کل ہوتی ہے تو اس سے اگلی کل پر حوالہ کرتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی نفس کا ایک بہانہ ہے کہ حرام مال کھانے کے وقت ہندوستان کو دارالحرب مان لیا اور بے خوف وخطر سود کھایا اور جب زکوٰۃ دینے کا وقت آیا تو حرام مال بتلا دیا پھر مسئلہ بھی کیسا من گڑھت تراشا ہے بالکل بے اصل اور بے بنیاد کیونکہ زکوٰۃ کا وجوب محض مال کے مملوک ہونے پر ہے اگر کسی کی ملک میں بقدر نصاب مال موجود ہے خواہ وہ حلال ہو یا حرام سے مخلوط ہو تو زکوٰۃ ضرور واجب ہوگی اور اگر مال مخلوط بہ حرام سے زکوٰۃ نہ ادا کی جاوے گی تو دو سزائیں مرتب ہوں گی ایک تو حرام مال کھانے کمانے کی (جس کا اقرار اپنے منہ سے کرتے ہیں) دوسرے زکوٰۃ کے ادا نہ کرنے کی بخلاف زکوٰۃ ادا کرنے کی صورت کے کہ اس وقت صرف ایک جرم عائد ہوگا کہ مال حرام کیوں کمایا تھا زکوٰۃ نہ دینے کے جرم میں تو ماخوذ نہ ہوگا۔ اگرچہ عذاب اخروی کیواسطے پہلا جرم بہت کافی ہے۔ مگر خیر کچھ کمی تو ہو جائیگی حاصل یہ ہے کہ نفس ہر جگہ اپنی سہولتیں اختیار کرتا ہے۔ ایسی ہی یہاں پر بھی اس نے سہولت نکالی ہے کہ ہمیں اپنے آپکو باعتبار سفر اخروی کے مسافر سمجھنا چاہئے تھا اسمیں تو مقیم سمجھا (کیوں محض اس وجہ سے کہ اگر اپنی حالت سفر کو مدنظر رکھیں گے تو پھر ان لذائذ سے دلچسپیاں کون لیگا۔ ان عیش و راحت کے سامانوں کا لطف کون اٹھائیگا) اور اصطلاح فقہاء کے اعتبار سے اپنے کو مقیم سمجھنا چاہئے تھا وہاں مسافر بن بیٹھے کیوں محض اس وجہ سے کہ یہاں سہولت نظر آتی ہے فریضہ وقتی میں تخفیف ہوتی ہے بجائے چار کے دو ہی پڑھنی پڑتی ہیں حالانکہ جس اعتبار سے ہماری یہ حالت حالتِ مسافرت ہے یعنی انقضاء عمر دنیا اس کا بالکل خیال بھی نہیں گذرتا کہ وہ کون سی منزل مقصود ہے جسپر ہم کو یہ دور و دراز مسافت قطع کر کے پہونچنا ہے یہی وجہ ہے کہ ہم دنیا کی دلچسپیوں میں سرشار ہیں۔ اسباب عیش و نشاط مہیا ہیں عیش و طرب میں مست ہیں کچھ دنیا و مافیہا کی خبر نہیں کاش کہ استحضار اس سفر اخروی کا ہو جاوے اور اس کا جزم کامل و اعتقاد راسخ ہو جاوے کہ ہم کو اس دنیا سے ضرور کوچ کرنا ہے

یا ہم اس دنیا میں ایک غریب مسافر کی طرح کسی منزل کے رہرو اور کسی شاہراہ کے طے کرنے والے ہیں کوئی عظیم الشان منتہی ہماری اس مسافرت شدیدہ کی ہے جس کے اہتمام شان کے باعث ہم کو اتنی کاوشیں اس سفر کے قطع کرنے اور اس تک پہونچنے میں برداشت کرنا ضروری ہیں۔ مگر اس کا تو کہوں بھی گمان نہیں ہاں چار رکعت کی دو کرنے کے لئے ہر دم آمادہ ہیں صاحب جس وقت ہمارا یہ وظیفہ عمل اور دائمی طور سے سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے یہی مراقبہ و معاینہ ہو جائیگا تو اس کا لازمی اثر یہ ہے کہ دنیا سے طبیعت برداشتہ ہو جائیگی بجائے دلچسپی کے وحشت پیدا ہوگی اسباب تنعم و آلات تلذذ انتہا درجہ کے موحش و موہم ہو جاویں گے۔ ہر چیز سے جی گھبرانے لگیگا ایک ساعت بھی دنیا میں ٹھہرنا دشوار ہوگا بخواہ مخواہ طبیعت کا اقتضاء ہوگا کہ جس طرح بھی ہو چلو جب یہاں دوام و خلود ہی نہیں تو پھر ان چیزوں کا ہم سے ایک نہ ایک دن چھوٹنا ضروری ہے لہذا ابھی سے ہم ہی ان کو چھوڑ کر چلیں اور ایسی جگہ چلیں کہ جہاں پر دوام و خلود ہو سکون و اطمینان سے زندگی بسر کریں یہ تو بالکل موٹی سی بات ہے کہ جب کسی آدمی کو کسی جرم پر جیل خانہ بھیجدیا جاتا ہے تو اس کو وہ جیل کی کوٹھری سخت ہیبت ناک اور وحشت سے پر معلوم ہوتی ہے ایک ساعت بھی جی نہیں لگتا ہر وقت یہی فکر رہتی ہے کہ جس طرح بن پڑے یہاں سے نکل چلو اسی طرح جب اس استحضار کے باعث دنیا سے جی اچٹ جائیگا تو اس وقت وہی دنیا جو عیش و نشاط کا مرکز و دلچسپیوں کا سرچشمہ لذائذ کا منبع تھی اس کی حقیقت بجز ایک وحشت کدہ اور حزناک ہیبت انگیز حبس کے اور کچھ نہ رہے گی ہر طرف سے مہیب صورتیں نظر آنے لگیں گی اس وقت دنیا یا اس کی کسی دل بہلانے والی چیز سے دل لگنا ناممکن ہوگا ترک دنیا کے اسباب و ذرائع کی فکر ہوگی تحصیل آخرت کے وسائط و ذرائع کی طلب ہوگی اور وعدہ خداوندی یہ ہے "والذین جاہدوا فینا لنہدینہم سبلنا" لہذا جب اس وعدہ کے سفر آخرت جس کی سعی و کوشش میں تم سرگرداں ہوگے سہل ہو جائیگا راستہ منکشف ہوگا اس شاہراہ مقصود سے غفلت و لاپرواہی کی بار یکی

دور ہو جاوے گی اس کے بعد کامیابی کی مبارک صورتیں نظر آئیں گی منزل مقصود قریب تر اور سہل الوصول معلوم ہوگی یہ تو نقلی دلیل ہے استلزام مذکور کی نیز جبکہ استحضار فنا و مفارقت دنیا ہونے کے بموجب محبت دنیا منقطع ہوگی۔ اس کی ظلمت کے آثار کافور ہوں گے اس انقطاع حب دنیا سے وہ ظلمات دنیویہ جن میں ابتک ملوث تھے دور ہو جاویں گی جہالت کی تاریکیاں یکطرف ہوں گی تو اس وقت لازمی طور سے ایک نور پیدا ہوگا جس سے قلب روشن ہو جائیگا راستہ سفر آخرت کا منور ہو جائیگا یہ شاہراہ عمل جگمگا اٹھے گی جسکے بعد سفر کرنا نہایت آسان اور منزل مقصود پر پہونچنا نہایت سہل ہوگا امیدیں قرب الٰہی کی قوی ہوں گی اس طرح سے کہ اسی نور میں یہ نظر آئیگا کیونکہ مخلوقات خداوندی بیکار و بیفائدہ نہیں ان حوادث کی کوئی غرض و حکمت ضرور ہے منجملہ اُن حکمتوں کے ایک حکمت یہ بھی ہے کہ کوئی فعل حسب عادۃ اللہ اثر سے خالی نہیں رکھا گیا۔ خواہ ثواب ہو یا عقاب یہ نہیں ہے کہ کوئی بندہ اس دار المحن میں کوئی فعل یا کوئی عمل کرے اور اس پر ثواب یا عقاب مرتب نہ ہو اور ہم بعض افعال و اعمال کو دیکھتے ہیں کہ اُن پر دنیا میں کوئی ثواب و عقاب مرتب نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک شخص ہے کہ اُس نے آج کوئی نہایت مستحسن شرعی فعل کیا تو ہم اس پر کوئی خاص اثر یا کوئی خاص ثواب مرتب ہوتا ہوا نہیں دیکھتے یا کوئی شخص ہے کہ وہ نہایت ہی قبیح امر کا مرتکب ہوتا ہے شراب پیتا ہے یا زنا کرتا ہے اس پر کوئی گناہ کا اثر یا کسی قسم کا عذاب وغیرہ نہیں پاتے پس جب اس عالم میں بعض اعمال پر آثار مرتب ہوتا ہوا نہیں دیکھتے لہذا معلوم ہوا کہ کوئی نہ کوئی اور عالم ماسوا اس عالم کے ضرور ہے جس میں ان اعمال کے آثار مرتب ہوں گے اور ثمرات ان اعمال کے ضرور ملیں گے یہ استلزام کی عقلی دلیل ہے لیکن میں لزوم عقلی اصطلاحی کا دعوی نہیں کرتا بلکہ عقلی بمعنی ترجح کا مدعی ہوں یعنی ممکن کی دونوں جانبین وجود و عدم کی مساوی ہیں ان میں سے عقلاً ایک جانب کا راجح ہونا بصورت عدم تحقق مانع کے چنانچہ معاد بھی فی نفسہ ایک امر ممکن مساوی الطرفین ہے یعنی عدم وجود اُس کے دونوں فی نفسہ مساوی

ہیں نہ وجود ضروری ہے نہ عدم لازمی ہے لیکن عقل اس کے جانب وجود کو ترجیح دیتی ہے بوجہ انعدام مانع کے کیونکہ آج تک کوئی دلیل عقلی قابل اعتماد اس کے امتناع پر قائم نہیں ہوئی لہذا معلوم ہوا کہ معاد ممکن عقلی بمعنی مذکور ہے اور ترجیح دلیل عقلی مذکور سے ثابت ہے اب ترجیح سے آگے رہا وجوب سو وہ نصوص قطعیہ شرعیہ سے واجب و ثابت ہے لہذا معاد کا ثبوت جو ممکن عقلی تھا مخبر صادق کا قول اسکو وجوب شرعی کی جانب لے آیا پس اب وہ ممکن عقلی واجب شرعی ہو گیا یہی معاد ہے لیکن اس معاد کے ثبوت کی طرف التفات کیوں ہوا محض اسوجہ سے کہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ اشیاء فانیہ کے مشاہدہ فناء سے اُن سے طبیعت برداشتہ ہوئی پھر جب دنیا سے طبیعت گھبرائی اُس وقت دوسرے عالم کی طلب ہوئی (چنانچہ بتقریر مذکور یہ امر واضح ہو چکا) لہذا معلوم ہوا کہ مضمون اول یعنی استحضار فناء دنیا کے واسطے معاد و بقاء آخرت کا خیال لازم ہے اور اول چونکہ بدیہی ظاہر و باہر ہے لہذا اس کا جو لازم ہے وہ بھی بدیہی اور واضح ہوگا کیونکہ ظاہر کا لازم ظاہر ہی ہوتا ہے چنانچہ اس لزوم کی تقریر بھی مذکور ہو چکی پس معلوم ہوا کہ فی نفسہ تمام مضمون ظاہر ہے مگر عارض کے سبب جو غفلت ہے اسلئے تنبیہ کی حاجت ہے پس اسی تنبیہ کے لئے اس وقت یہ بیان کیا جاتا ہے چنانچہ اسی غفلت کے ازالہ کے لئے ارشاد ہے وما ہذہ الحیوٰۃ الدنیا الا لہو ولعب یعنی یہ دنیا اور جس قدر اسکے متعلقات ہیں سب من کل الوجوہ لہو اور لعب ہیں بجز اس کے اور کچھ اس کی حقیقت نہیں باری تعالیٰ نے اس مقام پر یعنی مقام اثبات معاد میں اس آیت کو ذکر فرمایا حالانکہ اثبات معاد کا علم اوپر آیت معاد سے بھی ہو چکا تھا۔ اور آگے وان الدار الآخرۃ لہی الحیوان سے اور زیادہ ہو جاویگا پھر جو دنیا کے لہو و لعب ہونیکا ذکر فرمایا اس سے معلوم ہوا کہ مقصود اللہ تعالیٰ کا کسی ایسی بات کی طرف اشارہ کرنا ہے جس آیت ماقبل و مابعد نے ادا نہ کیا تھا اور وہ بھی کہ اگرچہ معاد کا یقین تو والذین آمنوا وعملوا الصلحت لنبوئنہم من الجنۃ غرفا اور وان الدار الآخرۃ لہی الحیوان سے بھی ہو گیا اور اعتقاد آخرت کے واسطے تو یہی کافی ہے لیکن مقصود محض وقوع آخرت کی خبر دینا اور صرف معاد

کا علم کرانا ہی نہیں ہے بلکہ اس یقین و اعتقاد پر جو ثمرہ مرتب ہونا چاہئے وہ مقصود ہے یعنی عمل للآخرۃ جس سے شغل دنیا مانع تھا گویا اس جگہ استدلال سبب سے ہے مسبب پر اس طرح سے کہ دنیا و ما فیہا کا جب لہو و لعب میں داخل ہونا مستحضر ہو گیا تو یہ سبب ہو جاویگا استعداد للآخرہ کا پس مسافر آخرت سے ہرگز یہ امید نہیں کی جاتی کہ وہ ملہیات میں مشغول ہو کر اپنے عزیز سفر اور کٹھن منزل کو کھوٹا کرے جبکہ ایک مسافر اسفار دنیویہ میں اس قسم کے افعال سے گریز کرتا ہے تو ایک مسافر آخرت کو تو لازمی طور سے اس پر کاربند ہونا اور ملہیات سے اعراض کرنا چاہئے لہذا معلوم ہوا کہ مقصود خداوندی اس آیت کو اثبات معاد کے سلسلہ میں بیان کرنے سے یہ ہے کہ جس طرح اعتقاد و یقین معاد مطلوب ہے اسی طرح اعراض عن الدنیا بھی مقصود ہے جو مفضی الی العمل ہے گویہ مقصود کے دو جزو ہیں اور ان دونوں اجزاء ترکیبیہ سے مل کر وہ مقصود طیار ہوتا ہے ایک علم دوسرا عمل پہلی اور مابعد کی آیت میں علم آخرت کی طرف متوجہ کیا تھا اس آیت میں اعراض عن الدنیا کی تعلیم دیکر عمل للآخرت پر متوجہ کیا ہے اور خداوند تعالیٰ نے جہاں کہیں علوم کا تذکرہ کیا ہے ان سے مقصود محض علوم ہی نہیں ہوتے بلکہ اعمال بھی مقصود ہوتے ہیں جن کے لئے علوم وسیلہ ہوتے ہیں بہت سے لوگ خوش ہیں کہ ہم آخرت کے قائل ہیں معاد پر ہمارا ایمان ہے ہمیں کس بات کا فکر ہے سو ہوشیار رہو یہ بھی نفس کا ایک دقیق مغالطہ ہے محض اعتقاد مقصود کے اتمام کے لئے ہرگز کافی نہیں یہ ایمان بدون عمل کے بدرجۂ کمال معتبر نہیں گو کسی درجہ میں مفید ضرور ہے آج کل لوگوں کا عجیب مذاق بگڑا ہے کہ محض اعتقاد ہی کو نجات کے واسطے کافی سمجھتے ہیں۔ عمل کی گویا کوئی ضرورت ہی نہیں اس کا سبب محض غلبۂ جہل ہے اور جہل کا سبب یہ ہے کہ آج کل لوگوں نے علم اور اہل علم سے موانست و مجانست ترک کر دی بزرگان دین کے پاس جا کر بھی نہیں پھٹکتے جن مجالس میں علوم دینیہ کا تذکرہ ہوتا ہے وہاں جی نہیں لگتا جس کا ثمرہ یہی ہے کہ اس قسم کی غلطیوں میں پڑتے ہیں اور گمراہ ہوتے ہیں اور اعمال تو اعمال آج کل تو اعتقادات کے اندر بھی جس کو سب ضروری سمجھتے ہیں عجیب گڑبڑ ہے اعتقادات کی تصحیح بھی بدون مجالست اہل علم کے

دشوار ہے پس اول تو اعتقاد محض کافی ہی نہ تھا اور اگر اُن کے زعم میں کافی تھا تو حیرت ہے کہ اس کی بھی تکمیل نہیں کرتے چنانچہ اس وقت بہت کم لوگ ایسے ملیں گے جن کے اعتقادات موافق اصول شریعت ہوں اور وہ اس فرقہ اہل حق میں داخل ہوں جن کی نسبت آپنے فرمایا ہے کہ میری امت تہتر فرق پر منقسم ہوگی جس میں سے بہتر فرقے تو ناری ہوں گے اور ایک فرقہ ناجی ہوگا صحابہ نے دریافت فرمایا کہ حضور وہ کونسا فرقہ ہے کہ جو ناجی ہے آپ نے ارشاد فرمایا کہ "ما انا علیہ و اصحابی" یعنی جس پر میں ہوں اور میرے صحابہ سو اس طریق پر بہت کم لوگ ہیں اور جو تھوڑے سے ہیں بھی وہ اس غلطی میں گرفتار ہیں کہ انھیں سے بعض لوگوں نے اس ما انا علیہ کو صرف اعتقادات کے اندر منحصر کر رکھا ہے یعنی وہ کہتے ہیں کہ اگر آپ کے اور آپ کے اصحاب کے ساتھ محض اعتقادات میں بھی مطابقت ہوگئی تو فرقہ ناجیہ میں داخل ہونے کے واسطے یہی کافی ہے حالانکہ یہ اُن کی سخت غلطی ہے کہ انھوں نے مطابقت کو صرف اعتقادات میں منحصر کر دیا ہے اور ما کو خاص کر دیا ہے علوم یقینیہ کے ساتھ حالانکہ یہ مطابقت عام ہے۔ جمیع افعال و اعمال کو جس کی بناء یہ ہے کہ ما انا علیہ میں لفظ ما عام ہے اس میں کسی قسم کی تخصیص نہیں پس جس طرح یہ اعتقادات کو شامل ہے اسی طرح عادات اخلاق افعال اعمال کو بھی شامل ہے گویا جس طرح فرقہ ناجیہ میں داخل ہونے کے واسطے تصحیح عقائد ضروری اور لازم ہے اسی طرح اس کے دیگر متممات کا ہونا بھی ضروری اور لازمی ہے مگر آج کل بہت لوگ اس قسم کے پائے جاتے ہیں جو محض تصحیح عقائد کے بعد اہل حق ہونے کا دعوٰی کرتے ہیں اور اپنے کو "ما انا علیہ و اصحابی" کے زمرہ میں داخل کرتے ہیں حالانکہ افعال و اعمال اُن کے ایسے ہیں جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے اعمال سے کچھ بھی مناسبت نہیں اور بڑے غضب کی بات تو یہ ہے کہ یہ نام نہاد خوش اعتقاد لوگ جن بزرگوں سے تعلق رکھتے ہیں اور جن سے وابستہ ہوتے ہیں وہ بزرگ بھی صرف تصحیح عقائد پر ہی اکتفاء کرتے ہیں اور اُن اعمال و افعال سے اصلا تعرض نہیں کرتے بلکہ خوش ہو کر فرماتے ہیں کہ بھئی فلاں صاحب بڑے خوش عقیدہ ہیں یہ گویا اُن کی بڑی تعریف اور لیاقت کی توصیف ہوتی ہے۔ اور اگر اُن کے اعمال کو دیکھا جائے تو خواہ ایک فاسق سے

بھی بڑھ کر کیوں نہ ہوں مگر ان سب سے قطع نظر کر لی جاتی ہے حالانکہ اگر غور کیا جاوے تو معلوم ہو کہ بدون عمل کے یہ تصحیح اعتقاد بھی محض زبانی جمع خرچ ہے پورا اعتقاد بھی نہیں کیونکہ اعتقاد جازم کے لئے عادۃً اقتضاء الی العمل لازم ہے پس یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص کے دل میں اعتقادات شرعیہ راسخ ہوں اور عقائد میں وہ ما انا علیہ واصحابی کے طریق پر ہو اور اعمال اس قسم کے ہوں جن میں آپ کے اور آپ کے اصحاب و متبعین کے اعمال میں بون بعید ہو اور فساق دنیا داروں سے بڑھ چڑھ کر ہوں اور اس آفت کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے زمرہ میں جو لوگ اہل حق کہلاتے ہیں اُن کے اوپر یہ رحمت خدا کی ہے کہ وہ بھی "ما انا علیہ واصحابی" میں اعتقادات کو کافی سمجھتے ہیں اور اس غرض سے وہ اپنے معتقدین کے واسطے بھی صرف اسی کو کافی سمجھتے ہیں۔ اور اُن کے عادات اخلاق سے چشم پوشی کرتے ہیں جب یہ تعرض ترک کرتے ہیں اور مسامحت سے کام لیتے ہیں تو وہ بھی آزاد ہو جاتے ہیں اور جو اُن کا نفس پسند کرتا ہے وہی عمل اختیار کرتے ہیں چنانچہ بعضے اُن میں سے اہل باطل اور ہوا پرستوں کا طرز معاشرت اور دنیا داروں کا فیشن اختیار کرتے ہیں بزرگان دین کے طرز طریقہ کو ٹھکرا دیتے ہیں اہل حق کے تعلیمات کو دقیانوسی خیالات سے تعبیر کرتے ہیں تو اہل حق کی یہ سخت غلطی ہے بلکہ نفس کی ایک بڑی زبردست چال ہے کہ اس نے ان بزرگوں کو ایک غیر مستحسن شرعی کے تعرض سے باز رکھا ہے غرض جس طرح موافقت اعتقادات میں شرط ہے دیگر اعمال و افعال میں بھی ضروری اور لازمی ہے اور اس سے معلوم ہوا کہ اہل سنت والجماعۃ میں اہل حق ہونے کا وہی لوگ دعوی کر سکتے ہیں جن کے عقائد کی طرح تمام اعمال و افعال و طرز معیشت آپ کے اور آپ کے اصحاب کی طرز پر ہو اُن کے اخلاق نمونہ ہوں اخلاق نبوی کے اور اُن کی معاشرت ایسی ہی مستحسن ہو جیسی آپ کی اور آپ کے اصحاب کی تھی نیز بزرگان دین کے شعار کو جان سے زائد عزیز سمجھیں دلوں میں اُن کی قدر ہو آنکھوں میں وقعت ہو شعار اہل باطل سے نفرت ہو آجکل کے نوجوانوں کی طرح نہ ہوں کہ انھوں نے اپنے اعتقادات میں اس بات کو بھی شامل کر لیا ہے کہ اہل حق کا شعار ٹھکرا دینے کے قابل ہے اور جو نیا فیشن ایجاد ہو تو وہ بدل و

جان قبول کرنے کے لائق ہے اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ اہل حق بننے کے واسطے تو اعتقادات کی طرح اور چیزیں بھی ضروری ہیں جن کو تم چھوڑے ہوئے ہو اور یہ دعوے تمہارا اس وقت صحیح ہوگا جب کہ تم اپنے باطن کی طرح ظاہر کو بھی اہل حق کیساتھ ملالو گے اور اُن کے جیسے عادات و اخلاق اُن کا سا طرز معیشت انداز معاشرت بھی اختیار کروگے تو فوراً بادی النظر میں ایک زبردست شبہہ پیش کرتے ہیں کہ جناب اگر آپ ایسا ہی عموم کے مدعی ہیں تو پہلے اپنی ہی خیر منائیں ہماری بعد میں خبر لیجئے کیونکہ خیریت سے آپ بھی فرقہ اہل حق سے خارج ہوئے جاتے ہیں اور ما انا علیہ واصحابی کے طریق مستقیم سے ہٹے جاتے ہیں۔ چاہ کن را چاہ در پیش آپ ہمیں ہٹا ہوا بتلاتے تھے آپ خود ہٹ گئے بتلایئے کہ ایسی چولی دار اچکنیں اور سینہ کھلے ہوئے انگرکھے آپ نے اور اصحاب نے کب پہنے تھے اور اس قسم کے سلیم شاہی جوتے آپ نے اور آپ کے اصحاب نے کب پہنے تھے صفحات تاریخ اس قسم کے طرز معاشرت نبوی کے بیان کرنے سے بالکل معرا بلکہ منکر ہیں۔ یہ آپ کے غرارے دار یا تنگ موہری کے پاجامے اس کا پہننا کون سی احادیث نبویہ یا آثار صحابہ سے ثابت ہے بلکہ اوراق تاریخ پر زور دار الفاظ کے ساتھ اور احادیث واضح بیان کے ساتھ ہم کو یہ بتلا رہی ہیں کہ بحیثیت مجموعی تمام صحابہ و آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لباس مبارک میں تین کپڑے ہوتے تھے ایک تہبند اور ایک کرتہ ٹخنوں کے قریب تک اور ایک چادر اور جو لوگ بہت زیادہ غریب ہوتے تھے وہ بیچارے ایک کرتے یا ایک تہبند ہی میں گذر کرتے تھے ہاں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم و نیز متمول صحابہ سے عمامہ اور قبا کا بھی ثبوت ملتا ہے اور جوتے وہی تسمہ دار ہوتے تھے بہرحال یہ لباس اور اس قسم کے جوتے کہیں بھی پہننے ثابت نہیں ہوتے اور حضرت یہ تو فرمایئے کہ یہ پلاؤ قورمے بریانیاں اور یہ نفیس نفیس کھانے آں حضرت یا صحابہ نے کب کھائے تھے۔ اکثر اوقات آنحضرت کی بسر اوقات جو یا خرما پر تھی شاذ و نادر آپ سے گیہوں کا استعمال بھی ثابت ہے لہٰذا آپ بھی ما انا علیہ واصحابی کے طریق پر ہونے کے واسطے ان مرغن کھانوں کو چھوڑ کر نان جویں پر بسر اوقات کیجئے اور اس کے بعد اہل حق ہونے کا دعوی کیجئے لیکن یہ شبہہ بھی ہوا ہے

نفس کا ایک پیچیدہ جال ہے حل اس شبہہ کا یہ ہے کہ اگرچہ ما میں بحیثیت افراد تقسیم ہے اور ہر چیز اس میں داخل ہے لیکن پھر بھی ایک قسم کی تخصیص اس میں موجود ہے جس کے بعد مقصود اس جملہ کا یہ متعین ہوتا ہے کہ حضور کی ہیئت و وضع قطع کو ہر بات میں اختیار کیا جاوے لیکن وضع و ہیئت سے مراد محض وضع متعارف یعنی وضع فعلی ہی نہیں بلکہ اسکے تحت میں اجازت قولی بھی (جس کو اگر وضع قولی کے نام سے تعبیر کیا جاوے تو بہت مناسب ہے) داخل ہے یعنی جس طرح اس امر کو اختیار کرنا جس پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل درآمد رہا ہے ما انا علیہ کا مصداق ہے۔ اسی طرح ہر اس عمل کو اختیار کرنا جس کے اختیار کرنے کی آنحضرت نے اجازت فرمائی ہے اگرچہ حضور نے اس پر عمل نہ کیا ہو نیز ما انا علیہ کا مصداق ہے۔ اور ہر دو قسم کے اعمال ما انا علیہ یعنی وضع نبوی کے تحت میں داخل ہیں اور اہل حق بنانے کے واسطے کافی ہیں لہذا آنحضرت نے اگرچہ اس قسم کے انگرکھے اچکنیں جوتے نہیں پہنے اور اس قسم کے کھانے پلاؤ زردے نہیں نوش فرمائے لیکن اس قسم کے توسعات کے حاصل کرنے کی آنحضرت نے اجازت دی ہے جس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ یہ مسلم امر ہے کہ صحابہ سے بڑھکر کوئی ما انا علیہ پر عمل پیرا نہیں ہوسکتا بلکہ صحابہ نمونہ عمل نبوی ہیں چنانچہ خود آپ نے ان کی اقتداء کو بھی ذریعہ نجات اخروی کا قرار دیا اور صفحات تاریخ کی ورق گردانی سے یہ توسعات تنعمات صحابہ زمانہ خلافت راشدہ و عروج اسلامی میں صاف ظاہر ہیں جو کہ زمانہ ابتداء اسلام و حیوۃ نبوی میں نہ تھے۔ نیز حیوۃ نبوی میں بھی ابتداء زمانہ اسلام و انتہاء زمانہ اسلام میں صحابہ کی حالت میں تغیر ہونا اور فقر کے بعد اسباب راحت کا اختیار کرنا بالکل ظاہر و باہر ہے چہ جائیکہ بعد از حیوۃ نبویہ لہذا معلوم ہوا کہ ہر ایک قسم کے تنعمات حاصل کرنے اور خوش عیشی کے اسباب اختیار کرنے کی بشرطیکہ حدود شرعیہ میں داخل ہوں اجازت نبوی سنت قولی سے ثابت ہے لہذا اس پر عمل کرنے کے بعد بھی فرقہ اہل حق میں شمار کئے جانے کے مستحق ہیں اگرچہ سنت فعلی و خاص طریقہ عمل آں حضرت کا یہ نہ ہو لہذا جو کی روٹی کھانا سنت ضرور ہے اور اس پر عمل کرنا اعلی و افضل اور سنت خوب ہے

اگر ممکن ہو اور وسعت میں داخل ہو کیونکہ ہر ایک سنت پر عمل کرنے کا ہر ایک کا حوصلہ نہیں
اسپر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک مرتبہ حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندی کی نظر سے وہ
حدیث گذری جسمیں طرز معیشت صحابہ کا منقول ہے کہ صحابہ جو کو پیستے تھے اور پھونک کر
جو کچھ موٹے موٹے چھلکے ہوتے اُن کو اُڑا دیتے اور بغیر چھانے ہوئے ویسی ہی گوندھکر
روٹی پکاتے اور تناول کرتے تھے اگرچہ یہ حدیث سیکڑوں مرتبہ نظر سے گذری ہوگی لیکن
اس مرتبہ یہ بات قلب پر اثر کر گئی اور التفات خاص ہوا کہ کیا وجہ ہے کہ ہماری معیشت
معیشت نبوی و طریقہ صحابہ کے موافق نہ ہو اور ہم پر تکلف کھانے کھائیں تو آپ نے
تلامذہ سے ارشاد فرمایا کہ ہم بھی آج سے ایسی جو کی روٹی بلا چھنے آٹے کی کھایا کرینگے
چنانچہ مطابق ارشاد دوسرے دن جو کی روٹی اسی طرح تیار ہوئی اور آپ نے تناول
فرمائی چونکہ تمام اناج میں جو کی بھوسی سخت ہوتی ہے اور بغیر چھانے روٹی پکائی گئی تھی
اس وجہ سے سب کے پیٹ میں درد ہو گیا اور ایسی سخت تکلیف ہوئی کہ دوسرے وقت
کھانے کی ہمت نہ ہوئی اللہ اکبر ان حضرات کے مراتب عالیہ ان مقالات سے منکشف
ہوتے ہیں اگر کوئی ہم جیسا نفس پرست ہوتا تو مع یہ خیال ہوتا اور خیال کیا معنی بلکہ بہت
سے منہ پھٹ زبان سے یہ کہتے کہ میاں اچھا سنت پر عمل کیا کہ پیٹ کو ہی پکڑے پکڑے
پھرتے ہیں اگر دو چار مرتبہ اور سنت پر عمل کیا تو شاید دنیا ہی سے چل بسیں ہم باز آئے
ایسی سنت پر عمل کرنے سے مگر اُن حضرات کا ادب دیکھئے کہ آئندہ کے لئے جو کے کھانے
کو تو چھوڑتے ہیں مگر اس طرح کہ سنت نبوی پر ذرہ برابر بھی غبار نہ آنے پائے اور آپ
نے یہ بھی نہیں کیا کہ نفس کش اور سخت پیروں کی طرح سے جو کا کھانا لازم کر دیا ہو کہ جو
چاہے گذرو اگرچہ پیٹ میں درد ہو لیکن جو کھانا نہ چھوڑیں بلکہ کمال یہ کیا کہ جو بھی
چھوڑ دیا اور سنت پر بھی الزام نہ آیا آپ نے ان دونوں باتوں کو نہایت خوش اسلوبی
کے ساتھ جمع کر دیا چنانچہ فرماتے ہیں کہ ہم نے بے ادبی کی کہ من کل الوجوہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم و صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مساوات کا قصد کیا جو کہ من وجہ
مساوات کا دعوے ہے ہمارا یہ دعوے مساوات محض غلطی تھی جس کی ہم کو سزا

دیدی گئی سنت پر کسی قسم کا الزام نہیں بلکہ درحقیقت ہم میں قصور ہے کہ ان مراتب عالیہ کی تحصیل اور ان کے تحمل سے ہمارا نفس قاصر ہے یہ طریقہ حضرات صحابہ ہی کے مناسب ہے وہی اس کے متحمل تھے ہم کو اس کی ہوس نہ کرنا چاہئے چنانچہ مولانا ارشاد فرماتے ہیں ؎

چار پارا قدر طاقت بار نہ　　بر ضعیفاں قدر ہمت کار نہ

گویا اس شعر میں مولانا تعلیم فرمارہے ہیں شیوخ کو کہ طالبین سے اُن کی ہمت وطاقت کے موافق کام لو طاقت سے زیادہ کام نہ لو ورنہ ؎

طفل را گر نان دہی بر جائے شیر　　طفل مسکیں را از اں ناں مردہ گیر

بچہ کو دودھ کی جگہ روٹی دینا اُس کو ہلاک کرنا ہے حافظ شیرازی بھی اس شعر میں اس مضمون کو کس خوبی سے ادا کرتے ہیں ؎

خستگاں را چو طلب باشد و قوت نبود　　گر تو بیداد کنی شرط مروت نبود

بعض لوگ حافظ شیرازی پر بیہودہ حملے کرتے ہیں کہ صاحب وہ مدہوش شرابی کبابی تھے اُن کا کلام عارفانہ کہاں سے آیا تھا سو یہ کہنا محض اُن کی غلطی اور خباثت نفس کی دلیل ہے مگر اسمیں کچھ حضرت حافظ کی تخصیص نہیں اس قسم کے اعتراضات اہل کمال پر ہمیشہ ہوتے رہے ہیں ان سے ان کی شان پر کسی قسم کا دھبہ نہیں آتا بلکہ اور زیادہ کمال ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے علوم ایسے عالی ہیں جہاں تک ہر اک کی عقل نہیں پہونچتی حضرت حافظ کے کلام سے نہایت اہم مسائل تصوف مستنبط ہوتے ہیں ان کے کلام کی لطافت ان کے عرفان اور اہل دل ہونے کی شاہد ہے ان کی عالی دماغی اُن کے اعلیٰ مضامین سے ٹپکتی ہے یہ ناممکن ہے کہ ایک ناقابل اور غیر مستند مدہوش شخص کے کلام سے اس قدر مسائل تصوف مستنبط ہوں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ "میاں جو ہوتا ہے وہی نکلتا ہے" یعنی کسی کے مضمون یا کلام سے اعلیٰ مضامین یا پیچیدہ مسائل علمیہ اسی وقت نکالے جاسکتے ہیں جبکہ اسمیں ان مضامین کا اندراج قصداً ہو ورنہ کسی رند کے کلام سے تو تم یہ مسائل نکالدو لہذا حضرت حافظ شیرازی کے کلام سے اس قسم کے مسائل تصوف کا مستنبط ہونا ان کے شیخ کامل ہونے

کی دلیل ہے تو وہ فرماتے ہیں ؎

خستگاں را چو طلب باشد و قوت نبود گر تو بیداد کنی شرط مروت نبود

یہ بھی تعلیم ہے سخت مزاج شیوخ کو کہ وہ اپنے مریدین پر سہولت کریں اور حسب استعداد و قوت ان سے کام لیں ایسا نہ ہو کہ ان کی صحت جسمانی میں بھی نقصان واقع ہو اور دماغ بھی خراب ہو جائے پھر کسی کام کے نہ رہیں مثلاً کسی بیچارہ کا دل شوق محبت سے لبریز ہو خدا کی طلب اعلیٰ پیمانہ پر ہو لیکن ساتھ ہی ضعف و پیری کی یہ حالت ہو کہ کمر جھک گئی ہو تھوڑی دور چلنے سے سانس پھول جاتا ہو اُس کو چوبیس ہزار بار اسم ذات کا ورد کرنے کی طاقت نہ ہو وہ بیچارہ کسی شیخ کا مرید ہوا اور شیخ نے فرمایا کہ چوبیس ہزار بار ورد اسم ذات شریف روزانہ کیا کرو اس نے کہا کہ اجی حضرت چوبیس ہزار بار ورد اسم ذات کر کے میں کہاں کا رہوں گا ایک ہی دن میں مر مٹوں گا فرمایا کچھ حرج نہیں اگر مر گئے تو شہید ہو گے طلب خدا میں مشغول ہو ایسے وقت کی موت شہادت کے ثواب کا مستحق بلکہ اعلیٰ درجہ کا شہید بنا دیتی ہے خوب درست فرمایا واقعی اس بیچارہ کی شہادت میں تو کچھ کلام نہیں یہ تو ضرور شہید ہو گا لیکن آپ بھی ہوشیار رہیں اس کے شہید کرنے والے تم ہی ہو اس کو تو جام شہادت نصیب ہوا لیکن آپ کے نامۂ اعمال میں ایک قتل عمد کا جرم لکھا گیا اور قاتل کا خطاب مل گیا چنانچہ ایک شیخ تھے دہلی میں وہ تمام مریضوں کو ایک ہی لکڑی ہانکتے کسی ضعیف و قوی کا کوئی امتیاز نہیں رکھتے تھے اُنکے ہاں جوان بوڑھے سب کا وظیفہ عمل یکساں تھا چنانچہ ایک شخص مرید ہوا اُس کو آپ نے صلوٰۃ معکوس تعلیم فرمائی اُس نے شیخ کا فرمان ہرگز قابل رد و گردانی نہ سمجھا اور بے چارہ نے موافق تعلیم شیخ کے صلوٰۃ معکوس پڑھی اور دم نکل گیا تو جب اُن سے تذکرہ ہوا تو فرمایا کچھ حرج نہیں اچھا ہوا شہید ہو گیا تزکیہ نفس کامل طور سے ہو گیا اُن کی وہی مثال تھی جیسے ایک طبیب تھے مگر خدا کے فضل سے علم سے کورے اناڑی محض تھے اُن کے پاس ایک مریض آیا آپ نے اس کے واسطے مسہل تجویز کیا اور نہایت سخت اجزا تجویز کئے اور کہا کہ جا کر کھا لو اس سے دست ہوں گے مریض نے اِدھر دوا کھائی اُدھر

دست آنے شروع ہوئے جب دستوں کی تعداد متعارف سے زائد ہو گئی تو اہل خانہ کو تشویش پیدا ہوئی حکیم صاحب کے پاس گئے اور کہا حضرت دست بیحد آرہے ہیں مریض پر ضعف وقتاً فوقتاً بڑھتا جاتا ہے کہا کہ ابھی کیا ہے میاں آخر مسہل ہے کوئی ہنسی کھیل تو نہیں دست تو آویں گے ہی اور ضعف بھی ضرور ہی ہوگا۔ تم کیوں گھبرائے جاتے ہو خود بند ہو جاویں گے بیچارے چپکے ہو کر چلے گئے تھوڑی دیر اور انتظار کیا مگر دست اس بلا کے چھوٹے تھے کہ رکنے ہی کو نہیں کہتے تھے جب بہت دیر ہو گئی اور دست بند نہ ہوئے تو بہت گھبرائے اور پھر حکیم صاحب کے پاس پہونچے کہ حکیم صاحب اتنا وقت ہو چکا ہے اور مریض کا دم لبوں پر ہے دست ایک منٹ کو بند نہیں ہوتے تو جواب دیا کہ میاں مریض سے پہلے تمہارا دم نکلا جاتا ہے ارے بھئی اگر دست آرہے ہیں تو اچھا ہے مادۂ فاسد نکل رہا ہے اگر اس وقت رک گیا تو تمام عمر پریشان کرے گا وہ بیچارے پھر چپ ہو کر چلے گئے مگر دست بند نہ ہوئے حتی کہ بیچارہ کا دم نکل گیا لوگوں نے حکیم جی سے آکر کہا کہ صاحب دست نہ رکنے تھے نہ رکے آخر مریض ہی چل بسا آپ نے تعجب سے فرمایا افوہ مادے نکلنے پر تو یہ کیا اگر رکتا تو جانے کیا حال کرتا اس بے وقوف سے کوئی پوچھے کہ وہ اور کونسا حال تھا جو رکنے کے بعد ہوتا مرنے سے تو بڑھکر کوئی اور حالت نہیں انسان کے واسطے انتہائی حالت موت ہے اگر رک جاتا تو زائد سے زائد موت آجاتی تو جس طرح اس مریض کی موت کے باعث اور اس بیچارے کے قاتل یہ حکیم صاحب ہوئے اسی طرح اس مرید کو اگر درجۂ شہادت ملا مگر آپ کے نامۂ اعمال میں ایک قتل ناحق کا بدنما دھبہ لگا جو مٹائے بھی نہیں مٹ سکتا غرض حافظ شیرازی اس شعر میں اس قسم کے درشت مزاج شیوخ کو ظالم اور اس قسم کے طرز عمل کو بیداد سے تعبیر فرماتے ہیں اور شرط مروت کے خلاف سمجھتے ہیں صاحب واقعی بڑا ظلم ہے کہ یہ حضرات بیچارے مریدوں کی حالت پر ذرا غور نہیں کرتے بلکہ سب کو ایک لکڑی ہانکتے ہیں ضعفاء اور اقویاء سب کے ساتھ ایک سا برتاؤ کرتے ہیں ہمارے حضرت کا کیا پر شفقت طرز عمل تھا کہ مریدوں کی حالت کو پیش نظر رکھنا ان کے ہاں سب سے پہلا اصول تھا اگر کوئی قوی الاعضاء سلیم الصحۃ ہوتا تو اس کو

پوری مقدار پر ورد اسم ذات تعلیم فرماتے اور اگر کچھ ضعف جسمانی یا کثرت مشاغل پاتے تو حسب طاقت تعلیم فرماتے کسی کو دس ہزار کسی کو پانچ ہزار کسی کو پانچسو مرتبہ غرض جس قدر جس میں وسعت ہوتی اس کے موافق اس سے کام لیتے اور اس تشدد کو اچھا نہیں سمجھتے تھے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ یہ جو آجکل دیکھا جاتا ہے کہ مساجد میں ہر نماز کے بعد لوگ سلام پھیرتے ہی تین ضربیں "لا الہ الا اللہ" کی لگایا کرتے ہیں تو حقیقت اس کی یہ ہے کہ کسی شیخ نے اپنے کسی بہت ہی ضعیف و کمزور مرید کے واسطے بعد ہر نماز کے یہ ذکر جہر تعلیم فرمایا تھا کہ تم سے زیادہ تو کیا ہوگا بس ہر نماز کے بعد تین ضربیں لگا لیا کرو دنیا کا قاعدہ ہے کہ خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ بدلتا ہے لوگوں نے اس کو دیکھ دیکھ کر یہ طریقہ اختیار کر لیا حتی کہ اب ہر کس و ناکس ہر نماز کے بعد ایسا ہی کرتا ہے گویا ایک رسم ہے اور دنیا کی اور رسموں کی طرح اس کو بھی پورا کرتے ہیں گویا اس ذکر نے بھی ایک رسم کی صورت اختیار کر لی اور جو اصلی حقیقت اس کی تھی وہ مٹ گئی واقعہ یہ ہے کہ دنیا سے اب حقائق مٹ گئے رسوم باقی رہ گئے ہیں مگر ابتداء اس عادت کی ضعفاء کی رعایت تھی اس مذاق کے متعلق ہمارے حضرت ہی کا شعر ہے ؎

بس ہے اپنا ایک نالہ بھی اگر پہنچے وہاں گرچہ کرتے ہیں بہت سے نالہ و فریاد ہم

یعنی وصول کے لئے تو ایک دفعہ بھی اللہ کہہ لینا کافی ہو جاتا ہے کچھ زیادہ ضربیں لگانے ہی پر وصول موقوف نہیں بلکہ اس کی ضرورت ہے کہ تم اپنی ہمت کی موافق طلب ظاہر کرو جتنی جسمیں ہمت ہو اس سے زیادہ نہ کرو غرض یہ ہے کہ حضرت کی تعلیم بہت ہی آسان و سہل ہوتی تھی جس سے مرید کو کسی قسم کی گرانی نہیں معلوم ہوتی تھی نہایت خوشی سے اوراد و اشغال کو انجام دیتے تھے۔ میں تو حضرت کی تعلیم دیکھ دیکھ کر کہا کرتا تھا ؎

بہار عالم حسنش دل و جاں تازہ میدارد برنگ اصحاب صورت را بیوار باب معنی را

بس کسی کو ہلکا پھلکا کر رکھا تھا وہ ہنستا کھیلتا مقصود پر پہونچتا تھا اور کسی کو خوب جکڑ رکھا تھا۔ وہ احوال و واردات سے مغلوب تھا ؎

بگوش گل چہ سخن گفتہ کہ خندان ست بعندلیب چہ فرمودہ کہ نالان ست

کوئی قاعدہ آپ کے یہاں ایسا نہ تھا جسکی پابندی سب پر لازمی ہوتی کوئی ضابطہ ایسا نہ تھا جس کا اہتمام سب کو ضروری ہوتا بلکہ جس کو جیسا مناسب سمجھا بتلا دیا اور محققانہ شان اس سے ظاہر ہوتی تھی کہ جس کو تھوڑا کام بتلایا اُس کو وہ تھوڑا سا بھی اس قدر کافی وافی ہوتا تھا کہ تمام امراض کا وضیفہ اسی سے ہو جاتا کسی اور عمل یا ورد کی ضرورت نہیں پیش آتی تھی اللہ اکبر واقعی یہ بڑا دشوار کام ہے اور اس کے لئے بڑے محقق کی ضرورت ہے سبکو ایک لکڑی ہانکنا ناواقفی کی دلیل ہے جیسے بعض ڈاکٹر ہوتے ہیں کہ وہ امراض بخار کیواسطے عموماً کونین تجویز کرتے ہیں یہ نہیں دیکھتے کہ بخار کس قسم کا ہے فصلی ہے یا وبائی مزاج حار ہے یا یابس ضعف کس قدر ہے بس ان کی مرغی کی ایک ٹانگ جہاں بخار دیکھا اور کونین دیدی بخلاف ایک حاذق طبیب یا ماہر ڈاکٹر کے کہ وہ ہر ایک امر کا لحاظ کر لینے کے بعد مناسب دوا دیتا ہے اگر کونین مناسب ہوگی تو کونین تجویز کریگا ورنہ نہیں یا اسکا مصلح اس کے ساتھ ضرور تجویز کریگا تاکہ مرض کے اندر شدت نہ ہو اور مریض کو نقصان نہ پہونچے اسی طرح یہ طرز عمل اختیار کرنا بھی ایک بڑے محقق اور باکمال شخص کا کام ہے کہ وہ کافی طور سے اپنے مرید کے حالات سے باخبر ہو جس کو ہر پہلو پر نظر ہو تو اگر کوئی اس قسم کا درشت مزاج پیر اور ایسا ہی سخت مزاج شیخ ہوتا جن کے ہاں مریض کی حالت کی طرف نظر کرنا مخل مقصود شمار کیا جاتا ہے تو وہ یہاں بھی یہی فرماتے کہ خواہ درد ہو یا مریں کچھ بھی ہو مگر جو کھانا ہرگز نہ چھوٹے سنت نبوی کو چھوڑنا ناممکن ہے چاہے جان ہی سے کیوں نہ ہاتھ دھونا پڑے اگر مر گئے تو شہید ہو جائیں گے کیونکہ ہمارے واسطے تو عزیمت جو کھانا اور رُخ نہ کرنا ہے جیسے ایک مولوی صاحب ریل کا سفر کر رہے تھے جب نماز کا وقت آیا تو انھوں نے گاڑی سے اُتر کر نماز پڑھنے کا قصد کیا لوگوں نے منع کیا کہ حضرت اس اسٹیشن پر گاڑی زیادہ نہیں ٹھہرنے کی آپ نماز پلیٹ فارم پر نہ پڑھیں بلکہ اندر گاڑی میں آنکر پڑھ لیں اُنھوں نے فرمایا واہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ چلتی گاڑی میں نماز پڑھیں ہم تو یہیں پڑھیں گے چاہے گاڑی چھوٹے یا رہے اس قسم کی تشدد پسند ہستیاں ہمیشہ اور ہر زمانہ میں موجود رہی ہیں۔ مگر بعضے محقق بھی ہوتے ہیں چنانچہ اپنے مولوی صاحب بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ گاڑی کے اندر ہی گو جگہ تنگ

ہی ہو جس طرح سے ممکن ہو نماز ضرور پڑھے لیکن اس قسم کی نماز جسمیں رکوع یا سجدہ کے بجائے ہجوم کی وجہ سے اشارہ کیا ہو اس کا اعادہ علی سبیل الاحتیاط ضرور کر لینا چاہئے یہ نہیں کہ اتر کر ہی پڑھو جیسے اُن مولوی صاحب نے کیا تھا ان متشدد لوگوں کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ عزیمت پر عمل کرنا اصل حکم شرعی ہے اور موجب اجر کثیر ہے اور رخصت پر عمل کرنا موجب تقلیل اجر ہے اس لئے وہ رخصت پر عمل نہیں کرتے اور خیال کرتے ہیں کہ یہ رخصتیں تو سخت تنگی کے وقت عوام کے لئے ہیں کہ وہ احکام شرعیہ کی سختی سے دل تنگ نہ ہوں اور ہم تو خواص ہیں ہم خواہ مخواہ کیوں اپنے کو اجر قلیل کا مستحق بنائیں لیکن یہ اُن کی سخت غلطی ہے کہ وہ رخصت کو اصل حکم شرعی نہیں سمجھتے نیز اس کو موجب اجر قلیل خیال کرتے ہیں حالانکہ نصوص فقہیہ صراحۃً اس کے مخالف ہیں یہ مسئلہ مجمع علیہ ہے کہ رخصت و عزیمت جبکہ اپنے موقع پر ہوں اجر میں برابر ہیں اور دونوں حکم شرعی ہیں اور ہر ایک حکم اپنی خاص حالت کے واسطے حکم اصلی ہے اگرچہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ خواص کیواسطے عزیمت پر عمل کرنا اولیٰ و انسب ہے بنسبت رخصت کے لیکن اپنا تو یہ خیال ہے کہ خواص کو بھی مواقع رخصت پر بنسبت عزیمت کے رخصت پر ہی عمل کرنا اولیٰ و انسب معلوم ہوتا ہے اس وجہ سے کہ خواص کے طرز عمل کو عوام اپنے واسطے نقشۂ عمل سمجھتے ہیں ان کی پیروی جمیع افعال و عبادات میں کرتے ہیں۔ تو جبکہ خواص ایسے مواقع رخصت میں عزیمت پر عمل کریں گے اور عوام کو رخصت پر عمل کرنے کی تعلیم کریں گے تو عوام سمجھیں گے کہ اصل حکم شریعت کا یہی ہے جسکو یہ لوگ کرتے ہیں اور یہ سہل احکام بوجہ سہولت اور آسانی کے ہمکو تعلیم فرمائے گئے ہیں۔ پھر اس کے ساتھ ایک مقدمہ وہ اپنی طرف سے لگا لیتے ہیں کہ اچھی سہولت ہوئی کہ ایک طرف جس قدر آسانی بڑھائی دوسری طرف اسی قدر ثواب کم کر لیا اب وہ عوام چکر میں ہیں کہ اگر عزیمت پر عمل کرتے ہیں تو دشواری میں پڑتے ہیں اگرچہ اجر کثیر ہاتھ آتا ہے اور اگر رخصت پر عمل کرتے ہیں تو اس میں سہولت تو اگرچہ ہے مگر اجر کثیر ہاتھ سے جاتا ہے تو اُن کو یہ وسوسہ ہوتا ہے کہ ایسی آسانی سے تو وہ سختی ہی اچھی تھی کہ اُس میں یکسوئی اور اطمینان

تو ایک جانب پر تھا اگرچہ سختی و تشدد بھی تھا مگر اب تو ایک گومگو کی حالت ہوگئی کہ اسے اختیار کریں یا اسے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے ہماری مصلحت و منفعت کی تکمیل نہیں فرمائی لہذا اس قسم کے شبہات سے بچانے اور اعتقاد عوام کو صحیح و سالم رکھنے کے واسطے مناسب یہ ہے کہ خواص بھی رخصت پر عمل کریں۔ اور سخت تعجب ہے کہ خواص اپنی خصوصیت کی وجہ سے اپنے واسطے عزیمت کو ترجیح دیتے ہیں حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو کہ اخص الخواص اور احکام خداوندی پر جان دینے والے تھے جن کے نزدیک مشکل سے مشکل کام آسان تھا۔ اور اعلیٰ درجہ کی مشقت بھی سہل تھی آپ نے تو مواقع رخصت میں رخصت ہی پر عمل کیا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے "ما خیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین امرین الا اختار ایسرہما حتیٰ کہ بعض اوقات صحابہ نے رخصت کو سہل سمجھکر یہ خیال کیا کہ شاید یہ رخصت آپ کے ساتھ ہی خاص ہوگی کیونکہ آپ کا بڑا درجہ ہے آپ کو زیادہ مجاہدہ کی ضرورت نہیں اور یہ خصوصیت ظاہر ہے کہ ہم میں نہیں کجا ہم اور کجا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ ع چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ لہذا ہم آسانی اور سہولت کے مستحق نہیں ہمکو زیادہ مجاہدہ کرنا چاہیئے چنانچہ انھوں نے رخصت پر عمل کرنے سے احتراز کیا۔ اور چاہا کہ عزیمت ہی پر عمل کریں تو آپ نے انکا یہ ارادہ معلوم کرکے فرمایا کہ "ما بال اقوام یتنزہون عن الشئ اصنعہ فواللہ انی لاعلمہم باللہ واشدہم لہ خشیۃ" (متفق علیہ) اور ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے بعض صحابہ کے ایسے ہی قول و ارادہ کے موقع پر فرمایا تھا "انتم الذین قلتم کذا وکذا اما واللہ انی لاخشاکم للہ واتقاکم لہ لکن اصوم وافطر واصلی وارقد واتزوج النساء فمن رغب عن سنتی فلیس منی (متفق علیہ) چنانچہ صحابہ نے آپ کے فرمانے کے بعد رخصت ہی پر عمل کیا تو جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رخصت پر عمل کیا ہے اور صحابہ کو اسپر عمل کرنے کے واسطے امر فرمایا تو یہ خیال کرنا کہ خواص کو مواقع رخصت میں عزیمت پر عمل کرنا مناسب ہے ایک بدیہی غلطی ہے کیا کوئی یہ خیال کرسکتا ہے کہ آنحضرت یا صحابہ کرام اعمال شاقہ پر عمل کرنے سے دل تنگ ہونے والے یا شدائد میں پڑنے سے جان چرانے

والے تھے خیال تو کجا ایسا وہم بھی معصیت ہے لہٰذا معلوم ہوا کہ مواقع رخصت میں رخصت ہی اصل حکم شرعی ہے لہٰذا ہر زمانہ کے خواص کو مناسب ہے کہ وہ خود بھی مسنون مواقع پر رخصتوں پر عمل کر کے فائدہ اٹھائیں اور دوسروں کو بھی تعلیم کریں تاکہ وہ بھی ان خداداد سہولتوں سے فائدہ مند ہوں اور یہ خیال نہ کریں کہ رخصت اصل حکم شرعی نہیں اور نہ اسکا خیال کسی دوسرے کو ہونے دیں نہ اپنے کسی قول سے نہ کسی فعل سے تاکہ لوگوں کی احکام شرعیہ پر عمل پیرا ہونے کی رغبت بڑھے اور نہایت فرحت وانبساط کے ساتھ احکام کو قبول کریں جیسے دیوبند کے دو بزرگوں کا واقعہ ہے جنمیں ایک اکبر تھے ایک کبیر وہ اکبر مرض وفات میں وضو کیا کرتے تھے اُن سے کبیر نے کہا کہ حضرت آپ وضو ایسی حالت میں کیوں کرتے ہیں آپ کے واسطے تو اس وقت تیمم کرنا جائز ہے۔ آپ تیمم کیجئے تاکہ اس مشقت سے نجات ملے انھوں نے کہا کہ میں عزیمت پر عمل کرتا ہوں اُن کبیر نے کہا کہ مولانا اسوقت آپ کا تیمم نکرنا اس خیال سے ناشی ہے کہ آپ تیمم کو وضو کی برابر طہارت کاملہ نہیں سمجھتے ناقص سمجھتے ہیں اور یہ درحقیقت شریعت پر ایک اعتراض ہے کہ شریعت نے ایک عمل ناقص کو ہمارے لئے تجویز فرمایا اور اس خیال سے عزیمت پر عمل کرنا باعث اجر نہیں چنانچہ وہ سمجھ گئے اور پھر رخصت پر عمل شروع کر دیا تو دیکھئے تیمم کرنا رخصت تھا ان بزرگ نے اس پر عمل نہ کیا اور برابر عزیمت پر عمل کرتے رہے اور وضو کو ہی اصل حکم شرعی سمجھتے رہے حالانکہ قرآن شریف میں خداوند تعالیٰ نے ایسے مواقع تکلیف میں تیمم کرنے کی اجازت عطا فرمائی ہے جس سے معلوم ہوا کہ ان مواقع میں تیمم وہی کام دیتا ہے جو وضو سے ہوتا ہے یعنی جس طرح وضو کرنے سے طہارت کاملہ حاصل ہوتی ہے اسی طرح تیمم کرنے سے بھی طہارۃ کاملہ حاصل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ خداوند تعالیٰ نے اجازت تیمم کے بعد اس کی علت تطہیر وتمام نعمت بیان فرمائی ہے فرماتے ہیں۔ ولکن یرید لیطہرکم ولیتم نعمتہ علیکم جس سے معلوم ہوا کہ تیمم سے طہارت کاملہ حاصل ہو جاتی ہے اور اسمیں ایک اور مزید انعام ہے جو اس وقت کے وضو میں نہ تھا یعنی اتمام نعمت (بالتفسیر الآتی) گویا تطہیر کے ساتھ ہی اتمام نعمت بھی

مقصود ہے چنانچہ اسی اتمام نعمت پر لعلکم تشکرون کا ترتب فرمایا ہے یہ سب سے بڑا نکتہ ہے رخصت میں اور اسمیں اشارہ ہے اس طرف کہ ہمارا مقصود تمہیر انعام و احسان کرنا بھی ہے تاکہ تم کو دل و جان سے شکر کی توفیق ہو اس وجہ سے کہ جب تم تیمم کروگے اور یہ تیمم ہمارا ایک انعام اور احسان ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ جب کوئی کسی پر احسان کرتا ہے یا انعام دیتا ہے تو منعم علیہ منعم کا شکریہ ادا کرتا ہے لہذا تیمم کرکے بیساختہ ہمارا شکریہ ادا کروگے کہ سبحان اللہ کیسی رحمت اور شفقت ہے کہ حق تعالیٰ ہماری تکلیف کو گوارا نہیں فرماتے قدم قدم پر آسانی کردی ہے یہ بات وضو کرکے بھلا کہاں حاصل ہوتی ہمارے حضرت حاجی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ میاں اشرف علی پانی خوب ٹھنڈا پیا کرو گرم پانی نہ پیا کرو کیونکہ گرم پانی پیوگے تو اگرچہ زبان سے الحمد للہ نکلیگا لیکن اندر سے دل شریک نہ ہوگا۔ حق شکر ادا نہ ہوگا اور اگر ٹھنڈا پانی پیوگے تو ایک زبان ہی سے الحمد للہ نہ نکلیگا بلکہ ہر بن مو سے الحمد للہ نکلیگا طبیعت خوش ہو جائیگی دل باغ باغ ہوگا اب جو شکر ادا ہوگا وہ اعلیٰ درجہ کا ہوگا تو اسی طرح وضو کرنے میں سخت دشواری و مشقت پیش آنیکا یقین ہے اور دل وضو کرنے سے گھبراتا ہے تو ایسے وقت تیمم کرنے سے کسقدر طبیعت خوش ہوگی اور کس قدر شکر ادا ہوگا ظاہر ہے کہ اس رخصت کے بدولت سردی سے بچے طرح طرح کی کلفتوں سے نجات ملی اگرچہ وضو کرلینا بھی ممکن تھا جو کچھ ہوتا دیکھا جاتا لیکن دل کا ہراس اور مرض کا ظن غالب دل کو پریشان کرنے کے واسطے کافی تھا غرض تیمم کے وقت تیمم کرنے سے لازمی طور پر دل سے شکر نکلتا ہے اور ایک شکر نہیں بلکہ ہر رگ و پے اور ہر سانس سے شکر ہی شکر خداوند تعالیٰ کا ادا ہوتا ہے اور یہ تجربہ و مشاہدہ ہے کہ شکر باعث ازدیاد محبت ہوتا ہے اسوجہ سے کہ شکر کا ترتب نعمت و احسان پر ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ منعم و منعم علیہ میں ازدیاد محبت کا اعلیٰ ذریعہ مشاہدہ احسان و نعمت ہوتا ہے لہذا شکر بھی دلیل ازدیاد محبت ہے اور ہر فرد بشر اور ہر ہر طریقہ کا مقصود محبت خداوندی ہے تو رخصت پر عمل کرنے میں ایک مصلحت یہ ہوئی کہ اس سے حق تعالیٰ کی محبت بڑھتی ہے۔ لیکن اس پر یہ شبہہ نہ کیا جاوے کہ کیا مصائب

سے محبت نہیں بڑھتی عارفین اہل مصیبت تو مشاہدہ کر رہے ہیں کہ ہم کو تو ہر مصیبت موجب ازدیاد محبت ہوتی ہے تو سمجھ لو کہ مصیبت بھی زیادت محبت کا سبب ہوتی ہے لیکن سب مصائب نہیں بلکہ بعض اور بعض مصائب موجب ازدیاد محبت نہیں ہوتے اب رہا اس کا معیار اور مصائب موجب للمحبۃ وغیر موجب للمحبۃ میں طریق امتیاز سو سمجھو کہ مصائب دو قسم کے ہیں ایک تو وہ مصائب جو منجانب اللہ نازل ہوتے ہیں جنمیں بندے کے کسب کو بالکل دخل نہیں ہوتا بلکہ انکا منشا محض مشیت ایزدی ہوتی ہے اس قسم کے مصائب تو واقعی اہل محبت کے لئے ہمیشہ موجب ازدیاد محبت ہوا کرتے ہیں چنانچہ اہل محبت میں سے بعض لوگوں کے ماں باپ عزیز اقارب مرتے ہیں اور اس سے اُن کو تکلیف بھی ہوتی ہے لیکن انکا جو معاملہ خداوند تعالیٰ کے ساتھ ہوتا ہے بحالہ باقی رہتا ہے اس میں کسی قسم کا نقصان نہیں آتا۔ کیونکہ انھیں یقین ہے کہ خدا نے اس کی عمر اتنی ہی لکھی تھی اسکی موت ہی وقت مقدر تھی اپنی موت سے مرگیا اور ایک وہ مصائب ہوتے ہیں جو بندہ پر اس کے کسب و اختیار سے آتے ہیں۔ خود وہ یا اُس کا فعل نزول مصائب کا سبب بنتا ہے اس قسم کے مصائب موجب ازدیاد محبت نہیں ہوتے چنانچہ مشاہدہ ہے لہٰذا اگر کوئی شخص باوجود تیمم کے جائز ہونے کے وضو کرے اور کہے کہ یہ عمل شاق ہے اس سے نفس کو تکلیف پہونچتی ہے اس لئے اس سے محبت خداوند تعالیٰ کی بڑھے گی چنانچہ بعض لوگ ایسے موقع پر کہا کرتے ہیں کہ بھئی اسوقت ہمنے باوجود مشقت کے وضو کیا تھا تو خوب مزا آیا طبیعت خوش ہوگئی۔ قلب منور ہوگیا۔ تو وہ سمجھ لے کہ یہ بھی نفس کا ایک بہت بڑا وسوسہ ہے کہ انسان اس سرور و لطف کو سرور محبت خداوندی سمجھتا ہے حالانکہ یہ سرور محض حظ نفس ہے اور یہ نور محض عجب نفس کی روشنی ہے یہ بھی نفس کی ایک زبردست تلبیس اور مکاری ہے کہ وہ اس نور کو نور الٰہی اور اس سرور کو سرور محبت خداوندی بتلاتا ہے۔ حالانکہ اس سرور کا منشاء صرف اپنی ہمت پر ناز کرنا ہے ورنہ اصل سرور وہ ہے جو انسان کو حدود شرعیہ میں رہکر عمل کرنے سے حاصل ہو اور اس پر فرحت بخش اثر پیدا ہو وہی ہے تو حقیقی

جس کو محبت الٰہی سے تعبیر کیا جاتا ہے جو کہ مقصود سالک ہے اسی طرح یہاں اگر کوئی ایسا ہی نفس کے فریب میں پھنسا ہوا ہوتا تو کہتا کہ جو ہی کھاؤ چاہے مر ہی کیوں نہ جاؤ اس مرنے میں ایسی لذت ہوگی جو تمام لذائذ حیات سے بہتر ہے اور ایسا لطف آئے گا کہ تمام عمر اس کا سرور نہ جائیگا محبت الٰہی سے سینہ روشن ہو جائیگا مگر یہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوتا بس یہی کہ چند روز عمل کرنے کے بعد سنت سے انقباض ہو جاتا سنت کی وہ وقعت جو ابتداء میں بغیر عمل کئے تھی وہ بھی نہ رہتی گویا یہ عمل بالسنۃ مفضی ہونا ترک سنت بلکہ انقباض عن السنۃ کی طرف اور اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ کیا ہے اس وقت ایک اور دقیقہ یاد آیا جس سے اس مقام کی توضیح میں کافی بصیرۃ ہو جائیگی وہ یہ کہ جو شخص کسی فعل عزیمت کو اختیار کرتا ہے اور اعمال شاقہ پر عمل کرتا ہے تو سکا لازمی اثر یہ ہوتا ہے کہ یہ شخص اس عمل سے فارغ ثمرات کا انتظار شروع کرتا ہے اور ثمرات بھی وہ اعلیٰ پیمانہ کے جو اس عمل کے مناسب ہوں یعنی خیال کرتا ہے کہ میری مشقت اور کام کی دشواری تو ظاہر ہے لہذا اس مشقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے مجکو ثمرہ مساوی ملنا چاہئے بخلاف اس شخص کے جو رخصت اور امر سہل پر عمل کرے گا یہ شخص نہ تو اس عمل سے فارغ ہو کر ثمرہ کا منتظر ہوگا اور نہ کسی خاص اثر اور نتیجہ کا طالب ہوگا اس وجہ سے کہ وہ سمجھتا ہے کہ میں نے عمل ہی کیا کیا ہے میں نے تو خود ہی رخصت پر عمل کیا ہے اور سہولت و آسانی کو تلاش کیا ہے جب کوئی کام ہی نہیں کیا تو ثمرات ہی کیا ملتے مثلاً ایک شخص ہے کہ دس پانچ ہزار بار ورد اسم ذات کرتا ہے لیکن ساتھ میں سوتا بھی ہے کھاتا بھی ہے پیتا بھی دیگر مشاغل دنیوی کو بھی انجام دیتا ہے غرض کہ وہ عمل کرتا ہے لیکن اس سہولت کے ساتھ کہ نفس پر شاق نہیں گذرتا اور ایک وہ شخص ہے جو کہ اعلیٰ مقدار پر ذکر اسم ذات کرتا ہے۔ اور مجاہدہ بھی کرتا ہے سوتا بھی نہیں کھانا بھی سد رمق ہی کھاتا ہے مشاغل دنیوی سے احتراز کرتا ہے تعلقات دنیوی سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔ غرضکہ اعلیٰ پیمانہ پر سلوک کو طے کر رہا ہے جمیع مندوبات و ضروریات پر نہایت پابندی سے عمل کرتا ہے یہ شخص اپنے ہر ہر فعل اور

عہ
قلت وقصور بصیرۃ فی النفس
یا فی بادی الرای قبل ان یمس
رسوخ الرخصۃ فی النفس عن
الفریضۃ مشقۃ فی ذوق کما
قال اوجب ان یزید ما تسا
دین فلیحرر ۱۲ ط
قلت فی النفس من الخلوص
کان یاتی بالنفس فی الخلوص
النفس اما ما یوجبا اعتبار
وجہ تشبیہ ۱۲ شرف

ہر ہر مجاہدہ کے بعد منتظر ثمرہ عظیمہ و انعامات کثیرہ کا رہتا ہے اور انتظار ہی نہیں بلکہ وہ خود بخود ہی اپنے اعمال کی مشقت کو دیکھکر ثمرات و انعامات کا تعین بھی کر دیتا ہے کہ مجھے کشف ہو بسط ہو واردات ہوں مراتب علیا حاصل ہوں اور جسقدر انتظار کی گھڑیاں زیادہ گذرتی جاتی ہیں اور ان ثمرات مجوزہ کے حاصل ہونے میں دیر لگتی ہے تو یہ شخص منقبض ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ جس قسم کے ثمرات میرے ان اعمال پر مرتب ہونے چاہئیں تھے۔ جنکا میں مستحق تھا مجھے وہ نہیں ملے بلکہ استحقاق سے کم دیا گیا حق شناسی سے کام نہیں لیا گیا بخلاف اول الذکر شخص کے کہ وہ کسی امر کا منتظر نہیں اور خیال کرتا ہے کہ میں نے کیا ہی کیا ہے جو مجکو انعام ملے یا کوئی ثمرہ مرتب ہو اب اس حالت میں اس کو جو کچھ بھی ملیگا اس کو غنیمت سمجھیگا اور محض انعام ایزدی و فضل یزدانی سمجھیگا اور اس نعمت و احسان پر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کریگا کہ منعم حقیقی نے مجکو نعمت بیکراں عطا فرمائی جسکا میں مستحق بھی نہ تھا غرضکہ یہ ہمیشہ شاکر رہیگا اور وہ شاکی لہذا معلوم ہوا کہ جو سہولتیں شریعت میں دی گئی ہیں ان پر عمل کرنا موجب ازدیاد شکر ہے اور ازدیاد شکر سے ازدیاد محبت ہوتا ہے لہذا شرعی آسانیوں پر عمل کرنا چاہیئے تاکہ خدا کی محبت زیادہ ہو مگر آسانیوں کا یہ مطلب نہیں کہ بالکل نفس کے مطیع ہو جاؤ کہ جس امر میں نفس کو آسانی معلوم ہوئی اسی کو اختیار کر لیا اور باقی احکام کو پس پشت ڈال دیا جیسے کسی اکال نے کسی سے پوچھا تھا کہ تم کو کلام مجید میں کونسی آیت زیادہ پسند ہے اس نے کہا کہ کلوا واشربوا۔ تو دیکھئے اس کا نفس چونکہ کھانیکا شیدا تھا لہذا تمام اوامر قرآنیہ میں سے آپ کو یہی دو امر پسند آئے کیونکہ اس آیت کے مضمون سے نہایت سہولت و اطمینان کے ساتھ کھانے کو ملتا ہے سو سہولت سے اس قسم کی سہولت مراد نہیں اور نہ یہ محمود ہے بلکہ شرعاً مذموم ہے ہاں وہ سہولت محمود ہے جو حدود شرعیہ میں رہکر خود شارع علیہ السلام نے بطور انعام عطا فرمائی ہیں نہ کہ شریعت سے بھی ایک ہاتھ آگے بڑھ جاؤ میرے ایک دوست تھے وہ کہتے تھے کہ علی الاطلاق اعمال شاقہ کرنے میں اجر زائد ملتا ہے میں نے ان سے پوچھا کہ یہ مطلق

ہے یا مقید انھوں نے کہا کہ نہیں اعمال شاقہ مطلقاً ہی موجب اجر جزیل ہیں اتفاق سے عصر کی نماز کا وقت آگیا تو میں نے ان سے کہا کہ اب نماز کے واسطے وضو کرنے کے دو طریق ہیں ایک تو یہ کہ یہیں مسجد کے کنوئیں سے پانی لیکر وضو کیا جاوے اور دوسرا یہ کہ جلال آباد سے پانی لاکر وضو کیا جاوے بتلایئے کون سی صورت اختیار کرنا مناسب ہے انھوں نے کہا یہی مناسب ہے کہ مسجد کے کنوئیں سے پانی لیکر وضو کیا جاوے میں نے کہا اب وہ آپ کا اطلاق کہاں گیا کیونکہ مشقت تو اسمیں زائد ہے کہ جلال آباد سے پانی لاکر وضو کیا جاوے تو بات یہ ہے کہ مطلقاً مشقت کو موجب اجر زائد کہنا غلط ہے بلکہ اول تو یہ مقاصد کے ساتھ مخصوص ہے اور جو چیزیں کہ قربات یا اعمال مقصودہ بذاتہا نہیں ہیں بلکہ شرائط وغیرہ نہیں ان میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ہمیشہ سہولت ہی کو اختیار فرمایا ہے چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ "ماخیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی امرین الا اختار ایسرہما الخ" لہذا اسی حدیث کے موافق ہم کو یہی عمل کرنا چاہیئے کہ ایسے مواقع پر رخصت ہی کو اختیار کریں چنانچہ وضو بھی قربات مقصودہ سے نہیں بلکہ شرائط صلوٰۃ میں سے ہے لہذا اس کے بارے میں سہولت کو اختیار کرنا مناسب ہے دوسرے مقاصد میں بھی جس محل میں رخصت میں کوئی شرعی مصلحت ایسی ہو جو کہ عزیمت میں نہ ہو وہاں مشقت اور عزیمت اختیار نہیں کی جاتی بلکہ رخصت و سہولت کو ترجیح ہوتی ہے اور جیسے وضو قربت مقصودہ نہیں اسی طرح جو کا کھانا بھی گو سنت نبوی تو ضرور ہے اور تعامل صحابہ بھی یقیناً ہے لیکن یہ قربات میں سے نہیں بلکہ عادات میں سے ہے اور وہ بھی ان لوگوں کے واسطے جو قوی المعدہ تھے تو اب جو لوگ اپنے اوپر یہ اعتماد رکھتے ہیں کہ بے پچنے جو کھانے سے ان کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی پیٹ کو پکڑے پکڑے نہ پھریں گے ان لوگوں کے واسطے جو کھانا مضائقہ نہیں بلکہ اولیٰ و انسب ہے۔ اور نیت اتباع کے ساتھ باعث ثواب کثیر ہے اور اگر ضعیف المعدہ حضرات نے سنت نبوی پر عمل کرنے کے شوق میں آکر ایک وقت بے پچنے جو کی روٹی کھائی اور شام کو جب نماز کے واسطے کھڑے ہوئے

تو پیٹ میں ایسا درد شدید ہوا کہ قیام پر بھی قادر نہ ہو سکے بیٹھکر نماز پڑھنا پڑی تو ان جوؤں اور پھلکوں کے کھانے میں اُن کو اتنا ثواب و اجر کثیر نہ ملیگا جسقدر ترک قیام سے فضیلت نماز فوت ہوگئی اور اپنے ہاتھوں ہوئی مگر جو کے کھانے سے اس طرح احتراز کرنا کہ سنت نبوی پر بھی کوئی الزام نہ آئے اور جو کا کھانا بھی ترک ہو جائے یہ اصداد کا جمع کرنا ہے یہ انھیں حضرات کا کام تھا سبحان اللہ کیا لطیف طریقہ سے دست کشی فرمائی کہ بھائی ہم نے گستاخی کی اور بے ادبی سے کام لیا کہ جو کھائے گویا ہمنے مساوات شان نبوی و صحابہ کا دعوی کیا کہ جو امر ان کی شایان شان تھا۔ اس کو اختیار کیا حالانکہ ہم میں وہ قوت کہاں ہے کہ اس قسم کے مجاہدہ کر سکیں یہ انھیں حضرات کی ہمتیں تھیں جو ہم لوگوں کے واسطے نمونہ عبرت پیش کر گئے غرض عمل بالسنۃ کے معنی یہ ہیں کہ حضور کے حکم کی مخالفت نہ ہو باقی عمل میں پوری مطابقت لازم نہیں کہ عادات و معمولات کو بعینہا ادا کیا جائے پس ما انا علیہ و اصحابی کے عموم و اطلاق پر جو شبہ وارد ہوتا تھا کہ آج کل جس قدر بھی ملبوسات ماکولات ہیں یہ تو سب ہی سنت نبوی و تعامل صحابہ کے خلاف ہیں تو ہندوستانی جوتا بھی ما انا علیہ کے تحت میں داخل نہیں جس طرح انگریزی داخل نہیں اور اسی طرح اچکن انگرکھے جس طرح کوٹ پتلون داخل نہیں پھر کیا وجہ ہے کہ اس زمانہ کے مولوی ہم کو کوٹ پتلون اتارنے پر مجبور کرتے ہیں اور خود اچکنیں اور انگرکھے نہیں اتارتے سو بفضلہ تعالیٰ اس تقریر سے اس شبہ کا دفعیہ طالب حق کیواسطے کافی ہوگیا اور معلوم ہوگیا کہ ما کے تحت میں دو قسم کے امور داخل ہیں ایک فعلی یعنی جسپر تعامل آنحضرت کا اور صحابہ کا رہا ہے اور ایک قولی یعنی جسپر عمل تو آپ کا ثابت نہیں لیکن ان کی اجازت صراحۃً آپ نے دی ہے یا کسی کلیہ کے تحت میں داخل ہیں بشرطیکہ کوئی دلیل شرعی حرمت کی موجود نہ ہو پس اس اصل پر ہندوستانی جوتہ تو اجازت کے تحت میں آسکتا ہے بخلاف انگریزی جوتہ کے کہ اسمیں تشبہ بالکفار علت حرمت موجود ہے اسکا جواز کسی طرح ثابت نہیں مگر پھر بھی بعض لوگ اہل حق ہونے کا دعوی کرکے لباس و وضع میں اہل حق کا طرز اختیار نہیں کرتے حالانکہ معیار اہل حق ہونے کا اور فرقہ ناجیہ کے زمرہ میں داخل

ہونے کا یہی تھا کہ جمیع امور میں ما انا علیہ واصحابی پر عامل ہوں اس کے جمیع اجزاء کو ضروری اور لازمی سمجھنا چاہئے کسی ایک جزو کو کافی سمجھکر دوسرے جزو کو نہ چھوڑ دینا چاہئے جیسے ان حضرات نے جملہ امور میں سے اصل اصول اور جزو اعظم یعنی اعتقادات کو کافی سمجھکر تصحیح اعتقاد ہی کو معیار اہل حق ہونے کا بنا رکھا ہے اور اپنی جماعت میں ہر صحیح الاعتقاد شخص کو بلا تعرض افعال و اعمال کے داخل سمجھتے ہیں حالانکہ یہ نص شرعی کے صریح مخالف ہے جیسا اوپر مذکور ہو چکا اسی اصل پر اس آیت کا مضمون ہے جسکی تلاوت کی گئی ہے اس میں بتلا دیا گیا کہ محض علم کافی نہیں عمل بھی ضروری ہے اسی پر تنبیہ کرنے کے لئے صرف اثبات آخرت پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ ساتھ ہی دنیا کی خست و دناءت کو بھی بیان فرمایا تاکہ اس کا استحضار مفضی الی العمل ہو جیسا کہ اس کا بھی بیان ہو چکا ہے کہ علم سے مقصود عمل ہی ہوتا ہے اور میں یہ دعوی ہر علم میں کرتا ہوں تفصیل اس کی یہ ہے کہ ما ہذہ الحیوٰۃ الدنیا الخ کا بیان کرنا صاف دلیل ہے اس امر کی کہ مقصود محض اعتقاد و وقوع آخرت نہیں بلکہ اعراض عن الدنیا و استحضار فناء دنیا بھی مقصود ہے ورنہ اگر صرف اعتقاد معاد ہی مقصود ہوتا تو اس مضمون کے ادا کرنے کے واسطے تو آیتہ "ان الدار الآخرۃ لہی الحیوان لو کانوا یعلمون" بہت کافی تھی باوجود اس کے پھر جگہ جگہ اس مضمون کو اس آیت کے ذیل میں بیان کرنا میرے دعوے کی روشن دلیل ہے ورنہ لازم آئیگا کہ یہ آیت بلا کسی فائدہ کے طول لاطائل میں داخل ہو حالانکہ اس قسم کا خیال کرنا بھی کلام باری کی نسبت معصیت ہے علوم کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جنکا علم فی نفسہ بھی مقصود ہے اور دوسری قسم وہ جنکا علم مقصود برای اعمال ہے ان دو قسموں میں سے ثانی قسم میں تو ہم اور عامہ اہل علم دونوں شریک ہیں کہ جس طرح ہم اس جگہ اعمال و علوم دونوں کو مقصود قرار دیتے ہیں اسی طرح وہ بھی ہماری موافقت کرتے ہیں اور دونوں کو مقصود میں داخل کرتے ہیں گو لنفسہ و لغیرہ کا فرق ہو مثلاً طریقہ وضو کا علم حاصل کرنا کہ یہ خود مقصود بالذات نہیں بلکہ اسوجہ سے مقصود ہے کہ یہ طریقہ ہے ادائے فریضہ کا جو شروط صلوٰۃ میں سے ہے لہذا صرف وضو کے طریقہ کا جان لینا اتفاقاً کافی نہ ہوگا بلکہ

وضو کرکے جب نماز ادا کرلی جاوے گی اس وقت مقصود کی تکمیل ہو گی یہ مسئلہ تو مجمع علیہ و مسلم ہے رہی پہلی قسم علم کی جسکا علم فی نفسہ بھی مقصود ہے اس میں عامہ اہل علم صرف علوم ہی کو مقصود قرار دیتے ہیں اور ان کو اعمال کے لئے کسی درجہ میں مقصود نہیں سمجھتے جیسا کہ مسئلہ مبحوث عنہ سے واضح ہے اور ہم یہ کہتے ہیں کہ اس جگہ گو علوم مقصود اصلی اور مطلوب بالذات ہیں لیکن اعمال بھی مقصودیت میں شرکت رکھتے ہیں اور ان کی تعلیم اس لئے بھی کی گئی ہے تاکہ اعمال میں ان سے کام لیا جائے۔ بغیر اس کے تکمیل مقصود نہیں ہوتی چنانچہ سورۂ حدید کی ایک آیت سے اس مضمون کا پتہ چلتا ہے خداوند تعالیٰ مسئلہ تقدیر کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں کہ "وما اصابکم من مصیبۃ فی الارض ولا فی انفسکم الا فی کتاب من قبل ان نبرأہا ان ذلک علی اللہ یسیر" یعنی جو کچھ بھی دنیا میں ہوتا ہے خواہ وہ تصرف نفوس میں ہو یا اس کے ماسوا میں یہ سب کچھ کتاب خداوندی میں قبل از پیدائش خلق لکھا جا چکا ہے لہذا کوئی تصرف دنیا میں مخالف مرقوم فی الکتاب کے نہیں ہو سکتا آگے اس کتابت کی غایت بیان فرماتے ہیں "لکیلا تاسوا علی ما فاتکم" یہ لام متعلق ہے اخبر کے یعنی تم کو ہم نے جو یہ مسئلہ تعلیم کیا ہے اور یہ تحریر فی الکتاب کی اطلاع دی ہے اس کی غرض و غایت یہ ہے کہ اس علم کے بعد اشیاء مفقودہ پر تم کو حزن و ملال نہ ہو۔ اور اشیاء حاصلہ و موجودہ پر فرحت بصورت تکبر و غرور نہ ہو اور فقدان اشیاء مرغوبہ پر تاسف و رنج و ملال کا نہ ہونا معنون اور حاصل ہے صبر کا اور صبر ایک عمل مامور بہ ہے۔ لہذا اس نہی عن الحزن سے مقصود امر ہے صبر کا گویا حاصل یہ نکلا عمل صبر کی تکمیل کی غرض سے ہم نے تم کو مسئلۂ قدر کی اطلاع دی ہے تکمیل صبر کے واسطے یہ خبر لازمی ہے کیونکہ بدون مسئلہ قدر کے مسئلۂ صبر تام نہیں ہوتا ان دونوں میں اچھا خاصہ علاقۂ لزوم ہے چنانچہ اس لزوم کے واسطے مشاہدات مؤید ہیں کہ اگر آج کسی قائل تقدیر مومن بالقدر کا لڑکا مر جاوے اس کو صبر بہت جلد حاصل ہو جاویگا بخلاف ایک منکر تقدیر کے کہ وہ ہمیشہ اس اندوہناک حادثہ پر قلق و تاسف میں رہے گا کہ افسوس علاج میں قصور ہوا فلاں حکیم کا علاج کرتا تو ضرور آرام ہو جاتا فلانے ڈاکٹر

کے علاج سے فلاں مریض کو آرام ہوا تھا اگر میں بھی اس کا علاج کرتا تو یقیناً آرام ہوتا غرض یہ حسرت اس کے واسطے لازم غیر منفک ہو جائیگی اور کس طرح زائل ہو سکتی ہے جبکہ خود ارشاد باری اس قسم کے باطل العقیدہ لوگوں کے متعلق یہ ہے "لیجعل اللہ ذلک حسرۃ فی قلوبھم" تقریر مقام کی یہ ہے کہ منافقین جو یہ کہتے ہیں کہ "لو کانوا عندنا ما ماتوا وما قتلوا الخ" یہ کہنا ان کا محض عدم ایمان علی القدر کی دلیل ہے چنانچہ دوسری جگہ فرمایا ہے کہ اگر تمہارا یہی خیال ہے کہ ان مقتولین کے قتل کا باعث ان کا میدان مبارزت میں جنگ کی غرض سے جانا ہے اور اپنے شہروں اور مکانوں میں رہنا موت سے بچا سکتا ہے تو پھر مہربانی کرکے ذرا تم اپنے نفسوں سے تو موت کو روک دو تم تو کہیں میدان کارزار میں نہیں جاتے پھر گھروں میں بیٹھے بیٹھے کیوں مر جاتے ہو لہذا معلوم ہوا کہ نہ میدان کارزار میں جانا موجب موت ہو سکتا ہے اور نہ گھر میں رہنا مانع موت ہو سکتا ہے بلکہ موت تو خدا کے اختیار میں ہے اور مرقوم فی الکتاب ہے جس وقت اجل مقررہ تمام ہو جائیگی خواہ مکانوں کی بند کوٹھریوں میں ہوں خواہ میدان کارزار میں ہوں موت کے چنگل سے رستگاری ہرگز نہیں ہو سکتی "ولو کنتم فی بروج مشیدۃ لیکن چونکہ یہ منافقین منکرین تقدیر ہیں اس وجہ سے ان کو حکم خداوندی پر صبر آ نہیں سکتا بلکہ ہمیشہ حسرت ہی میں مریں گے کہ ہائے ہمارے عزیز میدان میں نجاتے تو مارے نہ جاتے زندہ ہی رہتے لہذا معلوم ہوا کہ جو شخص منکر تقدیر ہے اس کو کبھی صبر نہیں آئیگا بلکہ ہمیشہ قلق و اضطراب میں رہیگا اور علاج ہی کی کوتاہی اور تدبیر علاج ہی کا قصور بتلاتا رہیگا بخلاف اس شخص کے جو سچے دل سے تقدیر پر ایمان لایا ہے اور تمام تغیرات و تصرفات احیاء و اماتت کو خدا کی طرف منسوب کرتا ہے اور مرقوم فی الکتاب ہونے کا قائل ہے گو یہ شخص بھی باقتضاء طبعی وفات ولد و زوجہ وغیرہ پر حزن و ملال کا اثر اپنے قلب میں پائیگا اور اسکا نفس بھی کسی وقت نقص علاج وغیرہ کو سبب بنا کر پیش کریگا۔ لیکن معاً اس کو یہ خیال پیدا ہوگا کہ درحقیقت اس کا وقت ہی آ گیا تھا حیات مستعار ختم ہو چکی تھی اور اسے نفس جس طرح اس کی عزیز عمر اسی ساعت تک مقدر تھی اور اس کے بعد کوئی سانس

اس کے واسطے باقی نہیں رہا تھا۔ اسی طرح نقص علاج بھی اس کے واسطے مقدر تھا اور جب اس کی موت کے واسطے خداوند تعالیٰ نے عالم ظاہر میں نقص علاج ہی کو علت بنایا تھا تو کوئی قوت دنیا میں ایسی نہ تھی جو اس کے نقصان علاج کو پورا کر دیتی بس اس کے بعد اس کو بالکل صبر آجائیگا اور کسی قسم کا رنج و ملال قلق و اضطراب کا اثر اس کے قلب پر نہ رہیگا غرض دیکھئے کہ اگر یہ مسئلہ قدر ان مسائل میں سے ہے جن کا علم مقصود بالذات ہوتا ہے اور جن کا علم جزو ایمان ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اس سے تحصیل صبر کا بھی مقصود ہونا نص سے ثابت ہے جو کہ بمنزلہ دیگر اعمال کے ایک عمل ہے لہٰذا اس آیت سے تائید ہوتی ہے میرے اس قول کی کہ علوم مقصودہ فی حد ذاتہا بھی تتمیم اعمال میں موثر ہیں۔ اور اُن کی تعلیم سے اصلاح اعمال بھی مقصود ہے پس در اصل صحیح الاعتقاد وہ ہے جسکے اعتقاد کا اثر عمل میں بھی ظاہر ہو گیا ہو ورنہ وہ ناقص الاعتقاد ہے اور اصلی معنی میں صحیح الاعتقاد نہیں نیز اس مضمون کی تائید ایک حدیث نبوی سے بھی ہوتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ خداوند ذوالجلال والاکرام آخر شب میں نزول فرماتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک خبر ہے مقصود اس سے نزول خداوندی کی اطلاع دینی ہے لیکن اس کو موقع احیاء لیل میں فرمانا دلیل ہے اس کی کہ اس سے محض خبر ہی مقصود نہیں بلکہ مقصود اس سے ترغیب ہے قیام لیل اور صلوٰۃ تہجد کی حالانکہ یہ علم تجلی حق بھی ان علوم میں سے ہے جو اعتقادی کہلاتے ہیں لیکن اس کی غایت بھی تکمیل ہے ایک عمل کی لہٰذا معلوم ہوا کہ جمیع علوم خواہ وہ مقصود فی حد ذاتہا ہوں یا نہ ہوں اُن سے اعمال بھی ضرور مقصود ہیں اسی طرح آیت متلوہ میں جیسا علم مقصود ہے یعنی اعتقاد آخرت اسی طرح یہ عمل بھی مقصود ہے یعنی اعراض عن الدنیا مگر ہمارا یہ حال ہے کہ ہم اعمال سے تعرض ہی نہیں کرتے ہماری تحقیقات کا دروازہ اور ہماری کوششوں کا مرکز صرف علوم ہی ہیں۔ ہمیشہ ذات و صفات کے مسئلہ میں الجھتے رہتے ہیں۔ آج نزول کے مسئلہ کو ثابت کیا ہے تو کل مجی و اتیان کے ثبوت کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اس سے فرصت ملی تو استواء علی العرش کے مسئلہ کی فکر میں ہیں۔ اور تمام

اشکالات واستحالات عقلیہ کو خود ہی وارد کرتے ہیں۔ اور خود ہی ان کے جوابات تجویز کرتے ہیں حالانکہ یہ بحث ومباحثہ اور ان مسائل کے اندر تحقیقات وتدقیقات کا چھانٹنا یہ خود خلاف سنت ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان علوم کے اندر گفتگو کرنے کے متعلق فرمایا ہے کہ "ابہموا ابہمہ اللہ تعالیٰ" یعنی جس مسئلہ کو خود خداوند تعالیٰ نے مبہم رکھا ہے اور واضح نہیں فرمایا تم بھی اس کو مبہم ہی رکھو تمہارا اقتضاء امر یہی ہے کہ تم اس مبہم کو مبہم ہی سمجھتے ہوئے ایمان لے آؤ ایک بزرگ نے ایک بزرگ سے دریافت کیا کہ حضور سے معراج کی شب کیا کیا باتیں ہوئیں اور کیا واقعات پیش آئے انھوں نے فرمایا کہ ؎ اکنوں کراد مانع کہ پرسد ز باغباں بلبل چہ گفت گل چہ شنید وصبا چہ کرد

یعنی جب خداوند تعالیٰ نے ان واقعات واسرار کو فاوحیٰ الی عبدہ ما اوحیٰ میں مبہم رکھا ہے تو ہماری کیا مجال ہے کہ ہم کچھ لب کشائی کرسکیں جب ان کے ہاں اتنا ابہام مدنظر ہے تو ہم ان کے خلاف سنت کیا کہہ سکتے ہیں۔ ہمارا کام تو یہ ہے کہ جو امور ہمارے سامنے وضاحت وتفصیل کے ساتھ بیان کردئے گئے ہیں اُن کی مفصل تحقیق کریں۔ اور جن چیزوں کو ہمیں نہیں بتلایا گیا اور ابہام ہی کو مصلحت سمجھا گیا ہے۔ اُس پر ابہام ہی کے ساتھ ایمان لاکر الذین یومنون بالغیب کے مقبول زمرہ میں داخل ہوں نہ یہ کہ ہم اس کی تحقیق وتنقیح کے درپے ہوجاویں اور عقل کے گھوڑے دوڑاویں ہماری مثال تو ایسی ہونی چاہئے جیسے کوئی شخص کسی کے ہاں مہمان ہو اور میزبان نے اس کو اپنا ایک بہت بڑا وسیع مکان قیام کے واسطے جس کے متعدد کمرے عجیب عجیب سامانوں سے مملو ہیں اور نادر نادر چیزوں سے لبریز ہیں۔ لیکن یہ کہدیا کہ یہ چار کمرے جن کے دروازہ کھلے ہوئے ہیں ان کی سیر وتفریح سے تم اپنا دل بہلانا اور جن کے کمروں کے دروازے بند ہیں ان کو نہ کھولنا اب ہم کو چاہئے کہ جن کمروں کی سیر وتفریح کی ہمیں اجازت دی گئی ہے اُن کی سیر وسیاحت سے تو ہم اپنا دل بہلائیں اور جن کمروں کے کھولنے کی ہم کو اجازت نہیں ہے اُن کو ہاتھ نہ لگائیں اگر ہم ان چاروں دروازوں کے بھی قفل توڑ ڈالیں گے یا ان کے بند کرنے کی علت دریافت کریں گے کہ یہ کیوں بند ہیں اور یہ کیوں کھلے ہیں تو یہ خلاف تہذیب اور اخلاقی جرم

سمجھا جاویگا اسی طرح جن امور کی تحقیق اور غور و خوض کا دروازہ بغرض افہام و تفہیم کھول دیا گیا ہے ان میں ہم کو بحث و مباحثہ کرنا چاہیئے اور جن امور کے متعلق کشائی کرنے سے ہم کو منع کر دیا گیا ہے ان میں ہمارا کلام کرنا دخل در معقولات اور معصیت و نافرمانی سمجھا جائیگا۔ اور انحراف امتثال امر میں داخل ہوگا اسی کو فرماتے ہیں ؎

اکنوں کہ ادا مانع کہ پرسد ز باغباں بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

کیا مجال ہے کسی کی کہ ان اسرار و رموز کی حقیقت کو معلوم کر سکے کیا ہستی ہے ہمارے عقول کی کہ ایسی پر خطر راہ میں قدم رکھ سکے اسرار خداوندی کو معلوم کرنا قوت بشریہ سے خارج ہے ذات و صفات خداوندی کی کنہ معلوم کرنا امکان سے باہر ہے حتیٰ کہ جمیع عقلاء کا اس پر اتفاق ہے کہ علم بالکنہ خداوند تعالیٰ کی ذات و صفات کا ممتنعات سے ہے ہم تو صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح وہ ذات قدوس غیر مدرک بالکنہ ہے ایسا ہی اُس کی شان کے شایاں اس کا نزول ہے اور ایسے ہی جاء ربک میں مجئی بھی اُن کے مرتبہ و عظمت کے مناسب ہے جیسا جائی ویسی ہی مجئی اس مجیئۃ کی تعیین ایسے وقت ہو سکتی ہے جبکہ اس موصوف کی حقیقت معلوم کی جاوے اس وجہ سے کہ مجئی کی کوئی ایسی حقیقت متعینہ نہیں جسمیں ہر جائی بلا امتیاز شریک ہو۔ اور مجئی سب میں ایک حقیقت مشترک ہو بلکہ ہم برابر دیکھتے ہیں کہ جہاں اختلاف جائی ہوتا ہے مجئی بھی مختلف ہو جاتی ہے اور اس مجئی کا علم موقوف ہوتا ہے۔ اس جائی کی ادراک حقیقت پر چنانچہ دیکھئے جاء زید میں ایک مجئی کا حکم ہے اس کی حقیقت معلوم کرنے کے واسطے۔ اول ذات زید کا علم ضروری ہے حقیقت ذات زید معلوم کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ مجئی بالمشی ہے۔ یعنی یہ ذات چل کر آنے کی وجہ سے متصف مجئی کے ساتھ ہوئی بخلاف جاء المدینہ کے کہ یہاں پر امکنہ کی حقیقت معلوم کرنے سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ یہ مدینہ کا آنا اس طرح سے تھا کہ کوئی بات متحرک خود چلکر اس مدینہ میں داخل ہوئی یہ مدینہ اپنی جگہ سے نہیں سرکا اسی طرح قوت خیالیہ میں کسی امر کا آنا کہ میرے ذہن میں یہ بات آئی تو یہاں نہ ذہن چلتا ہے نہ بات چلتی ہے بلکہ یہاں افکار کی مجئی بذریعہ تخیل ہوتی ہے افکار کی گردش سے کسی ایک رائے یا فکر

کا متعین کر لینا اس کا نام ذہن میں آنا رکھا ہے ایسے ہی جاء الصبح وغیرہ اب دیکھئے کہ تینوں آنے والے موصوف آنے کے ساتھ ہیں لیکن آنے والوں کی تغائر حقیقت سے مجئی کی حقیقت میں زمین و آسمان کا تفاوت ہو گیا کہ ایک مجئی پر دوسری ہرگز صادق نہیں آسکتی۔ لہذا جس طرح کہ یہ اشتراط ممکنات میں مشاہد ہے کہ بغیر ذات جائی کا علم حاصل کئے حقیقت مجئی کی تعیین نہیں کر سکتے ایسے ہی یہ اشتراط وہاں پر بھی ہے کہ پہلے ذات خداوندی کی حقیقت کا ادراک کر لو پھر مجیئۃ و نزول کی کیفیت ہم بتلاویں گے اور حقیقت خداوندی کا ادراک نا ممکن ہے جس سے تم عاجز ہو لہذا اس کے افعال کی حقیقت کا ادراک بھی نا ممکن جس سے ہم تم دونوں عاجز لہذا اس بحث میں پڑنا محض اضاعت وقت ہی نہیں تو اور کیا ہے۔ بلکہ خلاف سنت مظنۂ ضلالت بھی ہے اور اسی وجہ سے امام شافعی علیہ الرحمۃ متکلمین کے پیچھے نماز پڑھنی مکروہ بتلایا کرتے تھے ان متکلمین سے وہی مراد ہیں جنکو غلو فی الکلام ہو اور جنھوں نے اعتدال سے گذر کر حقائق مختلفۃ الادراک کے معلوم کرنے کا تہیہ کر لیا ہو پھر اس میں وہ ایسے سرگرداں ہو جاتے ہیں کہ جہاں پر عقل کے گھوڑے نہیں چلتے اور یہ کار آمد ہتھیار بیکار ہو جاتا ہے وہاں پر طرح طرح کی ضعیف بے محل تاویلیں کرتے ہیں اور وہ متکلمین مراد نہیں جو رد بدعات و اعتراضات اہل باطل کی غرض سے کلام کرتے ہیں کہ ان کا مطمح نظر صرف بدعات کا رد کرنا اور مسائل دینیہ پر سے اعتراضات کا دفع کرنا ہوتا ہے۔ ادراک حقیقت کا نہ وہ قصد کرتے ہیں اور نہ دعوے اور اگر کہیں ایسی بحث اجمالاً کرتے ہیں تو وہ حقیقت میں دعوی نہیں ہوتا منع ہوتا یعنی دوسرے کے کسی دعوے میں ایک احتمال نکال دیا جاتا ہے اس قسم کا کلام محمود مستحسن شمار کیا جاتا ہے غرض یہ کہ جیسے اُن کی شان ویسا ہی نزول نہ ہم اُن کی حقیقت کو جانیں کہ وہ کیسی ذات ہے جو اجسام اور مادیات بلکہ مجردات ممکنہ سے بھی پاک و حرکات و سکنات سے مبرا ہے اور متصف بکمالات عجیبہ ہے نہ ہم اُن کی اُن صفات عجیبہ کمالات غریبہ کو جانیں اور اس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ ہم اس ذات قدوس کی حقیقت اور اس کے اوصاف کی ماہیت سے جاہل ہیں کیونکہ بہت سی چیزیں دنیا میں ایسی ہیں جن کو

لہ ورد ہم نمبر ۵ فی تفسیر قولہ تعالیٰ ھل ینظرون الا ان یاتیھم اللہ فی ظلل من الغمام والملئکۃ ص ۱۲

ہم آج تک نہیں جانتے اور یہی نہیں کہ صرف بڑے بڑے رازوں اور پوشیدہ ملکوں سے ہم ناواقف ہیں بلکہ اکثر وہ ایسی معمولی چیزیں ہوتی ہیں جو ہر وقت ہم سے قریب رہتی ہیں مگر پھر بھی ہم اُن کو نہیں جانتے بلکہ جب ان کا علم ہوتا ہے تو تعجب ہوتا ہے کہ اتنی معمولی سی بات اور ہم اس سے آج تک جاہل تھے تو پھر اگر ہم ایک ذات قدوس بعید عن الادراک غائب عن النظر غیر محدود الاوصاف کے ادراک سے جاہل و ناواقف ہیں تو کون سا ہماری شان میں بدنما داغ لگ جائیگا افسوس ایسی معمولی اشیاء کی جہالت سے تو ہماری قابلیت میں نقصان نہ آوے اور ایک ایسی باسطوت و جبروت ذات کی حقیقت معلوم نہ ہونے سے ہماری قابلیت میں بٹہ لگ جاوے اور ہم تو کیا چیز ہیں ہماری ہستی ہی کیا ہے یہاں تو ایسے ایسے جلیل القدر عارف کہ جنکی تمام عمر علوم و اسرار و معارف ہی میں گذرتی ہے کوئی لمحہ اُن کی عمر کا عرفان سے خالی نہیں اُن کا یہ حال ہے کہ شیخ فرماتے ہیں ؎

دور بینان بارگاہ الست غیر ازیں پے نبردہ اند کہ ہست

ایسے ہی عارف شیرازی فرماتے ؎

عنقا شکار کس نشود دام باز چیں کینجا ہمیشہ باد بدست ست دام را

عنقا کنایہ ذات باری سے ہے کہ یہاں عقل کا جال نہ پھیلاؤ یہاں بجز ہوا کے جال میں اور کچھ نہ آئیگا۔ مولانا رومی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

در تصور ذات اورا گنج کو تا در آید در تصور مثل او

یعنی خداوند تعالیٰ کے مثل کا تصور بھی ناممکن ہے اس وجہ سے کہ تصور مثل موقوف ہے تصور ممثل لہ پر کیونکہ ادراک مماثلت کے شرائط میں مثلین کا انکشاف بھی ہے اور ممثل لہ یعنی ذات خداوندی کا ادراک و انکشاف ناممکن لہٰذا انکشاف و تصور مثل بھی نہیں ہو سکتا اور یہاں تو کیا حقیقت باری تعالیٰ کا انکشاف تو آخرت میں بھی نہ ہوگا محض دیدار ہوگا پس جب اُس عالم میں جو کہ انکشاف حقائق کا عالم ہوگا یہ حقائق منکشف نہ ہوں گے تو اس عالم میں تو کیا توقع ہے اور اس مسئلہ پر عرفاء و حکماء سب کا اتفاق ہے اور بعض

صفات جو واجب و ممکن میں بظاہر مشترک ہیں جیسے علم و قدرت وغیرہا اُن سے وسوسہ نہ کھانا چاہیئے کہ صفات ممکن کا تو ادراک بالکنہ ممکن ہے اور بوجہ اشتراک کے وہی حقیقت ہوگی صفات واجب کی پس صفات واجب کا ادراک بالکنہ ممکن ہوگیا جواب یہ ہے کہ یہ اشتراک باعتبار حقیقت کے نہیں محض باعتبار اسم کے ہے اور حقیقت دونوں کی جدا جدا ہے اس اصل پر ایک آیت کی تفسیر نہایت سہل ہوئی جاتی ہے اُس کی تقریر کرتا ہوں وہ آیت یہ ہے "واما الذین شقوا ففی النار لہم فیہا زفیر وشہیق خالدین فیہا ما دامت السموات والارض الا ما شاء ربک الخ" "واما الذین سعدوا ففی الجنۃ خالدین فیہا ما دامت السموات والارض الا ما شاء ربک" یہاں دو سوال ہیں ایک یہ کہ آیت میں خداوند تعالیٰ نے دونوں مقام میں خالدین فیہا کے بعد "ما دامت السموات والارض" فرمایا ہے یعنی خلود و دوام جبتک ہوگا جب تک آسمان وزمین باقی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ حشر و نشر کے وقت جب صور پھونکا جائیگا تو جمیع مخلوقات کی طرح آسمان وزمین بھی فنا ہو جائیں گے تو جبکہ سموات والارض فنا ہوئے اور ان کے واسطے دوام نہ ہوا تو جو خلود اُس کے ساتھ محدود ہوگا وہ خلود غیر محدود نہ ہوا تو یہ خلود نہ کفار کے واسطے دوزخ میں ہوا نہ مومنین کے واسطے جنت میں اسکا جواب یہ ہے کہ جن آسمان وزمین کے ساتھ تجدید اور ظرفیت دوام کی اس جگہ فرمائی گئی ہے وہ آسمان وزمین ہمارے اس عالم فانی کے سموات وارض نہیں ہیں بلکہ ان سے اس عالم کے سموات وارض مراد ہیں۔ اور اُنکا دوام غیر محدود ہے اور اس پر تعجب نہ کرو کہ کیا وہاں بھی آسمان وزمین ہوں گے سو سمجھ لو کہ وہاں کے آسمان وزمین تو یہاں کے آسمان وزمین سے بھی بڑے ہیں اسی کو مولانا رومیؒ فرماتے ہیں ؎

غیب را ابرے و بادے دیگرست　　آسمانے آفتابے دیگرست

وہاں کا بادل اور پانی بھی پانی ہے وہاں کا آسمان و آفتاب ہی جدا ہے بلکہ میں اس سے بھی زیادہ عجیب بات سناؤں خدا اس عالم میں ایسی چیز موجود ہے یعنی روح جسمیں آسمان وزمین اس آسمان وزمین سے زیادہ عجیب موجود ہیں اس کو حکیم سنائی فرماتے ہیں ؎

آسماں باست در ولایت جاں　　کار فرمائے آسمانِ جہاں

در رہ روح پست و بالا ہاست　　کوہ ہائے بلند و صحرا ہاست

اسی طرف ایک مصرعے اشارہ کیا ہے ؎

ستم ست اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو چمن رود　　تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ برو دل کشا بچمن در آ

اسی سیر کو عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

خلوت گزیدہ را بتماشا چہ حاجت است　　چوں کوی دوست ہست بصحرا چہ حاجت ست

اسی کو مولانا رومی فرماتے ہیں ؎

اے برادر عقل یکدم با خود آر　　دمبدم در تو خزان ست و بہار

غرض یہ کہ جب اس عالم فانی کے مصالح کے لئے سمٰوات وارض ہیں تو اس عالم باقی کے مصالح تو اس کے زیادہ مستحق ہیں اور وہ بھی باقی ہیں لہٰذا "مادامت السمٰوات والارض" خلود و دوام کے منافی نہیں البتہ یہ خلجان ہوتا ہے کہ پھر اُس تجدید کی ضرورت کیا تھی جبکہ مومنین و کفار کے لئے دوام و خلود آخرت میں بتلا دیا تو پھر اُس خلود کی تجدید کیوں فرمائی گئی۔ اگرچہ اشیاء دائمہ ہی کے ساتھ کی گئی۔ مگر اس میں فائدہ زائدہ ہی کیا ہوا سو اس خلجان کا دفع یہ ہے کہ اسمیں ایک عجیب لطیفہ ہے اور مقصود اس سے تاکید ہے خلود کی جو کہ ایک عجیب و غریب طریق سے کی گئی ہے جو محض "خالدین فیہا" سے حاصل نہ ہوئی تھی اس کو ایک مثال سے سمجھنا چاہئے جیسے کسی شخص کو ایک مکان دیا جاوے اور ہمیشہ رہنے کے واسطے دیا جاوے تو اس ہمیشگی اور دوام کی تاکید کا کوئی عنوان اس سے بہتر نہیں کہ اس سے یہ کہدیا جاوے کہ جب تک یہ گھر باقی ہے اس وقت تک کے واسطے تم کو یہ گھر دیا جاتا ہے اب آپ ہی بتلایئے اس سے بڑھکر اور کون سی تجدید یا تاکید ہے جس سے اس دوام کی توضیح اور تاکید ہو جاوے تو اسی طرح اللہ پاک نے ارشاد فرمایا ہے کہ تم کو جنت اور اس کے اندر رہنے کی اجازت ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے دیجاتی ہے اور کیسی ہمیشگی کہ جب تک جنت قائم ہے اُس وقت تک تمہاری اور تمہارے باپ دادا کی ہے تم کو اس زمانہ قیام جنت تک نہ نکالا جاویگا اور ظاہر ہے کہ جنت خود دائمی ہے اور ابدالآباد تک کے واسطے ہے تو گویا اس تاکید سے ایک ایسا لطیف مضمون ادا کیا گیا کہ ہزار تصریحات ہوں اُن سے

بھی اس پختگی کے ساتھ یہ مضمون نہیں ادا ہو سکتا۔ بحمداللہ مادامت السموات والارض تو یہ شبہہ بالکل رفع ہو گیا اور یہ تحقیق اس مقام پر مقصود نہ تھی تبعاً بیان کر دی گئی۔ مقصود دوسرے سوال کا جواب دینا ہے جو مبنی ہے تغائر و تمائز بین صفات الممکن و صفات الواجب پر وہ سوال یہ ہے کہ اسی آیت میں آگے چلکر ایک استثناء فرمایا ہے "الا ماشاء ربک" یہاں پر استثناء بظاہر "خالدین فیہا" سے معلوم ہوتا ہے جسکا حاصل یہ ہے کہ مومنین کا جنت میں اور کافرین کا دوزخ میں ہمیشہ رہنا یقینی نہیں مشیت سے آسکیں استثناء بھی ہو سکتا ہے کہ کسی وقت اگر چاہیں گے نکال بھی دیں گے ساری عمر کا وعدہ نہیں ہے اور یہ ایک ایسی بات ہے جس سے جنتیوں کی تو کمر ٹوٹ گئی ہو گی کہ ہماری ساری تمناؤں اور آرزؤں کا مدار یہی خلود اور دوام تھا کہ دنیا کی نعمتوں کو ہم نے اسی مداومت پر قربان کر دیا ہے اپنی امیدوں کا مرکز عالم آخرت کو بوجہ اس کے دوام ہی کے بنایا تھا لیکن قسمت سے وہاں پر بھی دوام سے محروم اور خلود سے ترستے رہے اور دوزخیوں کے غنچۂ آرزو کھل گئے ہوں گے کہ بھئی خلود فی النار کو سنکر تمام دنیا کے مزے تلخ ہو رہے تھے۔ چلو اس کھٹکے سے نجات ملی سو جواب اس کا یہ ہے کہ یہاں پر مادمصدریہ بمعنی ظرف ہے جیسے آیتک حقوق النجم پس ماشاء ربک کے معنی یہ ہیں الا ان یشاء ربک یعنی خلود تو ہمیشہ رہے گا لیکن اگر خدا تعالیٰ کی مشیت اس کے خلاف کے ساتھ متعلق ہو جائے تو خلود نہیں ہو گا لیکن چونکہ دلائل سے یہ امر یقینی ہے کہ مشیت رب کبھی اس کی مقتضی نہ ہو گی کہ مومنین کو جنت سے یا مشرکین کو دوزخ سے نکالا جاوے لہذا خلود کے خلاف کبھی واقع نہ ہو گا تو خلود ثابت رہا اور کوئی خدشہ خلود میں نہیں رہا باقی یہ کہ پھر فکر نے اس استثناء میں کیا ہوا اور "الا ماشاء ربک" کے زائد کرنے کا فائدہ کیا ہوا تو وہ فائدہ یہ ہے کہ اس سے مخلوق کے بقاء اور رب العزت کے بقاء میں فرق ظاہر ہو گیا تاکہ کسی غیر محقق کو یہ خیال نہ ہو کہ او فوہ اب تو ہم کو بھی دوام کا سارٹیفکٹ مل گیا چلو اب تک جو ہم وجوب کے درجہ سے گرے ہوئے تھے اس فرق کی علت یہ ہی گرانمایہ موقی دوام کا تھا۔ جو آج ان کی فیاضی سے ہم کو مل گیا جس کے باعث آج امتیاز

کا پردہ اٹھ گیا اور آج سے ہم بھی واجب بن گئے اور ان تخیلات و توہمات کے شرک ہونے میں کوئی شک نہیں لہٰذا اس قسم کے تخیلات موجبہ للشرک سے بچانے کے لئے "الا ماشاء ربک" فرمایا کہ اس عنوان "خالدین فیہا" کے معنوں دوام سے پھول نہ جانا یہ نہ سمجھنا کہ ہم مساوی واجب کے ہو کر ممکنیت کے پیراہن سے خارج ہو گئے نہیں بلکہ تم ممکن ہی ہو اور ہم واجب ہی ہیں دوام اگرچہ تمہارے حصہ میں بھی آگیا لیکن تمہارا یہ دوام تو داخل تحت المشیۃ ہے ہمارے ارادہ پر موقوف ہے کہ جب تک ہم چاہیں تم کو اس دوام میں رکھیں اور جب چاہیں کان پکڑ کے نکال باہر کریں گو نکالیں گے نہیں مگر پھر بھی تحت المشیۃ ہے بخلاف ہمارے دوام کے کہ ہمارا دوام مستقل بالذات ہے کسی کی مشیت پر موقوف نہیں کوئی احتمال اس دوام کے فنا ہونے کا نہیں ہے اس نکتہ کی طرف شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تفسیر میں بہت سہل عنوان سے اشارہ فرمایا ہے کہ اس سے مقصود صرف یہ بتلانا ہے کہ یہ دوام تحت المشیت ہے یہی تھی وہ اصل تغائر و تمائز بین صفات الممکن و صفات الواجب کی جسکا اوپر ذکر تھا اور اس ممکنات کے دوام پر ایک حکایت یاد آئی کہ کسی گانوں کا ایک گنوار کلکٹر کے پاس آیا اور بہت ادب سے سلام کیا اور نہایت عاجزی سے پیر دبانے لگا کلکٹر نے منع کیا کہ بس رہنے دو مطلب کہو کس واسطے آئے ہو کیا کام ہے مگر اس نے پیر نہ چھوڑے دباتا رہا آخر جب اُس نے بہت کچھ منع کیا اور مطلب دریافت کیا تو اُس نے کہا کہ میں تو تمہارے (تمہارے) سے ایک بات پوچھوں کہ مجھے یہ بتادے کہ موروثی کسے کہتے ہیں (کہتے ہیں) اس نے کہا جا کسی پٹواری سے جاکر پوچھ اُس نے کہا کہ نا صاحب میں تو تمہارے ہی سے پوچھوں کوئی کچھ بتلادے کوئی کچھ بتلادے اُس نے بتلایا کہ موروثی اُسے کہتے ہیں کہ کوئی کاشتکار کسی زمیندار کی زمین (میں) ۱۲ برس تک کاشت کرتا رہے تو اس کے بعد اس زمیندار کو کاشتکار سے زمین لیکر کسی دوسرے کاشتکار کو دینے کا حق باقی نہیں رہتا اُس نے کہا کہ دیہہ دیہہ گجب (غضب) ہو گیا تمہارے تصیلدار (تحصیلدار) کو شاملی کی تحصیل میں گیارہ برس تو ہو گئے بس ایک برس میں تحصیل اس کی موروثی ہو جاوے گی پھر نہ تیرے

باپو سے جا نہ میرے باپو سے جا غرض اس نے ایسے مزے سے کہا کہ کلکٹر اُس کے مطلب کو خوب اچھی طرح سمجھ گیا کہ یہ تحصیلدار کی شکایت کرنا چاہتا ہے چنانچہ حالات تحقیق کئے اور وہ تحصیلدار اس تحصیل سے تبدیل کر دیا گیا تو دیکھئے حکام دنیوی میں کوئی حاکم اپنے عہدہ و منصب پر اپنے اختیار سے دائم نہیں رہ سکتا بلکہ ہر حاکم پر ایک حاکم اعلیٰ ہے جسکا یہ ماتحت ہے اور وہ اس کو اس عہدہ سے علیحدہ کرنے کا اختیار رکھتا ہے تو تحصیل جو کہ ایک نہایت ادنیٰ محکمہ ہے وہ تو کسی کے واسطے موروثی ہو نہیں سکتا اور جنت الفردوس جو اس النعیم ہے جسکے وعدہ سے مومن کی روح تازہ ہوتی ہے بدن میں قوت آتی ہے ایسی بڑی نعمت ہمارے واسطے موروثی ہو جائے کہ خدا کو بھی نعوذ باللہ اس سے علیحدہ کرنے کا اختیار نہ رہے کیا خوب لہٰذا ابدیت اور دوام اگرچہ ممکن کے واسطے ثابت ہے لیکن دوام واجب کے ہرگز مساوی نہیں ہو سکتا بلکہ دونوں میں حقیقۃً تغائر نوعی ہے پس خداوند تعالیٰ نے اس شرک اور باطل پرستی سے بچانے کی غرض سے اس استثنا کو بڑھا دیا ہے تو دیکھئے کہ دوام منجملہ دیگر صفات خداوند قدوس کے ایک صفت ہے اور ممکن بھی انمیں مشارکت عرضی رکھتا ہے لیکن پھر بھی تغائر و امتیاز دونوں دوامو ں میں ایسا موجود ہے جسکی وجہ سے ہر ایک دوسرے سے ممتاز ہے۔ اس ذات قدوس کا دوام اعلیٰ و برتر ہے اس ذات ممکن کا دوام ادنیٰ و انقص ہے ع چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ جب دونوں میں ایسا تغائر ہے تو صفات ممکن کے ادراک سے صفات واجب کے ادراک کا امکان لازم نہیں آتا خواہ آخرت میں ہو خواہ دنیا میں کسی جگہ بھی ادراک و انکشاف حقیقت واجب تعالیٰ یا اُن کی صفات کا بالکلیہ نہیں ہو سکتا۔ استحالہ عقلی و امتناع نقلی ہر دو موجود ہیں چنانچہ جمیع عقلاء زمانہ و فلاسفہ متقدمین و متاخرین کا اس پر اتفاق بھی ہو چکا ہے کہ ادراک ماہیت واجب تعالیٰ کا بالکلیہ عقلاً مستحیل ہے اور نقلاً بھی حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ آخرت کی سب سے بڑی نعمت اور اعلیٰ ترین انعام رویۃ خداوند ذوالجلال ہے کہ اُس روز جمیع حجب و موانعات اس ذات کبریائی کے چہرۂ انور سے اٹھ جائیں گے اور تشنہ لب دیدار سے سیراب ہوں گے ولایبقی علی وجہہ حجاب الا رداء الکبریاء ایک حجاب یعنی ردائے

کبریاء اس وقت بھی نہ اٹھیگی اور نہ اس کے بعد اٹھنے کی امید ہے کیونکہ منشا اس کا وجوب بالذات ہے جب وجوب منفک نہیں ہوسکتا تو اس کا لازم یعنی امتناع ادراک بالکنہ بھی منفک نہیں ہوسکتا اس لئے میں نے کہا ہے کہ نہ وہ رداء اٹھیگی اور نہ اس کے اٹھنے کی امید ہے اور یہ وجوب جس طرح لازم ہے اسی طرح اخص صفات سے بھی ہے اس پر ایک کام کا مضمون یاد آگیا۔ وہ یہ کہ عامۂ متکلمین وحکماء میں ایک اختلاف ہوا ہے حکماء تو صرف وجوب وقدم بالذات کو خاص کہتے ہیں باری تعالیٰ کے ساتھ اور قدم بالزمان اور تجرد کو غیر واجب کے لئے بھی مانتے ہیں اور متکلمین ان سب کو خاص لکھتے ہیں اسی بناء پر قائلین بالمجردات کی تکفیر کرتے ہیں اور محققین وجوب بالذات وقدم بالذات و بالزمان کو خاص کہتے ہیں اور تجرد کو خاص نہیں کہتے اور خود بھی مجردات حادثہ بالزمان کے قائل ہیں اور اُن کو لطائف کہتے ہیں جنمیں ایک روح بھی ہے جسکو حادث بھی مانتے ہیں اور مجرد بھی چنانچہ وہ روح کی حقیقت جوہر مجرد حادث قبل لبدن بتلاتے ہیں اور اسی تجرد کی بناء پر وہ روح مجرد کو خارج از امکنہ مانتے ہیں اور لامکانی سے تعبیر کرتے ہیں اور نجازاً کہدیا کرتے ہیں کہ وہ لامکان میں رہتی ہے اور صوفیہ نے اسی توجیہ پر لطائف کی نسبت کہا ہے کہ وہ فوق العرش ہیں جس کے معنی یہ نہیں کہ عرش کے اوپر رہتے ہیں جیسا کہ لفظی ترجمہ اور ظاہر کی معنی سے متبادر ہوتا ہے بلکہ عرش چونکہ متحیز اور محدود ہے امکنہ ثابتہ بالدلیل کا لہذا فوق العرش بمعنی لامکان ہے اور لطائف چونکہ امکنہ سے منزہ اور مجرد ہیں اس لئے فوق العرش کنایہ ہوا غیر مکانی ہونے سے ان کے نزدیک کسی ایسے مجرد کا قائل ہوجانا جو ممکن اور حادث بمعنی مسبوق بالعدم الواقعی ہو موجب تکفیر نہیں البتہ جو شخص وجوب بالذات یا قدم بالذات یا بالزمان کو غیر باری کے لئے ثابت کرے اس کی وہ بھی تکفیر کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ اخص صفات باری تعالیٰ سے ہے یہ استطراداً اس اختلاف کا بیان ہوگیا اب مقصود مقام کی طرف عود کرتا ہوں کہ جب منشاء اس امتناع ادراک بالکنہ کا وجوب بالذات ہے جسکا الفکاک محال ہے اس لئے آخرت میں بھی خداوند تعالیٰ کی ذات وصفات کا انکشاف ہونا اور اُن کی کنہ کا معلوم ہونا ناممکن اور محال ہے

اور اسی وجہ سے عرفاء نے کہا ہے کہ مسئلہ قدر کا انکشاف آخرۃ میں بھی نہیں ہوگا جیسا کہ یہاں نہیں ہوا اس وجہ سے کہ یہ مسئلہ بھی راجع ہے ادراک کنہ ذات وصفات کی طرف اور ذات وصفات کا علم بالکنہ نہ دنیا میں ہوسکتا ہے نہ آخرت میں ہر دو جگہ ناممکن ہے لہذا جو اس پر موقوف ہے اسکا علم بھی دونوں جہان میں نہ ہوگا نہ یہاں نہ وہاں، تو جب ایسے عرفاء و فضلاء نے اپنی ہمتوں کو قاصر سمجھا اور یقین کر لیا کہ ان مسائل ذات وصفات کا حقیقی علم نہیں ہوسکتا تو اب ہم جیسے جاہلوں کا ان مسائل میں لب کشائی کرنا محض بے ادبی اور تضیع اوقات ہے بلکہ خلاف فرمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وصحابہ کرام ہے ہمکو ایسے علوم میں تو ابہام پر اکتفاء کرنا چاہئے اور اعمال کے اہتمام میں لگنا چاہئے جس کو میں نے اوپر بیان کیا ہے جسکا سلسلہ دراز ہوتا چلا آیا اور وہ بیان یہ تھا کہ یہ آیت یعنی لکیلا تاسوا علی ما فاتکم مؤید ہے اس دعوی کی کہ علوم مقصودہ فی انفسہا سے بھی مقصود محض علوم ہی نہیں ہوتے بلکہ مثل علوم کے اعمال بھی مقصود ہیں لہذا جس طرح کہ مقصود اس حدیث ینزل ربنا تبارک وتعالی سے اطلاع نزول باری تعالی ہے اسی طرح مقصود ترغیب قیام لیل بھی ہے مگر ہمارا حال یہ ہے کہ ہم محض علم کو مقصود سمجھکر ینزل ویجئ وغیرہ کی تحقیق کے پیچھے پڑگئے، اور جو مقصود یعنی قیام لیل تھا اس کو ترک کر دیا اسی طرح آیت ماہذہ الحیوۃ الدنیا صاف دلیل ہے کہ صرف علم و اعتقاد آخرت ہی مقصود نہیں بلکہ اس سے عمل میں کام لینا بھی مقصود ہے یعنی جس طرح ہم کو فناء دنیا کا اعتقاد و یقین ہے اسی طرح اعراض عن الدنیا و استحضار فناء دنیا کو بھی اختیار کریں جو اس علم و اعتقاد کا مقصود ثانی ہے گویا اعتقاد فناء دنیا کی غرض اس وقت تام ہوگی جبکہ اعراض من الدنیا بھی ساتھ ساتھ ہو اور اسکا استحضار بھی ہر وقت رہے تاکہ اس علم و اعتقاد کی غرض و غایت مرتب ہو ورنہ یہ علم و اعتقاد درجۂ مقصودیت میں کامل نہ ہوگا چنانچہ عنوان اس آیت کا کس خوبی سے اس مضمون کو ادا کر رہا ہے (ماشاء اللہ کس قدر طویل لذیل اور قابل قدر مضمون اس مختصر سی آیت میں بلا کسی تدقیق و مشقت اور بغیر کسی دلالت خفیہ کے بیان فرمایا ہے) یہ نہیں کہ کسی قسم کی تکلیف یا کھینچ تان کے ذریعہ سے یا توجیہات بعیدہ کی مدد سے ان مضامین

کو اخذ کرنا پڑا ہو بلکہ ان مسائل کا استنباط اس آیت سے ایسا ہی ہے جیسے کنوئیں سے پانی نہ ہوتا تو کس طرح نکل آتا لہذا پانی کا برآمد ہونا یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ اس کنوئیں میں ضرور پانی تھا اسی طرح ان مضامین کا اس وضاحت کے ساتھ اس آیت سے مستنبط ہونا بتلا رہا ہے کہ یہ مضامین فی الواقع اس آیت میں تھے اور حقیقۃً یہ مضامین صرف ایک حصہ ہیں اُن مضامین کا جو اس آیت میں واقع میں رکھے ہوئے ہیں کیونکہ کسی شخص کی قدرت میں نہیں کہ وہ کسی آیت کی تفسیر اور تشریح اس قدر کر سکے جس کے بعد اس کے تحت میں مسائل نہ رہیں نکات و مضامین عالیہ قرآن شریف کے ختم ہونے والے نہیں ہیں - یہ ہی تو اعجاز ہے کلام مجید کا جس نے تمام دنیا سے کلام الٰہی ہونے کی تصدیق کرا دی ؎

چیست قرآں اے کلام حق شناس　　رونمائے رب ناس آمد بناس
حرف حرفش راست در بر معنے　　معنے در معنے در معنے

یعنی قرآن شریف کیا چیز ہے وہ ایک خدا کو دکھلانے والا آئینہ اور رب العزت تک پہونچانے والا زینہ ہے کہ اس کی شاہراہ پہ پڑ کر انسان کبھی گمراہ نہیں ہو سکتا مقصود حقیقی تک انشاء اللہ ضرور پہونچ جائیگا کیونکہ فی الحقیقت قرآن شریف ایک تجلی ہے تجلیات خداوند تعالیٰ سے اور ظاہر ہے کہ جو شخص تجلی حق دیکھنا چاہیگا وہ کیونکر اس تجلی کے مبدا یعنی خداوند حقیقی تک نہ پہونچیگا اگرچہ اس قرآن کو متکلمین کلام لفظی سے تعبیر کرتے ہیں لیکن کلام لفظی ہونا تجلی ہونے کے منافی نہیں کیونکہ یہ واضح رہے کہ قرآن خداوند تعالیٰ کا کلام لفظی ایسا نہیں جیسا کہ ہمارا تمہارا کلام لفظی ہوتا ہے کہ اس کو گو ہمارے ساتھ ایک خاص تعلق اور ایک بلا واسطہ نسبت ہوتی ہے - مگر اس کو ہماری ذات سے بعد تکلم کے انفصال ہو جاتا ہے کیونکہ اس کا مبدأ ظہور ہماری زبان ہے اور زبان کے ساتھ بعد تکلم کے کلمات قائم نہیں رہتے سو یہ نسبت و علاقہ خدا کے کلام لفظی کو اس کی ذات سے نہیں اگرچہ متکلمین نے اس پر کلام لفظی کا اطلاق کیا ہے اور کلام لفظی ہی سے اس کو تعبیر کیا جاتا ہے لیکن پھر بھی کلام لفظی الٰہی کو اپنے کلام لفظی پر قیاس کرنا غلط ہے اور گو اس کی کوئی

مثال حقیقی بیان نہیں ہوسکتی جیسا عارف رومی فرماتے ہیں ؎

اے بروں از وہم قال و قیل من ۔۔۔ خاک بر فرق من و تمثیل من

مگر تقریب الی الفہم کے لئے میں اس کی ایک مثال بیان کرتا ہوں کیونکہ بدون مثال کے فرق واضح نہیں ہوتا جیسا مولانا فرماتے ہیں ؎

بندہ نشکیبد ز تصویر خوشت ۔۔۔ ہر دمت گوید کہ جانم مفرشت

یعنی گو مثال مشابہ ممثل لہ کے نہیں ہوسکتی بلکہ کوئی شے دنیا میں ایسی نہیں جس کو تشبیہ کا فی یا کسی درجہ میں بھی مماثلت واقعیہ خداوند تعالیٰ کے ساتھ ہو لیکن تسلی بدون اسکے نہیں ہوتی لہذا عوام کو سمجھانے اور خلجان کو رفع کرنے کے واسطے اس کی اس طرح مثال دیجا سکتی ہے جیسے ایک تو آفتاب کی ذات ہے یعنی قرص آفتاب اور ایک وہ نور ہے جو آفتاب کے ساتھ قائم ہے اور ایک وہ لمبی لمبی تیز شعاعیں ہیں جو دور تک پہونچتی ہیں اور ایک آئینہ ہے کہ اول اس پر شعاعیں پڑتی ہیں اور ایک زمین ہے جس پر وہ لمبی لمبی شعاعیں آئینہ میں سے آکر پڑتی ہیں تو ذات خداوند تعالیٰ تو بمنزلہ ذات آفتاب کے ہے اور ان کا کلام نفسی جو کہ بمرتبۂ صفات لازمہ لاعین ولا غیر ہے یہ بمنزلہ نور آفتاب کے ہے اور کلام لفظی بمنزلہ ان شعاعوں کے ہے جو قرص سے نکلکر دور دور منتشر ہوتی ہیں اور قلب مبارک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بمنزلہ آئینہ کے ہے اور ہم بمنزلہ زمین کے ہیں غرض اس مثال کے بیان کرنے سے یہ ہے کہ ازالہ شبہ کافی طور سے ہو جائے اور اس کلام لفظی کے اطلاق سے ایسا ہی کلام لفظی مفہوم نہ ہو جیسا ہمارا کلام ہوتا ہے اور فرق واضح ہو جائے اگر شبہ ہو کہ کلام لفظی کو تو مخلوق کہا گیا ہے پھر اس کلام میں اور ہمارے کلام میں کیا فرق ہے جواب یہ ہے کہ وہ فرق مجہول الکنہ ہے اس فرق کا اثر یہ ہے کہ ہم سے جو کلام صادر ہوتا ہے اس کو کلام حق تعالیٰ کہنا جائز نہیں اور قرآن کے مرتبہ کلام لفظی کو کلام حق کہنا جائز ہے اور اسی مثال سے یہ بات بھی معلوم ہو جائیگی کہ جس طرح ہم منتشر شعاعوں سے زائد خاص نور آفتاب کی تجلی کے متحمل نہیں ہوسکتے اسی طرح اس تجلی کلامی میں کلام لفظی کی تجلی سے زائد تجلی کے متحمل نہیں ہوسکتے تھے جس کا سبب ہمارا ضعف استعداد ہے اور اسی وجہ سے

جب موسیٰ علیہ السلام نے سوال کیا اور تجلی کی درخواست کی تو اُن کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ "لن ترانی" یعنی تم ہمکو نہیں دیکھ سکتے یعنی ہم میں تو مرئی ہونے کی قابلیت تام ہے کوئی شے ہماری رویتہ سے مانع نہیں اسی لئے لن ارٰی نہیں فرمایا مگر تم میں اس وقت رائی ہونے کی قابلیت نہیں کیونکہ ہم نور محض ہیں اور تم جسم کثیف سے متلبس ہو جو ہمارے پرتو نور کا متحمل نہیں ہوسکتا گویا بتلا دیا کہ اسوقت تم میں اتنی استعداد نہیں کہ ہم کو دیکھ لینے کے بعد صحیح وسالم رہو اور ہر چند کہ یہ فرما دینا تجلی نہ ہونے کے سبب کو صاف طور سے بتلا رہا تھا اور اس کے سن لینے کے بعد ہر ایک مومن کو عقیدہ اپنی عدم قابلیت کا کافی طور سے ہونا لازم ہے چہ جائیکہ موسیٰ علیہ السلام مگر چونکہ موسیٰ علیہ السلام عاشق تھے اس لئے گو عقیدہ کے اعتبار سے تو اُن کو اپنی عدم استعداد کا یقین ہوگیا تھا لیکن شوق اور جذبہ بہ رویت الٰہی کا حد سے بڑھا ہوا تھا اس کی تیزی اب تک کم نہ ہوئی تھی لہذا آگے خود ہی اُن کی اس حالت کی رعایت سے ارشاد فرماتے ہیں کہ لیکن اگر تمھیں اب بھی شوق ہے تو انظر الی الجبل الآیہ تم اس پہاڑ کی طرف دیکھتے رہو اگر یہ پہاڑ صحیح وسالم رہا اور ہماری تجلی کا متحمل ہوگیا تو تم کو بھی نہ خرد دم رکھا جائیگا چنانچہ فلما تجلی ربہ الآیۃ جب اس پر تجلی فرمائی تو پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا اور موسیٰ علیہ السلام بیہوش ہوکر گر گئے اور اطمینان شافی ہوگیا اور عدم قابلیت کا مشاہدہ بھی ہوگیا کہ جب پہاڑ باوجود اس قدر عظیم جثہ اور شدت کے نہ ٹھہر سکا تو میں کیا ٹھہر سکوں گا اگر یہ شبہہ کیا جائے کہ پہاڑ کو موسیٰ علیہ السلام سے کیا نسبت تھی یہ جماد محض وہ ایک انسان باکمال صاحب نبوۃ کلیم اللہ لہذا یہ قیاس اور تلازم سمجھ میں نہیں آتا جو کہ فان استقر مکانہ فسوف ترانی میں استقرار جبل و رویت موسوی کے درمیان ثابت کیا گیا ہے ممکن ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اپنی روحانی قوت کی وجہ سے تجلی کے متحمل ہو جاتے تو جواب اسکا یہ ہے کہ جس تجلی کا موسیٰ علیہ السلام کو پہاڑ سے زیادہ تحمل تھا وہ تو ان کو اس درخواست سے پہلے ہی حاصل تھی یعنی تجلی بالقلب و بالروح مگر اس وقت تو انھوں نے آنکھ سے دیکھنے کی درخواست کی تھی اور آنکھ سے رویت تجلی بالروح نہیں بلکہ بالجسم ہے تو اس صورت میں تجلی خداوند تعالیٰ کی موسیٰ علیہ السلام کو بذریعہ آنکھ کے ہوئی اور آنکھ ایک

جسمانی شے ہے مگر نہایت ضعیف اور نازک عضو ہے اور پہاڑ بھی ایک جسم ہے اگرچہ غیر جاندار ہی سہی مگر آخر جسمیت میں آنکھ کا مشارک ہے ہی اور باوجود اس کے نہایت ثقیل و قوی ہے کہ ہر ایک بھاری سے بھاری بوجھ کو سہہ سکتا ہے اس صفت میں یہ تمام جسم انسانی اور اس کے جمیع اجزاء سے بڑھا ہوا ہے چنانچہ خود خداوند تعالیٰ فرماتے ہیں "ءانتم اشد خلقا ام السماء بناہا الآیۃ" اور فرماتے ہیں "لخلق السموات والارض اکبر من خلق الناس اشدیت واکبریت سماوات اور ارضین کی انسان سے اس آیت سے ظاہر ہے کہ باعتبار مادہ کے آسمان و زمین انسان سے سخت تر ہیں۔ لہٰذا جلال و جمال خداوندی کے جلوہ کا تحمل جب ایک ایسا جسم سخت و قوی نہ کر سکا تو موسیٰ علیہ السلام کی آنکھ تو کیا جمال جہان آرا کی تاب لا سکتی تھی اور وہ خود کیونکر قائم رہ سکتے تھے لہٰذا اپنے ضعف اور پہاڑ کی شدت کو پیش نظر رکھتے ہوئے جب انھوں نے پہاڑ کا یہ حال دیکھا تو اُن کو مشاہدہ سے اطمینان اپنے غیر متحمل ہونے کا ہو گیا اور یہاں بظاہر ایک شبہ ہوتا ہے کہ اس تقریر سے تو معلوم ہوا کہ تجلی نہ ہوئی لیکن لفظ تجلی جو آیت میں واقع ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو تجلی ہوئی کیونکہ موسیٰ علیہ السلام تجلی کے بعد بیہوش ہوئے چنانچہ آیت میں "فلما تجلی ربہ للجبل جعلہ دکا وخر موسیٰ صعقا الآیۃ" سے صاف ظاہر ہے کہ اول تجلی ہوئی اور اس کے بعد پہاڑ بھی ٹکڑے ٹکڑے ہوا اور موسیٰ علیہ السلام بھی بیہوش ہوئے لہٰذا موسیٰ علیہ السلام کے لئے ثبوت تجلی اسی آیت سے بالکل واضح ہے تو جواب یہ ہے کہ یہ تو مسلم ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا بیہوش ہونا تجلی سے موخر ہے لیکن تاخر کی دو قسمیں ہیں ایک زمانی دوسرے ذاتی تو موسیٰ علیہ السلام کا بیہوش ہونا ذاتاً تجلی سے موخر ہے نہ کہ زماناً بلکہ زماناً بجائے تاخر کے اقتران تھا اگر تاخر زمانی کا ثبوت ہو جاتا تب تو تجلی کا ثبوت ہوتا مگر محض تاخر ذاتی سے اس کا ثبوت دشوار ہے کیونکہ زماناً معیت تھی نیز تجلی کے معنی ظہر کے ہیں اور ظہور مستلزم ادراک و رویت کو نہیں پس ذات خداوندی کا ظہور تو ضرور ہوا چنانچہ اس کے اثر سے پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا لیکن اس کا ادراک موسیٰ علیہ السلام کو نہیں ہوا بلکہ آپ فوراً بیہوش ہو گئے لہٰذا تجلی خداوند تعالیٰ کی فی نفسہ ممکن ہے اور ہو سکتی ہے مگر ہم میں

ابھی اتنی قابلیت نہیں کہ ہم اس کے متحمل ہوسکیں بلکہ وہاں تو تجلی کا خود تقاضا ہے چنانچہ عارف جامی فرماتے ہیں ؎

نکو رو تاب مستوری ندارد چو در بندی سراز روزن برآرد

اور ان الفاظ کا ظاہری مدلول مراد نہیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ اُدھر سے تو ظہور ہی کا تقاضا اختیاری ہے بوجہ غایت رحمت و رافت کے کہ آؤ اور ہماری تجلی سے مستفیض ہو گویا کریں ہم مجبور ہیں ہم میں اتنی قابلیت ہی نہیں کہ ہم اس سے فائدہ اُٹھا سکیں اگر ہم میں ہمت ہوتی تو ضرور مستفیض ہوتے چنانچہ تجلی کلامی لفظی کے تحمل کی طاقت ہم میں تھی لہذا ہم کو اس سے فیض یاب کیا گیا لیکن یہ نہ سمجھنا کہ یہ ہماری ذاتی قابلیت کا طفیل ہے اور ہمارے اندر بھی کوئی ذاتی جوہر اگرچہ بقدر قلیل ہو رکھا ہوا ہے جس سے ہم خود اُس کے متحمل ہو گئے بلکہ درحقیقت یہ قدرت اور طاقت بھی خداوند تعالیٰ ہی نے ہم کو دی ہے یہ بھی انھیں کی عنایات کا ثمرہ ہے کہ آج اس نور کی بدولت ہمارے قلوب روشن ہیں نیز اس تحمل سے یہ بھی نہ خیال کرنا چاہیئے کہ اس تجلی کلامی نے اپنی عظمت کو چھوڑ کر نقص اختیار کر لیا ہے جس کی بناء پر ہم متحمل ہوئے بلکہ وہ اپنی اُسی شدت و صولت پر باقی ہے جیسے اصل میں تھی جس کا یہ اثر ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ زید بن ثابتؓ کے زانو پر سر رکھے ہوئے بیٹھے تھے کہ نزول وحی ہونا شروع ہوا وہ صحابی فرماتے ہیں کہ اُس وقت ثقل سے یہ حالت تھی کہ قریب تھا کہ میرا زانو پھٹ جاوے نیز ایک مرتبہ آپ اونٹنی پر سوار تھے کہ آپ پر نزول وحی ہوا اونٹنی اس شدت کو برداشت نہ کر سکی اور بیٹھ گئی اس سے معلوم ہوا کہ باوجودیکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ممتاز تحمل عطا فرمایا گیا تھا مگر پھر بھی آپ پر اس قدر شدید اثر ہوتا تھا مگر ہم جو آج اس کلام مجید کو پڑھتے ہیں اور اس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں اور یہ شدت ہم کو محسوس نہیں ہوتی اس کی وجہ محض یہ ہے کہ اول اس کے نزول میں جبریل علیہ السلام واسطہ ہوئے اور اس میں خفت ہوئی اس کے بعد آنحضرت پر اس کا نزول ہوا تو اور خفت ہوئی اب ان واسطوں کے بعد ہم اس کے متحمل ہو سکے کہ ہم اس کو پڑھ سکیں اور یاد کر سکیں باقی اس کی اصلی عظمت کہیں نہیں گئی ان دونوں حضرات نے اس کی

صولت کو برداشت کر لیا اب ہمارے واسطے سہل ہو کر ہم تک پہونچا جیسے بچے سے بوجھ اٹھوانا ہو تو ماں باپ سہارا لگا دیتے ہیں تو بچہ اس کو اٹھا لیتا ہے لیکن اب تک بھی اگر موانع مرتفع ہوں تو اس تجلی کا اتنا بڑا اثر باقی ہے کہ بعض وقت جب نہایت خشوع و خضوع سے تلاوت کی جاتی ہے تو ایک عجیب کیفیت طاری ہوتی ہے حتیٰ کہ بعض اولیاے کرام تو ان آیات کلام مجید کو سن کر اس قدر متاثر ہوئے کہ وہ اس جہان سے بھی رحلت فرما گئے اور ان حضرات کے قلوب تو اعلیٰ درجہ کے نورانی تھے جو اس سے اس قدر متاثر ہوئے مگر ہم سیاہ کاروں پر بھی اتنا اثر تو ضرور ہے کہ بسا اوقات جب قرآن شریف کو قرآن کی طرح پڑھا جاتا ہے تو ایک عجیب کیفیت اور رقت طاری ہو جاتی ہے حقیقت تو یہ ہے کہ ہم کو قرآن شریف پڑھنا ہی نہیں آتا ورنہ اگر حق قرأت ادا کیا جائے اور خشوع و خضوع ہو تو اس کے کوئی معنی نہیں کہ یہ لذت حاصل نہ ہو چنانچہ عرب میں ایک ادنیٰ درجہ کا فقیر یا معمولی آدمی بھی قرآن شریف پڑھتا ہے تو اٹھنے کو جی نہیں چاہتا واقعی حق تو وہی لوگ ادا کرتے ہیں چنانچہ ایک معمر اور نابینا بی فاطمہ تھیں جو باب عمرہ پر برابر بیٹھا کرتی تھیں اور قرآن شریف پڑھتی رہتی تھیں واقعی ان کے پڑھنے میں ایک عجیب لطف آتا تھا کہ ہر وقت سننے والوں کی ایک بھیڑ لگی رہتی تھی اور صاحب اہل عرب ہی پر کیا موقوف ہے جو اہل دل ہوتے ہیں انکے پڑھنے میں ضرور اثر ہوتا ہے چنانچہ میرٹھ میں ایک حافظ ایک مسجد میں تراویح پڑھتے تھے وہ مسجد لب سڑک واقع تھی تمام آنے جانے والے حتیٰ کہ انگریز تک بھی کھڑے ہو کر سنا کرتے تھے اس سے زیادہ اور کیا تجلی کا اثر ہوگا کہ اگر معتقد بھی نہ ہو مگر خالی الذہن ہو اس کے قلب کو بھی نہایت پوری قوت کے ساتھ اپنی طرف کھینچتا ہے قطع نظر اس سے کہ وہ مومن ہو یا کافر اس کی کشش سب پر اپنا اثر دکھاتی ہے چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مکہ میں رہ سکنے کے لئے کفار کی یہ شرط ٹھہری تھی کہ آپ کلام مجید نہ زور سے نہ پڑھا کریں ہماری عورتوں پر اثر پڑتا ہے خدا کی شان کہ جاہل عورتیں وہ بھی دنی الطبع مگر اس کی ترباقی قوت وہاں بھی اپنا رنگ لاتی تھی چنانچہ بہت سے لوگ محض قرآن سن سن کر ایمان لائے اور داخل زمرۂ اسلام ہوئے غرض قرآن شریف تجلی الٰہی ہے اس وقت ہم اسی قدر تجلی کے قابل

تھے توحق تعالیٰ نے اس کے ذریعہ سے ہم کو اپنا جلوہ دکھا دیا ہے گویا اس وقت وہ یوں فرما رہے ہیں ؎

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

یہ شعر زیب النسا متخلص بہ مخفی کا ہے اور اسکے متعلق ایک قصہ ہے وہ یہ کہ شاہ ایران کی زبان پر ایک دفعہ یہ مصرعہ بیساختہ موزوں ہوگیا تھا ع دُر ابلق کسے کم دیدہ موجود۔

بادشاہ نے شعراء ایران سے درخواست کی کہ اس کا دوسرا مصرعہ لگاؤ کسی سے بھی دوسرا مصرع نہ بن سکا تو بادشاہ نے شاہ ہندوستان کو لکھا کہ شعراء ہند سے درخواست کی جائے کہ اس مصرع پہ مصرع لگائیں اس کی اطلاع زیب النسا کو بھی ہوئی یہ بھی بڑی شاعرہ تھی اس لئے اس کو بھی فکر ہوئی ایک دن اتفاق سے صبح کے وقت سرمہ لگا رہی تھی سرمہ کچھ آنکھ میں لگا اور اس کے اثر سے ایک قطرہ سرمہ آلود ٹپکا تو فوراً اس کا ذہن اس شعر کی طرف منتقل ہوا اور کہا ؎

دُر ابلق کسے کم دیدہ موجود مگر اشکِ بتان سرمہ آلود

اس نے شاہ ہند کو اطلاع کی کہ مصرع ثانی بنگیا آپ شاہ ایران کو اطلاع کردیجئے چنانچہ وہاں یہ مصرع پہونچا تو شاعرہ کی بڑی تعریف ہوئی مگر یہ کسی کو خبر نہ تھی کہ شاعر عورت ہے شاہ ایران نے وہاں سے بہت کچھ انعام وخلعت بھیجا اور ساتھ میں یہ بھی لکھا کہ شاعر کو ہمارے پاس بھیجدیا جائے شاہ ہند نے زیب النسا سے کہا کہ ایران سے تیرا بلاوا آیا ہے بتا میں کیا جواب دوں اس نے کہا کہ آپ جواب میں میری طرف سے یہ شعر لکھ بھیجئے کہ شاعر نے یہ جواب دیا ہے ؎

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

چنانچہ یہ شعر لکھ دیا گیا اور شاہ ایران سمجھ گیا کہ شاعر عورت ہے بہرحال اس شعر میں مخفی نے یہ کہا ہے کہ جس کو میرے دیدار کا شوق ہو وہ مجھے میرے کلام میں دیکھ لے تو گویا مخفی کا کلام منکشف کو دکھا دے اور خدا کا کلام خدا کو نہ دکھائے یہ نہیں ہو سکتا۔ پس حق تعالیٰ بھی گویا اسوقت یہی فرما رہے ہیں کہ جو مجھے دیکھنا چاہے وہ میرے کلام میں مجھے دیکھ لے

اسی کو فرماتے ہیں ؎

چیست قرآں اے کلام حق شناس رو نمائے رب ناس آمد بناس

واقعی قرآن کریم رو نمائے حق ہے حاصل اس تمام تقریر کا یہ ہے کہ کلام مجید بڑی عجیب چیز ہے خدا کا عجیب و غریب لذیذ و پر اسرار کلام ہے جسکی تہ کو پہونچنا اور اس کے جمیع نکات و معانی کو سمجھنا قوت بشریہ سے خارج ہے آپ لوگوں کو چاہئے کہ خداوند تعالیٰ کی اس عظیم الشان نعمت کی قدر کریں اور اس کی تلاوت کی طرف خاص توجہ کریں اسکے نکات و معانی سے فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کریں مطالب پر غور کریں اور اس کی ہدایات پر عمل کریں چنانچہ ایک یہی آیت ہے جس کو میں نے تلاوت کیا اور اس کے مطلب اور مفہوم کو آپ کے سامنے واضح کر کے بیان کیا ہے آپ کو چاہئے کہ اس سے نفع حاصل کریں یعنی اعتقاد بقائے آخرت اور یقین فنائے دنیا کی جو غرض و غایت اعراض عن الدنیا و استحضار فنائے دنیا ہے اس کو اختیار کریں دنیا سے نفرت اور آخرت سے محبت پیدا کریں اور دنیا کی جن غافل کرنے والی اشیاء سے نفع اٹھایا جاتا ہے اس کو مقصود اصلی نہ قرار دیں اور اس معمولی فائدہ و آرام کو اپنا مطمح نظر اور مبلغ پرواز نہ بنائیں غرض چونکہ اعتقاد بقائے آخرت و فنائے دنیا کا لازمی نتیجہ اعراض عن الدنیا تھا لہذا اس آیت میں دنیا کو لہو و لعب سے تعبیر کیا گیا "وما ہذہ الحیوٰۃ الدنیا الا لہو ولعب" گویا دنیا کی حقیقت کو محصور کر دیا صرف دو چیزوں میں ایک لہو دوسرے لعب کہ دنیا بجز اس کے اور کچھ نہیں یہاں پر دو لفظوں کا استعمال کیا گیا ایک لہو اور دوسرا لعب اگرچہ یہ دونوں لفظ بظاہر بالکل مرادف معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن حقیقۃً ان میں قدرے تفاوت ہے لعب کہتے ہیں کسی لغو و عبث فعل کو اور لہو کہتے ہیں غفلت میں ڈالنے والی بات کو حاصل یہ ہوا کہ دنیا میں دو صفتیں ہیں ایک صفت عبث ہونے کی دوسری موجب غفلت ہونے کی اول کو لعب فرمایا ہے اور دوسری کو لہو لیکن اس پر ایک شبہ پڑتا ہے کہ جبکہ دنیا بجمیع اجزائہا لغو و عبث ہو گئی تو لازم آیا کہ جمیع مخلوقات خداوندی بے فائدہ اور مہمل محض رہ جاویں حالانکہ خداوند تعالیٰ کی طرف یہ بات منسوب کرنا کہ وہ حکیم ذات ایک ایسی مخلوق کو پیدا

کرے جو محل محض ہو سخت گستاخی ہی نہیں بلکہ ایک قسم کا جرم ہے علاوہ ازیں خود دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے "افحسبتم انما خلقناکم عبثا وانکم الینا لاترجعون" یہاں پر استفہام انکاری ہے یعنی کیا تمھارا یہ خیال ہے کہ ہم نے تم کو عبث اور بغوض پیدا کیا ہے بالکل غلط ہے نیز ایک آیت میں ارشاد ہے "ربنا ما خلقت ہذا باطلا" جواب شبہہ کا یہ ہے کہ فی الواقع کوئی شے مخلوقات خداوندی سے عبث اور بیکار نہیں البتہ تعیین فوائد ایک امر اہم ہے اور اس میں غلطی ہو سکتی ہے یہ ضروری ہے کہ دنیا سے قابل قدر فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں انسان ان کے منافع سے اپنی ضروریات کو پورا کرتا ہے یہ سب کچھ دنیا کے منافع میں داخل ہیں لیکن ہم لوگوں نے ان جمیع منافع میں سے بعض منافع کو جو کہ واقعی منافع تھے نظر انداز کر دیا اور دنیا کے منافع کا انحصار صرف ان منافع کے اندر کر دیا جو کہ حظ نفسانی سے لبریز ہوتے ہیں اگرچہ ان منافع سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ہم بداہتہ دیکھتے ہیں کہ ہر شخص ان سے فائدہ اٹھاتا ہے آرام پاتا ہے لیکن ان کی وجہ سے وہ حظ وافر جو اہم نفع اور قابل قدر فائدہ تھا اس کو ہم بھول جاتے ہیں اور اس نسیان کے باعث صرف یہی فوائد بنتے ہیں جو چند روز کے لئے ہم کو حظ نفس کا مزہ چکھا دیتے ہیں اور مقصود اصلی اور راس المنفعت کو چھوڑ دیتے ہیں اب ان لذتوں اور دلچسپیوں کو ہی فائدہ اور نفع قرار دے لینا اور انھیں پر قناعت کر لینا اس کی مثال تو بعینہ اس شخص کی سی ہے کہ جو ایک دور دراز ریل کا سفر کر رہا ہے اور رستہ میں کسی جگہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہوئی سنے اور وہاں جا کر کھڑا ہو جائے اور اس گھنٹی کو مزے لے لیکر سنتا رہے اور بجاتا رہے اور اس طرف گاڑی چھوٹنے والی ہو انجن نے سیٹی دیدی ہو اور جب اس سے کہا جائے کہ اے ظالم گاڑی چھوٹنے والی ہے انجن نے سیٹی دیدی ہے تو وہ یہ کہے واہ صاحب مجھ کو تو اس کی ٹن ٹن میں مزہ آ رہا ہے میں تو اس کو نہیں چھوڑ سکتا چاہے گاڑی جائے یا رہے تو جس طرح اس شخص کو اس گھنٹی کی آواز اور لذت نے ایسا مست کر دیا کہ نتیجہ یہ ہوا کہ گاڑی چھوٹ گئی سفر کھوٹا ہوا اسی طرح اگر آپ بھی ان لذات دنیویہ اور دلچسپ اشیاء کی دلچسپیوں میں پڑے رہیں گے تو آپ کا بھی انجام یہی ہوگا کہ

مقصود اصلی سے محروم ہو کر کوئی حظ وافر نہ حاصل کر سکیں گے تو دیکھئے گو آرام پہونچنا اور دل کا خوش ہونا یہ بھی منافع کی فہرست میں داخل ہے لیکن پھر وہ کس قدر مضرت رساں اور نقصان دہ ثابت ہوا کیونکہ اس نے ایک ضروری اور قابل قدر منفعت سے غافل بنا دیا اسی طرح دنیا کی ہر چیز فی نفسہ حکم و مصالح و منافع سے لبریز ہے عبث و فضول کوئی نہیں مگر جب وہ مقصود اصلی سے مانع ہو جائے تو اُس وقت یہی فوائد جن کو ہم نے منافع دنیویہ کا اصل اصول سمجھ رکھا ہے اور وقعت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں انھیں کو لہو و لعب سے تعبیر کیا جاویگا یعنی جس صورت سے تم دنیا کے ساتھ انتفاع اور اشتغال رکھتے ہو اس صورت میں وہ تمھارے لئے لہو و لعب سے زیادہ نہیں گو فی نفسہ اس میں بہت مصالح و منافع ہیں مگر وہ منافع ایسے نہیں جن میں پڑ کر منافع آخرت کو بھلا دیا جائے خلاصہ یہ کہ جن منافع کے لئے یہ اشیاء وضع کی گئی ہیں ان کے اعتبار سے ان سے عبثیت و باطلیت کی نفی کی گئی ہے اور جو منافع اہل ہوا نے خود تراشے ہیں جو کہ واقع میں مضار ہیں اُن کے اعتبار سے اس کو لہو و لعب فرمایا ہے بہرحال یہ دنیا اگر آخرت سے اعراض کا سبب بن جاوے تو یہ لغو و عبث ہے چنانچہ مقابلہ میں اس کے فرماتے ہیں کہ "ان الدار الآخرۃ لھی الحیوان" اس طرف تو دنیا کو لہو و لعب سے تعبیر فرمایا اور اس طرف دار آخرت کو حیوان سے تعبیر کیا کیونکہ لہو و لعب باعتبار اپنے ثمرات کے مثل مردہ ہیں اور موت ثمرات دلیل ہے موت اصل کی بخلاف دار آخرت کے کہ اس کو حیوان بمعنی حیوۃ مراد زندہ سے تعبیر کیا کیونکہ اس کے ثمرات زندہ اور باقی رہنے والے ہیں اور حیات ثمرات دلیل ہے حیات اصل کی لہٰذا آخرت خود بھی زندہ ہے باقی فوائد دنیویہ در اصل فانی و مردہ ہی ہیں تو زندہ فوائد کو چھوڑ کر مردہ فوائد کو کیا کریں کارآمد چیز کو چھوڑ کر بیکار شے کے پیچھے پڑنا اگر حماقت نہیں تو اور کیا ہے چنانچہ آگے ارشاد فرماتے ہیں کہ "لو کانوا یعلمون" کہ کاش کہ یہ لوگ اپنی دینی منفعتوں کا احساس کرتے اور دنیوی مضرتوں کو جان لیتے اور سمجھتے کہ یہ دنیا اور اس کے لواحق سخت مضرت رساں ہیں اور آخرت اور اس کے متعلقات نفع رساں اور راحت بخش ہیں یہاں پر استعمال کیا گیا ہے حرف لو کا جو کہ تمنی کے واسطے بھی آتا ہے

لہ معجم و الف ۱۰ للبرقانی ۱۲

اور یہاں یہی معنی ہیں تو اس سے انتہا درجہ کی شفقت و رحمت مترشح ہوتی ہے کہ جیسے ایک شفیق باپ اپنے بچے سے پیار کی باتیں کرتا ہے اور محبت میں آکر بچے کے ساتھ خود بھی توتلا بن جاتا ہے بلا تشبیہ اسی طرح خداوند تعالیٰ کی ذات سے کسی امر کی تمنا کرنا بالکل مستبعد اور ان کی شان کے خلاف ہے کیونکہ آرزو ہمیشہ ایسی چیز کی کی جایا کرتی ہے جو حاصل نہ ہو اور خود اُسکے نفع کا محتاج ہو اور خداوند تعالیٰ قادر قیوم اور مالک کل شئ ہے اس کے واسطے کوئی شے ایسی نہیں جو حاصل نہ ہو دوسرے وہ نفع کا محتاج نہیں پھر آرزو کیسے کرتے لیکن باوجود اس کے محض اپنے بندوں کی دلدہی کی خاطر اُن کے مذاق کے موافق اُن سے معاملہ فرمایا جس سے غرض و مقصود محض تقریب اور تفہیم ہے اور اس تفہیم کی دو صورتیں تھیں ایک یہ کہ تم ہمارے موافق ہو جاؤ دوسرے یہ کہ خیر ہم ہی تمہارے موافق ہو جائیں لیکن چونکہ تم میں اتنی قابلیت و استعداد نہیں کہ تم ہمارے موافق ہو جاؤ یا ہم سے قریب ہو سکو لہذا چلو ہم ہی تمہاری خاطر تمہارے موافق ہوئے جاتے ہیں لہذا جن مواقع پر قرآن شریف میں الفاظ تمنی و ترقی مستعمل ہیں اُن سے تمنی و ترجی حقیقی مراد نہیں ہوتی ایسے ہی جہاں کہیں قرآن شریف میں تعجب کے صیغے مستعمل ہیں اُن سے بھی تعجب حقیقی مراد نہیں ہوتا یعنی خداوند تعالیٰ کسی امر پر تعجب نہیں کرتا کیونکہ تعجب کے واسطے متعجب فیہ سے جہل ہونا لازم ہے مثلاً کسی شخص کو معلوم نہ ہو کہ میرا بھائی آئیگا اور وہ اتفاقاً بلا کسی اطلاع کے آجائے تو اس پر تعجب ہوگا کہ ہائیں تم کیسے پہنچ گئے غرض کہ تعجب کے واسطے ہمیشہ جہل لازم ہے اور خداوند تعالیٰ جہل سے منزہ و مبرا ہیں اُن کی ذات عالم جمیع جزئیات و کلیات ہے اسکا علم محیط ہے جمیع اکوان کو لہذا اسکے واسطے کوئی امر یا کوئی واقعہ موجب تعجب یا حیرت نہیں ہو سکتا بلکہ مراد اس سے تعجیب ہوتی ہے (یعنی تعجب دلانا) یعنی یہ امر اس قابل ہے کہ تم لوگ اس پر تعجب کرو اور متحیر ہو ہم تو کیا تعجب کریں ہماری نظروں میں کوئی شے عجیب نہیں۔ اسی طرح تمنی ہے کہ ہمارے پاس تمام اشیاء موجود ہیں تمام کائنات ہماری مخلوق اور مملوک ہیں لہذا ہمیں تو کیا آرزو ہوتی ہاں بیشک یہ امر تم لوگوں کی آرزو اور تمنی کے قابل ہے اللہ اللہ کیا شان

ایزدی ہے اور کیا رحمت خداوندی ہے کہ جب دیکھا کہ یہ اتنے بے حس ہو گئے کہ ان کو اپنے نفع رساں اور مفید اشیاء کے ملنے کی آرزو بھی نہیں رہی تو خود اپنی طرف آرزو کو منسوب کر کے متنبہ کر دیا کہ یہ امر قابل تمنی ہے جیسے ایک شفیق باپ کہتا ہے کہ کاش یہ میرا بچہ پڑھ جاتا حالانکہ اس کے پڑھ جانے سے اس کو کچھ بھی نفع نہیں مگر مقصود اس کا یہ ہے کہ میرے بیٹے کو احساس ہو کہ پڑھنا بھی کوئی قابل تمنی چیز ہے اسی طرح اگر ہم لوگوں کو یہ متمنی بہ علم بھی حاصل ہو جائے تو کیا خیال کیا جا سکتا ہے کہ خداوند تعالیٰ کو ہمارے اس علم سے کوئی قسم کا نفع پہونچے گا نعوذ باللہ من ذلک وہ تو مستغنی ہیں احتیاج سے مبرا ہیں صرف ہمارا ہی نفع ہے اور میں نے جو حق تعالیٰ کو مستغنی کہا ہے اس استغناء کے وہ معنی نہیں جو آجکل جاہلوں میں مشہور ہیں کیونکہ آج کل لوگوں نے استغنا کے معنی بے توجہی اور لاپرواہی کے سمجھ رکھے ہیں چنانچہ کتنا گندہ محاورہ ہے کہ جب کوئی شخص جوان دو چار بچے چھوڑ کر مر جاتا ہے تو جہاں دو چار آدمی مل کر بیٹھے تو ان میں سے کوئی تو کہتا ہے کہ کیا جوان موت ہوئی دوسرا کہتا ہے کہ ہاں بھئی کیسے چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ کر مرا ہے بیچارے بالکل بے وارث رہ گئے تیسرا بولتا ہے کہ ہاں میاں اللہ پاک کی ذات بڑی بے پرواہ ہے جو چاہتا ہے کرتا ہے وہاں چارہ دم زدن نہیں غضب خدا کا اس موقع پر بے پرواہ کا طلب بجز اس کے اور کیا ہے کہ لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ نعوذ باللہ خداوند تعالیٰ کو اپنے بندوں کے مصالح پر بالکل توجہ نہیں ان کے حالات سے غافل اور لاپرواہیں ان کے یہاں کوئی انتظام نہیں سو یہ کتنی سخت بے ادبی ہے اگر آپ کسی غلام کو اس کی مصلحت کے لئے دوا سے مسہل پلاویں اور اس لئے اس کے گھر والوں سے جدا کر کے خلوت گاہ میں رکھیں تاکہ طبیعت یکسو ہو کر مادہ کو دفع کرے اور کوئی صاحب اس پر افسوس کریں کہ دیکھو میاں یہ کیسے لاپرواہ آدمی ہیں کہ بیچارے غلام کو گھر والوں سے الگ کر دیا تو کیا آپ کو اس شخص کا کہنا برا نہ معلوم ہوگا اور کیا آپ نہ کہیں گے کہ میاں ہم نے اس کو اسی کی مصلحت سے گھر سے الگ کیا ہے اب عنقریب گھر والوں میں رہنے سہنے لگے گا سو جب آپ کو اتنا سا کہنا ناگوار گذرتا ہے تو کیا اللہ تعالیٰ کو جو کہ ہر وقت اپنے بندوں کی راحت رسانی اور

فلاح میں ہیں اور باوجود ان کے عصیاں اور نافرمانی کے پھر عنایات فرماتے ہیں تو انکو اپنے بندوں کی یہ احسان فراموشی اور یاوہ گوئی ناگوار نہ گذرے گی تم کو کیا خبر ہے کہ جس کو آپ نے بے توجہی سمجھا ہے وہی اُن کے حق میں عین توجہ اور عنایت ہو خداوند تعالیٰ کی حکمتوں پر کوئی شخص مطلع نہیں ہو سکتا غرضکہ استغنا کے معنی بے التفاتی و بے توجہی کے کرنا سخت غلطی ہے۔ اور منشا غلطی کا محض یہ ہے کہ لفظ استغنا عربی اور اردو دونوں میں مستعمل ہے مگر عربی میں اس کے معنی عدم احتیاج کے ہیں اسی معنی میں یہ خدا کی صفت ہے اور اردو محاورہ میں بے پروائی کے معنی بھی آتے ہیں بس اب لوگوں نے قرآن میں غنی اور واستغنی اللہ کا یکھکر اردو محاورہ سے ترجمہ کر لیا اور استغناء کو یہ لوگ بمعنی لاپرواہی سمجھ بیٹھے مگر یہ بالکل غلط ہے کیونکہ جیسے خداوند تعالیٰ نے اپنے آپ کو غنی حمید کہا ہے ایسے ہی رؤف الرحیم سے بھی تو متصف کیا ہے تو اگر استغنا کے معنی بے توجہی اور عدم رعایت و بے انتظامی کے ہیں تو پھر رؤف کے کیا معنی ہونگے رافت و عدم مراعات میں تو تناقض ہے رأفت کے معنی غایت شفقت و رحمت کے ہیں اور عدم مراعات و بے توجہی ایک سخت دل اور غیر منصف شخص کا کام ہے لہذا معلوم ہوا کہ استغنا کے یہ معنی نہیں بلکہ استغناء خداوندی کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے افعال یا اعمال ہمارے واسطے مضرت رساں یا نافع نہیں ہو سکتے ہم تمہارے کسی فعل کے محتاج نہیں اور نہ تم ہمیں کسی قسم کا نفع یا ضرر پہونچا سکتے ہو چنانچہ ان اللہ لغنی عن العالمین کے ساتھ ارشاد فرمایا ہے کہ "من جاہد فانما یجاہد لنفسہ" جو کوئی محنت کرتا ہے اور حسنات پر عمل کرتا ہے وہ اپنے لئے کرتا ہے ایسے ہی ارشاد ہے "ان تکفروا فان اللہ غنی عنکم" اس سے بھی یہی مفہوم ہوا کہ جو شخص کفر و شرک کرتا ہے وہ اپنے آپ کو خوار مذلت میں ڈالتا ہے اور مخلد فی النار بنتا ہے جیسا کہ حسنہ کا خدا تعالیٰ محتاج نہیں تھا ایسے ہی شرک و کفر بھی اس کے لئے باعث نقصان نہیں یہ معنی ہیں استغنا کے اور اگر آپ کہیں کہ صاحب ہماری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک شخص کے چھوٹے چھوٹے چار بچے ہوں جن کی ماں مر چکی ہے اور خداوند تعالیٰ اُن کے باپ کی بھی روح قبض

کر لیتا ہے کہ یہ کس طرح رأفت میں داخل ہو سکتا ہے اس سے زائد کیا عدم رعایت اور بے انتظامی ہو گی تو حضرت آپ کی سمجھ پر پڑیں پتھر آپ کو کیا خبر ہے حقیقت حال کی بچہ بھی انھیں کا ہے اُن کا باپ بھی انھیں کا ہے۔ دونوں اُن کے مملوک ہیں اُن کی مصلحتوں کا آپ زیادہ خیال کر سکتے ہیں یا وہ جس طرح اس نے اس باپ کو اتنا بڑا کر دیا ہے ایسے ہی وہ ان کی بھی پرورش کرے گا تم کون ہوتے ہو بیچ میں دخل دینے والے اور رائے زنی کرنے والے غضب خدا کا کس قدر اصرار ہے اور لوگ کیونکر بے التفاتی اور عدم مراعات کے ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں حالانکہ وہاں کے آداب کا حال یہ ہے کہ اثبات کمال میں بھی سلیقہ کا لحاظ رکھنا ضروری حمد و ثنا کے اندر بھی ادب کے ملحوظ رکھنے کی سخت تاکید ہے چنانچہ ایک بزرگ بیٹھے ہوئے تھے بارش ہونے لگی سخت گرمی پڑ رہی تھی پانی سے لوگ ترس رہے تھے ایسے موقع پر جو بارش ہوئی تو بے ساختہ اُن کی زبان سے نکلا کہ سبحان اللہ آج کیا موقع پر بارش ہوئی ہے فوراً بارگاہ صمدیت سے ان پر عتاب ہوا کہ بے ادب بے موقع کون سے روز ہوئی تھی جو موقع کو آج کے ساتھ مقید کرتا ہے غرضکہ اس بارگاہ میں اثبات کمالات کے واسطے بھی سلیقہ چاہئے اور حق یہ ہے کہ ہمتو کسی طرح بھی اُن کی مدح نہیں کر سکتے یہ بھی اُن کی رحمت ہے کہ حمد و ثنا کا طریقہ بھی خود بتلا دیا ورنہ ہماری ثنا کی تو یہ حقیقت ہے ؎

شاہ را گوید کسے جولاہہ نیست ایں نہ مدح است او مگر آگاہ نیست

صاحبو ان بزرگ نے تو تعریف ہی کی تھی مگر چونکہ تھی غیر مہذب الفاظ میں اسوجہ سے اس قدر عتاب ہوا وہاں پر بڑے سنبھل سنبھل کر قدم رکھنا پڑتا ہے اور واقعی بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں کہ جو ظاہر میں کچھ سخت نہیں معلوم ہوتے مگر کبھی موقع و محل کے مناسب نہ ہونے کی وجہ سے اور کبھی مخاطب کی شان کے اعتبار سے وہ الفاظ سخت بے ادبی اور گستاخی میں داخل کئے جاتے ہیں چنانچہ ان بزرگ پر ہی محض لفظ آج کی بناء پر اتنی سختی ہوئی حالانکہ ظاہر میں ہمارے خیال سے یہ لفظ کچھ گستاخانہ نہ تھا تو جب اس ذرا سے طرز بدل جانے اور الفاظ کے محاورہ کے خلاف ہونے پر اس قدر عتاب ہوا تو

اثبات نقص پر تو جو کچھ عتاب نہ ہو تھوڑا ہے کیونکہ شان خداوندی میں اثبات نقص ایک بہت بڑا جرم اور گستاخی ہے ایسے موقع پر لوگ کہدیا کرتے ہیں کہ لو صاحب ایک ذرا سی بات پر کس قدر سخت گرفت ہوئی ایسی بھی کیا سختی ہے حالانکہ وہ لوگ غور و تامل سے کام نہیں لیتے ورنہ وہ سمجھ جائیں کہ اُن کا یہ کہنا بھی جہالت کی علامت ہے کیونکہ یہ باتیں ذرا سی نہیں ہیں بلکہ یہ وہ باتیں ہیں جن پر عام طور سے ہمارے محاورات میں بھی گرفت ہوتی ہے مثلاً آپ کچہری روزانہ جاتے ہیں اور وقت معینہ پر پہونچ جاتے ہیں کسی روز آپ کا حاکم کہدے کہ صاحب آج تو آپ بہت ٹھیک وقت پر آئے تو آپ کو کس قدر ناگوار معلوم ہوگا کہ لو صاحب روز تو ہم صحیح وقت پر یہاں پہونچ جاتے ہیں وہ کہتا ہے کہ آج تو آپ بہت صحیح وقت پر پہونچے گویا اور کسی دن صحیح وقت پر آئے ہی نہیں ایسے ہی اگر کوئی آقا اپنے کارگذار ملازم کو کسی کام کے واسطے بھیجے اور جب وہ کام کرآئے تو کہے بھئی آج تو خوب کام کیا تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس ملازم کے دل کو کس قدر سخت تکلیف ہوگی تو جب ہم لوگوں کا یہ حال ہے کہ اس ہی محاورہ سے ہم اس قدر تنگ دل ہوتے ہیں اور اس قدر یہ الفاظ تکلیف دہ ثابت ہوتے ہیں تو اللہ میاں کو یہ الفاظ کیوں نہ ناگوار گذریں گے اور ان کے ہاں کیوں نہ ان پہ گرفت ہوگی حالانکہ ہم یہ جانتے ہیں کہ کبھی قید اتفاقی بھی ہوا کرتی ہے مگر نہیں چونکہ محاورہ ہی سخت ہے اس وجہ سے یہ باتیں ضرور چبھتی ہیں تو جب ایک ادنےٰ انسان کا یہ حال ہے تو احکم الحاکمین کے دربار کا تو کیا ٹھیک ہے یہ گفتگو تو لفظ لو پر چلی تھی کہ لفظ تمنی کے استعمال سے اس طرح شفقت کا اظہار ہو گیا کہ ہمارے علم سے ان کو کچھ نفع نہیں مگر پھر بھی صیغہ تمنی سے اس کو ظاہر فرمایا اب کا نوا یعلمون کو سنئے قران کے نکات اور مضامین لطیفہ بھی کیسے کیسے عجیب ہیں کہ لفظ لفظ میں ایک علم کا دریا ہے اس آیت میں لو کا نوا یعلمون سے ایک دقیق اور نفیس اشارہ ہے اس طرف کہ یہ دنیا دار باوجود اس میں اس قدر منہمک ہونے کے اس دنیا کی حقیقت سے ہی بالکل بے بہرہ اور ناواقف ہیں دین سے تو کوئے

تھے ہی دنیا سے بھی جاہل ہیں۔ اسی لئے ایک آیت میں آخرت کے ساتھ دنیا کی حقیقت سمجھنے کی بھی ترغیب دی ہے "کذلک یبین اللہ لکم الآیات لعلکم تتفکرون فی الدنیا والآخرۃ" یعنی اللہ تعالیٰ اس آیت کو اس لئے بیان کرتے ہیں تاکہ تم دنیا و آخرت کی حقیقت میں خوب غور و فکر کرلو اور اس سے معلوم ہو کہ یہ دنیا جس پر تم جان دیتے ہو تماشا یہ ہے کہ تم اس کی حقیقت سے بھی جاہل ہو لو آؤ اس کی حقیقت ہم سے سن لو اور اس کے قبائح و نقائص پر غور کرو اور ساتھ ہی ساتھ آخرت کی بھی حقیقت معلوم کرلو جس سے تم بالکل غافل ہو اور اس کے محاسن و محامد میں تامل کرو اور پھر دیکھو کہ ابتک تم ایسی نفع رساں اور مفید شے سے غافل اور ایک عبث شے کے پیچھے سرگرداں تھے لہٰذا اب اس دنیا سے اعراض کرو اور اس کی دلچسپیوں کو ٹھکرا دو اور اس آخرت یعنی دار البقا کی طرف رغبت کرو اور اس تک پہونچنے کی کوشش کرو اسی واسطے لعلکم تتفکرون فرمایا دوسرے دنیا کی حقیقت بتلانے میں یہ بھی فائدہ ہے کہ وبضدہا تتبین الاشیاء یعنی آخرت کی حقیقت کامل طور پر بھی واضح ہو سکتی ہے جب دنیا کی حقیقت بھی آشکارا ہو اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی شخص کسی بدصورت عورت کو برقعہ پہنے ہوئے دیکھے اور اس کے ظاہری تناسب اعضا اور رفتار گفتار کو دیکھ کر دل و جان سے شیفتہ و فریفتہ ہو جائے تو جس طرح اس کا ایک کارگر علاج یہ ہے کہ اس کی نوعروس بیوی کا چہرہ جو کہ اس سے بدرجہا حسین و خوبصورت ہے نقاب اٹھا کر دکھلا دیا جاوے اسی طرح اس کا تتمہ علاج یہ بھی ہے کہ اس بدصورت عورت کا چہرہ بھی نقاب اٹھا کر دکھلا دیا جاوے تاکہ مقابلہ میں پھر اس کو احساس ہو کہ واقعی میری بیوی اس سے بدرجہا خوبصورت و حسین ہے ورنہ تو یہ تذبذب ہی میں رہتا کہ نہ معلوم اس کے جہاں سوز حسن کی کیا کیفیت ہوگی اس کے جمال کا کیا عالم ہوگا غرضکہ برقع رہتے ہوئے کافی طور سے استیصال اس مادہ عشق کا نہ ہوگا اور نقاب اٹھاتے ہی حقیقت حال واضح ہو جائے گی اور پھر بجائے رغبت کے نفرت اور بجائے الفت کے کلفت ہو جائے گی اسی طرح عروس آخرت کی قدر اس وقت ہوگی جبکہ اس ڈائن دنیا کی مکروہ صورت بھی اچھی طرح دیکھ لو اور اس کے قبائح معلوم کرلو اگر دنیا کا کچا چٹھا کھول کر نہ دکھایا جاتا اور محض

آخرت ہی کی خوبیاں بیان کی جاتیں تو اس قدر اہمیت آخرت کی نہ ہوتی اور دنیا کا خیال دل سے نہ نکلتا اس لئے حکیم مطلق نے دنیا اور اس کے نقصانات کی بھی شرح کی اور آخرت اور اس کے مفاد کو بھی بیان کیا تاکہ حبِ دنیا قلب سے کافی طور پر منقطع ہو کر اُس میں رغبت آخرت کی پیدا ہو جائے یہ بھی خدا کی خاص رحمت اور عنایت ہے کہ اُس نے محض ہمارے نفع کے لئے اس مبغوض دنیا کا ذکر بھی فرمایا حالانکہ بظاہر اس کلام معجز نظام میں اشیائے مبغوضہ کا تذکرہ مستبعد ہے اس استبعاد پر ایک قصہ یاد آگیا ایک مرتبہ حضرت رابعہ بصری کی مجلس میں کچھ بزرگ دنیا کی مذمت اور اسکے نقائص وعیوب بیان کر رہے تھے اُنھوں نے فرمایا کہ "قوموا عنی فانکم تحبون الدنیا" انھوں نے جواب دیا کہ ہم تو دنیا کی مذمت کر رہے ہیں فرمایا کہ من احب شیئًا اکثر ذکرہ تمھارا اسکے تذکرہ میں مشغول ہونا گو بصورت ذم ہی ہو محبت کی علامت ہے کہ اگر کسی ظالم بادشاہ سے کوئی سخت گفتگو ہوئی ہو اس کا تذکرہ کرتا ہے اور اگر کسی چمار سے ایسی ہی گفتگو ہوئی ہو اُس کا تذکرہ نہیں کرتا وجہ اُس کی یہی ہے کہ بادشاہ کو باعظمت سمجھتا ہے اور اس سے دلیرانہ گفتگو کو فخر سمجھتا ہے اس لئے اُس کو نقل کرتا ہے بخلاف چمار کے معلوم ہوا کہ مذمت بھی عادتًا باوقعت چیزوں کی کی جاتی ہے پس اسی طرح دنیا کی مذمت کرنا متضمن ہے اس دعوے کو کہ ہم ایسی بڑی چیز کے تارک ہیں یعنی ہیں تحبون الدنیا کے دیکھئے اس مبغوضہ کا ذکر مجلس اولیاء میں مستبعد سمجھا گیا۔ چہ جائے کلام حق مگر باوجود اس ظاہری استبعاد کے پھر بھی خداوند تعالیٰ نے تذکرہ دنیا کا اس لئے فرمایا ہے کہ اس میں ہمارے حال کی رعایت ہے کہ ہم بدون بتلائے اس کی حقیقت معلوم نہ کر سکتے تھے پس جیسا کلام مجید میں تمثیل اصنام کی غرض سے مکھی اور مچھروں کا ذکر کیا گیا ہے ایسا ہی یہاں تقبیح کی غرض سے اس مبغوض دنیا کا بھی ذکر کیا اور مقابلہ کے لئے آخرت کو بھی بیان فرمایا اور اگر یہاں کوئی سوال کرے کہ جس طرح خداوند تعالیٰ کے ذکر دنیا کو تم نے حکمت پر محمول کیا اسی طرح رابعہ بصری نے ان حضرات کے تذکرہ کو ان حکمت پر کیوں نہ محمول کیا اس کی کیا وجہ ہے۔ جواب اس کا یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ کے کلام میں تو

حکمت ظاہر ہے کیونکہ ہم کو مطلع کرنے کی ضرورت تھی لیکن ان حضرات کے کلام میں یہ حکمت اس لئے نہ تھی کہ ان شیوخ کے پاس کون سا دنیا دار بیٹھا ہوا تھا جس کو تنفر واعراض عن الدنیا کی ترغیب دینا مقصود تھا لہذا ان کا یہ فعل متضمن ہوگا ایسی باوقعت چیز کے ترک کے دعوے کو جیسے زاہد کسی فعل زہد کو اظہار زہد کے واسطے بیان کرتا ہے جیسے کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص ہمارے پاس اتنا اتنا روپیہ لایا ہم نے ایک حبہ بھی نہ لیا سب واپس کر دیا یہ بھی ایک بڑی بھاری لغزش ہے اس قسم کی لغزشوں کا احساس بھی نہیں ہوتا چنانچہ ایک بزرگ کسی دوسرے بزرگ کے گھر مہمان گئے میزبان نے خادم سے کہا کہ شیخ کو اس صراحی میں پانی پلانا جو ہم اپنے دوسرے حج میں مکہ سے لائے تھے شیخ نے کہا اے شخص تو نے ایک کلمہ ریا سے اپنے دونوں حج کا ثواب باطل کر دیا لغزشیں تو سب ہی سے ہوا کرتی ہیں کیونکہ عصمت بجز ملائکہ وانبیاء کے اور کسی کے واسطے ثابت نہیں لیکن لغزشوں کا ادراک یہ بھی ایک اہم مرحلہ ہے ایسے لوگ بہت کم پائے جاتے ہیں جن کو اپنی لغزشوں پر تنبیہ ہو جایا کرتا ہو لہذا کیا تعجب ہے کہ یہ حضرات رابعہ کی مجلس والے بھی اس ہی مرض میں مبتلا ہوں اور اسی وجہ سے انکی زبان سے یہ مذمت دنیا صادر ہوئی ہو اور حضرت رابعہ بصری کو اس مرض کا احساس ہو گیا ہو اسی طرح بوجہ انقباض ذکر مبغوض کے یہ شیطان پر لعنت بھی نہ کیا کرتی تھیں کہ کون اتنی دیر شیطان کے پیچھے پڑے ذکر محبوب ہی میں کیوں نہ لگیں اور یہ بھی ہے کہ عدم لعنت پر تو مواخذہ نہ ہوگا نہ کسی قسم کی بازپرس بخلاف ترک ذکر کے کہ اس پر بازپرس ہوگی حاصل یہ ہے کہ اتنی دیر ہم شیطان پر لعنت کریں۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ اس وقت کو ذکر الٰہی میں گذاریں تاکہ خدا کے ہاں کی بازپرس سے بچیں تو یہ بھی ممکن ہے کہ اسی طرح انھوں نے ان حضرات کو تذکرہ دنیا سے منع کیا ہو کہ اس میں چنداں فائدہ نہیں جس قدر ذکر الٰہی میں نفع ہے لہذا کیوں وقت کو عبث ضائع کرتے ہو تو جب خدا کے مقبول بندے دنیا کو اس قدر برا سمجھتے ہوں کہ اپنی مجالس میں اس کی مذمت کو بھی گوارا نہ کریں نام تک لینا اضاعت وقت سمجھیں تو ہم یہ خداوند تعالیٰ کے کلام میں تو کیونکر قابل ذکر ہوگی مگر مع ہذا پھر خدا نے تذکرہ دنیا کا کیا

تاکہ ہم لوگوں کو تنبیہ ہو اور ہوش میں آجائیں یہ کمال رحمت ہے کہ اپنے بندوں کی خاطر ایک ایسے امر کے ذکر کو اختیار کیا جائے جو کہ مبغوض ہے غرض یہ ہے کہ اتنی سی تو آیت اور اس میں کس قدر عنایات و احسانات کہ ہر پہلو سے بیدار کیا اور ہر جانب سے ہوشیار فرمایا خلاصہ تمام آیت کا یہ ہے کہ ہر وقت اپنا وظیفہ اور مطمح نظر صرف دو چیزوں کو رکھے اول تنفر و انقباض عن الدنیا مع استحضار فنائے دنیا و دوسرے رغبت اور طمع آخرت اور اس کے تحصیل کے ذرائع و اسباب کی تلاش اور یہ مطلق استحضار تو ہر وقت اور ہر ساعت ہی کا وظیفہ ہے لیکن خاص استحضار کے لئے بھی کم از کم ایک دن میں ایک مرتبہ ضرور وقت مقرر کر لینا چاہئے وہ اس طرح کہ روزانہ سوتے وقت جب چارپائی پر لیٹے تو اپنے تمام دن کے افعال حسنہ و سیئہ طاعات و معصیت کو پیش نظر رکھ کر ان میں سے سیئات و معصیات کو علیحدہ کرے اور حسنات کو علیحدہ اور پھر جو نافرمانیاں کی ہیں اُن پر جو وعیدیں ہیں اور ان پر جو سزائیں و عذاب وارد ہیں اُن کا تصور کرے اور یہ سمجھے کہ گویا میں خدا کے سامنے کھڑا ہوں اور حساب و کتاب ہو رہا ہے۔ اور اتنے میرے گناہ ہیں جن پر یہ عذاب میرے واسطے تجویز ہوا ہے یہ خاص استحضار ہے دنیا و آخرت کا اور استحضار کے بعد دو کام اور کرے ایک تو توبہ اور خداوند تعالیٰ سے وعدہ کہ آئندہ پھر ارتکاب معاصی سے بچوں گا اور دوسرے اس وعدہ پر باقی رہے اور توبہ پر ثابت رہنے کی دعا کرے کہ خدایا مجھ کو توفیق دے کہ میں اس توبہ پر قائم رہوں۔ توبہ کی ضرورت تو ظاہر ہے اور دعا کی ضرورت اس لئے ہے کہ انسان کی قدرت سے یہ باہر ہے کہ خود وہ کسی وعدہ کو پورا کر دے یا کسی دعوے کو نباہ دے۔ بدون خدا کی عنایت و اعانت کے نیز اس استحضار کا تتمہ یہ بھی ہے کہ جس قدر دن بھر میں خدا کے احسانات ہوئے ہیں ان پر بھی ایک تفصیلی نظر ڈالے کہ او فوہ باوجود اس قدر نافرمانیوں کے پھر خداوند تعالیٰ نے مجھ پر اس قدر انعامات فرمائے تو اگر میں ان نافرمانیوں سے بچوں گا تو نہ معلوم کس قدر احسانات و انعامات ہوں گے نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ اگلے ہی دن رغبت طاعت کی طرف بہت زیادہ ہو جائے گی یہ دستور العمل ہمیشہ کے واسطے مقرر کرے اور پابندی کے ساتھ اس پر

عمل کرے نیز اس کے ساتھ ہی کوئی خاص وقت مقرر کرنا چاہئے۔ جس میں کچھ ذکر کر لیا کریں تاکہ قلب تازہ رہے اور روح کے اندر ایک حیات روحانی باقی رہے لیکن یہ واضح رہے کہ محض ذکر ہی کافی نہیں بلکہ کسی بزرگ سے تعلق اور نسبت بھی ضرور رکھنی چاہئے تاکہ تزکیہ نفس بھی ہو جائے اور اس کی مدد سے ہر قسم کی لغزشوں سے بھی بچتا رہے ورنہ اس کے کامیابی دشوار ہے بلکہ احتمال ہے کہ جادۂ استقامت سے نہ ہٹ جائے اور افراط و تفریط میں مبتلا ہو جائے اگر زندہ بزرگوں میں سے کسی کے ساتھ عقیدت نہ ہو تو ان بزرگان دین کے تذکرے اور کتابوں ہی کا مطالعہ کیا کرے جو وفات پا چکے ہیں اول وہی نافع ہوں گی اور اگر نہیں، تو پھر رغبت و تلاش پیدا ہو گی اور ضرور کسی پیر طریقت کے ساتھ عقیدت ہو جائیگی اور کامیابی کی صورتیں مہیا ہو جائیں گی باقی سب سے بڑا مراقبہ وہی ہے جسکو میں اول بیان کر چکا ہوں اور مکرر عرض کرتا ہوں کہ ہر وقت یہ خیال پیش نظر رکھے کہ میں اس وقت سفر کر رہا ہوں آخرت کی ایک دور دراز منزل میرے سامنے ہے جسکی شاہراہ بہت کٹھن ہے اس میں بہت سے موانعات پیش آیا کرتے ہیں اور منزلیں کھوٹی ہو جایا کرتی ہیں لہٰذا جن قدر امور معاد میں اور مقصود میں مدد گار ہیں ان کو اختیار کرنا چاہئے اور جو امور مضرت رساں اور نقصان دہ ہیں ان کو چھوڑنا چاہئے لیکن یہ سب کچھ موقوف ہے خدا کی عنایت پر جب تک میاں کی نظر رہے گی اس وقت تک تمام مشکل سے مشکل کام سہل ہو جائیں گے اور سب دقتیں آسان ہو جائیں گی اور جہاں اس فیض سے محروم ہوئے تو پھر آسان سے آسان کام بھی دشوار اور ناقابل برداشت ہوں گے لہٰذا مناسب ہے کہ امداد خداوندی کی دعا ضرور کرے یہی امداد وہ چیز ہے کہ سالکین کو اسی کی بہت فکر رہتی ہے ان کی آنکھیں روشن ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ بدون اس کی عنایت کے ہم اس شاہراہ پر نہیں چل سکتے ؎

این ہمہ گفتیم و لیک اندر پیچ — بے عنایاتِ خدا ہیچیم و ہیچ
بے عنایاتِ حق و خاصان حق — گر ملک باشد سیاہ ہست ش ورق

دوسرے شعر میں مولانا نے حصول عنایات حق کی صورت بتلائی ہے کہ خدا کے خاص

بندوں کی عنایت حاصل کرو اس کو فضول نہ سمجھو اور یہ نہ خیال کرو کہ ایک آدمی کی عنایت سے کیا ہوتا ہے صاحبو! یہ بھی بہت مفید ہے اور بہت سی مضرتوں سے محفوظ رکھتی ہے دوران کی عنایت اور توجہ یہی ہے کہ وہ اپنے متعلقین اور مریدین پر توجہ رکھیں ہر وقت ان کا خیال رکھیں اور ان کو مضرتوں سے بچنے کی ہدایت کریں منافع حاصل کرنے کی تدبیریں بتلائیں غرضکہ ہر وقت ان کو اپنی زیر نظر رکھیں اگر سامنے آکر بیٹھیں تو خاص تفقد رکھیں یہی عنایت ہے یہی توجہ ہے ہمارے شیوخ پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ حضرات اپنے مریدین پر توجہ نہیں ڈالتے نہ کوئی حلقہ باندھتے ہیں نہ کوئی خاص وقت مقرر کرتے ہیں لیکن یہ لوگ ناواقف ہیں یہ نہیں سمجھتے کہ ہمارے شیوخ کی توجہ ہم پر ہر وقت رہتی ہے جو لوگ حلقہ باندھکر بیٹھتے ہیں اور خاص اوقات میں توجہ ڈالتے ہیں ان کی توجہ تو ان خاص اوقات ہی میں رہتی ہے ہمارے بزرگوں کی توجہ ہر وقت ہمارے ساتھ ساتھ ہے فی الحقیقت توجہ کے واسطے حلقہ باندھنے یا کسی خاص انتظام کرنے کی ضرورت نہیں کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ صحابہ پر نہ تھی حالانکہ وہاں پر کوئی حلقہ باندھا جاتا تھا نہ توجہ کا کوئی خاص وقت مقرر تھا نہ کوئی اس کا خاص اہتمام وانتظام تھا مگر باینہمہ آپ کی توجہ ان کے ساتھ ہر وقت لازم غیر منفک تھی کسی وقت آپ کی توجہ سے خالی نہیں رہتے تھے۔ اسی طرح ہمارے حضرات اپنے معتقدین کو خلوت میں ہوں یا جلوت میں کبھی توجہ سے خالی نہیں رکھتے برابر ان کا خیال کرتے ہیں جس طرح ایک شفیق استاد اپنے شاگرد کا ہر وقت خیال رکھتا ہے کہ وہ اگر سامنے بیٹھا پڑھ رہا ہے تب بھی اس کی حرکات وسکنات کا خیال ہے اور اگر گھر چلا جاتا ہے اور دیر میں آتا ہے تب بھی اس سے پوچھتا ہے کہ اتنی دیر میں کیوں آیا کہاں گیا تھا جس سے معلوم ہوا کہ استاد کو گھر جانے سے پہلے اور عدم موجودگی میں بھی اس شاگرد کا خیال تھا چنانچہ مولانا اسی مضمون کو اس شعر میں ادا فرماتے ہیں ؎

دست پیر از غائباں کوتاہ نیست ۔۔۔ قبضۂ اش جز قبضۂ اللہ نیست

غرض کہ عنایات وتوجہ شیخ کا ہونا ضروری ہے اور اس قسم کے تعلقات شیخ سے رکھنے چاہئیں جس سے اس کی تمام عنایات کو اپنے حق میں مبذول کرے اور اسکی رغبت کو اپنی طرف

کھیل نے لیکن یہ رغبت و عنایت شیخ کی خدمت کرنے پیروبانے ہدایا بھیجنے سے نہیں
حاصل ہوتی جس طرح ایک شاگرد اپنے بے غرض استاد کے پاس روزانہ مٹھائیاں
لے جائے دوسرے تیسرے روز نذرانہ دیتا رہے آٹھویں دسویں دن دعوت کرتا رہے
مگر پڑھنے لکھنے سے کورا ہو محنت سے بھاگتا ہو تو ایسے شاگرد سے ایسے استاد کو ہرگز محبت
نہ ہوگی بخلاف اُس شاگرد کے جو نہ مٹھائی لاتا ہے نہ دعوتیں کرتا ہے نہ نذرانے پیش کرتا ہے
لیکن سبق خوب محنت کرکے یاد کرتا ہے ہر وقت پڑھنے لکھنے میں مشغول رہتا ہے کھیل کود سے
نفرت کرتا ہے ایسے طالب سے استاد کو خالص محبت ہوگی اور اس کے دل میں پڑھانے
لکھانے کی اُمنگیں پیدا ہوں گی خود بھی محنت کریگا اس سے بھی محنت لیگا اسی طرح مشائخ
محققین کا حال ہے کہ وہ اُس شخص سے کبھی خوش نہیں ہوتے کہ جو اُن کو تحفہ تحائف بھیجا کرے
نذرانے خوب پیش کیا کرے مگر کام کچھ نہ کرے تو اُن کو نہ ایسے لوگوں کی طرف توجہ ہوتی ہے
نہ ان کی اصلاح کا خیال ہوتا ہے ہاں ان کی توجہ اُن لوگوں پر مبذول ہوتی ہے جو ہر وقت
طلب حق میں مشغول رہتے ہیں ان کا التفات ان لوگوں کی جانب ہوتا ہے جن کے دلوں
میں خدا کی محبت ہوتی ہے اور سچی دھن ہوتی ہے غرضکہ ان دونوں مراقبوں میں یہ بھی
لازمی ہے کہ ان مراقبوں کے فائدہ تامہ حاصل کرنے کے لئے کسی شیخ کا دامن پکڑا جائے
اور اس کے ساتھ تعلق خاص اتباع کا رکھا جائے خواہ بیعت ہو یا نہ ہو زمرۂ مریدین میں
داخل ہو کہ نہ ہو محض تعلق اتباع بھی کافی ہے انشاء اللہ اس طرز عمل کرنے کے بعد نجات
یقینی ہے فلاح دارین اور نجات کونین کے حاصل کرنے کی صورت صرف یہی ہے کہ موافق
مذکورہ بالا طلب حق کی کوشش کی جائے اور سعی سے کسی وقت قدم نہ ہٹایا جائے تو انشاء اللہ
تعالیٰ ضرور کامیابی ہوگی اور مقصود حاصل ہوگا چنانچہ اسی رکوع کے اخیر میں وعدۂ خداوندی
ہے "والذین جاہدوا فینا لنہدینہم سبلنا" یعنی جو لوگ طلب حق کی کوشش کرتے ہیں اور ہم سے
ملنے کی تمنا رکھتے ہیں ہم ان کے واسطے اپنے راستوں کو کھول دیتے ہیں اور چلنے میں ان کی رہبری
کرتے ہیں دنیا کا قاعدہ ہے کہ بسا اوقات انسان محنت کرتا ہے مگر بیکار ثابت ہوتی ہے سعی
ہوتی ہے مگر بجائے کامیابی کے ناکامیابی کی صورتیں نظر آتی ہیں بخلاف اس کے ہمارے یہاں

یہ قاعدہ نہیں کہ ہم کسی کی محنت کو بے کار کریں ہمارے ہاں تو جو کوئی اس کورس میں محنت کریگا کوشش کرے گا وہی کو ملازمت ضرور مل جائیگی چاہے کتاب آئے یا نہ آئے ہاں محنت کرنا شرط ہے غرضکہ خداوند تعالیٰ نے ہمارے متعلق صرف سعی و مجاہدہ سپرد کیا ہے۔ اب اس پر ثمرات کا مرتب ہونا یہ منجانب اللہ ہے وہ خود اس کے ذمہ دار ہیں۔ انھوں نے وعدہ کیا ہے کہ تم ہمارے لئے کوشش کرو ہم اس کا ثمرہ تم کو ضرور دیں گے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ کوشش محض ہمارے واسطے ہو جیسا فینا کا مفہوم ہے طلب دنیا کا شائبہ بھی نہ ہونا چاہئے ورنہ پھر اگر ترتب ثمرات وہدایت سبل نہ ہو تو کچھ بعید نہیں کیونکہ ہمارا وعدہ تو اسی وقت تک ہے جب تک طلب حق کے واسطے مجاہدہ وسعی کرتے رہوگے اور ہم سے ملنے کی کوشش کرتے رہوگے اگر تم دنیا طلب کرنے ہو تو تم جانو اور تمہارا کام ہم سے کچھ واسطہ نہیں دنیا کے طلب کرنے میں ہم تمہارے معاون و مددگار نہیں کیونکہ دنیا ایک قبیح شے ہے اس کی طلب بھی قبیح لہذا ہم ایک امر قبیح کے حاصل کرنے میں تمہاری معاونت کا وعدہ کیسے کر سکتے ہیں اور مراد اس دنیا سے جس کو لہو و لعب فرمایا گیا ہے دنیائے مذموم ہے دنیائے محمود نہیں کیونکہ دنیا کی دو قسمیں ہیں ایک محمود اور ایک مذموم پس مذموم کو آخرت سے بُعد ہے کہ اس کو آخرت سے کوئی تعلق ہی نہیں مگر محمود کو آخرت سے بعد نہیں اور یہاں سے ایک شبہہ کا حل ہو گیا جو میری تقریر پر وارد ہو سکتا تھا وہ یہ کہ مذکورۂ بالا تقریر سے معلوم ہوتا ہے کہ طلب دنیا مذموم ہے حالانکہ بعض صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین پر جو غزوہ اُحد میں پہاڑ کے مورچہ پر سے غنیمت حاصل کرنے کو چلے آئے تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت وہاں سے ہٹنے کی نہ تھی مگر جب انھوں نے دیکھا کہ لشکر عدو بھاگ گیا ہے اب یہاں رہنے کی کیا ضرورت ہے چلو غنیمت کو کیوں چھوڑ یہاں پر بیٹھے رہنے سے کیا فائدہ خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے اور ان کی نسبت ارشاد فرمایا منکم من یرید الدنیا جس سے اُنکا طالب دنیا ہونا معلوم ہوتا ہے تو کیا صحابہ کو فعل مذموم کا مرتکب کہا جاویگا اس شبہہ کے ازالہ کی صورت یہ ہے کہ دنیا کی دو قسمیں ہیں جیسا بیان کیا گیا ایک مذموم اور اس کی طلب بھی مذموم وہ طلب الدنیا للدنیا ہے اسیکا نام لہو و لعب ہے اور ایک دنیا ہے محمود اس کی طلب بھی محمود وہ دنیا للآخرت ہے صحابہ

رضوان اللہ علیہم اجمعین کی طرف ارادہ دنیا کی نسبت کی گئی ہے وہ طلب الدنیا نہ تھی بلکہ طلب الدنیا للآخرت تھی کہ مال غنیمت حاصل ہوگا تو آلات حرب تیار کرکے دشمنان اسلام کا مقابلہ کریں گے۔ اپنے حال کو درست کرکے شوکت اسلامی بڑھائیں گے اور قرآن شریف میں صرف یرید الدنیا فرمایا ہے اور اُن کے حال سے للآخرۃ کی قید معلوم ہوئی پس اشکال رفع ہوگیا اور اگر اس پر یہ شبہ ہو کہ پھر عتاب کیسا حالانکہ یہ طلب دنیائے مذموم کی وجہ یہ ہے کہ اُنھوں نے نص کے ہوتے ہوئے اجتہاد پر کیوں عمل کیا لہذا اس بنا پر عتاب ہوا تو یہ کہ فی نفسہ وہ دنیائے قبیح کے مرتکب ہوئے تھے حاصل آیت کا یہ ہے کہ تم ہمارے واسطے محنت کرو مجاہدہ کرو تو ہم تمہارے پہونچنے کے واسطے اپنے راستے کھول دیں گے اور رہبری کرینگے یہ ہمارا وعدہ ہے اور ان اللہ لا یخلف المیعاد دیکھئے خدا کی شان کہ اتنا بڑا وعدہ کیا کہ تم محض کوشش کرلو آگے مطلوب دینے کے ہم ذمہ دار ہیں پھر ہماری بدگمانی کی طرف نظر فرماکر کہ شاید اپنی تنگدلی کی وجہ سے اتنے بڑے وعدہ کو سن کر مطمئن نہ ہوں لہذا دلجمعی کی خاطر کسقدر تاکیدات فرمائیں کہ اول میں لام تاکید لائے آخر میں نون ثقیلہ لائے تاکہ وعدہ خوب موکد ہوجائے نیز صیغہ لائے جمع متکلم کا ابہیم نہیں فرمایا تاکہ ہمارے مذاق کی پوری پوری رعایت ہوجائے کیونکہ ہمارے محاورہ میں وعدۂ مقارن قدرت کو صیغۂ جمع ہی سے ظاہر کرتے ہیں اور ایک لطیف اشارہ اسطرف بھی ہے کہ ہم وہ کام کرسکتے ہیں جو ایک جماعت بھی ملکر نہیں انجام نہیں دے سکتی کبھی تمکو یہ خیال ہو کہ مجاہدہ وسعی کرنے والے تو سیکڑوں ہوں گے خدا کیونکر ان سب کو ہدایت کرے گا اگرچہ ایک مسلمان کی قوت ایمانیہ ہرگز تقاضا نہیں کرسکتی کہ وہ ایسا خیال کرے لیکن توہمات کے درجہ میں ایسے وساوس پیدا ہوجاتے ہیں ان کے رفع کرنے کی غرض سے صیغہ جمع متکلم اختیار کیا کہ اگرچہ ہم تنہا ہیں لیکن ہم وہ کام کرسکتے ہیں کہ تمام دنیا ملکر بھی نہیں کرسکتی اور آیت میں لفظ سبلنا سے ایک مسئلہ تصوف کی طرف بھی نہایت لطیف اشارہ ہے۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ "طرق الوصول الی اللہ بعدد انفاس الخلائق" کیونکہ یہاں لفظ سبل میں صیغہ جمع اختیار کیا اور دوسری طرف تہدین کا مفعول بھی جمع کی ضمیر ہے

قاس مقابل جمع با بجمع سے معلوم ہوا کہ ہم تک پہونچنے کا طریقہ صرف ایک ہی نہیں بلکہ بہت
سے طریقے ہیں یعنی ہر شخص کے لئے جدا ہے جس طرح کہ اصل اجزاء نسخہ کے ایک ہی ہوتے ہیں
ہے لیکن طبیب خصوصیات طبائع پر نظر کرکے کمی بیشی کے ساتھ یا اختلاف ترکیب کے ساتھ
ہو کسی مریض کے واسطے کسی طرح تجویز کرتا ہے اور کسی مریض کے واسطے کسی دوسرے طریقہ
سے تجویز کرتا ہے اور کسی مریض کے واسطے انہی اجزاء کے نسخہ کے ساتھ بدرقہ بھی تجویز کرتا
ہے اور کسی کو محض نسخہ ہی لکھدیتا ہے غرضکہ اصلی اجزاء ایک ہی ہیں لیکن طبیعت
و مریضوں کی کیفیت کو ملحوظ رکھ کر اس کے موافق نسخہ تجویز کرتا ہے اسی طرح اصل
شریعت غرا واحد ہے مقصود محض وصول الی اللہ ہے لیکن بعض اعمال کے اعتبار
سے ان کے طریق متفرق ہیں جیسے حضرت حاجیصاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک بیمار
شخص آیا اور اس نے عرض کیا کہ حضرت میں بیمار ہوگیا تھا اور افسوس ہے کہ میں مسجد
حرام میں نماز نہ پڑھ سکا آپ نے اس کے واسطے دعائے صحت فرمائی اور رخصت کیا اسکے
چلے جانے کے بعد جب عرفاء کا مجمع رہگیا تو فرمایا کہ اگر یہ شخص عارف ہوتا تو ہرگز قلق
نہ کرتا کیونکہ جس طرح وصول کی یہ صورت ہے کہ حرم میں نماز پڑھو یہ بھی ایک صورت ہے
کہ کسی عذر سے گھر میں نماز پڑھکر حرم کو ترستے رہو اس لئے عارف کی نظر میں دونوں
حالتیں وصول کا سبب ہیں اور ایک سماں ہیں عارف تو ایک بندہ رضا جوئے ہے
اسکا مقصود ادائے صلوٰۃ ہے۔ اگر مسجد حرم میں ہوسکتا تو وہاں ادا کرتا اور اگر عذر
یا بیماری کی وجہ سے وہاں ادا نہ کرسکتا تو اپنے گھر پر ادا کرتا حاصل یہ ہے کہ طرق وصول
الی اللہ کے مختلف ہیں کسی کے استعداد کے مناسب کوئی راستہ ہے اور کسی کی استعداد
کے مناسب دوسرا راستہ ہے لہذا شیخ اور حکیم استعداد کے موافق کوئی طریقہ خاص کردیتا
ہے جو اس کو منزل مقصود پر پہونچانے کا سہل طریقہ ہوتا ہے جس طرح مکہ شریف کے جانے
کا ایک راستہ بمبئی سے ہے ایسے ہی ایک راستہ کراچی سے بھی ہے راستہ اگرچہ متفاوت ہیں
لیکن جس جگہ پہونچنا ہے وہ ایک ہی ہے چاہے ادھر سے جاؤ چاہے اُدھر سے جاؤ اسی
طرح مقصود ایک ہی ہے وصول الی الحق اور طرق متفاوت ہیں اب شیخ کے پاس

ایک شخص آتا ہے اس کے نفع کی صورت کثرت تلاوت ہے تو اس کے واسطے کثرت تلاوت قرآن شریف تجویز کریگا اور ایک دوسرا شخص آتا ہے اس کے اندر مرض کبر ہے اسکے واسطے وہ ایسی تجویزیں اختیار کرتا ہے جن سے کبر رفع ہو جائے پھر اسمیں بھی تعدد ہوتا ہے چنانچہ دیکھئے اس مرض کبر کے ازالہ کی صورت جیسے یہ ہے کہ اس سے سڑک پر جھاڑو دلوائی جائے اسی طرح یہ بھی علاج ہے کہ اس سے نمازیوں کے جوتے اٹھوائے جائیں مقصود دونوں صورتوں سے اور دونوں علاجوں سے مرض کبر کا دفع کرنا ہے غرض کہ طرق اگرچہ مختلف ہیں لیکن مقصود ایک ہی ہے پھر آگے اس پر جزا مرتب فرمائی ان اللہ لمع المحسنین تو اس پر نظر کر کے خلاصہ آیت یہ ہوا کہ تم ہمارے بتلائے ہوئے طریقہ کے موافق عمل کئے جاؤ مجاہدہ وسعی سے ہمت نہ ہارو اس سے تم محسن بندوں میں شامل ہو جاؤ گے اور پھر اسپر یہ جزاء مرتب ہوگی کہ ہم اس طائفہ محسنین کو اپنی معیت کی دولت عطا فرمائیں گے اور معیت کا وعدہ اس صیغہ سے فرمایا ان اللہ لمع المحسنین یوں نہیں فرمایا ان المحسنین لمع اللہ اسمیں اس طرف اشارہ ہے کہ ہم تک پہونچنے کی اگرچہ ایک محتمل صورت یہ بھی ہے کہ تم ہم سے آکر مل جاؤ مگر یہ تمہاری قدرت سے باہر ہے ؎

نگردد قطع ہرگز جادۂ عشق از دویدنہا کہ می مالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا

لہذا ہم نے دوسری صورت تجویز کر لی ہے کہ ہم محسنین کے ساتھ مل جائیں گے اب محسنین کی حقیقت سمجھئے جس کو اوپر والذین جاہدوا سے تعبیر فرمایا ہے احسان کی حقیقت حدیث شریف میں یہ آئی ہے۔ ان تعبد اللہ کانک تراہ یعنی خدا کی عبادت اس طرح خوبی وادب وتوجہ سے کرو کہ اگر تم اس کو دیکھتے ہوتے اس وقت جس طرح کرتے اس پر یہ شبہ ہوگا کہ جب ہم دیکھتے نہیں تو اس حالت کا اثر ہم کیسے لے سکتے ہیں اسکا جواب حضور نے ساتھ ہی دیدیا ہے فان لم تکن تراہ فانہ یراک اگر تم خدا کو نہیں دیکھتے تو وہ تو یقیناً تم کو دیکھ رہے ہیں اور رویت حاکم للمحکوم کا اثر ہی محکوم پر وہی ہوتا ہے جو رویت محکوم للحاکم کا اثر ہوتا ہے یعنی جس طرح ایک محکوم اپنے حاکم کو دیکھ کر اس کے سامنے نہایت ادب اور متانت کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے اور تمام کام نہایت ہوشیاری